

# لے دو وقت کی سی دے

## ناولٹ

کبھی کوئی خاص مشکل پیش نہیں آتی تھی۔ وہ ہمیشہ اس کے آس پاس ہی موجود ہوتا۔ لا بھری میں عین سامنے والی ٹیبل پر 'ڈیپارٹمنٹ' کے باغچے میں پڑے بیچ پر۔ سینئر روم میں اس کے عقب والی سیٹ پر اور کیفے ٹیریا میں وہ ہمیشہ اس سے پہلے ہی موجود ہوتا۔ حالانکہ اس نے زارا سے کبھی کچھ نہ کہا تھا۔ مگر زارا کو اس کا ٹھنکی باندھ کر دیکھنا ناگوار گزرتا، ایک الجھن کا شکار کر دیتا تھا۔ وہ گھر میں بھی جھنجھلاہٹ کا شکار رہتی کہ ہمہ وقت اعصاب پر تو وہ سوار رہنے لگا تھا۔

زارا نے اپنے عین سامنے دیکھا۔ وہ سامنے بیچ پر بظاہر کتاب کھولے مگر اسی پر نظریں جمائے بیٹھا تھا۔ مگر وقفے وقفے سے نظریں زارا پر گھبرا جاتیں اور وہ کبھی اتفاقاً "زارا کی نگاہیں اس سے مل جاتیں تو وہ گھبرا کر دوبارہ سے کتاب پر جھک جاتا۔

"کیا احمقانہ حرکت ہے؟" زارا نے شاید کی انتقاد بردہ مائے تھے جب انعم نے چونک کر اس سے پوچھا۔  
"تم کہیں پہنچ گئی ہو۔"

"ہاں؟" وہ چونک کر زارا کی طرف متوجہ ہوئی۔

"بھئی، یوں چپکے چپکے سرگوشیاں کرنے والے کہیں نہ کہیں تو پہنچے ہی ہوتے ہیں۔ بالی داوے کتنے جٹان قابو میں کر رکھے ہیں اور اس وقت ہماری زارا کے

پر پولیس کی کلاسز شروع ہونے کے دن سے لے کر آج تک وہ دیکھ رہی تھی کہ وہ نوجوان مسلسل اس کا پیچھا کر رہا تھا۔ شروع میں تو زارا اعمیہ نے اسے نظر انداز کرنے کی کوشش کی کہ یونیورسٹی تھی جہاں تعلیم کے لیے سنجیدہ نوجوانوں کے ساتھ ساتھ ان جیسوں کی بھی کمی نہ تھی، جن کا مقصد محض وقت گزاری کے لیے جامعہ کا ماحول خراب کرنا تھا۔ مگر اب اتنے دن گزر جانے کے بعد وہ اسے نظر انداز نہیں کر سکتی تھی، سولا شعوری طور پر اس کی نگاہیں اپنے ارد گرد اسے تلاش کرنے لگتیں اور زارا اعمیہ کو





ساتھ کون چھینر خانی کر رہا ہے۔ ”لمبی چٹیا گندی سنہری رنگت، بڑی بڑی تاثر انگیز آنکھیں۔ چہرے پر بے تحاشا نمک اور معصومیت، یہ تھی انعم بظاہر خاموش اپنی کتابوں کی دنیا میں مگن مگر ایک ہلکی سی چھینر اور شرارت جو محض اپنی فریڈز کے سامنے ہی ظاہر ہوتی تھی۔

”کہیں پہنچوں نہ پہنچوں۔ مگر پاگل خانے ضرور پہنچوں گی۔“ زارا نے چڑ کر کتاب بند کر دی۔

”کون جا رہا ہے پاگل خانے۔“ عظمیٰ نے اپنی ناک کی پھٹنگ پر کھٹک آنے والی عینک کو شہادت کی انگلی سے اوپر کیا اور بے حد چونک کر اسے دیکھا۔ عظمیٰ ایک عام سے نقوش کی مالک ذہین لڑکی تھی۔ رنگت ذرا صاف تھی۔ پڑھائی میں سب سے آگے ڈپارٹمنٹ میں کوئی بھی تو اس کے مقابلے پر نہ تھا۔

انعم اور عظمیٰ میں بہت سی باتیں مشترک تھیں۔ دونوں کا تعلق ایک سفید پوش گھرانے سے تھا۔ دونوں ہی اپنا کیریئر بنانے کے بارے میں سنجیدہ تھیں۔ دونوں ہی کے والدین کو ان کے لیے اچھے رشتوں کا انتظار تھا اور سب سے بڑی بات وہ دونوں ایک ہی کالونی میں رہتی تھیں اور اسکول سے ہی ایک دوسرے کے ساتھ تھیں۔ زارا عمیر کو ان لوگوں کا اپنی اسٹڈی کے بارے میں سیریس روٹی ہی ان کے قریب لایا تھا۔ ورنہ ان کے خاندانوں میں کوئی مشترک بات نہ تھی۔ زارا عمیر کا تعلق رائے فیملی سے تھا اور اس کا خاندان ایک عرصے سے سیاست سے وابستہ تھا اور ایک وسیع جاگیر کا مالک تھا۔

”تمہیں؟“ انعم نے کہا تو وہ مسکرا دی۔

”مگر وہاں سب نے پوچھا کہ باقی دو کہاں ہیں

”کہہ دینا پیچھے پیچھے آرہی ہیں۔“ انعم خود ہی ہنسنے لگی۔

”مسئلہ کیا ہے؟“ اس نے کتاب بند کر کے

”بیک میں ڈالی۔“

”زارا سے پوچھو۔“

”کوئی مسئلہ نہیں ہے۔“ زارا نے بے زاری سے کہا اور گھاس کی پتیاں نوچنے لگی۔

”کیوں نہیں ہے۔ مسئلہ تو عین سامنے موجود ہے۔“ عظمیٰ کے لبوں پر مبہم سی مسکراہٹ بکھری۔ زارا نے چونک کر اسے دیکھا۔ پھر ایک طویل سانس لے کر رہ گئی۔

”تو تمہیں بھی معلوم ہے۔“

”ہم بھی دو آنکھیں رکھتے ہیں جناب۔ میں تو بس منتظر تھی ہماری زارا بی بی کا ضبط کب جواب دیتا ہے۔“

”افوہ کیا کہہ رہے ہو تم لوگ۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔“ انعم جھنجھلائی۔

”تو اس میں سارا قصور تمہاری سمجھ کا ہے نا۔“ عظمیٰ آج بڑے موڈ میں نظر آرہی تھی۔

”کس مسئلے کی بات کر رہے ہو۔ مجھے تو دور دور تک کوئی مسئلہ نظر نہیں آ رہا۔“

”دور دور تک واقعی کوئی مسئلہ نہیں ہے مگر نزدیک۔“

”عظمیٰ پلیز!“ زارا نے بے اختیار اسے ٹوکا۔ تو عظمیٰ نے ہنسنے ہوئے انعم کو دیکھا جو ہونقوں کی طرح انہیں دیکھ رہی تھی۔

”فکال ہے تمہیں اتنا نزدیک چھ فٹ کا مسئلہ نظر نہیں آ رہا۔“

”مسئلے کی تسبیح چیتی رہنا۔“ انعم نے دانت پیس کر اسے دیکھا۔ ”میرے نزدیک تو تم دونوں ہو یا پھر درخت۔ اب تم چھ فٹ سے کم ہو اور درخت چھ فٹ سے زیادہ۔“

”میری سمجھ میں نہیں آ رہا یہ شخص یوں میرے پیچھے کیوں پڑا ہے۔“ زارا بڑبڑائی۔

”حالانکہ دیکھنے میں خاصا معقول نظر آتا ہے۔“ عظمیٰ نے ذرا سی گردن موڑ کر عینک کے پیچھے سے اس کا جائزہ لیا۔

”پہلے میرا خیال تھا کہ شاید تم لوگوں میں سے کوئی۔۔۔ مگر۔۔۔“

”کون۔۔۔ کون؟“ انعم نے زارا نے کی طرح گردن اٹھا کر ادھر ادھر دیکھنا شروع کر دیا۔

”اپنے عین پیچھے بیٹھ کر گرے شرٹ میں ملبوس ریولیس کے زین العابدین کو دیکھ لو۔“ عظمیٰ نے کہا تو انعم نے فوراً گردن گھمائی۔ زین العابدین نے جو یوں خود کو گھورتے پایا تو گھبرا کر اٹھ گیا اور کبے لمبے ڈنگ بھرتا غائب ہو گیا۔

”یہ زارا کا پیچھا کرتا ہے۔ مگر کیوں؟“

”یہ تو زارا کو پتا ہو گا۔“ عظمیٰ مائل بہ شرارت تھی۔ زارا نے اسے گھور کر دیکھا۔

”حالانکہ وہ خاصا شریف انسان ہے۔ ڈپارٹمنٹ کی کسی لڑکی کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتا۔“

”ہاں۔۔۔ کسی لڑکی کی طرف نہیں دیکھتا اور مجھے عینکلی باندھ کر دیکھتا ہے۔ خاصا شریف انسان ہے۔“ زارا غصہ بولی۔

”یہ تو وہی بات ہوئی۔ یعنی ایک کڑی نوں چھڑ کے باقی سب توں اے شرماندا۔ زارا۔ اسے کہیں تجھ سے محبت تو نہیں ہو گئی۔“ انعم ایک دم پر جوش ہوئی۔

”زارا اسر تھام کر رہ گئی۔“

”اسے صرف عنوان دے دو۔ پورا مضمون یہ خود لکھ لے گی۔“

”ہاں تو اور کیا وجہ ہو سکتی ہے۔ اسے ضرور ہی تم سے محبت ہو گئی ہے۔“ انعم ڈھٹائی کے ساتھ اپنے ذہان پر قائم تھی۔ زارا نے ادھر ادھر سے چیزیں سمیٹ کر اپنے بیگ میں ڈالیں اور کھڑی ہو گئی۔

”کہاں؟“ عظمیٰ نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

”گھر۔“ وہ مختصراً بولی۔

”اے سرر رضا ابراہیم کا انٹرویو نہیں لینا۔“

”میرا موڈ نہیں ہے۔“ وہ سچ سچ آگاہی تھی۔ سوان کے دکنے کے باوجود گھر چلی آئی۔

”مالان میں کھڑی مالی سے گملوں کی ترتیب بدلو

رہی تھیں۔

”۲۱ جلدی واپس آگئیں۔؟“ ممانے حیرت سے پوچھا۔

”بس ممانے کوئی خاص کلاسز نہیں تھیں آج۔“ وہ اندر چلی آئی۔ بیگ رکھنے اور فریش ہونے تک بھی اس کا ذہن زین العابدین میں ہی اٹکا رہا تھا۔ اگرچہ زارا عمیر کے لیے یہ نئی بات نہ تھی کہ کوئی اسے دیکھے اور ٹھٹھک جائے یا عینکلی باندھ کر دیکھنے لگے۔ وہ تھی ہی ایسی۔ مگر زین میں کچھ ایسا ضرور تھا جو اسے سوچنے پر مجبور کر رہا تھا۔ ایک دم سوچتی اور تھجکتی۔

ہوئی نگاہ ہوئی تھی اس کی۔ جیسے وہ اس کے چہرے کے عقب میں کسی کھوجانے والے چہرے کو ڈھونڈتا ہو۔

”مگر وہ کھوجتا کیوں ہے۔ آگے بڑھ کر پوچھ کیوں نہیں لیتا۔“

”آج شیراز کا فون آیا تھا زارا!“ ممی کمرے میں داخل ہوئیں۔ وہ جو گلاس وینڈو کھول رہی تھی۔ چونک کر پلٹی۔

”ہوں۔!“

”شیراز کا فون آیا تھا۔“ ممانے دوبارہ بتایا۔

”کیا کہہ رہے تھے بھائی۔ بھابھی کیسی ہیں اور میرا جھنجھا۔ کیا نام رکھا ہے اس کا۔“ وہ اشتیاق سے پوچھنے لگی۔

”سب ٹھیک ہیں۔ اور نام رائے فمد شیراز رکھا ہے۔“

”اچھا ہے، لیکن وہ آئیں گے کب۔“

”۲۲ بھی تو کوئی پروگرام نہیں ہے۔“ ممانے کچھ افسردہ دکھائی دیں۔ شیراز ان کا اکلوتا بیٹا تھا۔ امریکہ پڑھنے گیا تو پھر واپس نہیں آیا۔ وہیں ایک مسلمان لڑکی رابعہ سے شادی کر لی۔ ممانے کو وہ تو بہت ہوا تھا۔ مگر انہوں نے رابعہ کو قبول کر کے پاکستان آنے کی دعوت دی۔ اچھی خوبصورت اور خوش مزاج لڑکی تھی۔ ان سب کو اس بات کا افسوس تو تھا کہ شیراز نے انہیں بغیر بتائے شادی کی مگر رابعہ سے مل کر وہ سب ہی بہت خوش ہوئے تھے۔ پاپا نے دیمہ ”رائے ہاؤس“ میں



بڑی دھوم دھام سے کیا تھا اور اب چند دن قبل بذریعہ ای میل انہیں پوتے کی اطلاع اور تصویر ملی تھی۔  
”ہمیں بلا رہا ہے کہ کچھ عرصہ ہمارے پاس آکر رہیں۔ اب تو اس نے اپنا ذاتی اپارٹمنٹ بھی خرید لیا ہے۔“

”تو چلی جائیں نا۔ بھائی کب سے تو بلا رہے ہیں۔“  
”تمہیں اکیلا چھوڑ کر چلی جاؤں۔“ ممانے گھورا۔

”میرا کیا ہے۔ کچھ عرصہ رائے ہاؤس میں رہ لوں گی۔“

”بنار خستی کے ہی۔“ ممانے چھینرا۔  
”ممنی۔۔۔ وہ جینپ گئی۔“

”ایک تو یہ رائے رضوان حیدر امریکہ جا کر ہی بیٹھ گیا ہے۔“ ممانے مسکرائیں۔

”بہت جلدی ہے آپ کو مجھے رخصت کرنے کی۔“ وہ ہلکی سی خفگی کے ساتھ بولی۔

”ہر ماں کو ہوتی ہے۔“  
”کبھی کبھی آپ بھی انعم اور عظمیٰ کی ماؤں جیسی باتیں کرتی ہیں۔“

”مائیں ساری ایک جیسی ہوتی ہیں خواہ کسی بھی طبقے سے تعلق رکھتی ہوں۔“

”اور جو امریکہ میں وہ بھی شادی رچا بیٹھا ہو بھائی کی طرح تو۔“ زارا نے مسکراتے ہوئے کہا تو ممانے نے اسے گھور کر دیکھا۔

”فضول باتیں مت کیا کرو۔ امریکہ میں تمہارے اتنے رشتے دار تو موجود ہی ہیں کہ اگر ایسی کوئی بات ہو تو فوراً معلوم ہو جائے۔“

”چھا خفا تو مت ہوں۔ میں نے تو یونہی ایک امکان ظاہر کیا تھا۔“ اس نے لاٹ سے ممانے کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

”ایسے بڑے بڑے امکان مت ظاہر کیا کرو۔ ممانا دل دلی جاتا ہے۔“ اس نے لاٹ سے ممانے کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

”خوشیاں دیکھنے کے ہم منتظر ہیں۔“ انہوں نے زارا کے سر پر ہاتھ رکھا۔

”خوشیاں دیکھنے کے ہم منتظر ہیں۔“ انہوں نے زارا کے سر پر ہاتھ رکھا۔

”اور آپ کے خیال میں یہ ساری خوشیاں رضوان حیدر سے وابستہ ہیں۔“

”خدا کرے کہ تمہاری ساری خوشیاں اسی کے ساتھ وابستہ رہیں۔“ ممانے دعائیہ انداز میں کہا۔

”اور اس کی مجھ سے۔“ زارا متنبہم لہجے میں بولی تو ممانے مسکرا دیں۔

”ہاں۔ آؤ۔ اب کچھ کھالی لو۔“  
”میں آرہی ہوں۔“ ممانا چلی گئیں تو زارا کا دھیان پھر سے بھٹک کر زمین العابدین کی طرف چلا گیا۔

جسے جھٹک کر وہ ڈانگ روم میں چلی آئی۔

ہلکی روم جھم نے یونیورسٹی کے سبزہ زاروں کو عجیب سا نکھار بخش دیا تھا۔ سرخ درودیاوار پر چھلکتی بارش کی پوندوں نے ان کے دلوں میں ایک نئی امنگ بھر دی تھی۔ وہ سب کچھ بھول بھال کر موسم کے رنگ انجوائے کر رہے تھے۔ افتخار کھوکھرا اپنے مخصوص پنجابی لہجے میں منیر نیازی کی پنجابی نظم سن رہا تھا۔

توں ہیں تے فیر میں دی ہاں  
میں جے نہ ہو واں  
میری طراں فیر کون ایس جگ دے  
سارے زہروں پیوے  
دل وچ جلدے بھانیز لے کے  
پسلیاں پسلیاں جیولے

(تم ہو تو میں بھی ہوں۔ اگر میں نہ ہوں تو کون ہے جو میرے طرح اس جگ کا سارا زہر پیے اور دل میں جلتی آگ بسائے ہنس ہنس کر جے۔)

افتخار کھوکھرا کی نگاہیں عظمیٰ کے آس پاس بھٹک رہی تھیں اور وہ اس سے یکسر بے نیاز آسمان پر چھائے سرمئی بادلوں سے برستی بوندیں گن رہی تھی۔

”کچھ تو ترس کھاؤ اس بے چارے پر۔“ انعم نے سرگوشی کی۔

”جس گاؤں جانا نہیں اس کے کوس گھننے کا کیا فائدہ۔“ وہ نظروں کا زاد سے بدلے بغیر اطمینان سے بولی۔ اس کے گلاسز گود میں رکھی فائل پر دھبے

تھے۔ لمبے چوٹی میں سے نکلے بال چہرے کا احاطہ کئے ہوئے تھے۔ سفید کلف لگے دوپٹے میں وہ انتہائی نکھری نکھری سی لگ رہی تھی۔

”انتہائی سنگدل ہو تم۔“ زارا نے کہا اور پھر سے افتخار کھوکھرا کی طرف متوجہ ہوئی۔

وہ اندرون لاہور کی گلیوں میں دودھ مکھن پر پلنے والا صحت مند و توانا نوجوان تھا۔ اس کے مضبوط بازو اور جوڑی چھاتی بتاتی تھی کہ اس نے کبھی حلاوتی کی دکان پر اپنے باپ کے ساتھ بیٹھ کر لسی میں مکھن کے پیڑے ”ٹرڈک“ کر پیے ہیں۔ پھر اس کے انداز میں بڑی بے نیازی اور جرات تھی۔ وہ آصف ارتم ماجد اور فیروز کے کہنے پر اگلی نظم سن رہا تھا۔

بھید نہیں کھلا آخر کی اے  
ایس کڑی دی چال  
کلیاں ور گارنگ اے جس دا  
بد لال ور گے وال  
کلی ہووے تے ان جملدی  
جیوے گورھے یار  
جے کوئی نال سہیلی ہووے  
اکھاں نہ کردی چار

”تم اس سے تنہا کب ملی تھیں۔“ انعم بے اختیار بول اٹھی۔ عظمیٰ تپ کر کھڑی ہو گئی۔

”چلو یہاں سے۔۔۔“  
ان دونوں نے بھی اس کی تقلید کی۔ مگر سر رضا کو دیکھ کر رک گئیں۔

”آپ لوگ یہاں کیا کر رہے ہیں۔“ ساری کلاس غل بھر اٹھی۔

”سرا! آج ہمیں نہیں پڑھنا۔“ افتخار کھوکھرا بول اٹھا۔

”کیوں؟۔۔۔“  
”سرا ہمارا موڈ نہیں ہے۔“ بڑی لا پرواہی سے بولایا۔ سر رضا نے سب پر ایک نگاہ دوڑائی۔ موڈ کسی کا بھی نہ تھا۔ ان کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ بکھری۔

”تو پھر کیا ارادے ہیں۔؟“

”سرا ہمارا موڈ نہیں ہے۔“ بڑی لا پرواہی سے بولایا۔ سر رضا نے سب پر ایک نگاہ دوڑائی۔ موڈ کسی کا بھی نہ تھا۔ ان کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ بکھری۔

”تو پھر کیا ارادے ہیں۔؟“

”سرا ہمارا موڈ نہیں ہے۔“ بڑی لا پرواہی سے بولایا۔ سر رضا نے سب پر ایک نگاہ دوڑائی۔ موڈ کسی کا بھی نہ تھا۔ ان کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ بکھری۔

”تو پھر کیا ارادے ہیں۔؟“

”سرا ہمارا موڈ نہیں ہے۔“ بڑی لا پرواہی سے بولایا۔ سر رضا نے سب پر ایک نگاہ دوڑائی۔ موڈ کسی کا بھی نہ تھا۔ ان کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ بکھری۔

”تو پھر کیا ارادے ہیں۔؟“

”سرجی! آم کھاتے ہیں۔ میں آپ کو پنجابی شاعری بھی سناؤں گا۔“ افتخار کھوکھرا نے تجویز دی۔ جس پر سر رضا نے کچھ لمحے غور کیا۔ پھر بولے۔

”ٹھیک ہے چندہ کرو۔“

”سرا ہمارا تو خیال تھا یہ پارٹی آپ کی طرف سے ہوگی۔“ آصف نے کان کھجاتے ہوئے کہا۔

”میں فیاض ہوں پر خوردار۔ بے وقوف نہیں۔“ افتخار کھوکھرا سب سے پیسے لینے لگا۔ عظمیٰ کے پاس آیا تو مسکرا کر ہاتھ پیچھے کیا۔

”اب میں آپ سے پیسے لوں گا۔؟“  
عظمیٰ جزبز ہو گئی۔ افتخار کھوکھرا آگے بڑھ گیا تھا۔

”ایڈیٹ۔“ عظمیٰ دانت پیس کر رہ گئی۔

”اس نے تمہارے پیسے بچا دیے۔ تم خواخوہ خواہ رہی ہو۔“ انعم نے حیرت سے اسے دیکھا۔ جو غصے میں لال چلی ہوتی۔ ان دونوں کے روکنے کے باوجود وہاں سے چلی گئی۔

ڈپارٹمنٹ میں فائل کے طلبا نے ہنگامہ کھڑا کر رکھا تھا۔ آموں کا کریٹ درمیان میں پڑا تھا اور لڑکے اس کے گرد بھنگڑا ڈال رہے تھے۔ لڑکوں کی تجویز تھی کہ دو نمیس بنائی جائیں۔ لڑکے الگ لڑکیاں الگ مگر لڑکیاں انکاری تھیں کہ اس صورت میں ہارنا تو ایک طرف وہ لوگ آموں سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتیں۔

پریویس کے اسٹوڈنٹ دور کھڑے اس ہنگامے سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ ان میں وہ بھی تھا۔ ”زین العابدین“ اس کے لبوں پر ایک خوبصورت اور معصوم سی مسکراہٹ کھیل رہی تھی مگر زارا کو دیکھتے ہی وہ سنجیدہ ہو گیا۔ زارا اسے نظر انداز کر کے افتخار کی طرف متوجہ ہو گئی جو عظمیٰ کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔

”وہ خفا ہو گئی ہے۔“ انعم نے بتایا۔

”کس سے مجھ سے۔۔۔؟“ حد درجہ حیرت تھی اس کے لہجے میں۔

”تم نے اس سے پیسے جو نہیں لیے تھے۔“

”بس اتنی سی بات سے خفا ہو گئی۔“ وہ مسکرایا۔

”ہاں۔ کیونکہ اسے اپنے پیسوں کا کھانے کی عادت

”تم نے اس سے پیسے جو نہیں لیے تھے۔“

”ہاں۔ کیونکہ اسے اپنے پیسوں کا کھانے کی عادت



”جے۔“  
 ”خیر کھلائیں گے تو اسے ہم اپنے ہی پیسوں کا۔  
 ورنہ ہمارا نام بھی افتخار کھو کر نہیں۔“ اپنی موچھیں  
 سنوارتے ہوئے وہ بھرپور انداز میں مسکرایا تھا۔  
 اور اگلے دن عظمیٰ جی ہوئی افتخار کھو کر کو ساری  
 یونیورسٹی میں ڈھونڈ رہی تھی۔  
 ”یا اللہ! ایک ہی رات میں ایسی کایا پلٹی کہ وہ جو اس  
 کا نام سننے کی روادار نہ تھی۔ اب اسی کو دیوانہ وار  
 ڈھونڈ رہی ہے۔“ مارے حیرت کے انعم کا منہ بند نہ ہو  
 رہا تھا۔  
 ”میں اسے قتل کر دوں گی۔“ عظمیٰ دانت پیس کر  
 بولی۔

”گھائل تو وہ پہلے ہی ہو چکا۔ اب جان بھی لوگی تو وہ  
 اف نہیں کرے گا۔“ زارا مسکرائی۔  
 ”جانتی ہو اس نے کیا کیا ہے۔“  
 ”نہیں میں نہیں جانتی۔“  
 ”وہ کل آموں کا کریٹ لے کر میرے گھر پہنچ  
 گیا۔“ اس نے دانت پیس کر بتایا۔ وہ دونوں چیخ  
 اٹھیں۔  
 ”کیا؟۔“

”ہاں۔“ باقاعدہ اپنا تعارف میرے کلاس فیلو کی  
 حیثیت سے کرایا اور کہا کہ اس کے باغ کے آم ہیں  
 اور وہ اپنے سارے دوستوں کے ہاں دے کر آیا ہے۔  
 بسن بھائیوں نے کل سے جان کھا رکھی ہے کہ آلی تم  
 لوگوں کے ساتھ بھی دوستی کرتی ہو۔ اللہ اباجی کیا  
 سوچتے ہوں گے میرے بارے میں۔“ دونوں ہاتھوں  
 میں چہرہ چھپا کر وہ رو رہی ہو گئی۔  
 ”کیا انہوں نے کچھ کہا تم سے۔“ زارا نے تفکر  
 سے پوچھا۔

”نہیں کہا تو کچھ نہیں۔ بس خاموشی سے حقہ  
 کڑکڑاتے رہے۔“  
 ”اور افتخار؟۔“  
 ”بہت خوش ہو کر ملے۔ چائے بھی پلائی اور آموں کا  
 شکریہ ادا کر کے واپس بھیجا۔“ وہ جھل کر بولی۔ زارا اور

انعم بے اختیار مسکرائی تھیں۔

”تو پھر تم کیوں ٹینس ہو رہی ہو۔“  
 ”کیوں بہت اچھا کام کیا ہے اس نے۔ انتہائی ذلیل  
 اور گھٹیا حرکت ہے یہ۔“  
 ”اچھا ٹھیک ہے وہ ملے گا تو اس سے پوچھ لیں گے  
 کہ اس نے ایسا کیوں کیا۔“ زارا نے اسے ٹھنڈا  
 کرنے کی کوشش کی۔

”میں اسے چھوڑوں گی نہیں۔“  
 ”ہرگز مت چھوڑنا۔“ انعم فوراً بول اٹھی۔ اس  
 سے قبل کہ عظمیٰ اس کے جملے میں چھپے معنی ڈھونڈ کر  
 اس کی گردن دبا دیتی۔ زارا جلدی سے کھڑی ہو گئی۔  
 ”او تمہیں ٹھنڈا جو س پلو آؤں۔“

”مگر وہ ہے کہاں؟۔“ عظمیٰ فوراً اس سے دو  
 ہاتھ کرنا چاہتی تھی کہ آج وہ آئی ہی اس لیے تھی۔  
 ”پتا نہیں۔ صبح سے دیکھا نہیں کہیں۔“ زارا نے  
 کہا وہ تینوں کیفے میرا کی طرف چل دیں اور وہاں افتخار  
 بہت سے دوستوں میں گھرا کہہ رہا تھا۔

کرم کرو یا ستم۔ گلہ نہیں کرتے  
 خزاں میں پھول یقیناً کھلا نہیں کرتے  
 ملاؤ خاک میں ہم کو مگر خیال رہے  
 ہم ایسے لوگ دوبارہ ملا نہیں کرتے

اس کی نگاہوں میں شوخی سی اٹھ آئی تھی۔  
 ”انتہائی گھٹیا اور ذلیل انسان ہے۔“ ظاہر ہے وہ  
 اتنے سارے لوگوں میں اسے اٹھا کر یہ تو نہیں پوچھ  
 سکتی تھی کہ تم میرے گھر آؤ کیوں لے کر آئے۔ سو  
 چڑ کر دروازے کے پاس ہی کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔ کچھ  
 دیر بعد افتخار اٹھ کر خود ہی ان کے قریب آ گیا۔  
 ”السلام علیکم اور سنا میں کیا حال چال ہیں آپ  
 کے۔“ خالی کرسی کی پشت پر اپنی ہتھیلیاں ٹکائے  
 ہوئے وہ بظاہر سب سے پوچھ رہا تھا۔

”ہمارا حال اور چال تو ٹھیک ہیں تم اپنی فکر کرو۔“  
 زارا نے نیبل پر انگلی بجاتے ہوئے کہا۔  
 ”ہم سے کون قصور سرزد ہو گیا جی۔“ مخصوص

لب و لہجہ نگاہوں میں بلا کی شرارت۔ عظمیٰ تاؤ  
 کھا کر پلٹی۔ عینک کو شہادت کی انگلی سے ٹھکانے پر کیا  
 اور اس کے عقب سے کھا جانے والی نظروں سے  
 افتخار کو دیکھا۔ جو پورے کا پورا اس کی طرف متوجہ  
 تھا۔ وہ ایک پل کو گڑبڑائی۔ (اور اسی ایک پل کو افتخار کی  
 نگاہوں نے قید کیا تھا) پھر سنبھل کر بولی۔

”تم نے میرے گھر آنے کی جرات کیسے کی؟“  
 ”کیا پھر اگر دکھاؤں کہ کیسے ہمت کی۔“ افتخار نے  
 معصومیت سے پوچھا۔ انعم نے اپنی مسکراہٹ روکنے  
 کو منہ پر ہاتھ رکھا۔  
 ”تم آم کیوں لائے؟۔“ وہ دبے دبے لہجے میں  
 چیخی۔

”اچھے نہیں نکلے، خفامت ہو اور بھجوا دوں گا۔“  
 بلا کا اطمینان تھا اس کے لہجے میں۔  
 انعم کا قہقہہ آؤٹ آف کنٹرول ہوا تھا۔ عظمیٰ غصے  
 میں افتخار کی ڈھٹائی اور دوستوں کی بے وفائی پر سب  
 کچھ چھوڑ چھاڑ باہر بھاگی۔ وہ دونوں اس کے پیچھے  
 تھیں۔ جبکہ افتخار کھو کر اسی اطمینان سے پلٹ کر  
 اپنے دوستوں میں جا بیٹھا تھا۔  
 ”ہاں تو میں کیا سنا رہا تھا۔“



وہ کیپیوٹر پر مصروف تھی۔ جب دروازہ ہلکا سا ناک  
 ہوا۔

”ہیس۔۔۔“ کی بورڈ پر انگلیاں چلاتے ہوئے اس  
 نے کہا تو ملازمہ دروازہ کھول کر اندر آ گئی۔  
 ”بڑی بی بی آئی ہیں۔“

”اوہ مائی جان۔“ وہ چوکی ”کیلی ہیں۔۔۔“  
 ”نہیں ساتھ میں رائے سلیمان حیدر بھی ہیں۔“  
 ”اور ممّا۔ پارلی سے واپس آ گئیں۔؟“ اس نے  
 کیپیوٹر آف کرتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں۔ ابھی تک تو نہیں لوٹیں۔“  
 ”ٹھیک ہے تم کولڈ ڈرنکس وغیرہ لے کر آؤ اور کھانا  
 تیار ہے؟“ ڈربینگ نیبل کے سامنے کھڑے ہو کر اس  
 نے بالوں میں برش چلایا۔



”کھانا تو بالکل تیار ہے جی۔“  
”ایک دو ڈشز کا اضافہ کرو۔ وہ لوگ کھانا کھا کر ہی جائیں گے۔“ ملازمہ کو ہدایت دے کر وہ ڈرائنگ روم میں آگئی۔

”السلام علیکم! تائی جان۔“  
”جیتتی رہو۔“ تائی جان نے اسے محبت سے ساتھ لگا کر باریا کر لیا۔

”اور آپ کیسے ہیں سلیمان بھائی! گاؤں سے کب آئے۔“ وہ سلیمان حیدر کی طرف متوجہ ہوئی۔  
”آج صبح ہی لوٹا ہوں۔“ وہ مسکرائے۔

”میری بیٹی تو اب مجھے اپنی شکل بھی نہیں دکھاتی۔“ تائی اماں نے کہا تو سلیمان بھی بول اٹھے۔  
”ہاں بھئی۔ یہ تم کیا کر رہی ہو آج کل۔“

”وہی اسٹڈیز۔“ زارا نے قدرے حیرت سے انہیں دیکھا۔

”مہینوں رائے ہاؤس میں نہیں جھانکتی ہو۔“  
”کیا کروں سلیمان بھائی! سارا دن تو یونیورسٹی میں گزر جاتا ہے۔ واپسی میں بھی یونیورسٹی ٹائم نکل جاتا ہے۔ سوچتی تو روز ہوں کہ آج جاؤں گی۔“ زارا نے کہا۔ ملازمہ ڈرنک سرو کرنے لگی تھی۔

”کیا ضرورت تھی اتنا پڑھنے کی۔ گریجویٹیشن کافی نہ تھا۔“ سلیمان بھائی کو تو پہلے ہی اس کے یونیورسٹی جوائن کرنے پر اعتراض تھا۔

”بالکل کافی نہ تھا۔“ وہ فوراً بول اٹھی۔ تو تائی جان نے بھی اس کی حمایت کی۔

”فارس رہ کر کیا کرتی۔ اچھا ہے جب تک رضوان نہیں آجاتا۔ بہتر ہے اپنا شوق پورا کر لے۔“ زارا جزیب ہو گئی۔ وہ اپنے شوق کو انتظار کا نام نہیں دے سکتی تھی مگر وہ خاموش ہی رہی کہ سلیمان کے سامنے وہ ابھی اپنے کیریئر کے بارے میں کوئی بات نہیں کرنا چاہتی تھی کہ تائی جان کے قتل کے بعد ہر معاملہ عملاً سلیمان حیدر کے ہاتھ میں تھا۔ پایا نے اپنے شوق سے لیڈر گارمنٹس کا بزنس شروع کیا اور باقی ہر معاملے سے دستبردار ہو کر محض اپنے بزنس پر توجہ دینے لگا۔

سو تائی جان کی ہی طرح جاگیر کے معاملات سلجھاتے سلجھاتے سلیمان لہجے میں ایک تحکمانہ پن آگیا تھا۔ اگر زارا کی بات سے وہ اختلاف کرتے تو زارا کے پاس کوئی دلیل بھی نہ پہنچتی کہ پھر کوئی سنیٹا ہی گوارہ نہ کرتا۔ وہ پہلے رضوان سے بات کرنا چاہتی تھی۔

”یہ لوس۔“ تائی جان نے پرس کھنگال کر ایک چھوٹی سی مشری ڈبیا اس کو دی۔ جس کے شفاف شیشے میں سے دل کی شکل کے ٹاپس نظر آ رہے تھے جس پر ڈائمنڈ جڑے تھے۔

”یہ کیا ہے؟“  
”رضوان نے بھجوائے ہیں تمہارے لیے۔“ سلیمان مسکرائے۔ اس نے جینپ کرڈ یہ پہن لی۔ رضوان اس سے قبل بھی اسے مختلف گفٹس بھجواتے رہتے تھے۔

”کیسا ہے؟“  
”اچھا ہے۔“ وہ کھڑی ہو گئی۔ ”میں کھانا لگواتی ہوں تائی جان۔“

پہلے کمرے میں آکر اس نے ٹاپس سنبھال کر رکھے۔ پھر کچن میں آکر خانسالاں کو ہدایات دینے لگی۔ کھانے کے وقت تک ماما اور پاپا بھی آگئے تھے۔

”رضوان آجائے تو میں فوراً ہی تاریخ لینے پہنچ جاؤں گی۔“ کھانے کے دوران تائی اماں نے اچانک کہا۔ پاپا نے ایک نظر زارا پر ڈالی۔ پھر لا پرواہی سے بولے۔

”کیا جلدی ہے بھابھی۔“  
”جلدی کیوں نہیں۔ بڑا عرصہ ہوا راجہ ہاؤس میں کوئی فنکشن نہیں ہوا۔ اب تو سلیمان کا بیٹا بھی آٹھ برس کا ہو گیا ہے۔“

”رضوان کو آنے تو دیں۔ بچے ایک دوسرے کو دیکھ لیں، اچھی طرح سمجھ لیں تو پھر دیکھا جائے گا۔“ زارا کو پہلی بار پاپا کی کوئی بات اتنی اچھی لگی۔ سلیمان نے پلیٹ سے نظر ہٹا کر پاپا کو دیکھا۔

”نکاح ہو چکا ہے۔“ سمجھنے سمجھانے کا وقت تو گزر گیا اب تو رشتہ نبھانے کا وقت ہے۔“

”یہ نیا دور ہے بر خوردار۔“

”اور آپ اس نئے دور کے ساتھ کچھ زیادہ ہی قدم ملانے لگے ہیں۔“ سلیمان نے قہقہہ لگایا۔ زارا کو اس کا یوں طنز کرنا بہت برا لگا۔ پاپا بھی خاموش ہو گئے تھے۔ ماما نے بات بدلنے کو سلیمان کے آگے سوئٹ ڈش رکھ دی۔

کھانے کے بعد زارا اسٹڈی کا ہمانہ کر کے اپنے کمرے میں آگئی۔ تائی جان اور سلیمان بہت رات گئے لوٹے تھے۔ سلیمان کو پاپا کے ساتھ زمینوں کے معاملات سلجھانے تھے۔ ماما اور تائی جان اپنی اپنی تیاریاں لے کر بیٹھ گئیں۔ ان کے جانے کے بعد زارا ماما کے کمرے میں آئی تو وہ سیف کھولے بیڈ پر زیورات کے ڈبے سجائے بیٹھی تھیں۔

”ماما! کیا کر رہی ہیں آپ۔۔۔؟“ ماما نے مسکرا کر ایک سیٹ اس کی طرف بڑھایا۔

”یہ دیکھو۔ کنڈن کا یہ سیٹ مجھے تمہاری دادی نے رونمائی میں دیا تھا۔ کتنا خوبصورت ہے نا۔“

”ہاں وہ تو ہے۔ مگر آپ یہ سب اس وقت کیوں کھولے بیٹھی ہیں۔“ وہ ان کے قریب بیڈ پر بیٹھ گئی۔ ”سنا نہیں رضوان آنے والا ہے۔“

”آپ تو یوں کہہ رہی ہیں جیسے وہ کل کی فلائٹ سے آ رہا ہے۔“

”انشاء اللہ وہ دن بھی جلد ہی آئے گا۔ اس کے ایگزامز تو شروع ہو گئے ہیں۔“ انہوں نے ڈبہ بند کر کے ایک طرف رکھا اور دوسرا دیکھنے لگیں۔

”اس کے شروع ہوئے ہیں میرے تو نہیں۔“ وہ ہنس بھری سی ڈبے پر انگلی پھیرتے ہوئے بولی۔  
”کیا مطلب؟“

”مطلب کہ میرے ایگزامز شروع ہونے میں پورے چھ ماہ باقی ہیں۔“

”تو۔۔۔؟“ اب کے ماما نے قدرے حیران ہو کر اسے دیکھا۔

”تو یہ ماما کہ میں اپنی ایجوکیشن کمپلیٹ ہونے سے قبل شادی نہیں کروں گی۔“ وہ دو ٹوک لہجے میں بولی۔

”ممانے بہت دھیان سے اس کا چہرہ دیکھا۔“  
”اتنا عرصہ تو تیاریوں میں نکل ہی جائے گا۔“

”ماما! میں جرنلزم میں ایم۔ اے گھر بیٹھنے کے لیے نہیں کر رہی۔“ وہ چڑ کر بولی۔

”تم کتنا کیا چاہتی ہو زارا۔“ ماما کے لہجے میں ناگواری سی اتاری۔

”ماما! میں جاب کرنا چاہتی ہوں۔“  
”رائے میاں کی کسی بھی لڑکی نے اس سے قبل جاب کی ہے؟“ ماما نے الٹا اسی سے سوال کیا۔

”تو کیا کرے گی بھی نہیں۔“ اس نے جرح کی۔  
”زارا۔۔۔؟“

”ماما! ان لوگوں کو یہ قیمتی زیور، کپڑے اور فنکشنز زندگی لگتے ہوں گے۔ مجھے وقت کا ضیاع لگتے ہیں۔ میں کچھ اور کرنا چاہتی ہوں۔ اپنی صلاحیتیں آزمانا چاہتی ہوں۔“

”تمہارے پاپا۔۔۔۔۔“  
”کچھ نہیں کہیں گے۔ وہ خامے لبل ہیں۔ میری آزاد ماحول میں تربیت اور ایجوکیشن اس بات کا ثبوت ہے۔“ وہ فوراً بولی۔

”سلیمان نہیں مانے گا۔“ انہوں نے نیا نکتہ نکالا۔  
”میری شادی سلیمان سے تو نہیں ہو رہی اور رہے رضوان تو ان سے میں خود ہی بات کر لوں گی۔ آئی ہو۔۔۔ وہ مجھے با آسانی ایڈرا اسٹینڈ کر لیں گے۔“

”زارا!۔۔۔“ ماما نے زچ ہو کر اسے دیکھا۔ ”کیا ضرورت ہے اس خواری کی۔ آرام سے شادی کر کے لائف انجوائے کرو۔“

”ماما! میں لائف کو اس طرح انجوائے نہیں کر سکتی ہوں جس طرح آپ لوگوں نے کی۔ میری اپنی ترجیحات ہیں۔“

”جیتا نہیں کیسی باتیں کرتی ہو تم۔ میری سمجھ میں نہیں آتیں تمہاری باتیں۔۔۔“ انہوں نے تنگ آکر سارے ڈبے بند کرنے شروع کر دیے۔ ”سیدھا سادا راستہ چھوڑ کر مارے مارے پھرنے میں نجانے کیا مڑا ہے۔“ ماما چڑ کر بولیں۔



”اصل زندگی یہی ہے ماما۔“  
”یہ ڈیے اٹھا کر سیف میں رکھو۔ میرے تو سر میں درد شروع ہو گیا ہے۔“ انہوں نے انگلیوں سے پیشانی دبا لی۔

”دباؤں۔“ زارا شرارت سے مسکرائی۔  
”کوئی ضرورت نہیں۔“ ماما نے اسے گھور کر دیکھا۔

”آپ نے میری بات کا تو جواب ہی نہیں دیا۔“  
”صحبت کریں گے۔“ انہوں نے ٹالا۔  
”اور رات بھر مجھے قائل کرنے کے لیے آپ دلیلیں سوچیں گی۔ بٹ ماما! ایک بات طے ہے۔ میں قائل نہیں ہوں گی۔ مجھے کام کرنا ہے اور وہ میں کر کے رہوں گی۔“ وہ مصمم ارادے سے بولی۔

”جانتی ہوں میں۔“ ماما کے لہجے میں خفگی در آئی۔  
”رضوان آئے تو کہہ دوں گی اس سے سنبھالو زارا کو ہماری نہیں سنتی اب۔“

”اس معاملے میں کسی کی نہیں سنوں گی اور رضوان کی آپ فکر مت کریں۔ وہ میری بات مان لیں گے۔“

”سب اسی کی شہ ہے اور رضوان نے تمہیں ڈانٹنا نہیں بھیجے ہیں۔“ ماما کو اچانک یاد آیا۔

”ہاں بھجوائے تو ہیں۔“  
”تم نے مجھے دکھائے ہی نہیں۔“  
”بھول گئی تھی۔“

”جھوٹ مت بولو۔“ ماما اس کی طرف دیکھ کر مسکرائیں۔ ”رضوان کا تحفہ بھولنے والی چیز تو نہیں۔“

”آئی سویر ماما! واقعی بھول گئی تھی۔ اب دکھاؤں۔“ وہ کھڑی ہو گئی۔  
”نہیں سچ دیکھ لوں گی۔“ ماما نے رد کیا۔

”جیوری کا مجھے کوئی خاص شوق نہیں۔ رضوان نے یونہی بھجوا دیے۔“

”محبت ہے اس کی۔ بہت سنبھال کر رکھنا۔“  
”یہ رضوان ہاں صرف پڑھتے ہیں یا جاب دیکھتے ہیں۔“

بھی کرتے ہیں۔“ زارا نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا۔  
”اسے کیا ضرورت ہے۔ سلیمان خاصا پیسہ بھجواتا ہے اسے۔ بہت پیار کرتا ہے رضوان سے۔ رضوان چھوٹا ہی تو تھا۔ جب بھائی صاحب کا قتل ہوا۔ سلیمان نے اسے بچوں ہی کی طرح پالا۔ ایک باپ کی طرح خیال رکھا ہے۔ حالانکہ وہ خود اس وقت کوئی سولہ سترہ برس کا ہو گا۔ مگر شروع ہی سے باپ کے ساتھ اسے سچ تھا۔ انہی کے ساتھ زمینوں پر جانا بلکہ وہ جہاں بھی جاتے تھے۔ بڑا بیٹا ہونے کی بنا پر سلیمان کو ساتھ لے کر جاتے تھے۔ سو وہ جاگیر کے سارے اسرار و رموز سمجھ چکا تھا۔ رضوان چھوٹا تھا۔ پھر اس کا رتھان بھی نہیں تھا۔ سلیمان نے بھی اسے ان سارے بکھیڑوں سے دور ہی رکھا۔“

”مما پوری تفصیل بتانے بیٹھ گئی تھیں۔ وہ بغور سن رہی تھی۔ تب ہی پایا آگئے۔“

”کیا مذاکرات چل رہے ہیں۔“ انہوں نے خوشدلی سے پوچھا۔

”کچھ خاص نہیں۔ میں زارا کو سلیمان کے بارے میں بتا رہی تھی۔“

”سلیمان کے بارے میں کیا بتا رہی تھیں؟۔“  
”پاپا نے چونک کر پوچھا۔“

”یہی کہ اس نے بھائی صاحب کے بعد کس طرح جاگیر کو سنبھالا۔ زارا کو یہ سب معلوم ہونا چاہیے۔“

”ہاں بھی اس معاملے میں تو اس کی صلاحیتیں قابل رشک ہیں۔ اسی کی وجہ سے تو میں سب کچھ بھلائے اپنے بزنس میں مصروف ہوں۔“ انہوں نے بے اختیار تعریف کی۔

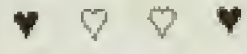
”میرا خیال ہے سلیمان بھائی کی کافی تعریف ہو گئی ہے اور رات بھی کافی ہو گئی ہے۔“ زارا اٹھ کر ڈبے ختم ہو گئی۔

”اور یہ آپ کیا کہہ رہے تھے عمیر۔“ ماما پاپا کی طرف متوجہ ہو گئی۔

”میں نے کیا کہہ دیا۔“ انہوں نے وارڈ روپ کھول کر ٹائٹ ڈریس نکالا۔

”رضوان آئے تو پہلے ایک دوسرے کو سمجھ لیں کوئی تک بھی اس بات کی۔“  
”میں نے تو یونہی ایک بات کی تھی۔“ وہ لاپرواہی سے بولے۔

”ایسی باتیں یونہی تو نہیں کی جاتیں۔ کچھ تو تھا آپ کے ذہن میں۔“ ان دونوں نے اپنی بحث شروع کر دی تھی۔ زارا نے سیف بند کیا اور اپنے بیڈ روم میں آئی۔



سر صدر کی اسائنمنٹ بناتے بناتے زارا نے اچانک سر اٹھا کر کہا۔ ”ویسے ایک بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی۔“

”وہ کیا ہے؟۔“  
”افتخار کو عظمیٰ میں کیا نظر آ گیا۔ جو اس پر مر گیا۔“

وہ عظمیٰ کا ناقہ انداز میں جائزہ لے رہی تھی۔

تب ہی افتخار لا بھری میں داخل ہوا۔ اس کی نگاہ چاروں طرف گھوم کر ایک پل کو عظمیٰ پر رکی۔ جو اسے دیکھتے ہی پوری کتاب پر جھک گئی تھی۔ مگر وہ ان کی طرف آنے کے بجائے دوسری میز کی طرف بڑھ گیا۔

”کو بھی صاحبو! کمر کس لو۔“  
”کیوں۔؟“ ایک ساتھ کئی ”کیوں“ آئے تھے۔

”یونیورسٹی بند ہونے والی ہے۔“  
”وجہ؟۔“

”جنگڑا فساد ہنگامہ۔“  
وہ تینوں بھی اس کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

”اسد ملک اور سلیم بہادر کے درمیان فساد۔“

”تیس۔“ میں ہو گئی ہے۔ میں — ان کے درمیان صلح کی کوشش کر رہا ہوں، مگر ناممکن۔“

”اب کیا ہوا تھا۔“ عظمیٰ نے پوچھا۔  
”تمہیں نہیں بتا۔ اسد نے سربراہیم کے ساتھ بی بی تیزی کی۔ سلیم نے روکنا چاہا تو اس کے گلے پڑ گیا۔ بس دونوں گروپوں میں ٹھن گئی۔ پروفیسر

صاحبان الگ ہڑتال کا سوچ رہے ہیں۔“ زارا نے بتایا۔ عظمیٰ کل جلدی چلی گئی تھی۔ سو اس سارے ہنگامے سے بے خبر تھی۔

”ہاں تو ٹھیک ہے نا۔ استاد اسکول کا ہویا یونیورسٹی کا۔ اسٹوڈنٹ کی کسی بھی غلطی پر سرزنش کرنا اس کا حق ہے۔“ انعم نے کہا اور پھر سے افتخار کی طرف متوجہ ہوئی۔ جو کہہ رہا تھا۔

”میں کوشش کروں گا انہیں سمجھانے کی۔ بلاوجہ ہنگامے کا فائدہ بھی کیا ہے۔“

”اسے بہت شوق ہے ہر جھگڑے میں ٹانگ اڑانے کا۔“ عظمیٰ جل کر بولی۔

”تمہیں کیوں فکر ہو رہی ہے۔“ زارا نے چھیڑا۔

”مجھے کوئی فکر نہیں۔ میں نے یونہی ایک بات کی تھی اور تم اٹھو آج گھر نہیں جانا کیا۔؟“ عظمیٰ نے ٹائم دیکھا تو انعم سے کہہ کر اپنی کتابیں سمیٹنے لگی۔

”میں ڈراپ کر دیتی ہوں۔“ زارا بھی اٹھ گئی۔

افتخار انہیں اٹھتے دیکھ کر قریب آ گیا۔

”بہتر ہے آپ ایک دو دن یونیورسٹی نہ آئیں۔“

”کیوں؟۔“

”بس آثار کچھ اچھے نہیں ہیں۔ پس پردہ عناصر اس موقع سے فائدہ اٹھا کر کوئی نہ کوئی ہنگامہ ضرور کرا میں گے۔“

”ٹھیک ہے۔۔۔“ زارا نے کہا۔ انہیں ڈراپ کر کے وہ گھر آ گئی۔ ماما گھر نہیں تھیں۔ معلوم ہوا ”رائے ہاؤس“ گئی ہیں۔ زارا نے کھانا کھایا اور سو گئی۔ اٹھی تو شام ڈھل رہی تھی۔ وہ لان میں نکل آئی۔

”بی بی! آپ کے لیے لچھی کا جوس لاؤں۔“ ملازم نے پوچھا۔

”ہاں مگر فریش ہو اور بہت ٹھنڈا بھی۔“

”جی اچھا۔“ وہ پٹی پھر رک گئی۔ ”وہ بی بی رضوان صاحب کا فون آیا تھا۔“

”کب۔۔۔؟“ زارا نے چونک کر اسے دیکھا۔



”جب آپ سو رہی تھیں۔“  
”تو مجھے اٹھادیا ہوتا۔“ وہ جھنجھلا گئی۔ اسے رضوان سے بات کرنا تھی۔

”سری! آپ نے خود ہی تو کہا تھا جب آپ سو رہی ہوں تو آپ کو ہرگز نہ اٹھایا جائے۔ ورنہ آپ کے سر میں درد ہو جاتا ہے۔“

”اسندہ رضوان کا فون آئے تو مجھے ضرور ہی جگا دینا۔ وہ کوئی لاہور سے نہیں امریکہ سے فون کرتا ہے۔“

”جی اچھا۔“ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھری۔  
”اور کیا کہا تھا؟“

”کہہ رہے تھے چھ بجے دوبارہ فون کروں گا۔“  
”اچھا۔“ زارا نے ناظم دیکھا۔ چھ بجتے میں تھوڑا ہی وقت تھا۔

”ٹھیک ہے تم جوس لاؤ۔“  
اور جب تنگ وہ جوس سے فارغ ہوئی۔ رضوان کا فون آگیا تھا۔

”کیسی ہو زارا؟۔۔۔۔۔“  
”میں ٹھیک ہوں۔ آپ کے ایگزام کیسے ہو رہے ہیں۔“

”ہاں اچھے ہیں۔ یہ بتاؤ گفٹ پسند آیا۔“  
”اچھا تھا۔“ وہ نارمل سے انداز میں بولی۔  
”صرف اچھا۔“ ان کا لہجہ دانداز مستحسن تھا۔

”ہاں۔۔۔۔۔“  
”بہت اچھا کب ہو گا۔؟“

”جب آپ بھائی کے پیسے کی جگہ اپنے پیسے سے گفٹ خریدیں گے۔“ وہ فوراً بولی۔ رضوان تھل کر ہنس پڑا۔

”بہت خوب دیکھو وہ دن بھی جلد ہی آئے گا۔“  
”مجھے اسی دن کا انتظار ہے۔“

”اور کچھ؟۔۔۔۔۔“  
”یہ ان کا مخصوص انداز تھا بات کے اختتام پر ہمیشہ کی گتے۔“

”گے؟۔۔۔۔۔“ اس نے اچانک پوچھا۔  
”آلو پھولے بیچیں گے۔“ وہ ہنسے۔  
”میں نے یہ سوال سنجیدگی سے کیا ہے۔“ وہ مسکرائی۔

”ظاہر ہے بزنس کروں گا۔ میرے اپنے کچھ آئیڈیا ہیں زارا! مجھے وطن آنے دو۔ شاید میں بھی انکل عمید کی طرح اپنا الگ بزنس اسٹارٹ کروں۔“

”ہوں۔۔۔۔۔“ وہ کسی سوچ میں ڈوب گئی۔  
”کیا سوچنے لگیں۔“ رضوان اس کی خاموشی محسوس کر کے پوچھنے لگے۔

”رضوان میں بھی کام کرنا چاہتی ہوں۔“  
”کیا گھر کے سارے ملازمین چھٹی پر چلے گئے ہیں۔“ انہوں نے برجستہ پوچھا۔

”رضوان!“ وہ بے دے لہجے میں چیخی۔  
”مشرقی خواتین کام کاج کرتی ہی اچھی لگتی ہیں۔“ وہ شریر سے لہجے میں گویا ہوئے۔

”میں فون بند کروں گی۔“ وہ خفا ہو گئی تھی۔  
”ہونہ۔۔۔۔۔“ فضول حرکت نہیں۔“ انہوں نے سرزنش کی۔

”کہو کیا کرنا چاہتی ہو۔“  
”جواب۔۔۔۔۔“  
”کیا امریکہ میں۔۔۔۔۔“

”ہونہ۔۔۔۔۔ پاکستان میں۔۔۔۔۔“  
”تو کرو۔ اب یہاں بیٹھ کر میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں۔“

”آپ وہیں بیٹھ کر میری بہت مدد کر سکتے ہیں۔“  
”ہاں تو کوئٹہ۔“

”مما کا خیال تھا کہ اس سے قبل خاندان کی کسی لڑکی نے جاب نہیں کی۔ ایک بار پاپا سے بات ہوئی تھی۔ انہوں نے کہہ دیا کام کرنا ہے تو میرے آفس میں آجاؤ۔ لیکن بزنس میرا انٹرسٹ نہیں ہے۔ میں اخبار جوائن کرنا چاہتی ہوں۔“

”جہاں تک آنٹی کی بات ہے تو یہ کوئی کلیہ نہیں کہ پہلے کسی نے کام نہیں کیا تو تم بھی نہیں کرو گی۔ اگر تم میں صلاحیت ہے تو ٹھیک ہے آگے آؤ کام کرو۔“

”نہیں سپورٹ کروں گا اور دوسرا فیلڈ تو وہی ہونی چاہیے۔ جس میں تمہارا انٹرسٹ ہو۔ جس میں واقعی تمہارے آنے سے کوئی باپل ہو۔ تم جو کرنا چاہتی ہو کرو۔ مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔“

”مما کا خیال تھا سلیمان بھائی اعتراض کریں گے۔“

”نہی۔ میں ان سے بات کر لوں گا۔ وہ میری بات نہیں ٹالتے۔“

”تھینک پور رضوان! آپ نے تو میری پرابلم حل کر دی۔“ وہ خوش ہو گئی تھی۔  
”یہ کوئی پرابلم نہیں تھی اور ذرا سی بات پر پریشان مت ہو جایا کرو۔“

”تھینکس! گین اینڈ گڈ بائے۔“  
”کام تو مجھے لانا ہی تھا رضوان حیدر۔ بس میں نے سوچا یہ معاملہ افہام و تفہیم سے سلجھ جائے تو اچھا ہے۔“ اس نے موبائل آف کر کے سوچا۔ پھر انعم کا نمبر ڈائل کرنے لگی۔ دوسری طرف انعم کی امی تھیں۔

”کیسی ہو زارا بیٹا۔“ وہ شائستگی و شفقت سے پوچھنے لگیں اور ساتھ ہی شکوہ کیا۔ ”تم تو کبھی آتی ہی نہیں ہو۔“

”بس آنٹی کسی دن چکر لگاؤں گی۔ انعم ہے۔“  
”میں ابھی نہیں ہی فون کرنے والی تھی۔“  
ریسور فوراً ہی انعم کے ہاتھ میں منتقل ہو گیا تھا۔

”خیر بہت تو تھی۔۔۔۔۔“  
”نیو نی موڈ ہو رہا تھا۔ عظمیٰ بھی نہیں ہے۔“ اس نے اظہار دی۔

”تم لوگوں کے تو مزے ہیں یا۔۔۔۔۔ کتنے پاس پاس گھر آئے۔“  
”اور تمہارے پاس اپنی ذاتی گاڑی ہے۔“

”مطلب؟۔۔۔۔۔“  
”مطلب یہ کہ آجاؤ۔ عظمیٰ کی آواز ابھری۔“

”اس وقت۔۔۔۔۔“ وہ سوچ میں ڈوبی۔  
”ہم نے سوچا تھا مل کر اسٹڈی کریں گے۔ مگر اس

انعم کی تو زبان۔۔۔۔۔ بتا نہیں کس چیز کی بنی ہے۔“  
”ایڈیشنل میئر کی ہے۔“ عقرب سے انعم چھکی۔  
”آجاؤ زارا! ہم سووی دیکھنے کا پروگرام بناتے ہیں۔“

”بہت خوب! آئی ہو کمپائن اسٹڈی کے لیے اور دیکھی سووی جا رہی ہے۔“

”سب اس انعم کی کارستانی ہے۔ تو تم آرہی ہو۔“  
”آہ۔۔۔۔۔“ اس نے کچھ سوچ کر کہا۔ گھر پر پور ہونے سے بہتر تھا کہ ان کے ساتھ انجوائے کیا جائے۔

♥ ♥ ♥ ♥  
”کل رضوان کا فون آیا تھا۔“ اگلے دن اس نے ماما کو بتایا۔

”کیا کہہ رہا تھا؟۔۔۔۔۔“  
”زارا عمید کوئی بات کہے اور وہ پوری نہ ہو یہ تو ممکن نہیں۔۔۔۔۔“

”کیا مطلب۔۔۔۔۔؟“ ماما چونکیں۔  
”مطلب یہ کہ میں نے ان سے بات کر لی تھی اور رضوان کو میری جاب پر کوئی اعتراض نہیں۔“ وہ مطمئن انداز میں مسکرا رہی تھی۔ ماما سر تھام کر رہ گئیں۔

”تم سے پہلے ہی بات ہو گئی اور میں سوچ رہی تھی۔ اسے فون کر کے منع کر دوں گی۔“ انہوں نے بے چارگی سے کہا تو وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔

”تو یہ ارادے تھے آپ کے۔ لیکن دیکھ لیں زارا عمید جب کچھ کرنے کی ٹھان لیتی ہے تو پھر اس کے راستے کی ساری رکاوٹیں خود بخود دور ہو جاتی ہیں۔“

”خدا کا شکر ادا کیا کرو۔“ ماما نے بے اختیار اسے ٹوکا۔

”وہ تو کرتی ہوں ماما! ہمیشہ ہی کرتی ہوں۔ جتنا اس نے مجھے نوازا ہے۔ کل میں انعم کی طرف گئی تھی۔ اسے بتایا تو انعم کہنے لگی۔ کتنی خوش قسمت ہو تم جو چاہتی ہو پالیتی ہو اور خدا نے میری ہمیشہ ہر خواہش پوری کی ہے۔“ وہ آسودگی سے مسکرا رہی تھی۔



”اپنی کتنی پروا ہے اور ہماری؟۔۔۔“ ممانے خفگی سے اسے دیکھا۔

”آپ کی بھی پروا ہے۔ اسی لیے تو کہہ رہی ہوں اب آپ آرام سے میری شادی کی تیاریاں کریں کیونکہ اب کافی وقت ہے آپ کے پاس۔“ وہ انہیں چھیڑتے ہوئے بولی۔ ممانے اسے گھور کر رہ گئی تھیں۔ تب ہی ملازمہ فون لے کر آگئی۔

”نعم بی بی کا فون ہے۔۔۔“ ملازمہ نے بتایا۔ ممانے کمرے میں چلی گئیں۔

”ہیلو! کیا آج پھر کسی سووی کا پروگرام ہے۔“ اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”تمہیں کچھ پتا چلا۔۔۔“ انعم نے چھوٹے ہی فون میں کہا۔

”کیا؟۔۔۔“ زارا نے حیرت سے پوچھا۔ آج وہ یونیورسٹی نہیں گئی تھی۔ سارا دن یونہی گھر میں بور ہوئی رہی۔

”افتخار کو گولی لگ گئی ہے۔“

”کیا! کیسے؟۔۔۔“ وہ چیخ ہی تو اٹھی۔

”وہ اسد کو سمجھانے گیا تھا۔ وہیں جھگڑا ہو گیا۔“

”تمہیں کس نے بتایا۔“

”کننا مکس ڈپارٹمنٹ میں میرا جو کزن ہے اس نے ابھی فون کیا ہے۔“ انعم بہت پریشان تھی۔

”یونیورسٹی میں ہنگامہ ہوا ہے؟“

”نہیں باہر۔ لیکن اب ضرور ہو گا۔ سلیم سخت غصے میں ہے۔ افتخار کے دوست بھی بپھرے ہوئے ہیں اسد عائب ہو گیا ہے۔“

”اور افتخار۔۔۔“

”وہ ابھی تک اسپتال میں ہے۔“

”عظمیٰ کو بتایا۔۔۔“ زارا کو اچانک خیال آیا۔

”ہاں ابھی بتایا ہے۔ وہ تو بالکل چپ ہو گئی۔“

”جھانم اور عظمیٰ تیار رہو۔ میں آتی ہوں ہاسپٹل چلتے ہیں۔ زارا نے فون بند کیا۔ پھر بھاگی ہوئی ممانے کے بندروں میں آئی۔

”ممانے! اپنی گاڑی کی چابی دے دیں۔ مجھے ابھی

ہاسپٹل جانا ہے۔“

”کیوں۔“ وہ بری طرح چونکیں۔ ”خیریت تو ہے نا۔“

”خیریت نہیں ہے۔ وہ میرا کلاس فیلو ہے نا کہ لگ لگ گئی ہے۔“ زارا نے جلدی سے بتایا۔

”اوہ نو۔“ ممانے منہ سے بے اختیار نکلا۔ زارا نے نیبل پر رکھی چابی اٹھائی۔

”معلوم نہیں ممانے! کتنی دیر ہو جائے۔ مجھے عظمیٰ اور انعم کو بھی یک کرنا ہے۔“

”عظمیٰ انعم کے گھر ہی مل گئی تھی۔ وہ لوگ ہاسپٹل پہنچے تو پتا چلا۔ وہ آئی۔ سی۔ یو میں ہے۔ گولی اس کے سینے پر لگی تھی۔ آپریشن کے بعد گولی نکال دی گئی۔ مگر ابھی اس کی حالت خطرے سے باہر نہ تھی۔

اسٹوڈنٹس کی بھرمار تھی۔ سلیم اور آصف سخت غصے میں تھے۔

”ہم اسے چھوڑیں گے نہیں۔“ سلیم ہتھکڑیاں مار کر دھاڑا۔ ”وہ کیا سمجھتا ہے۔ اگر ہم جھگڑے سے بھاگتے ہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم بزدل ہیں۔“

”دعا کریں۔ نجانے اس وقت کس کی دعا اس کی زندگی بن جائے۔“ ساحد نے آہستگی سے کہا۔

زارا نے عظمیٰ کو دیکھا۔ پھیکے پڑتے چہرے پر لرزتے لب جن پر ایک ہی دعا چل رہی تھی۔ سرخ اسٹوڈنٹس کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش میں لگے تھے۔

”جب تک اسد گرفتار نہیں ہوتا۔ ہم کا سزا بائیکاٹ کریں گے۔“ سلیم بہادر نے فیصلہ سنایا۔ افتخار نے یہ گولی اسی کی وجہ سے ہی تو کھائی تھی۔ وہ بہت جذباتی ہو رہا تھا۔ سرخ سا تھک کر ان کی طرف آئے۔

”آپ لوگ گھر چل کر دعا کریں۔ اس وقت اسے صرف دعاؤں کی ضرورت ہے۔“

زارا نے اثبات میں سر ہلایا۔ افتخار ابھی اندر آبرو ویشن تھا اور وہ تینوں زیادہ دیر یہاں نہیں رکھ سکتی تھیں۔

”پلیز ساجد! ہمیں فون کر کے ضرور بتانا۔“ اس نے



تائید کی۔ پھر عظمیٰ کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔  
”چلو عظمیٰ۔“

”ایسا تو نہیں ہونا چاہیے تھا۔“ وہ زیر لب  
بروزائی۔

”سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ انعم نے اسے تسلی  
دی۔ تو وہ مرے مرے قدموں کے ساتھ ان کے ساتھ  
چل دی۔

”اسے کیا ضرورت تھی۔ صلح کا علمبردار بننے کی۔“  
انعم نے جھنجھلا کر کہا۔ زارا نے گاڑی کالا کھولتے  
ہوئے اسے دیکھا۔

”وہ ایسا ہی ہے یہ ہم سب جانتے ہیں۔“  
”ہاں جانتے ہیں اور یہ بھی سمجھتے ہیں کہ اس کی  
نیت نیک تھی مگر کیا فائدہ ہوا۔ الٹا اپنی جان خطرہ میں  
ڈال بیٹھا ہے۔ والدین کا اکلوتا بیٹا۔ نجانے کیا حال ہو  
رہا ہو گا ان کا۔“

”اسے کچھ نہیں ہو گا۔ میرا دل کہتا ہے۔ تم بس دعا  
کرو۔“ اس پورے عرصے میں عظمیٰ پہلی بار ہنس  
پڑی تھی۔ پھر ان کے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی  
تھی۔ سارا رستہ وہ لوگ خاموشی سے اپنی اپنی سوچوں  
میں گم رہی تھیں۔ وہ انہیں ڈراپ کر کے گھر آگئی۔  
”کیا ہوا ٹھیک تو ہے تمہارا کلاس فیلو۔“ ممانے

پوچھا۔  
”نو ماما! اس کی حالت بہت سیریس ہے۔“ وہ افسردہ  
سی تھی۔

”اوہ۔“ ممانے بھی پریشان ہو گئیں۔ وہ اپنے کمرے  
میں آگئی۔ مگر وقت گویا ٹھم سا گیا تھا۔ ایک ایک منٹ  
نہر نہر گزر رہا تھا۔ زارا کا دھیان عظمیٰ کی طرف چلا  
گیا۔ بالکل پیلا تھا اس کا چہرہ، ایک خوف تھا اس کی

لگا ہوں میں۔  
”شاید یہ حادثہ عظمیٰ کے دل کو نرم کر دے۔“ زارا  
نے ایک بل کو سوچا۔ شام تک وہ کئی بار ہسپتال بھی  
فون کر چکی تھی اور جب شام کو ساجد نے یہ خوشخبری  
سنائی کہ افتخار کی حالت اب قدرے بہتر اور خطرے  
سے باہر ہے تو اس نے فوراً عظمیٰ کو فون کیا تھا۔



”کیسی طبیعت ہے اب تمہاری۔“ زارا نے  
خوبصورت سا بکے بیڈ سائیڈ پر رکھا۔ افتخار مسکرا دیا۔

”اب بالکل ٹھیک ہے۔“ افتخار نے زارا کے  
عقب میں مضطرب سی عظمیٰ کو دیکھا۔ عظمیٰ نے بس  
ایک نظر ہی افتخار کو دیکھا تھا۔ اسے ڈرپ لگی تھی۔  
چہرے کی رنگت میں پیلاہٹ، مگر آنکھوں کی چمک اور  
لب و لہجہ کی تازگی اب بھی وہی تھی۔ زارا انہیں دی۔  
”گولی نے بھی تمہارا کچھ نہیں لگا ڈالا۔“

”کمبخت دل کے پاس سے گزر گئی۔ دل میں گھسٹی  
تو شاید کچھ بگڑی جاتا۔“ وہ مسکرایا۔  
”اللہ نہ کرے۔“ عظمیٰ بے ساختہ بولی۔ افتخار کا  
قہقہہ برجستہ تھا۔ دوسرے بل سینے میں اٹھتی نہیں نے  
اسے لب بھینچنے پر مجبور کر دیا۔

”مجھے معلوم ہوتا کہ ایک ذرا سی گولی یہ کام کرے  
گی تو میں پہلے ہی کھا چکا ہوتا۔“ تھوڑی دیر کے بعد وہ  
مسکرا کر بولا تھا۔ عظمیٰ ہنس پڑی۔

”فضول مت بولو افتخار! تم تو یوں کہہ رہے ہو جیسے  
ہسپتال کی نہیں سردرد کی گولی کھائی ہو۔“ زارا نے  
گھورا۔

”اب تو مجھے بھی یہی لگتا ہے۔“ اس کے جملے پر  
زارا نے نظروں ہی نظروں میں سرزنش کی۔  
”گھور کیوں رہی ہیں۔ میں تو صرف یہ کہتا ہوں۔  
کسی کی دعا میں ہمیں بچا گئیں۔“ وہ معصومیت سے  
بولا۔

”کسی کی کیوں۔ ہم سب نے دعائیں کی تھیں۔“  
”چلیں یہ کریڈٹ آپ لے لیں۔“  
”لیکن تمہیں پرانے پھدے میں پڑنے کی  
ضرورت کیا تھی۔“ زارا نے پوچھا تو وہ سنجیدہ ہو گیا۔  
”وہ مسلمان بھائیوں کے درمیان صلح کروانا ہر  
مسلمان کا فرض ہے۔“

”اچھا فرض نبھایا۔ گولی کھا کر آگئے۔“  
”یہ ان کا فعل ہے۔“ وہ متانت و لا پرواہی سے  
بولا۔

”یہ وہ دور نہیں ہے افتخار۔“

”ہاں یہ کیوتری طرح آنکھیں بند کر کے بیٹھ جانے  
کا دور ہے۔ مگر کب تک۔ کب تک ہم دور بیٹھے  
محض تماشائی بنے اپنے لوگوں کے ہاتھوں اپنے ہی  
لوگوں کے گریبان پھٹتے دیکھیں گے۔ کب تک محترم  
اساتذہ کی بے عزتی برداشت کریں گے۔“

”تو تم کیا کرو گے؟۔“  
””حجاج“ کو شش، ”امن و صلح“ کی کوشش، اتنا جتنا  
میرے بس میں ہے۔“ وہ ٹھوس لہجے میں گویا ہوا۔  
زارا ایک بل کو چپ ہو گئی پھر سر جھٹک کر بولی۔  
”اب تم سے بحث کون کرے۔“

”بحث مت کرو۔ عیادت کرو۔“ وہ اطمینان سے  
بولا۔ ”مگر کیا پھول عظمیٰ کی زبان بچ کر خریدے تھے۔“  
وہ فوراً ہی لہجہ بدل کر بولا تھا۔ عظمیٰ نے چونک کر سر  
اٹھایا۔ زارا بس دی۔

”عظمیٰ کی زبان کھلوانا تمہارا کام ہے۔ میں ابھی  
آئی ہوں۔“ وہ عظمیٰ کو کوئی بھی موقعہ دے بغیر ہر نکل  
آئی اور کارڈور کے اختتام پر بیڑھیوں کے پاس کھڑی  
ہو گئی۔

”ارے آپ۔۔۔“ زارا چونک کر پلٹی۔ پھر اپنے  
سامنے زین العابدین کو دیکھ کر اس کے ماتھے پر ٹھکن  
کی ابھر آئی۔

”آپ یہاں؟۔“  
”کیوں میں یہاں نہیں آسکتی۔“ زارا کے لہجے میں  
بلا کی اجنبیت تھی۔

”میرا یہ مطلب نہیں تھا۔“ وہ جھل سا ہو گیا۔  
”آپ شاید افتخار کی عیادت کے لیے آئی ہیں۔“  
”ہاں۔“ وہ مختصراً بولی اور گملے میں لگے پھول  
دیکھنے لگی۔

”میں بھی اسی کی عیادت کے لیے آیا تھا۔“ کچھ دیر  
کے بعد وہ بولا۔ زارا نے نظروں کا زاویہ بدل کر قدرے  
حیرت سے اسے دیکھا۔ ہمیشہ کی طرح اس کی بادای  
آنکھوں سے ایک نامعلوم سی الجھن مترشح تھی۔  
”وہ شاید اندر ہے۔“ زارا کا لہجہ ذرا سازشی لیے

”جالتے ہیں۔ جوس تو پی لیں۔ اتنی پیاس لگ رہی  
ہے۔“ وہ دروازے کے ساتھ والی ٹیبل کھیر کر بیٹھ  
گئیں۔ زارا کی نظروں نے عین سامنے والی ٹیبل پر  
زین کو اپنے دوستوں کے ساتھ بیٹھے دیکھا۔ زین  
نے ایک اچھٹی سی نظر اس پر ڈالی۔ پھر ساتھ والے  
لوہے سے باتیں کرنے لگا۔ کچھ دنوں سے اس نے  
زارا کو ٹھٹھکی باندھ کر دیکھا پھوڑا دیا تھا۔

”لیکن تم گئی کہاں تھیں۔ اس دن افتخار کو دیکھنے  
ہاسپتال بھی نہیں آئیں۔“ زین کی طرف سے اپنی  
توجہ مکمل طور پر ہٹا کر اس نے انعم کو دیکھا۔  
”بس مہمان آگئے تھے تو امی نے ننگے ہی نہیں  
دیا۔“ جوس کا سب لے کر انعم نے بتایا۔  
”کیوں خاص مہمان تو نہیں آگئے۔“ عظمیٰ

ہوئے تھا۔ نجانے کیوں زارا کو وہ اس بچے کی طرح  
لگا۔ جسے کوئی چیز سمجھ میں نہیں آ رہی اور وہ کسی کی مدد  
کے بغیر اسے سمجھنے کی کوشش کر رہا ہے۔

”میں جا ہی رہا تھا۔“ وہ پزل سا ہو کر اندر کی طرف  
برہہ گیا۔ وہ بہت اچھی چہرہ شناس نہ تھی۔ مگر نجانے  
کیوں اسے زین ایک سادہ حساس اور کنفیوزڈ  
نوجوان لگا تھا۔ وہ بے خیالی میں اسے سوچے لگی۔ جب  
عظمیٰ نے اسے دیکھا۔  
وہ چونک کر پلٹی۔  
”چلیں۔“ زارا نے پوچھا تو عظمیٰ نے اثبات میں  
سر ہلادیا۔ وہ زارا کو پہلے ہی کی طرح پریشان لگی۔  
”کیا کہا اس نے۔“  
”کچھ نہیں آو چلیں۔“ عظمیٰ نے آہستگی سے کہا تو  
زارا نے اسے کریدنے کی کوشش نہیں کی اور نہ عظمیٰ  
نے اسے کچھ بتایا تھا۔



باہر ہلکی ریم جھم ہو رہی تھی اور کیفیہ بیبا میں گرما  
گرم بخشیں چل رہی تھیں۔ کلاسز ہوئی نہیں تھیں  
اور وہ لوگ آکر بچھتا رہی تھیں۔

”خوا مخواہ آئے۔“ انعم سب سے زیادہ بے زار  
تھی۔

”جالتے ہیں۔ جوس تو پی لیں۔ اتنی پیاس لگ رہی  
ہے۔“ وہ دروازے کے ساتھ والی ٹیبل کھیر کر بیٹھ  
گئیں۔ زارا کی نظروں نے عین سامنے والی ٹیبل پر

زین کو اپنے دوستوں کے ساتھ بیٹھے دیکھا۔ زین  
نے ایک اچھٹی سی نظر اس پر ڈالی۔ پھر ساتھ والے  
لوہے سے باتیں کرنے لگا۔ کچھ دنوں سے اس نے  
زارا کو ٹھٹھکی باندھ کر دیکھا پھوڑا دیا تھا۔

”لیکن تم گئی کہاں تھیں۔ اس دن افتخار کو دیکھنے  
ہاسپتال بھی نہیں آئیں۔“ زین کی طرف سے اپنی  
توجہ مکمل طور پر ہٹا کر اس نے انعم کو دیکھا۔  
”بس مہمان آگئے تھے تو امی نے ننگے ہی نہیں  
دیا۔“ جوس کا سب لے کر انعم نے بتایا۔  
”کیوں خاص مہمان تو نہیں آگئے۔“ عظمیٰ

ہوئے تھا۔ نجانے کیوں زارا کو وہ اس بچے کی طرح  
لگا۔ جسے کوئی چیز سمجھ میں نہیں آ رہی اور وہ کسی کی مدد  
کے بغیر اسے سمجھنے کی کوشش کر رہا ہے۔

”میں جا ہی رہا تھا۔“ وہ پزل سا ہو کر اندر کی طرف  
برہہ گیا۔ وہ بہت اچھی چہرہ شناس نہ تھی۔ مگر نجانے  
کیوں اسے زین ایک سادہ حساس اور کنفیوزڈ  
نوجوان لگا تھا۔ وہ بے خیالی میں اسے سوچے لگی۔ جب  
عظمیٰ نے اسے دیکھا۔  
وہ چونک کر پلٹی۔  
”چلیں۔“ زارا نے پوچھا تو عظمیٰ نے اثبات میں  
سر ہلادیا۔ وہ زارا کو پہلے ہی کی طرح پریشان لگی۔  
”کیا کہا اس نے۔“  
”کچھ نہیں آو چلیں۔“ عظمیٰ نے آہستگی سے کہا تو  
زارا نے اسے کریدنے کی کوشش نہیں کی اور نہ عظمیٰ  
نے اسے کچھ بتایا تھا۔



مسکرائی۔

”ہماری ایسی قسمت کہاں؟“ اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔ ”پنڈی والی خالہ آئی ہیں۔“  
”وہ جن کے بیٹے ڈاکٹر ہیں۔“ عظمیٰ کو اس کے سارے رشتے داروں کے بارے میں معلومات تھیں۔  
”ہاں۔“ انعم نے منہ بنایا۔ ”اسی لیے تو امی ہلکان ہوئی جا رہی ہیں۔ ان کے سامنے یہ ثابت کرنے کو کہ خاندان بھر میں مجھ سے زیادہ خوبصورت، سلیقہ مند، سکھ اور باحیا لڑکی کوئی نہیں۔ گھر کا بجٹ الگ خراب ہو رہا ہے اور میں آدھی رہ گئی ہوں۔ قورمہ، کباب بناتے بناتے لیکن یہ بات طے ہے۔ خالہ کبھی اپنے بیٹے کا رشتہ میرے ساتھ نہیں کریں گی۔“  
”کیوں تم میں کس چیز کی کمی ہے۔“ زارا نے پوچھا۔

”بھئی بات کمی کی نہیں ہے۔ آج کل ہوائی ایسی چلی ہے۔ خالہ کا بیٹا اب اچھی جاب پر ہے۔ وہ کسی امیر خاندان میں ہی رشتہ کرنے کی خواہش کریں گی۔ ویسے بھی اڑٹی اڑٹی سنی ہے کہ وہ اپنے بیٹے کے لیے ڈاکٹر بہو کی خواہش رکھتی ہیں۔“ انعم نے سینڈویچ اٹھایا۔  
”تو پھر تمہاری امی کیوں ہلکان ہو رہی ہیں۔“ عظمیٰ نے پوچھا۔

”ایک آس، ایک امید، وہی ماؤں والی مخصوص عادت، جب تک دانیال بھائی کیس انٹیج نہیں ہو جاتے۔ وہ ایسی کوششیں کرتی رہیں گی۔ ویسے میں نے اس سے بد مزہ سینڈویج کبھی نہیں کھائے۔“ انعم نے بات کا رخ بدلا۔

”ہاں کچھ عجیب سے ہیں۔“ زارا نے سینڈویج الٹ پلٹ کر دیکھا۔  
”چلیں پھر ابھی پانچ منٹ میں ایک پوائنٹ لٹے گا۔“ عظمیٰ نے جوں جوں ختم کیا۔ تب ہی زین العابدین کے ساتھ بیٹھے لڑکے اٹھ کر چلے گئے۔ وہ کچھ لمبے انہیں دیکھتا رہا۔ پھر کچھ متذبذب سا اٹھ کر قریب آیا۔

”میں یہاں بیٹھ جاؤں۔“

انعم اور عظمیٰ نے زارا کو دیکھا۔ وہ خاموش ہی رہی۔

”بیٹھ جاؤ بھائی، یہ کرسی ہم گھر سے نہیں لے کر آئے۔“ انعم نے کہا تو ایک ہلکی سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر بکھری۔ وہ کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔

”ہاں بھئی بولو! کیا پر ابلم ہے تمہارے ساتھ۔“ انعم کچھ شوخ و متبسم لہجے میں بولی۔

”پر ابلم تو کوئی نہیں ہے۔“ وہ کچھ گھبرا کر زارا کو دیکھنے لگا۔

”تو پھر۔۔۔“ انعم خواہ مخواہ ہنس دی۔  
”مجھے ان سے بات کرنی ہے۔“ اس نے زارا کی طرف اشارہ کیا۔

”گویا ہم یہاں سے جائیں۔“  
”میں نے یہ تو نہیں کہا۔“ وہ کچھ زیادہ پر اعتماد نظر نہیں آ رہا تھا۔

”چلو انعم ہم چلتے ہیں۔“ عظمیٰ بے زاری سے کہہ کر اٹھ گئی۔ وہ آج سارا دن اسی موڈ میں رہی تھی۔

”اچھا بھئی ہم تو چلتے ہیں اور زین تم ان سے بات کر لو۔“ انعم نے مسکراتے ہوئے اپنا بیگ سنبھالا اور عظمیٰ کے ساتھ چلی گئی۔ زارا مکمل طور پر زین کی طرف متوجہ ہوئی۔

”کمو۔“  
زین۔ کچھ لمحے متذبذب سا اسے دیکھتا رہا۔ پھر سر جھکا کر میز کی سطح کو ناخن سے کھرچنے لگا۔

”زین! میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ مجھے گھر جانا ہے۔“ کچھ دیر انتظار کے بعد زارا کو کمنار پر اتار زین نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

”جب میں نے آپ کو پہلی بار دیکھا۔ تو مجھے لگا میں نے آپ کو پہلے بھی نہیں دیکھا ہے۔“

”یہ کوئی ایسی بات نہیں۔ اکثر لوگوں سے مل کر ہمیں یہی احساس ہو جاتا ہے۔“ زارا کو اس جملے پر خاصی کوفت ہوئی تھی۔

”میرا وہ مطلب نہیں۔ میں آپ کے بارے میں

جاننا چاہتا تھا۔“

”ڈپارٹمنٹ کے کسی بھی بندے سے پوچھ لیتے۔ وہ تمہیں میرے بارے میں بتا سکتا ہے کیونکہ مجھے یہاں پڑھتے ہوئے تقریباً ڈیڑھ سال کا عرصہ گزر گیا ہے۔“

”ہاں۔“ وہ چپ سا ہو گیا۔ پھر آہستگی سے بولا۔  
”ڈنگر میں کچھ اور جانا چاہتا تھا۔“

”کچھ اور کیا؟۔۔۔“ زارا کے لبوں پر مسکراہٹ بکھری۔

”آپ شاید میری بات کو مذاق سمجھ رہی ہیں۔“ وہ خائف سا ہو گیا۔

”تم نے ابھی کوئی بات ہی نہیں کی۔ نہ سنجیدہ نہ مزاحیہ، ابھی تو تم صرف تمہید باندھ رہے ہو اور میں سن رہی ہوں حالانکہ مجھے جانا ہے۔“

”میں چاہتا ہوں کہ آپ میرے بابا سے مل لیں۔“ اس نے اچانک سر اٹھا کر کہا۔ زارا حیران سی رہ گئی۔

”کیوں؟۔۔۔“  
”کیونکہ وہ آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔“

زارا کچھ حیران ہوئی۔ پھر بے اختیار پوچھنے لگی۔  
”کیا وہ مجھے جانتے ہیں؟“

”وہ آپ سے ملے نہیں لیکن وہ آپ کو جانتے ہیں۔“

”کیسے؟۔۔۔“ وہ اسے مسلسل حیران کر رہا تھا۔ ”کیا میں انہیں جانتی ہوں؟۔۔۔“

”شاید ہاں شاید نہیں۔“ وہ پھر سے کنفیوز نظر آیا۔ ”آپ ان سے ملیں گی تو وہ آپ کو بتا دیں گے کیا آپ ان سے ملیں گی؟۔“ اس کے لہجے میں ایک آس کی جاگی۔

زارا کچھ لمحے اسے دیکھتی رہی۔ پھر کھڑی ہو کر اپنی فائل اور بیگ اٹھالیا۔

”نہیں۔۔۔“ اس کے سوال کا مختصر سا جواب دے کر وہ رکی نہیں چلی گئی۔ اسے اچانک لگا کہ سامنے بیٹھا شخص محض اسے سسپنس میں مبتلا کرنے کے لیے بکواس کر رہا ہے۔ اس نے یہ بھی نہ دیکھا کہ زین کی آنکھوں میں جاگتی ہوئی آس پر کسی تیزی سے مایوسی کی

دھند بکھری تھی۔ زارا گھر آئی تو ماما بھی اسی وقت لوٹی تھیں۔

”کہاں سے آرہی ہیں آپ؟۔۔۔“  
”بس یہیں رائے ہاؤس تک گئی تھی۔“ انہوں نے پرس ملازمہ کو تھمایا۔ پھر زارا سے پوچھنے لگیں۔

”تم نے کھانا کھالیا۔“  
”نہیں۔ ابھی تو آئی ہوں۔“

”قافلہ کھانا لگاؤ۔“ انہوں نے پکار کر کہا۔  
”کیا بات ہے ماما؟ آپ کی ساری دلچسپیوں اور مشاغل کا گڑھ ”رائے ہاؤس“ بن کر رہ گیا ہے۔ کہیں میرے خلاف کوئی سازش تو نہیں ہو رہی۔“ اس نے مشکوک نظروں سے ماما کو دیکھا۔ تو وہ مسکرا دیں۔

”مہو بھی سکتی ہے۔“  
”مطلب؟۔۔۔“ اس نے حیران ہو کر پوچھا۔

”مطلب یہ کہ رضوان آ رہا ہے۔“ وہ بہت خوش تھیں۔

”ارے کب؟۔۔۔“ زارا نے بے ساختہ پوچھا۔  
”گلے مینے۔“

”اس دن تو بات ہوئی تھی ہماری۔ تب تو اس نے ایسا کوئی پروگرام ظاہر نہیں کیا تھا۔“

”اس کے آتے ہی رخصتی کی تاریخ طے ہو جائے گی۔“ ماما نے گویا اس کی بات سنی نہیں۔  
”ماما! آپ کو پتا تو ہے۔“

”پتا ہے اور ہم نے بھی سب طے کر لیا ہے۔ شادی کے بعد تم دونوں جو چاہو کرو۔ بس والدین کو اپنے فرض سے سبکدوش ہونے دو۔“ وہ واقعی سب طے کیے بیٹھی تھیں۔

”ماما! آپ کو کتنی جلدی ہے مجھے اس گھر سے نکلنے کی۔“

”تم ایسے جیلے استعمال کر کے مجھے ہر گز اموشنل نہیں کر سکتیں۔“ ماما نے ٹھورا۔

”تو کس طرح اموشنل ہوں گی۔“  
”بیٹا! انسان کی زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں اور میں چاہتی ہوں۔ تمہیں اپنی زندگی میں دلہن بنے دیکھ



لوں۔" "مما ایک دم سنجیدہ ہوئی تھیں۔ زارا نے انہیں دیکھا اور خفگی بھرے لہجے میں بولی۔  
"اب آپ مجھے اموشنل کر رہی ہیں۔"  
"اور تم ہو بھی گئی ہو۔" "مما نے کہا تو وہ ہنس دی تھیں۔"

♥ ♥ ♥ ♥  
زین اس سے اگلے دن یونیورسٹی نہیں آیا تھا اور اس سے اگلے اور پھر بہت سے دن۔ انعم کئی بار حیران ہو کر پوچھ چکی تھی۔  
"کہاں گیا تمہارا وہ زین العابدین؟"  
زارا کندھے اچکا کر رہ جاتی کہ وہ خود حیران تھی۔  
اس دن بھی انعم نے کہا تو وہ چڑھ گئی۔  
"مجھے کیا معلوم۔ میں تو اسے نام کے علاوہ جانتی بھی نہیں ہوں۔"

"اجھا بابا۔ میں نے یونہی پوچھ لیا تھا۔" انعم نے کہا تو زارا غلطی کی طرف متوجہ ہوئی جو بے حد خاموشی سے گھاس کی پتیاں نوچ رہی تھی۔  
"تمہیں کیا ہوا ہے۔" زارا نے اپنی نوٹ بک اس کے ہاتھ پر ماری۔ تو وہ بری طرح چوگی۔  
"نہیں کچھ بھی تو نہیں۔"  
"میں آج شام ہاسپٹل جاؤں گی تم لوگ چلو گے۔"

"مجھے تو ہرگز اجازت نہیں ملے گی۔ ایک دفعہ ہی مشکل سے ملی تھی۔" انعم نے منہ بنا کر کہا تو زارا نے غلطی کو دیکھا۔  
"میں نہیں جاؤں گی۔" وہ سپاٹ لہجے میں گویا ہوئی۔

"کیوں؟" زارا کو کبھی کبھی اس کے رویے پر حیرت سی ہوتی تھی۔  
"میں اسے کسی غلط فہمی کا شکار نہیں کرنا چاہتی۔"  
"عظمیٰ! تم کس سے ڈرتی ہو؟" زارا نے تحیر سے اسے دیکھا۔ غلطی نے سر اٹھا کر غلے امبر بڑھائے۔  
"میں نے کوئی کیا۔ پھر آہستگی سے بولی۔  
"وہ بہت سے راتوں میں بری کھٹنیاں ہیں اور میں"

بہت بزدل، جب منزل تک پہنچنے کا حوصلہ نہیں ہے تو رخت سفر کیوں باندھوں۔ جب قدم سے قدم نہیں ملا سکتی تو ہاتھ تھام کر دوھوکہ کیوں دوں۔ اسے کسی دورا ہے پر لاکھڑا کرنے سے بہتر ہے کہ خاموش رہوں۔ اسے کوئی زادراہ نہ تھماؤں۔ کبھی تو تھک کر پلٹے گا۔" اس کا لہجہ بہت عجیب سا تھا۔

"کیا یہ سب ممکن ہے۔"  
"بس ایک کوشش۔" وہ کھڑی ہو گئی۔  
"اور اس سے پہلے تم ہار گئیں تو۔" وہ ایک پل کو خاموش ہو گئی۔ پھر اتنا کہ کپ جلی گئی۔  
"میں اسے ہارانا نہیں چاہتی۔"

"ہار تو وہ بھی گیا ہے اور تم بھی۔ وہ یہ بات مانتا ہے اور تم اس حقیقت سے نظریں چراتی ہو۔"  
"شاید غلطی کی جگہ میں ہوئی تو یہی کچھ کر رہی ہوئی کہ ہم جس طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہاں ہمارے والدین بس زندگی میں ایک ہی چیز کھاتے ہیں اور وہ ہے عزت اور بدنامی کی ایک ذرا سی چھینٹ عزت کی اس چادر پر ہمیشہ کے لیے انٹ داغ چھوڑ دیتی ہے۔ محبت اور اس پر مرثیے کی داستانیں ہمارے نزدیک محض کہانیاں ہیں اور ہمیشہ کہانیوں میں اچھی لگتی ہیں۔" انعم اک ٹھنڈی سانس بھر کر بولی۔  
"عجیب لوگ ہیں ہم اندر سے کچھ اور باہر سے کچھ اور۔" زارا نے آہستگی سے کہا۔

"یونہی گزارا ہے سبھی! یہ ڈھیر سارے رشتے یہ ڈھیر ساری محبتیں ہمارے ارد گرد ہیں۔ انہیں بھی تو ہم کو ہی نبھانا ہے۔ کسی ایک محبت کی خاطر اتنی ساری محبتوں کا گلا تو نہیں گھونٹ سکتے ہم لوگ۔ سو یہ سب تو یونہی چلے گا۔"

"ہوں۔" زارا نے جانے کس سوچ میں ڈوب گئی تھی۔ پھر سر جھٹک کر پوچھنے لگی۔  
"تمہاری خالہ جلی گئیں۔؟"  
"ہاں جلی گئیں۔ امی اب سارا دن انوائی کھنوائی لیے بیڑی رہتی ہیں کہ اتنا خرچہ بھی کیا اور خالہ پھر بھی کوئی بات نہیں کر کے گئیں۔"

"ہر کام کا ایک وقت مقرر ہے۔ تم سمجھاتی کیوں نہیں ہو اپنی امی کو۔"  
"تم نے سمجھا لیا اپنی ماما کو۔" انعم نے برکت پوچھا۔ تو وہ ہنس دی۔  
"یو آر رائٹ۔ مائیں کسی بھی طبقے سے تعلق رکھتی ہوں۔ اولاد کے معاملے میں ایک جیسی ہوتی ہیں۔ چلیں۔" وہ اٹھ گئی۔

"ہاں۔" انعم بھی کھڑی ہو گئی۔ عظمیٰ فیضان اور ماریہ کے ساتھ کھڑی تھی۔ زارا نے بس اسے دور سے ہاتھ ہلا کر پائے کہا اور اپنی گاڑی کی طرف آگئی۔ وہاں سے سیدھا وہ ہاسپٹل ہی آئی تھی۔ افتخار اب کافی بہتر تھا۔

"انشا اللہ کل ڈسچارج ہو جائے گا۔" آصف اور باسط اس کے پاس ہی موجود تھے۔  
"سٹینڈنگ گاڈ۔" ڈپارٹمنٹ میں بالکل بھی رونق نہیں ہے تمہارے بغیر۔"

"تمہاری سکھیاں نہیں آئیں۔" افتخار آصف وغیرہ کے سامنے صرف غلطی کا نہیں پوچھ سکتا تھا۔  
"ہاں وہ نہیں آسکیں۔" زارا نے آہستگی سے بتایا۔ افتخار خاموش سا ہو گیا تھا۔ زارا جلد ہی اٹھ گئی۔ پارکنگ میں اسے زین العابدین مل گیا۔ اس کے ہاتھ میں بہت سی میڈیسن تھیں۔ زارا الاشعوری طور پر گاڑی کا دروازہ کھولتے کھولتے رک کر اسے دیکھنے لگی۔ اپنے ہاتھ کا پیسہ آستین سے صاف کرتے ہوئے زین نے نظریں اٹھائیں تو مٹھٹھک کر رک۔ پھر اس کے قریب آگیا۔

"آپ افتخار کے پاس آئی تھیں۔"  
"ہاں۔" اس نے گاڑی کا لاک کھولا۔  
"اب تو وہ تھیک ہے، انشا اللہ جلد ہی ڈسچارج ہو جائے گا۔"

زارا نے دیکھا۔ وہ کچھ کمزور ہو گیا تھا۔ شکل سے ہی مضطرب اور پریشان دکھائی دیتا تھا۔ زارا نے بے اختیار پوچھا۔  
"تم یونیورسٹی نہیں آرہے بہت دنوں سے۔ کیا

بیمار ہو۔؟"  
وہ مضطرب سا مسکرایا۔ "نہیں میں تو ٹھیک ہوں۔ بابا کو ہارٹ ایک ہو گیا تھا۔"  
"لوہ نو۔" زارا کے منہ سے بے اختیار نکلا۔  
"اب تو ان کی حالت خطرے سے باہر ہے۔" زین نے بتایا۔

"اسی ہاسپٹل میں ہیں۔؟" زارا نے پوچھا۔  
"جی۔۔۔ آپ۔۔۔ آپ ملیں گی ان سے۔" اس نے جھجکتے ہوئے وہی سوال کیا۔ زارا نے ایک ٹائیپ کو سوچا۔ اثبات میں سر ہلا کر گاڑی دوبارہ لاک کی اور اس کے ساتھ ہوئی۔ زین ایک دم ایکسائیڈ ہو گیا تھا۔

"بابا بہت خوش ہوں گے۔" ایک کمرے کا دروازہ کھولتے ہوئے زین بولا۔ زارا اس کے پیچھے کمرے میں داخل ہوئی تھی۔

"بابا۔" وہ سوئے ہوئے ادھیڑ عمر بیمار شخص پر جھٹک گیا۔ زارا نے بہت غور سے ان کا زرد کمزور چہرہ دیکھا مگر یادداشت میں کہیں کوئی شبہ نہ تھی۔  
"بابا! دیکھیں کون آیا ہے۔" زین انہیں جگانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"زین۔" زارا نے پکارا تو وہ رخ بدل کر اسے دیکھنے لگا۔  
"تمہارے بابا کو اس وقت آرام کی ضرورت ہے۔ انہیں سونے دو۔"

"لیکن وہ آپ کو دیکھ کر بہت خوش ہوں گے۔" زین کے لہجے میں اصرار تھا۔ گویا وہ اس موقع کو کھوتا نہیں چاہتا تھا۔ "بس اٹھ جائیں گے وہ دوا کے زیر اثر ہیں۔ ورنہ ان کی نیند اتنی بے خبر نہیں۔"  
زارا گو وہ کسی ضدی بچے کی طرح لگا جو ضرور ہی انہیں اٹھا کر دم لے گا۔

"انہیں آرام کرنے دو۔ میں پھر آجاؤں گی۔" اس نے رساں سے کہا تو زین تیزی سے سیدھا ہو گیا۔  
"آئیں گی نا۔"  
"ہاں۔" اس نے ایک نظر بابا پر ڈالی۔ "لیکن زین!



میں نے ان کو پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ پھر یہ مجھے کس طرح جانتے ہیں۔" وہ ابھٹکتی نظر آئی۔  
 "میں نہیں جانتا۔ بابا کہہ رہے تھے۔ وہ خود بتائیں گے۔"

زارا نے بغور اسے دیکھا۔ وہ نظریں چراگیا۔ اس کا لہجہ بتاتا تھا وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ مگر زارا نے زیادہ اصرار نہیں کیا۔

"اوکے۔ میں ان ہی سے پوچھ لوں گی۔" پھر وہ کچھ ٹھہر کر پوچھنے لگی۔ "ان کا نام کیا ہے؟" وہ بری طرح الجھ گیا۔

"میں انہیں بابا کہتا ہوں۔ آپ بھی انہیں بابا کہہ لیں۔"

زارا طویل سانس لے کر رہ گئی۔  
 "تو تم کچھ نہیں بتاؤ گے۔"

"مجھ سے کچھ مت پوچھیں۔" وہ جڑبڑہو کر بولا۔  
 "اوکے۔ بابا کا خیال رکھنا۔" وہ کچھ الجھتی کچھ سوچتی ہوئی پلٹ آئی۔  
 "کیا چکر ہو سکتا ہے۔"

گاڑی میں بیٹھ کر بھی اس نے آخری بار سوچا تھا۔ پھر کوئی جواب نہ پا کر سر جھٹکتے ہوئے گاڑی اسٹارٹ کر دی۔

♥ ♥ ♥ ♥  
 "تم کیوں اتنی گرم صم بیٹھی ہو۔" انعم نے پوچھا۔  
 "تو وہ چونک گئی۔  
 "گرم صم نہیں۔ کچھ تھکن محسوس ہو رہی ہے پھر طبیعت بھی کچھ ٹھیک نہیں۔" زارا نے کہا۔  
 "آج کلاسز بھی تو لگاتا رہی ہو گی۔" انعم نے کہا۔  
 "ساتھ ہی اپنا بیگ کھولنے لگی۔

"اسی لیے تو کہتی ہوں۔ ایک آدھ کلاس بیک کر لو۔ مگر نہیں۔ ان پر تو پڑھائی کا بھوت سوار تھا۔  
 انعم نے منہ بنایا۔  
 "میں بھی ایک مزے کی چیز کھاتی ہوں۔" انعم نے بیگ سے لفافہ نکالا۔  
 "خوب سے خوراک پر مانتی ہو۔"

نہیں سکتی تھیں۔ بیک میں کچھ کھانے کو ہے۔" انعم جھنجھلائی تو انعم نے ہنس دی۔

"ہر روز تم میرے بیک کی تلاشی لیتی ہو۔ آج میں حیران تھی۔ تمہاری ناک کو کیا ہوا ہے؟"

"ہائے بڑی غلطی ہوئی۔ جاتے ہی چیک کرواؤں گی۔" اس نے اپنی ناک ہلائی۔

"مگر ہے کیا؟" زارا نے پوچھا۔

"مسوہن حلوہ ہے میں نے خود بنایا ہے۔" اس نے لفافہ ان کے سامنے کیا۔

"واؤ۔ گویا آج کل تم بھی سکھ بننے کی کوشش کر رہی ہو۔" انعم نے فوراً برا سا ٹکڑا اٹھایا۔

"میں آل ریڈی سکھ ہوں۔" اس نے لفافہ زارا کے سامنے کیا۔ وہ مٹھائی نہیں کھاتی تھی۔ مگر انعم نے شوق سے لائی تھی اس نے ایک چھوٹا ٹکڑا اٹھا لیا۔

"اس بات کا فیصلہ ابھی ہو جاتا ہے کہ تم کتنی سکھ ہو۔" لفافہ اس کے ہاتھ سے غائب ہو گیا تھا۔ انعم نے غصے سے انعم کو گھورا۔ پھر ہنس دی۔

"فیصلہ تو ہو گیا۔ مکھیوں کی طرح جھپٹ پڑی ہو تم۔"

"نہیں۔ واقعی مزے کا بنا ہے۔" زارا نے کہا۔ پھر کچھ سوچتے ہوئے بولی۔ "تمہیں ایک نیوز بھی سناؤں۔"

"اس حلوے جتنی میٹھی اور مزے کی ہوئی چاہیے۔" انعم نے دوسرا ٹکڑا نکال کر لفافہ درمیان میں رکھا۔

"اتنی ہے کہ نہیں۔ مگر خبر یہ ہے کہ رضوان واپس آ رہے ہیں۔" اس نے بڑے آرام سے خبر دی تھی۔

مگر وہ دونوں ہی اچھل پڑیں۔  
 "یہ تو اس سے بھی زبردست خبر ہے کب؟"

"کسی بھی دن۔ بس انہیں سربراہ کا شوق رہتا ہے۔"

"ہائے زارا تمہاری شادی ہو جائے گی پھر۔" انعم نے بڑے جوش سے پوچھا۔

"لگتا تو یہی ہے۔"

"کتنا مزا آئے گا۔ میں آج تک کسی فریڈ کی شادی میں شریک نہیں ہوئی۔" وہ پر جوش ہو رہی تھی۔

"میں تمہیں انوائٹ کروں گی تب نا۔" زارا نے بے حد سنجیدگی سے کہا۔

"نہیں۔" اس کا منہ کھلا تو زارا ہنس دی۔ انعم جھینپ گئی۔

"بد تمیز نہ ہو تو۔"

"پاگل ہو تم بھی۔ بھلا فریڈز کے بغیر میری رخصتی ہو سکتی ہے۔" زارا نے پیار سے اپنی پر خلوص سی معصوم دوست کو دیکھا۔

"دیکھی ہماری ویلیو۔" انعم عظمیٰ کی طرف دیکھ کر اترائی تو زارا فوراً بول اٹھی۔

"میں دونوں کی بات کر رہی ہوں۔"

"گھڑی بھر کو خوش نہ ہونے دینا۔" وہ جھنجھلائی اور جب تک ان کے پوائنٹ کا ٹائم نہیں ہوا تھا۔ وہ اس کی شادی کے لیے اپنے ڈریسز ہی ڈسکس کرتی رہی۔ زارا گھر پہنچی تو قافلہ نے چھوٹے ہی پیغام دیا۔

"بیگم صاحبہ! رائے ہاؤس گئی ہیں۔ انہوں نے کہا تھا آپ بھی ادھر ہی آجائیں۔"

"کیوں خیریت تو ہے نا۔" اس نے چہرے سے پوچھا۔ ماما خود تو اکثر ہی رائے ہاؤس جاتی تھیں۔ مگر اسے یوں کبھی نہیں بلایا تھا۔

"بڑی بی بی کی طبیعت ٹھیک نہیں۔" ملازمہ نے بتایا۔ تو وہ پریشان ہو گئی۔ مائی جان کو ہائی بلڈ پریشر کی شکایت تھی۔

"اوکے۔ میں وہیں جا رہی ہوں۔" وہ اٹھنے قدموں واپس لوٹی۔ رائے ہاؤس کے سامنے دیکھیں پک رہی تھیں۔

"کمال ہے۔" اس نے بے حد حیرت سے سوچا۔

گیت کھل گیا تھا۔ وہ گاڑی پورچ میں لے گئی۔ وہاں پلوں کی گاڑی بھی کھڑی تھی۔

"طبیعت زیادہ خراب لگتی ہے۔" وہ کچھ متفکر سی

اندرو داخل ہوئی۔ عالیہ بھا بھی ڈرائنگ روم سے باہر نکلی تھیں پیچھے ہی ان کا آٹھ سالہ بیٹا سعد بھی تھا۔ وہ زارا کو دیکھتے ہی بول اٹھا۔  
 "زارا آئی! وہ۔"

عالیہ بھا بھی نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر دوبارہ ڈرائنگ روم میں دھکیل دیا تھا۔

"آؤ زارا! کب سے تمہارا انتظار ہے۔" وہ خوش دلی سے بولیں۔ زارا کو وہ معمول سے زیادہ ہشاش بشاش بلکہ خوش دکھائی دے رہی تھیں۔

"مائی جان کی طبیعت کیسی ہے اب۔"

"مائی جان۔" وہ کھلکھلا کر ہنسیں۔ زارا نے تعجب سے انہیں دیکھا اور وہ اس کی صورت دیکھ کر ہنستی ہوئی اس سے پلٹ گئیں۔

"بھا بھی!۔" زارا نے بمشکل خود کو ان کی گرفت سے چھڑایا۔ "مانا کہ ساس سو کا رشتہ کچھ ایسا ہی ہے۔

مگر ساس کی بیماری پر اتنا خوش ہونا۔ اگر ہونا ہی ہے تو دنیا داری بھانے کو ہی افسردہ نظر آنے کی کوشش کر لیں۔"

بھا بھی کی ہنسی پھر بھی رکنے میں نہیں آئی۔  
 "میں مائی جان کی طبیعت پوچھ رہی تھی۔"

"جاؤ خود ہی پوچھ لو۔" انہوں نے اسے دروازے کی سمت دھکیلا۔ وہ لڑکھڑا کر دروازے سے نکلتے شخص سے ٹکرائی۔ بلکہ باقاعدہ اس کے سینے سے جا لگی تھی۔ وہ سرعت سے پیچھے ہٹی۔

"استقبال کا یہ انداز۔ اچھا لگا۔ نہ گھبرانے کی ضرورت نہیں تمہیں تو شرعی حق حاصل ہے۔"

"آ۔ آپ۔" زارا ہونق سی ہو گئی۔

"آئی ٹھنک ایسی جرات کا مظاہرہ آپ رضوان حیدر کے ساتھ ہی کر سکتی ہیں۔" مقبسم لب و لہجہ وہ جھینپتی گئی۔

"بھا بھی نے دھکا دے دیا تھا۔" زارا جھل سی ہو کر بولی۔

"بروقت دیا تھا۔" وہ برہنہ ہوئے۔



”آپ کب آئے؟“ اس نے اپنے لہجہ و انداز کو نارمل کرنے کی سعی کی۔  
”صبح دس بجے۔“

”آپ نے بتایا ہی نہیں۔“  
”تب ایسا خوبصورت اتفاق کیسے ہوتا۔“ وہ شریر سے لہجے میں گویا ہوئے۔

”اوہ پلیز۔ رستہ چھوڑیں۔“ زارا کترا کر اندر داخل ہو گئی۔ سلیمان بھائی کے سوا سب ہی موجود تھے۔

”دیکھا میں نہ کہتی تھی۔ یہ لڑکی یوں ہی قابو آئے گی۔“ تائی جان اسے دیکھتے ہی بول اٹھیں۔

”اٹس ناٹ فیئر آپ کو پتا ہے۔ میں پریشان ہو جاتی ہوں۔“ وہ غلطی سے کہتی ہوئی ان کے قریب بیٹھ گئی۔ رضوان پایا کے برابر بیٹھ گئے تھے۔

”بھئی ہم نے سوچا۔ جس طرح رضوان نے ہمیں سر پرانز کیا۔ ہم تمہیں بھی دیں۔“ کوکیا ربا۔ ”عالیہ اندر داخل ہوئیں ان کے عقب میں ملازمہ ٹرائی گھسیٹی آ رہی تھی۔ جس میں انواع و اقسام کی کھانے پینے کی اشیاء بھری تھیں۔ ہر قسم کے جو سز تھے۔ عالیہ سب کو پیش کرنے لگیں۔

”میں جانتی تھی ایسی حرکت آپ ہی کر سکتے ہیں۔“ زارا نے کہا تو مسکرا دیں۔

”تم کون سا جوس لوگی۔“  
”پلیز کاہی۔“

”وہ تو نہیں ہے۔ میں ابھی بنواتی ہوں۔“ وہ اٹھنے لگیں۔ زارا نے روک دیا۔

”بس ٹھیک ہے۔“ اس نے یونہی ایک گلاس اٹھا لیا۔

”اچھا ہے عادت بدل دو۔ رضوان کو بھی اچھی نہیں لگتی۔“ عالیہ نے سرگوشی کی۔ وہ بس مسکرائی۔

تائی جان سے پوچھنے لگی۔  
”سلیمان بھائی کہاں ہیں؟“

”وہ تو گاؤں چلا گیا تھا۔ فون کروایا ہے میں نے آتا ہی ہو گا۔“ انہوں نے بتایا۔

”ہاں تو رضوان بیٹا! اب کیا ارادہ ہے تمہارا۔“ پایا نے پوچھا۔ تو رضوان انہیں اپنے پلان کے بارے میں مختصراً بتانے لگے۔ ماما اور تائی جان مصروف ہو گئیں۔

”اب کیا ارادے ہیں؟“ عالیہ نے زارا کو اپنی طرف متوجہ کیا۔

”بالکل وہی پہلے والے۔“ وہ لاپرواہی سے بولی تھی۔ اس رات وہ لوگ واپس ہی نہ آ سکے۔ اگلے دن بھی تائی جان نے آنے نہیں دیا۔ تیسرے دن وہ لوگ واپس آنے لگے تو تائی جان نے اسے ساتھ لگا کر پیار کیا۔

”بس اب تو مستقل یہاں لے آؤں گی۔“  
”رضوان کا بس چلے تو جانے ہی نہ دے۔“ عالیہ نے سرگوشی کی تو وہ جھینپ گئی۔ رضوان اس کے قریب آئے۔

”میں تمہارے لیے کوئی گفٹ نہیں لایا۔“  
”ہائیں۔ وہ کیوں بھئی۔“ عالیہ نے چونک کر پوچھا۔ وہ زارا کو دیکھ کر مسکرا دیے۔ وہ بھی ان کی بات سمجھ گئی تھی۔ تب ہی مسکرا کر بولی۔

”بہت اچھا کیا۔۔۔“  
”یہ کیا پسلی ہے بھئی۔ گفٹ لانے پر خوشی کا اظہار تو دیکھا تھا۔ یہ نہ لانے پر کیوں خوش ہو رہی ہو تم۔“ عالیہ حیران ہوئیں۔

”یہ باتیں آپ کی سمجھ میں کہاں آئیں گی بھابھی؟“ رضوان نے چھیڑا تو وہ خفا ہو کر کہنے لگیں۔

”ہاں۔ اب تو تم باہر سے ڈگری لائے ہو۔ اب واقعی تمہاری باتیں ہماری سمجھ میں کہاں آئیں گی۔“ رضوان مذاق کر رہے ہیں بھابھی۔ ”زارا نے ٹالا۔

”اب تم اس کی سائیڈ نہیں لوگی تو اور کون لے گا۔“ وہ مسکرا دی گئیں۔

”او بیٹا! اب چلتے ہیں۔“ پایا نے پکارا تو وہ عالیہ سے مل کر اور رضوان کو خدا حافظ کہہ کر آگئی اور ان تین دن کے ہنگاموں میں اسے کہاں یا درہا کہ کوئی اس کا کتنا

منتظر ہے۔



یونیورسٹی کے درودیوار پر ہنگاموں کے بعد سکوت طاری ہو گیا اور دھیرے دھیرے جامعہ کی رونقیں افتخار کی واپسی کے بعد واپس آنے لگیں۔ کیفے ٹیریا اور ڈپارٹمنٹ میں پھر سے اس کی شاعری شروع ہو گئی۔ وہ اب بھی غلطی کو دیکھ کر گنگناٹے لگتا۔

”اس شہر میں روپ کا کال نہیں۔ کچھ اور ہے اپنے سا جن میں۔“

غلطی بے نیازی رہتی۔  
زارا وہاں سے آتے ہی اسپتال گئی تھی۔ مگر وہ کمرہ خالی تھا۔ اس نے دریافت کیا تو اسے بتایا گیا کہ وہ تو ڈسچارج ہو گئے تھے۔

”وہ ٹھیک تو تھے نا۔“  
”بالکل ٹھیک تھے۔“

نرس نے رجسٹر بند کرتے ہوئے جواب دیا۔ تو وہ واپس آگئی۔ زین اب بھی نہیں آ رہا تھا۔ زارا کو افسوس سا ہوا۔ اسے ایک بار ان سے مل لینا چاہیے تھا۔

”میں آج صرف آپ کے لیے یونیورسٹی آیا ہوں۔“

وہ جو میڈم تبتم کی آمد سے ذرا پہلے افتخار کی زبانی منیر نیازی کی پنجابی نظم ”شہر دی کڑی“ سن رہی تھی۔ چونک کر پلٹی۔ افتخار بھی خاموش ہو گیا۔ زین کی نگاہوں میں غلطی تھی۔

”میں۔“ زارا ایک پل کو گڑبڑائی۔ ”میں آئی تھی۔“

”دیر کر دی آپ نے۔ ورنہ ہم نے تو پل پل انتظار کیا تھا۔“ اس کا لہجہ ایسا تھا کہ زارا شرمندہ ہو رہی تھی اور سب لوگ حیران اور عجیب نظروں سے انہیں دیکھ رہے تھے۔

”سوری زین۔۔۔“ وہ سب کو نظر انداز کر گئی۔  
”ایک بیمار شخص کے لیے دن سے رات کرنا کتنا دشوار ہے اور بابا نے ایک ایک سیکنڈ گنا ہے۔“ اس

کے لہجے میں شدید غصہ اور کرب اتر آیا۔ زارا کو اس کی حالت بہت عجیب لگی۔ عجیب سی وحشت اتر آئی تھی اس کے لہجے میں۔

”زین! تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے۔“ آصف نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔ زین نے اس کا ہاتھ انتہائی بے زاری سے جھٹکا۔ پھر زارا کو دیکھ کر انتہائی تلخی سے گویا ہوا۔

”انتہائی تو چاہا تھا انہوں نے زارا عمیر سے کہ وہ ایک بار ان سے مل لے۔ میں نے بھی کہا تھا آپ ان سے مل لیں۔ لیکن آپ نے انہیں اٹھانے سے روک دیا۔ اس پل کی بے آراہی انہیں یوں کرب انگیز انتظار کی اذیت سے تو دو چار نہ کرتی۔“

”زین! تم خواجواہ اموشنل ہو رہے ہو۔ میں آتا چاہتی تھی مگر نہیں آ سکی۔ کچھ مصروفیات نکل آئیں اچانک۔ پھر میں پہلی فرصت میں آئی تھی مگر بابا ڈسچارج ہو گئے۔“ وضاحت دینا زارا کی سرشت میں نہ تھا مگر زین کی حالت اسے نرمی اختیار کرنے پر مجبور کر رہی تھی۔ ورنہ نہ تو اس کا تعلق زین کے ساتھ تھا اور نہ اس کے بابا کے ساتھ۔ زین خاموش ہو کر لب کاٹنے لگا۔

”میں بابا سے ملنے آؤں گی۔“

زین نے جھٹکے سے سر اٹھایا۔ کچھ لمحے خاموشی سے اسے دیکھا رہا۔ پھر گویا ہار گیا۔

”کب؟“ اس کے لہجے میں وہی معصومیت اتر آئی۔

”آج یا کل۔۔۔“ زین نے اس کے ہاتھ میں پکڑی نوٹ بک تھامی۔

”پین ہو گا۔“

آصف نے اپنی ہاتھ میں پکڑی پنسل اسے تھما دی۔

زین نے نوٹ بک پر اپنا ایڈریس لکھا۔ پھر نوٹ بک اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔

”پلیز۔ دیر مت کیجئے گا۔“ اس کے لہجے میں بڑا اصرار تھا۔



زارا نے اثبات میں سر ہلایا تو لمبے لمبے ڈگ بھرتا چلا گیا۔

”کیا مسئلہ تھا؟۔“ عظمیٰ نے قدرے حیرت سے پوچھا۔

”کچھ نہیں۔“ زارا نے افتخار کو دیکھا تو اس نے نظم وہیں سے سنائی شروع کر دی۔ جہاں سے چھوڑی تھی۔ مگر زارا کو نہ تو اس کی نظم سمجھ میں آئی اور نہ ہی میڈم تبسم کا لکچر۔ وہ الجھ گئی۔

”کیوں ملنا چاہتے ہیں زین کے بابا مجھ سے۔ کیوں اتنی شدت سے منتظر ہیں۔“

اس سوال کا جواب ظاہر ہے اسے زین کے بابا ہی دے سکتے تھے۔

”اب تم ہم سے باتیں بھی چھپانے لگی ہو۔“ میڈم تبسم جیسے ہی باہر گئیں۔ عظمیٰ اور انعم نے اسے گھیر لیا۔

”میں نے کیا چھپایا ہے۔“ اس نے اپنی نوٹ بک وغیرہ شولڈر بیگ میں ڈالی۔

”زین تم سے پہلے کب ملا تھا؟“

”ہاسپٹل میں۔ اس کے والد کو ہارٹ اٹیک ہوا تھا۔“

”اور اس نے صرف تمہیں بتایا۔ یونیورسٹی میں اور کسی کو نہیں بتا کہ وہ اتنے دنوں سے کیوں نہیں آ رہا۔“ عظمیٰ نے گھور کر اسے دیکھا تو وہ مسکرا دی۔

”اتفاقاً“ وہ مجھے ہاسپٹل میں مل گیا۔“

”اور اس کے بابا تمہیں کیسے جانتے ہیں۔“ انعم نے سوال کیا۔

”مجھے نہیں معلوم۔“

”یہ گھنٹی ہے بالکل نہیں بتائے گی۔“ انعم نے دانت پیس کر کہا۔

”وہ فریڈنا مجھے کچھ نہیں معلوم۔ بس ایک دن زین اگر کہنے لگا کہ اس کے بابا مجھے جانتے ہیں اور وہ مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔“

”اور تم پھر بھی ان سے نہیں ملیں۔“

”میں۔ اتنے دنوں یونیورسٹی بھی نہیں آئی۔ سچی کے قدموں کی آواز دھیرے دھیرے بلند ہوتی

بات ہے ہاسپٹل میں ملنے سے پہلے تو مجھے یقین بھی نہ تھا کہ وہ سچ کہہ رہا ہے لیکن اب مجھے لگتا ہے کہ کوئی بات ضرور ہے۔“ وہ سوچتے ہوئے لمبے لمبے بولی۔

”زین کی حالت بہت خراب تھی تم ضرور جانتا۔“ انعم نے کہا تو اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ لیکن شاید اس کی قسمت میں ابھی ان سے ملنا نہیں لکھا تھا۔ وہ

گھر آئی تو ماما افسان خیزاں روئی روئی سی تیاری کر رہی تھیں۔

”کیا ہوا ماما۔؟“

”تمہارے انکل فیروز کی ڈینٹھ ہو گئی ہے۔“

”اوہ نو۔“ فیروز انکل اس کے خالو تھے۔ انہیں کینسر تھا کبھی کبھی ڈھیر سارا روپیہ اور مناسب علاج بھی قضا کو نہیں مل سکتا۔

”تم کپڑے بدلو۔ ابھی روانہ ہونا ہے۔ تمہارے پاپا ٹکٹ لے کر آتے ہوں گے۔“ اسے ایک پل کو زین کے بابا کا خیال آیا۔ اتنا وقت نہیں تھا کہ وہ ان سے مل سکتی۔ اس نے نوٹ بک کھولی۔ مگر وہاں کوئی فون نمبر نہ تھا۔

”اوہ مائی گاڈ۔“ وہ پریشان ہو گئی۔

”کھڑی منہ کیا دیکھ رہی ہو۔ جلدی کرو۔“ ماما نے ڈانٹا تو وہ زین کو بھول کر چینیج کرنے چلی گئی۔ ٹھیک آدھے گھنٹے کے بعد وہ لوگ اسلام آباد کے لیے روانہ ہو گئے۔ وہاں کھرام بچا تھا۔ آنٹی کی حالت بہت خراب تھی۔ ظاہر ہے ایک طویل رفاقت کا خاتمہ صبر کرنا اتنا آسان بھی نہ تھا۔ قل خوانی کے بعد ماما تو وہیں رک گئیں

جبکہ وہ پاپا اور دوسرے لوگوں کے ساتھ واپس آئی تھیں۔

♥ ♥ ♥ ♥

بیل دینے سے پہلے وہ بزل سی تھی۔ دریا اس کے دائیں طرف تھا اور اورنج سورج کی کرنیں ساکت پانیوں کو چھو چھو کر اب پلٹنے لگی تھیں۔ زارا نے دور

رستوران میں جلنے والی روشنیوں کو دیکھا۔ پھر کال بیل پر انگلی رکھ دی۔ دور کوئی چڑیا چھمائی تھی۔ پھر کسی کے قدموں کی آواز دھیرے دھیرے بلند ہوتی

دروازے تک آ کر رکی۔ پھر دروازہ بے آواز کھل گیا۔ زارا کو ایک دھچکا سا لگا۔

یہ وہ زین تو نہ تھا۔ اس کے چہرے پر جی آنکھیں اتنی بے رونق اور بجھی ہوئی تھیں کہ زارا کو خوف سا محسوس ہوا۔ گھر کے اندر بالکل اندھیرا تھا اور دروازہ

میں ایستادہ وجود ایک دم چپ اور ساکت تھا۔

”آئی۔ ایم سوری زین۔ میں۔“

”آپ کیوں آئی ہیں۔؟“ اس کا لہجہ بھی اسی کی طرح سپاٹ اور بے رونق تھا۔

”میں تو اسی دن آجاتی۔ مگر مجھے اسلام آباد جانا پڑا۔ میرے انکل کی ڈینٹھ ہو گئی تھی۔ میں نے چاہا کہ تمہیں فون کروں مگر۔ تمہارا فون نمبر نہیں تھا۔“

وہ کچھ لمبے یونہی اسے گھورتا رہا۔ پھر ایک طرف ہٹ گیا۔

”اندر آجائیں۔“

وہ اس کے پیچھے اندر داخل ہو گئی۔ گھر کی ایک ایک چیز تاریکی کا راج تھا۔ وہ کسی چیز سے ٹکرائی۔

”زین روشنی تو کرو۔“ ٹیچ کی آواز کے ساتھ کمرہ روشن ہوا تھا۔ زارا نے دیکھا ہر چیز بے ترتیب تھی۔

فضا میں ابھرتی دریا کی لہروں کا شور، سیلن اور ہلکی سی بو شامل تھی۔ جو بہت عرصے سے بند گھروں سے آئی تھی۔ وہ میز پر نکل آیا تھا۔ سامنے دریا کنارے

لوگوں کی آمدورفت میں اضافہ ہو گیا تھا۔ دور رستوران میں جگمگاتی روشنیاں جلتے بجھتے جگنو لگ رہی تھیں۔ وہ دونوں ہاتھ گرل پر نکائے ڈو بتے سورج کو دیکھ رہا تھا۔ پھر اس کی سرسراہٹ آواز ابھری۔

”اس دن میرا دل چاہا۔ یہ دریا بھر جائے اور سب کچھ فنا ہو جائے۔ میں زندہ نہ رہوں یا۔۔۔“ وہ اس کی طرف پلٹا۔

”یا تمہیں مار دوں۔“ وہ دہل گئی۔ اسے ایک دم سے اس نیم تاریک اور پراسرار ماحول اور سامنے کھڑے شخص سے خوف سا محسوس ہوا۔ زارا

نے خود کو نارمل کرنے کی سعی کی۔

”بابا۔ بابا کہاں ہیں؟۔“

وہ لب بلبچھے اپنی تیز چلتی سانسوں کو قابو کرنے

کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر اس کی وحشت خون میں ابال پیدا کر رہی تھی۔

”وہ اس سے زیادہ آپ کا انتظار نہیں کر سکے۔“

زارا پھٹی پھٹی نگاہوں سے اسے دیکھنے لگی۔

”وہ اپنا انتظار مجھے سوئپ گئے۔ یہ پوچھنے کے لیے کہ آپ نے ایسا کیوں کیا زارا اعمیو۔“ وہ ٹوٹ رہا تھا بکھر رہا تھا اور خود کو سنبھالنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔

”میں۔ میں نے ایسا سوچا بھی نہ تھا۔“ وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر سسک اٹھی۔

”آئیں میرے ساتھ۔“ وہ اس کا بازو تھام کر بولا۔ وہ بس اس کے ساتھ کھینچتی رہی۔ وہ دروازہ کھول کر اسے ایک کمرے میں لے گیا۔ جہاں بیڈ کی چادر شکن آلود تھی۔ جیسے ابھی ابھی کوئی یہاں سے اٹھ کر گیا ہو۔ بیڈ کے عین اوپر دیوار پر زین اور بابا کی بہت بڑی تصویر تھی۔

”ان درو دیوار کو بہت غور سے دیکھیں زارا! یہ بابا کی آنکھیں بن گئی ہیں۔ میں نے جس پل انہیں بتایا کہ آپ کل آئیں گی۔ انہوں نے کہا دروازہ لاک نہ کرنا۔ برسوں کے بند دروازے جلدی نہیں کھلتے کیسے اسے انتظار نہ کرنا پڑے۔ یہ۔ یہ۔“ اس نے روم ریفریجریٹر کا دروازہ کھولا۔ جس میں انواع و اقسام کی چیزیں بھری تھیں۔

”یہ سب انہوں نے آپ کے لیے منگووا کر رکھا تھا۔“ اس نے ایک جھٹکے سے فریق کا دروازہ بند کیا اور اسی جھٹکے سے الماری کھول کر ایک گفٹ پیک نکالا۔

”یہ انہوں نے آپ کے لیے منگوایا تھا کہ زارا پہلی بار اس گھر میں آئے گی۔“ اس نے گفٹ دیوار پر دے مارا۔ وہ دیوار سے ٹکرا کر فرش پر گرنا اور اس میں نہ جانے کون سے چیز چکنا چور ہوئی تھی۔

”میں نے بابا کو زندگی بھر اتنا بے قرار اتنا بے چین نہیں دیکھا تھا۔ انہوں نے زندگی بھر کسی کا اتنا انتظار نہیں کیا۔ مگر آپ نہیں آئیں۔ کیوں کیا زارا اعمیو آپ نے ایسا۔ کیوں کیا۔“ وہ پھوٹ پھوٹ کر

187



روئے لگا۔ زارالبوں پر ہاتھ رکھے اپنی سسکیاں روکنے کی کوشش کرنے لگی۔ تب ہی اس نے سر اٹھا کر وحشت انگیز نگاہوں سے اسے دیکھا۔

”آپ یہاں سے چلی جائیں۔“

”زین۔۔۔!“ زار نے کچھ کہنا چاہا۔ وہ چیخ اٹھا۔

”فار گاڑ سیک۔ آپ چلی جائیں یہاں سے۔ ورنہ میں کچھ کر بیٹھوں گا۔ مار ڈالوں گا آپ کو۔۔۔“

وہ گھبرا کر کئی قدم پیچھے ہٹی۔ پھر بھاگ کر کمرے سے باہر نکل آئی۔ ٹیرس سے گاڑی تک کا فاصلہ اس نے بھاگتے ہوئے طے کیا تھا۔ گھر کس طرح پٹنی۔ اسے کچھ خبر نہ تھی۔ بس دلی دلی سسکیاں تھیں۔ جو بیڈ روم میں آکر لبوں سے آزاد ہو گئیں اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔ ”دفعنا“ اسے لگا کمرے کی دیواریں آوازیں اٹھنے لگی ہیں۔

یہ دیواریں آنکھیں بن گئی ہیں۔

یہ چیزیں دیکھ رہی ہیں۔ یہ سب انہوں نے آپ کے لیے منگوائی تھیں۔“

”انہوں نے کہا۔ دروازہ لاک مت کرنا۔ برسوں کے دروازے جلدی نہیں کھلتے۔ کہیں اسے انتظار نہ کرنا پڑے۔“

”تیسرا فل چاہتا ہے میں آپ کو مار ڈالوں۔“  
”اوہ میرے خدا۔۔۔“ اس نے دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ لیے۔ مگر آوازیں تھیں کہ بڑھتی جا رہی تھیں۔

♥ ♥ ♥ ♥

وہ بڑی ہمت کر کے دوبارہ وہاں گئی تھی۔ دروازہ پندرہ سولہ سالہ لڑکے نے کھولا۔ لباس اور وضع قطع سے وہ ملازم ہی لگتا تھا۔ اس نے بے حد حیرت سے زارا کو دیکھا۔

”زین ہیں۔۔۔“ وہ اسے ڈراٹنگ روم میں لے گیا۔ بیٹنی جی۔“ وہ اسے ڈراٹنگ روم میں لے گیا۔ بیٹنی

سازد سامان خاصی بے ترتیبی کا شکار تھا۔

”آپ بیٹھو! میں بھائی جان کو بلاؤں۔۔۔“  
”وہ کہاں ہے؟۔۔۔“ زارا بیٹنی نہیں تھی۔  
”اوپر بالکونی میں ہی بیٹھے رہتے ہیں۔“

”میں وہیں مل لوں گی۔“ زارا نے کہا تو وہ اسے ساتھ لے کر ٹیرس پر آگیا۔ زین نے آہٹ پر پلٹ کر دیکھا۔

”مجھے معلوم تھا آپ آئیں گی۔“

”بھائی جان۔۔۔!“ لڑکے نے کچھ کہنا چاہا۔ زین نے اس کی بات کاٹ دی۔

”تم جاؤ سلیم! تمہاری ماں انتظار کر رہی ہو گی۔ زیادہ انتظار نہیں کروایا کرتے، کبھی کبھی انتظار زندہ رہتا ہے اور انسان ہار جاتا ہے۔“

اس کا لہجہ بڑا عجیب تھا۔ زارا کٹ کر رہ گئی۔ وہ لڑکا سلام کر کے چلا گیا۔ وہ کچھ لمحے متذبذب سی اسے دیکھتی رہی۔ پھر ایک خالی کرسی پر بیٹھ گئی۔

”کبھی کبھی کوئی پل محض بچھتاوا بن کر رہ جاتا ہے۔ میں مجرم نہیں ہوں۔ مگر مجھے اپنا آپ کسی مجرم سے کم نہیں لگتا۔“ کناروں کو چھو کر پلٹتی لہر نظر میں جما کر وہ آہستگی سے بولی۔ زین نے اپنی انگلیوں کی پوروں سے جلتی ہوئی آنکھیں رگڑیں۔

”آپ کو خوف نہیں آیا یہاں آتے ہوئے۔“  
”میں ڈری ہوئی تھی، مگر کچھ ایسا تھا جو مجھے یہاں دوبارہ کھینچ لایا ہے۔“ وہ انگلیاں چمکاتے ہوئے بولی۔

یہ حرکت اس کے اندرونی اضطراب کی نشاندہی کر رہی تھی۔

”میں اس دن بہت ڈپر لہذا تھا۔ میں رونا چاہتا تھا۔ کسی اپنے کے سامنے بہت چیخ چیخ کر رونا چاہتا تھا اور مجھے آپ پر بہت غصہ بھی تھا۔“ آج اس کے لہجہ و انداز میں اس دن والی وحشت نہ تھی۔ بس ایک دکھ ایک کرب تھا جو وہ تنہا برداشت کر رہا تھا۔

”زین۔۔۔ زین پلیز! مجھے بتاؤ۔ تم کون ہو۔ وہ کون تھے۔ کیوں انتظار کرتے تھے میرا، کیسے جانتے تھے مجھے۔“ یہ سارے سوال اسے پاگل کیے دے رہے تھے۔

زین خاموشی سے اٹھا اور سیڑھیاں اتر گیا۔ وہ تھیر سے اسے سیڑھیاں اترتے دیکھتی رہی۔ مگر وہاں سے اٹھی نہیں کہ اسے آج ان سارے سوالوں کا جواب

چاہیے تھا۔ نیم تاریکی میں وہ دریا کی لہروں کا مدھم مدھم شور سنی رہی۔ سورج دریا کے پانیوں میں گھل کر آسمان کی ہتھیلیوں کو رنگ گیا تھا اور دھیرے دھیرے یہ رنگ رات کی تاریکی چوس رہی تھی۔ کچھ دیر کے بعد وہ آیا تو اس کے ہاتھ میں سرخ نمٹلیں جلد والا بڑا سا البم تھا۔ اس نے وہ البم زارا کو تھمایا اور کچھ بھی کہے بغیر دوبارہ واپس چلا گیا۔ زارا نے سیڑھیوں پر معدوم ہوئی اس کی قدموں کی چاپ کو سنا اور خیر سے ہاتھ میں پکڑی بند البم کو دیکھا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اسے لگا کچھ ہے جو بہت اچانک اس کے سامنے آئے گا۔

کوئی صدیوں پرانا راز جو اس البم کے کھلتے ہی اس پر افشا ہو جائے گا۔

اس کے ہاتھوں میں مبہم سی لرزش اتر آئی۔ اس نے بہت آہستگی سے البم کو یوں کھولا۔ جیسے اس میں چھپا ہر چیز ہوا میں تحلیل ہو جائے گا۔

البم کے پہلے صفحے پر زین کے بابا کی تصویر تھی۔ زارا نے انہیں بہت بوڑھا اور بیمار حالت میں دیکھا تھا۔ مگر یہ ان کی جوانی کی تصویر تھی۔ اگلے کئی صفحوں پر ان ہی کی تصویریں تھیں۔ کالج میں فٹ بال ٹیم کے ساتھ، بادشاہی مسجد کے قریب، داؤی کاغان اور ناران کی سرسبز وادیوں میں اپنے دوستوں کے ساتھ۔ اگلی تصویر میں وہ ایک خوبصورت اور روزانہ قامت لڑکی کے کندھے پر بازو پھیلائے مسکرا رہے تھے۔ دوسری تصویر میں وہ کسی مندی کے فنکشن پر بھنگڑا ڈال رہے تھے اس سے آگے وہ بری طرح چوٹیں۔

”مما۔۔۔“ اس کے لبوں نے بے یقین سرگوشی کی۔ پہلے جوڑے میں ملبوس منہ پر ہاتھ رکھے وہ ہنس ہنس کر بے حال ہو رہی تھیں۔ ان کا وہ سرا ہاتھ زین کے بابا کے ہاتھ میں تھا اور وہ انہیں مٹھائی کھلانے کی کوشش کر رہے تھے۔

زارا نے تیزی سے اگلی تصویریں دیکھیں۔ ہر تصویر میں وہ موجود تھے۔ مندی کے فنکشن، رخصتی کے وقت اور دلیپے میں۔ پھر اس نے ننھی سی زارا عجب

کو ان کی گود میں بیٹھے دیکھا۔ وہ اسے فضا میں اچھال رہے تھے۔ اس کے ساتھ کھیل رہے تھے۔ وہ ان کے کندھے پر چڑھی تھی اور ماما پاپا مسکرا رہے تھے۔ پھر اس نے ماما کی گود میں ننھا سا بچہ دیکھا۔ زارا کا سارا وجود سینے میں بھیگ گیا۔ دل کسی گہری کھائی میں جاگرا ہوئے ہوئے لرز رہا تھا اور اس کے ہاتھ پاؤں بالکل بے جان ہو گئے تھے۔

”رائے جمشید حیات۔۔۔“ اس کے ارد گرد دھماکے ہو رہے تھے۔  
”تایا ابو کا قاتل۔“

تب ہی سیڑھیوں پر قدموں کی آواز ابھری اور زارا کی حیران آنکھوں میں خوف سا ابھرا۔ وہ ساکت وصامت بیٹھی زین کی تاریکی کو گھورتی رہی۔ حالانکہ وہ وہاں سے بھاگ جانا چاہتی تھی مگر اٹھ نہ سکی۔ جسم گویا پتھر کا مجسمہ تھا۔

اسے لگا وہ اب یہاں سے زندہ واپس نہیں جاسکے گی۔

(باقی آئندہ)

گرستے ہاتھوں کو روکتا ہے۔  
ہاتھ بچھو اور گھٹے کرتا ہے۔  
بیوٹی بکس کا مقصد یہ ہے کہ

**سوہتی بیوٹی آئل**

پچھلے 25 سالوں سے بیوٹی اور تھراپی اسٹل کر رہی ہے۔  
سوہتی بیوٹی آئل کے بعد  
آپ کے خدے لگے  
بیوٹی بکس کا مقصد یہ ہے کہ تیار کیم وہ

**سوہتی آیل**

(ہر بلن بیوٹی پکٹور)

جو آپ کو خدے میں سے خدے میں بدلے  
رنگ نکھارے، چھوٹے کو خوبصورت بنائے،  
پہرے کا رنگ بدل کر صاف اور شفاف بنائے۔

سوہتی آیل۔۔۔ پھر سے اور باتوں کی خوبصورتی کارن  
پہرے کے خدے کو خدے میں، فاقہ پر اور ایک خاص نشا ہے۔  
پہرے کے خدے کو خدے میں، فاقہ پر اور ایک خاص نشا ہے۔

آپ کے خدے اور خدے میں خدے کا مقصد یہ ہے کہ  
پہرے کے خدے کو خدے میں، فاقہ پر اور ایک خاص نشا ہے۔

سوہتی آیل۔۔۔ پھر سے اور باتوں کی خوبصورتی کارن  
پہرے کے خدے کو خدے میں، فاقہ پر اور ایک خاص نشا ہے۔

سوہتی آیل۔۔۔ پھر سے اور باتوں کی خوبصورتی کارن  
پہرے کے خدے کو خدے میں، فاقہ پر اور ایک خاص نشا ہے۔



# لے وقت کی دے

دوسری قسط

تاریکی میں ایک ہیولہ نمودار ہوا تھا۔ وہ بھٹی بھٹی نگاہوں سے دیکھتی رہی۔ تب وہ ہیولہ روشنی میں آیا۔

”م۔ میں چلتی ہوں۔“ اس نے ہتھیلی کا دباؤ کر سی پر ڈال کر اٹھنا چاہا۔  
”بیٹھ جائیں۔“ کیسی سرور روح کو ٹھہراتی ہوئی آواز تھی۔ وہ جیسے اٹھی تھی ویسے ہی بیٹھ گئی۔  
”تبیایاں پسینے سے بھگ گئی تھیں۔“

”چائے۔“ اس نے ذرا سا جھک کر مگ نیبل پر رکھا۔ پھر سیدھے ہو کر ایک نظر اس کے خوفزدہ

چہرے پر ڈالی۔  
”بابا ہوتے تو نجانے آپ کی کیا کیا خاطر کرتے۔“ اس نے ہاتھ برہا کر اس کے ہاتھ سے الیم لینی چاہی۔ مگر گھبراہٹ میں زارا کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے جا گری۔ زین نے فرش پر الیم سے نکل کر بکھری تصویروں کو دیکھا۔ پھر اس کے زرد چہرے کو۔  
”آپ کو معلوم ہو گیا نا۔ میں کون ہوں۔ وہ شخص کون تھا۔ جو آپ کو یہاں اس گھر میں دیکھنا چاہتا تھا۔“

زارا کچھ بھی نہ کہہ پائی۔  
”جب میں نے آپ کو پہلی بار یونیورسٹی میں دیکھا۔ تو مجھے لگا میں نے آپ کو پہلے بھی دیکھا ہے۔ حالانکہ ہم لوگ جدا ہوئے تو میں شخص ڈیڑھ برس کا تھا اور آپ شاید تین برس کی۔“

اس نے جھک کر وہ ساری تصویریں بڑی محبت سے سمیٹنی شروع کی۔ وہ انہیں یوں انگلیوں کی پوروں سے اٹھا رہا تھا جیسے مقدس صحیفے کے اوراق ہوں۔ جو ہاتھ لگانے سے بکھر جائیں گے۔

”شاید اس لیے کہ آپ میں اپنی ماما کی شبیہ بہت گہری ہے اور میں اس الیم کو سینکڑوں بار دیکھ چکا تھا۔“ وہ ہاتھ میں پکڑی تصویروں کو ترتیب دے رہا تھا۔

پھر ایک دن بابا نے مجھ سے پوچھا۔  
”کیا بات ہے زین۔؟“

ناولٹ





”جی۔۔۔! میں چونکا۔

”کچھ دنوں سے میں دیکھ رہا ہوں تم چپ چپ سے ہو۔“

میری نظریں شطرنج کے مسوں پر جمی رہیں۔

”ایسی کوئی بات نہیں۔“

”کوئی الجھن ہے تم پچھلے بیس منٹ سے بساط پر نظریں جمائے بیٹھے ہو۔ جبکہ میں جانتا ہوں تم کوئی چال نہیں سوچ رہے۔“

وہ ہمیشہ مجھے میرے اندر تک بڑھ لیتے تھے۔ میں ہمیشہ سے ان کے سامنے ایک کھلی کتاب کی طرح تھا اور وہ مجھے ہر بار ہر نئے واقعے پر سطر سطر پڑھتے تھے۔ میں نے خاموشی سے بساط الٹ دی۔ وہ پھر بھی کچھ نہیں بولے۔

”بابا! البم دیکھیں۔“ میں ہمیشہ یہ فرمائش کرتا اور وہ خوش ہو جاتے۔ یہ البم ماضی کی ریت میں چھپے وہ بند دروازہ تھے جنہیں وہ اپنے ہاتھوں سے کھولتے۔ آنکھوں میں ریت چبھتی جسے نمی دھو ڈالتی۔ وہ ان تصویروں کے اندر اتر جاتے۔ ان کے ساتھ باتیں کرتے بہتے کھیلے اور یہ بھول جاتے کہ میں بھی یہاں موجود ہوں۔

”آئمہ کو لڈو بہت برے لگتے تھے اور میں نے اس رسم کے موقع پر اسے نہ جانے کتنے لڈو کھلا دیئے۔ آخر تک اگر اس نے کھانے سے ہی انکار کر دیا جبکہ میں بضد تھا کہ ایک لڈو تم اور کھاؤ۔ زارا کو میرے کندھے پر چڑھ کر اچھلنے میں پروا مزا آتا تھا۔ جس دن اس نے پہلی بار مجھے ماموں کہا۔ میں سارے گھر کو ڈنر پر لے گیا تھا۔ سارا دن ماموں بار چلیں کی رٹ لگائے رکھتی۔ زارا میری گود میں ہوتی اور زین آئمہ کی۔ وہ

خوش کر کہتی۔ ”دلو! دلو! زارا تم لے لو زین مجھے دے دو۔“ وہ یہ ساری باتیں مجھے نہیں بتاتے تھے خود کو یاد

دلا سکتے تھے۔ میں نے تصویر پر ہاتھ رکھ کر آنکھیں سے کہنا۔

”بابا! میں نے آج زارا عمیر کو دیکھا تھا۔“ وہ شہ سر سے رہ گئے۔

”کہاں؟۔۔۔“ انہوں نے بے قرار ہو کر پوچھا۔

”یونیورسٹی میں۔۔۔“

”کیسی۔۔۔ کیسی ہے وہ بچی؟“ ان کے لہجے میں

سمندر کی لہروں جیسی بے قراری اور تڑپ تھی۔

”بچی نہیں ہیں۔ بڑی ہو گئی ہیں۔ مجھ سے سینئر

ہیں۔۔۔ میں نے مسکرا کر بتایا۔

”تم۔۔۔ بات کرتے ہو اس سے؟“ انہوں نے

حسرت سے پوچھا۔

”نہیں۔۔۔“

”دیکھتے تو ہو گئے۔۔۔؟“

”ہاں میں انہیں آپ کی نظر سے دیکھتا ہوں۔

میری نگاہ میں آپ کی تڑپ آپ کی بے قراری آ جاتی

ہے اور انہیں غصہ آنے لگتا ہے۔“ میں آپ کے

تاثرات سوچ کر مسکرایا۔

”کیا وہ بھی مجھے۔۔۔“

”مجھے نہیں معلوم۔“ حالانکہ میں کہنا چاہتا تھا بابا

وہ بھی تو رائے ہاؤس کے مکینوں کے درمیان ہی پٹی

بڑھی ہیں۔

بابا خاموش ہو گئے۔ میں نے چور نظروں سے

انہیں دیکھا اور البم بند کر دی۔ مگر جو تصویریں از سر نو

ان کے ذہن میں تازہ ہو گئی تھیں انہیں کیسے بند کرنا۔

”اسے کسی دن لے کر آؤ نا۔۔۔“ انہوں نے سراٹھا

کر ایک عجیب سی فرمائش کی۔ میں نے حیرت سے

انہیں دیکھا اور پوچھا۔

”کیا وہ آپ کی؟۔۔۔“

”نہیں۔“ کتنا عجیب اور مایوس لہجہ تھا ان کا جس

کے اندر سے ایک حسرت ابھری۔

”اگر وہ آجائے تو میں اسے بتاؤں۔۔۔“

”آپ اچھی طرح جانتے ہیں بابا! وہ رائے جشد

حیات سے ملنے کبھی نہیں آئیں گی۔“ میں انہیں کوئی

جھوٹی امید نہیں دلانا چاہتا تھا۔ مگر خود اسی امید کے

کیا۔ بابا ہر روز مجھ سے پوچھتے۔

”آج زارا نے کیسے کپڑے پہنے تھے۔ اس نے تم

سے کوئی بات کی؟“

میں چپ رہتا تو پوچھتے۔

”وہ کیسی ہے؟“

”بالکل پچھو جیسی۔“ وہ ہر روز پوچھتے۔ میں ہر روز

یہی جواب دیتا۔ ”پھر ایک دن انہیں ہارٹ ایک ہو

گیا۔ نجانے کیوں مجھے لگتا تھا کہ آپ ان سے ملیں گی

تو وہ ٹھیک ہو جائیں گے۔ میں نے سوچا۔ میں آپ کو

لے آؤں گا۔ آپ انکار کریں گی۔ میں تب بھی آپ کو

یہاں لاؤں گا لیکن آپ مجھے ہسپتال میں مل گئیں۔“

وہ ایک ایک تصویر البم میں لگا رہا تھا اور وہ شہ سر سی

لوں پر ہاتھ رکھے سن رہی تھی۔

”بابا! مجھ سے کتنا لڑے تھے؟“

”تم نے مجھے کیوں نہیں جگایا۔“

”بابا! میں نے۔۔۔“

”تم جانتے تھے۔ میں نے اس کا بل بل انتظار کیا

ہے۔ لمحہ لمحہ جاگا ہوں میں۔ تم نے پھر بھی کیوں۔“

”زین۔ کیا تم واقف نہیں تھے میری حالت، میری

کیفیت سے۔۔۔“ وہ بہت غصے میں تھے اور میں مجرم

بنا کھڑا تھا۔ کاش میں نے اس دن آپ کی بات نہ مانی

ہوتی۔

”بابا! انہوں نے وعدہ کیا ہے۔ وہ پھر آئیں گی۔“

میں نے ان کے سامنے امید کا چراغ جلا دیا۔

”کب؟۔۔۔“ انہوں نے تڑپ کر پوچھا۔ میں نہیں

جانتا تھا، لیکن میں نے کہہ دیا۔

”بہت جلد۔“

وہ ساری رات پلک نہیں جھپکتے تھے۔ ڈاکٹر فینڈ کا

انجکشن دینا چاہتے تو وہ چیخ اٹھتے۔

”مجھے نہیں سونا۔ وہ پھر آئے گی اور مجھے سوتا دیکھ کر

لوٹ جائے گی۔“

”آپ زارا عمیر کو لے آئیں۔ ورنہ ان کی حالت

بگڑ جائے گی۔“ ڈاکٹر نے کیا تو مجھے غصہ آگیا۔ بابا کو

میری ذرا بھی پروا نہیں رہی تھی۔ میں ان سے لڑ پڑا۔

”اگر آپ کو ان لوگوں سے اتنی ہی محبت تھی تو

کیوں چھپ کر بیٹھ گئے تھے۔ آئیں سامنے آئیں ان

لوگوں کے۔ اور کہیں کہ آپ بے گناہ ہیں کیوں

مجرموں کی طرح چھپ رہے ہیں۔ اگر آپ نے کچھ

نہیں کیا تو سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر کیوں بھاگے تھے۔“

”تمہاری وجہ سے۔۔۔؟“ بابا نے آنکھیں سے کہنا۔

”میری وجہ سے۔۔۔ مطلب؟“ میں نے حیرت

سے پوچھا۔

”ان کے اندھے انتقام کے ہاتھوں تم مارے

جاتے۔“ کتنا خوفزدہ لہجہ تھا بابا کا۔

”مگر کیوں۔۔۔ جب آپ نے کچھ کیا ہی نہیں ہے۔

آپ نے انہیں اپنی بے گناہی کا یقین بھی نہیں

دلا یا۔“

”کوئی ثبوت بھی تو ہوتا۔ سارے حالات و واقعات

اسی طرح ترتیب پائے تھے کہ مجرم میں بن گیا۔“

”آپ آپ اپنی بے گناہی کس طرح ثابت کریں

گے۔“ میرا لہجہ چبھتا ہوا تھا۔

”تم ایک بار اسے لے کر آؤ۔“

”نہیں بابا۔۔۔“ میرا لہجہ قطعی تھا۔ ”میں اب ان

کے پاس نہیں جاؤں گا۔ اگر ان میں ذرا بھی مروت

ہوتی تو ایک بیمار شخص کو دیکھنے وہ ضرور آتیں۔“

بابا خاموش ہو گئے۔ کچھ نہیں بولے۔ مجھے معلوم

تھا کہ وہ خفا ہو گئے ہیں۔ پھر انہیں ڈسچارج کر دیا اور مجھ

سے رہا نہیں کیا تو پھر سے آپ کے پاس چلا گیا۔“

ایک دم سے تاریکی کا احساس برپا ہوا۔ تو زارا نے

سراٹھا کر دیکھا۔ گھنے بالوں نے چاند کو اپنی آغوش میں

لے لیا تھا۔ اس گھنی تاریکی میں درختوں سے لگرائی

ہوا کا شور زارا کی سماعتوں پر خوف بن کر گرا۔ گھر کے

اندر کہیں کوئی روشنی نہیں تھی اور اس کے سامنے

بیخاسا یہ کہہ رہا تھا۔

”انہوں نے کہا زین! بہت اچھا سا تحفہ لانا۔ میری

زارا پہلی بار میرے گھر آئے گی۔“

زارا گھبرا کر اٹھ گئی۔ ”میں چلتی ہوں۔“

”وہ رات بڑی بھیا نک تھی اور ایسی راتوں کی کبھی



سحر نہیں ہوتی۔" وہ بھی کھڑا ہو گیا۔ زارا سیڑھیوں کی طرف بڑھی۔ وہ سایہ اس کے سامنے آ گیا۔  
 "اگر میں آپ کو اپنے بابا کی قاتل کہوں تو آپ کو برا نہیں لگنا چاہیے۔"

"مجھے جانے دو۔" وہ بے حد خوفزدہ ہو گئی تھی۔  
 "میں کب روک رہا ہوں آپ کو۔ روک ہی نہیں سکتا۔" وہ مایوس سے لہجے میں گویا ہوا۔ "مگر آپ اتنا تو بتادیں۔ کیا آپ بھی میرے بابا کو قاتل سمجھتی ہیں۔"  
 "مجھے نہیں معلوم۔" وہ تیزی سے سیڑھیاں اترتی۔ وہ سایہ اس کے پیچھے تھا۔

"آپ واقعی یہ سمجھتی ہیں کہ بابا نے آپ کے تباہ کو قتل کیا ہے؟"  
 زارا کی نہیں۔

"میرے بابا قاتل نہیں ہیں۔ انہوں نے کسی کو نہیں مارا۔ وہ کسی کو مار ہی نہیں سکتے۔ آپ کو یہ بات ماننی ہوگی۔" وہ اس کے گاڑی میں بیٹھنے تک چیختا رہا۔  
 اس نے گاڑی فل اسپینڈ پر چھوڑ دی۔ گھر میں ماما فون پر کسی سے اس کی بابت دریافت کر رہی تھیں۔  
 "کہاں چلی گئی تھیں زارا؟" ماما نے اسے دیکھتے ہی فون رکھا۔

وہ بھاگ کر ان سے لپٹ گئی۔  
 "زارا! کیا ہوا؟"

"مجھے ڈر لگ رہا ہے ماما۔"  
 "تم ٹھیک تو ہو۔ اتنی پبلی کیوں ہو رہی ہو؟" کسی انہونی کے احساس سے ان کا دل کانپ گیا۔  
 "بولو زارا! چپ کیوں ہو۔ میری جان! میرا دل گھبرا رہا ہے۔"

وہ ان کے ساتھ لگی لپے لپے سانس لیتی رہی۔ وہ اسے لے کر صوفے پر بیٹھ گئیں۔

"بتاؤ تاہنا! کہاں سے آ رہی ہو؟"  
 "ماما! اس نے سرائی کرمان کا پریشان چہرہ دیکھا۔  
 "آپ سمجھتی ہیں ماما میں نے تباہ کو قتل کیا تھا۔"  
 "تم کیوں پوچھ رہی ہو؟"  
 "آپ مجھے اس سوال کا جواب نہیں دینا چاہتیں۔"

مت دیں۔ مگر اب یہ سوال آپ سے ماموں کی روح کرے گی۔"

"زارا! وہ چیخ اٹھیں۔ زارا کے گلے میں پھندا سا بڑ گیا۔ وہ کچھ بھی نہ بول پائی۔ ماما نے اسے بھجھوڑ کر رکھ دیا۔

"کیا بکواس کر رہی تھیں تم ابھی۔"  
 زارا نے آہستگی سے خود کو ان کی گرفت سے چھڑایا اور قدرے دور جا کھڑی ہوئی۔ چند لمحے اسے اپنی ہمت مجتمع کرنے میں لگے۔ پھر وہ بے حد آہستگی سے بولی تھی۔

"میں ان سے ملی تھی ماما۔"  
 "تم۔ تم جہشید سے ملی تھیں؟" کتنی حیرت دے دیتی تھی ان کے لہجے میں۔ زارا نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"ک۔ کہاں۔ کہاں ہے وہ؟" ماما کی آواز کسی سرگوشی سے زیادہ نہ تھی۔ مگر کتنی تڑپ تھی ان کے لہجے میں۔ زارا کا دل چاہا۔ وہ خاموش رہے۔ کبھی نہ بتائے۔

اک تسلی تھی۔ وہ جہاں بھی ہے زندہ ہے۔ اک امید اک آس تھی۔ وہ کبھی تو آئے گا۔

"تم بولتی کیوں نہیں ہو زارا! وہ ٹھیک تو ہے نا۔"  
 کیسی بے بسی اور تڑپ تھی اس ایک جملے میں۔ وہ سامنے ہوں تو وہ انہیں بانسوں میں بھینچ لیں۔ پریشانی پر بوسہ دیں۔ وہ ان کا ماں جایا، ان کا مان اکلوتا چھوٹا بھائی۔

کیسے کہوں جس کی سلامتی کی دعائیں آپ چھپ چھپ کر کیا کرتی تھیں۔ منوں مٹی تلے جاسویا۔ اس کا دل پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا اور آنکھیں گم صم تھیں۔

آنکھیں ایک قاتل کو دیکھتی تھیں اور دل ماں کی تڑپ اس کے یقین کو۔

"زارا! وہ تڑپ تڑپ کر پکا رہی تھیں۔"  
 "وہ اب اس دنیا میں نہیں رہے۔"

ایک دم سے ساری کائنات پر خاموشی چھا گئی

تھی۔ ہر آواز ساکن اور ہر نظر ٹھہری ہوئی بے یقین۔ ہر شے حیران اور منجمد اور وہ آنکھیں اس میں جاگی آنکھیں چپ خالی بے جان کوئی ایک منظر بھی نہ تھا ان آنکھوں میں۔ زارا کو ایسی چپ آنکھوں سے خوف آنے لگا۔ اس ٹوٹی۔ دن رات جی گئی امید کی تسبیح دانہ دانہ بکھری۔ تو وہ آنکھیں خود بخود تھک کر بند ہو گئیں۔ زارا نے انہیں لہرا کر گرتے دیکھا۔

"ماما! ماما! وہ بے ہوش ہو چکی تھیں۔"  
 "فاطمہ! امجد! اس نے ایک تواتر سے ملازموں کو آوازیں دیں۔ آنا فانا سب ہی اکٹھے ہو گئے۔  
 "کیا ہوا بیگم صاحبہ کو؟"

"بے ہوش ہو گئی ہیں۔ تم پانی لاؤ۔" اس نے ماما کا سراپنی گود میں رکھا۔ امجد فوراً ہی پانی لے آیا۔ اس نے پانی کے چھینٹے منہ پر مارے۔ مگر انہیں ہوش نہیں آ رہا تھا۔

"ڈاکٹر کو فون کروں؟" کسی ملازم نے پوچھا۔  
 "فوراً۔" وہ ہراساں ہوئی جا رہی تھی۔ ساتھ ہی اس نے نیچے گرا بیگ اٹھا کر قالین پر الٹ دیا۔ ملازم نے ان کے قیمتی ڈاکٹر کا نمبر ملایا تھا۔

"بس جی! آپ جلدی آجائیں۔ انہیں ہوش نہیں آ رہا۔" وہ کہہ رہا تھا۔ اس نے موبائل سے پاپا کا نمبر ملایا۔

"پاپا! ماما بے ہوش ہیں اور انہیں ہوش نہیں آ رہا۔ پلیز آپ جلدی گھر آجائیں۔" وہ چھوٹے ہی بولی تھی۔

"ڈاکٹر کو فون کیا ہے؟" وہ پریشانی سے پوچھ رہے تھے۔

"ڈاکٹر سٹشی کو فون کیا ہے پاپا! وہ آرہے ہیں بس آپ گھر پہنچیں۔" فون بند کر کے وہ پھر سے ماما کی طرف متوجہ ہوئی۔ مگر وہ بے حس و حرکت تھیں۔ ڈاکٹر اور پاپا ایک ساتھ پہنچے تھے۔ ساتھ میں سلیمان بھائی بھی تھے۔ سب سے پہلے تو ماما کو بیڈ پر منتقل کیا۔

"کوئی شک لگا ہے یا کوئی گہرا صدمہ پہنچا ہے۔" انہوں نے معائنے اور ٹیسٹ منٹ کے بعد کہا تھا۔



سب کی سوالیہ نظریں زارا کی طرف اٹھیں۔  
”مجھے نہیں معلوم۔ میں جب آئی تو یہ بے ہوش تھیں۔“ وہ نظریں چرا کر بولی۔

”فاطمہ! امجد! کیا ہوا تھا؟“ پیانے ملازموں کی طرف دیکھا۔

”پتا نہیں صاب جی۔“ انہیں کچھ معلوم ہوتا تو بتاتے۔

”کوئی ملے تو نہیں آیا تھا؟“  
”نہیں جی! کوئی بھی نہیں۔“ فاطمہ نے جواب دیا۔

”کوئی فون وغیرہ۔“  
”نہیں سر جی۔ میں نے جب آخری بار دیکھا تو وہ بیس صوفے پر بیٹھی رسالہ پڑھ رہی تھیں۔ پھر پریشان ہو کر کھینے لگیں۔ زارا نے بہت دیر کر دی۔

میں اس کی سہیلی کے گھر فون کرتی ہوں۔“ امجد نے جلدی جلدی بتایا۔

”تم کہاں تھیں زارا؟“ سلیمان بھائی نے پوچھا تو وہ گڑبڑائی۔

”وہ۔۔۔ میں۔۔۔“  
”اتنی پریشانی کی بات نہیں ہے۔ ٹھیک ہو جائیں گی۔“ ڈاکٹر شمس بروقت بول اٹھے۔ پھر پیانے سے پوچھنے لگے۔

”کیا تم بہت زیادہ مصروف رہتے ہو آج کل؟“  
”مصروف تو میں ہمیشہ سے ہی ہوں۔“ انہوں نے فکر سے ماما کے سفید پڑتے چہرے کو دیکھا۔

”پھر بھی خیال رکھا کرو۔“ وہ کھڑے ہو گئے۔  
”یہ ہوش میں تو آجائیں گی۔“ سلیمان نے پوچھا۔

”یا پھر اسپتال لے جائیں۔“  
”اس کی ضرورت نہیں رہے گی۔ بھابھی انشاء اللہ جلد ہی ہوش میں آجائیں گی۔ اگر کوئی پرابلم ہوئی تو

مجھے فون کرنا۔“ وہ مطمئن لہجے میں کہہ کر اٹھ گئے۔  
”میں آپ کو باہر تک چھوڑ دیتا ہوں۔“ سلیمان

بھائی ڈاکٹر شمس کے ساتھ باہر نکل گئے۔ تب پیانے ماما کے چہرے سے نظریں ہٹا کر زارا کو دیکھا۔

”کیا بات ہے زارا! تمہاری ماما کو کیا ہوا ہے؟“  
ان کا لہجہ سنجیدہ و پریقین تھا گویا وجہ صرف زارا ہی جانتی ہے اور زارا نے سوچا تھا۔ اب چھپانے کا کیا

فائدہ جانے والا تو اپنی ساری دشمنیاں اپنے ساتھ ہی لے گیا۔

”پیا! ماموں کی ڈیوٹی ہو گئی ہے۔“ اس نے آہستگی سے بتایا۔

”ماموں۔“ ایک پل کو پیانے کے ذہن سے یہ رشتہ ہی نکل گیا۔ دوسرے پل وہ چونک کر بولے۔

”یو مین، ہمیشہ حیات۔۔۔“  
زارا نے اثبات میں سر ہلایا۔

”آئی سی۔۔۔“ انہوں نے ماما کے چہرے پر نگاہ ڈالی۔ شوہر تھے، جانتے تھے وہ اپنے بھائی سے کتنی محبت کرتی تھیں۔

”آئمر کو کیسے معلوم ہوا؟“ انہوں نے آہستگی سے پوچھا۔

”میں نے بتایا تھا۔“ زارا کی آواز ان سے بھی مدھم تھی۔ وہ بری طرح چونکے۔

”تم نے۔۔۔ تمہیں کیسے معلوم ہوا؟“ ان کی نگاہوں میں الجھن سی تیرنے لگی تھی۔

”زین العابدین ان کا بیٹا! میرا یونیورسٹی فیلو ہے۔“  
پیا ٹھٹک گئے۔ پھر انہوں نے پلٹ کر دروازے کو دیکھا۔ پھر تیزی سے مگدھم آواز میں بولے۔

”سنو زارا! یہ بات کسی اور کے سامنے نہیں کرنا۔“  
سلیمان کے سامنے تو ہرگز نہیں۔“

زارا نے حیرت سے انہیں دیکھا مگر اثبات میں سر ہلادیا تھا۔ تب ہی سلیمان بھائی آگئے۔

”آئی تمہیں سلیمان! تم چلے جاؤ۔“ زارا بھی جاری ہو گا۔ صرف ٹیبلر سب چھوڑنا ٹھیک نہیں۔ تم جا کر

انہیں اینڈ کرو۔“ پیانے کا تو وہ بیٹھے بیٹھے رک گئے۔  
”میرے خیال میں کوئی حرج نہیں۔ جب تک

انہی کو ہوش نہیں آتا۔ میں رک جاتا ہوں۔“  
”نہیں۔ یہ ٹھیک نہیں ہو گا۔ آئمر جلد ہوش میں آجائے گی۔ کوئی پریشانی والی بات نہیں تم جاؤ۔“ وہ

ہرگز نہیں چاہتے تھے کہ جب انہیں ہوش آئے تو سلیمان یہاں موجود ہو۔ سلیمان نے الجھ کر انہیں دیکھا۔ پھر کندھے اچکا کر بولے۔

”ٹھیک ہے جیسے آپ کی مرضی۔“  
ان کے جانے کے بعد پیا ٹھٹکے ٹھٹکے سے انداز میں کرسی پر گر گئے۔

”تو یہ کہانی ختم ہو گئی۔“ وہ زیر لب بڑبڑائے۔  
زارا یو سی ماما کے چہرے پر نظریں جمائے کھڑی رہی۔

”بیٹھ جاؤ بیٹا۔۔۔“ پیانے کی آواز نے اسے چونکا دیا۔  
پھر وہ آہستگی سے ماما کے پاس ہی بیٹھ گئی تھی۔

”پیا! کیا آپ بھی یہی سمجھتے ہیں کہ۔۔۔“ اس نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

”وہ ایسا شخص تھا نہیں۔ مگر حالات و واقعات۔۔۔“  
میں چاہتا تھا کہ ہر چیز واضح ہو کر سامنے آئے مگر

سلیمان۔۔۔ اس نے رپورٹ بھی درج نہیں کرائی۔“  
وہ پریشانی مسلتے ہوئے بولے۔ تب ہی ماما ہلکا سا

”ج۔۔۔ ہمیشہ۔“ ان لبوں نے ہزاروں بار یونہی بے صدا آوازیں دی تھیں۔ آج انہیں الفاظ ملے تھے۔

”ماما۔۔۔“ زارا نے ان کے گال تھپتھپائے۔  
”ہمیشہ مر گیا۔۔۔ میرا بھائی مر گیا۔“ الفاظ اب

بھی بے یقین تھے۔  
”ماما!“

انہوں نے ایک دم آنکھیں کھولیں۔ وہ کچھ لمبے خالی خالی نظروں سے چھت کو گھورتی رہیں۔ پھر

زیر لب بڑبڑائیں۔  
”خواب۔۔۔ کوئی خواب دیکھا تھا میں نے۔۔۔؟“

انہوں نے نظروں کا زاویہ بدل کر زارا کو دیکھا۔  
”نہیں۔۔۔“ ان کا سر آہستگی سے نفی میں ہلا۔ ”تم

نے بتایا تھا۔ تم نے بتایا تھا۔۔۔ وہ مر گیا۔“ انہوں نے آنکھ کی کوشش کی۔ زارا نے انہیں سارا دیا۔

تب ہی ان کی نگاہ پیا پر پڑی۔  
”تم نے سنا عمیر! وہ مر گیا۔ میرا بھائی، تمہارا

دوست، نہیں۔۔۔ دوست نہیں تمہارے بھائی کا قاتل نہیں ہو گیا۔ تم لوگوں کو موقع دیئے بغیر ہی۔۔۔“ ماما کے لہجے میں وہی وحشت تھی جو اس نے

زین کے لہجے میں محسوس کی تھی۔  
”ماما پلیز! سنبھالیں خود کو۔ وہ تو کبھی بھی ہمارے

درمیان نہیں تھے۔“ زارا نے اپنے تئیں انہیں تسلی دینا چاہی تھی مگر وہ بھڑک اٹھیں۔

”وہ تھا۔ وہ ہمیشہ سے میرے پاس تھا۔ اس نے ہمیشہ میرا کندھا تھپتھپایا ہے۔ ہمیشہ میرے آنسو صاف کیے ہیں، تسلیاں دی ہیں، وہ کبھی مجھ سے دور نہیں رہا۔ زارا عمیر! کبھی نہیں۔“ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھیں اور انہوں نے اتنی اجنبیت سے زارا کا نام لیا تھا کہ وہ تڑپ اٹھی۔ مگر وہ اب پیا کی طرف متوجہ ہوئی تھیں۔

”آپ تو خوش ہیں ناعمیر! بہت خوش۔ وہ جسے ختم کرنے کی چاہ میں ایک عمر گزری تم لوگوں کی۔ وہ

خود بخود ختم ہو گیا۔ کچھ تو انتقام کی آگ ٹھنڈی پڑی ہو گی۔ کچھ تو دل کو قرار آیا یا ابھی کسی اور کا خون بھی چلا ہے تم لوگوں کو۔۔۔؟“

”آئمر۔۔۔“ انہوں نے آگے بڑھ کر ان کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ مگر انہوں نے تیزی سے ہاتھ جھٹک دیا اور ہزبانی انداز میں پچھیں۔

”چلے جائیں یہاں سے۔ اس سلیمان کو بھی بتائیں جا کر خوشیاں منائے، مٹھائی بانٹے، چراغاں کرے کہ اس کا کام قدرت نے کر دیا۔“

پیا نے بے بسی سے پھوٹ پھوٹ کر روتی ماما کو دیکھا۔ پھر دانستہ باہر نکل گئے تھے۔ وہ انہیں سنبھالنے کی کوشش کرنے لگی۔

”ماما! تم سے کام لیں۔“  
”اس نے کچھ نہیں کیا تھا۔ وہ بے گناہ اور معصوم تھا زارا۔“

(کیا آپ بھی میرے بابا کو قاتل سمجھتی ہیں۔۔۔)  
”ماما! اس یقین دہانی کی ضرورت کہ آپ انہیں

بے قصور سمجھتی ہیں۔ مجھے نہیں زین کو ہے۔“ زارا

285



نے ان کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام کر آہستگی سے کہا۔

”زین۔۔۔؟“ انہوں نے چونک کر پوچھا۔

”زین العابدین۔۔۔“

”کہاں۔۔۔ کہاں ہے وہ۔۔۔؟“ ”مما ایک دم سیدھی ہو بیٹھیں۔“

”وہ یونیورسٹی فیلو ہے میرا۔ میں اس کے گھر گئی تھی۔ مجھے نہیں معلوم تھا ابو کا قتل ماموں نے کیا ہے یا نہیں لیکن زین کی حالت ٹھیک نہیں تھی۔ اس وقت اسے آپ کی اور آپ کو اس کی ضرورت ہے۔“ وہ کچھ سوچتے ہوئے بولی تھی۔ ”مما ٹرپ کر سیدھی ہوئیں۔“

”مجھے اس کے پاس لے چلو زارا!“ وہ اس کا ہاتھ تھام کر بلکتی لہجے میں بولی تھیں۔

”مما! اس حالت میں کیسے لے جاؤں آپ کو۔“ ”مہ۔۔۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔۔۔“ انہوں نے تیزی سے اپنے آنسو پونچھے۔

”رات بہت ہو گئی ہے۔ صبح ہی جا سکیں گے۔“ اس نے گھڑی کی طرف اشارہ کر کے رات کے گزرنے کا احساس دلایا۔ وہ بری طرح جھنجھلا گئیں۔

”تم سمجھتی نہیں ہو۔ مجھے ابھی اس کے پاس جانا ہے۔ وہ اکیلا ہے پریشان ہے۔ اس وقت اسے صرف میری ضرورت ہے زارا کہ یہ دکھ صرف میرا اور زین کا ہے۔“

”اس وقت کوئی نہیں جانے دے گا۔“ زارا نے آہستگی سے کہا۔ ”ممانے بے بسی سے اسے دیکھا پھر رو پڑیں۔“

”ہاں دیواریں تب بھی تھیں۔ دیواریں اب بھی ٹوٹ جائیں گی۔ ساری دیواریں ٹوٹ جائیں گی۔“

”مما صبح تو ہونے دیں۔ میں آپ کو خود لے کر جاؤں گی۔“ زارا نے تسلی دینی تو وہ خاموش سی ہو گئیں۔

”اچھا دیکھو۔ کسی کو بتانا نہیں کہ ہم کہاں گئے ہیں۔“

”اوکے۔ اپنا خیال رکھنا۔“ پیانے نے کہا اور پھر وہ بنا

ناشتہ کیے آفس چلے گئے تھے۔ جیسے ہی ان کی گاڑی باہر

”نہیں بتاؤں گی۔۔۔“

”یہ۔۔۔ یہ صبح کب ہوگی؟۔“ انہوں نے بے تابی سے گھڑی کی طرف دیکھا۔ پھر بند کھڑکی کو۔ ”کھڑکی کھول دو زارا!“ انہوں نے یوں کہا جیسے صبح کا رستہ اس بند کھڑکی نے روک رکھا ہوگا۔

زارا نے کچھ بھی کیے بغیر کھڑکی کھول دی تھی۔ باہر تاریک رات بہہ رہی تھی اور ممانے اس رات کو تکتے تکتے صبح کی تھی۔ کتنا جاں کسل اور لذت ناک انتظار تھا۔ جب صبح کی پہلی کرن نے کھڑکی سے جھانکا تو ممانے تالی سے بولی تھیں۔

”چلیں۔“

زارا انہیں بے بسی سے دیکھ کر رہ گئی۔ پیانے آئے تھے اور یوں لگتا تھا وہ بھی ساری رات جاگتے رہے تھے۔

”آپ سوئے نہیں پیانے۔؟“ زارا نے ان کی سرخ آنکھیں دیکھیں۔

”ساری رات وہ واقعات پھر سے دہراتا رہا۔“ ”سارے جرم تب بھی اسی کے نام نکلے ہوں گے۔“ ”مما کالج چھٹتا ہوا تھا۔“

”سارے جرم اسی کے نام نکلے ہوتے تو میں سو نہ جاتا۔“ انہوں نے آہستگی سے کہا پھر پوچھنے لگے۔

”کیسی طبیعت ہے تمہاری؟“ ”ٹھیک ہوں۔“ ”ممانے رکھائی سے کہہ کر بازو آنکھوں پر رکھ لیا۔“ ”آپ آفس جائیں۔“

”میں آج آفس نہیں جا رہا۔“ ”کیوں؟“ ”ممانے آنکھوں سے بازو ہٹایا۔“

”آج کا دن تمہارے۔۔۔“ ”مجھے ضرورت نہیں۔“ وہ اجنبیت سے بولیں۔

”پیانے کچھ کہنے کو لب کھولے مگر زارا بول اٹھی۔“ ”پیانے پلین۔“ ”مما اس وقت تیار ہونا چاہتی ہیں۔“

”میں نے ایک عمر اس کی جدائی کا دکھ تھما سہا ہے۔ اس کی موت کا دکھ اگر ہاتھوں کی تو۔۔۔“ وہ زیر لب برہماتے ہوئے خاموش ہو گئیں۔

”اوکے۔ اپنا خیال رکھنا۔“ پیانے نے کہا اور پھر وہ بنا

ناشتہ کیے آفس چلے گئے تھے۔ جیسے ہی ان کی گاڑی باہر

”نہیں بتاؤں گی۔۔۔“

”یہ۔۔۔ یہ صبح کب ہوگی؟۔“ انہوں نے بے تابی سے گھڑی کی طرف دیکھا۔ پھر بند کھڑکی کو۔ ”کھڑکی کھول دو زارا!“ انہوں نے یوں کہا جیسے صبح کا رستہ اس بند کھڑکی نے روک رکھا ہوگا۔

”نہیں بتاؤں گی۔۔۔“

”یہ۔۔۔ یہ صبح کب ہوگی؟۔“ انہوں نے بے تابی سے گھڑی کی طرف دیکھا۔ پھر بند کھڑکی کو۔ ”کھڑکی کھول دو زارا!“ انہوں نے یوں کہا جیسے صبح کا رستہ اس بند کھڑکی نے روک رکھا ہوگا۔

زارا نے کچھ بھی کیے بغیر کھڑکی کھول دی تھی۔ باہر تاریک رات بہہ رہی تھی اور ممانے اس رات کو تکتے تکتے صبح کی تھی۔ کتنا جاں کسل اور لذت ناک انتظار تھا۔ جب صبح کی پہلی کرن نے کھڑکی سے جھانکا تو ممانے تالی سے بولی تھیں۔

”چلیں۔“

زارا انہیں بے بسی سے دیکھ کر رہ گئی۔ پیانے آئے تھے اور یوں لگتا تھا وہ بھی ساری رات جاگتے رہے تھے۔

”آپ سوئے نہیں پیانے۔؟“ زارا نے ان کی سرخ آنکھیں دیکھیں۔

”ساری رات وہ واقعات پھر سے دہراتا رہا۔“ ”سارے جرم تب بھی اسی کے نام نکلے ہوں گے۔“ ”مما کالج چھٹتا ہوا تھا۔“

”سارے جرم اسی کے نام نکلے ہوتے تو میں سو نہ جاتا۔“ انہوں نے آہستگی سے کہا پھر پوچھنے لگے۔

”کیسی طبیعت ہے تمہاری؟“ ”ٹھیک ہوں۔“ ”ممانے رکھائی سے کہہ کر بازو آنکھوں پر رکھ لیا۔“ ”آپ آفس جائیں۔“

”میں آج آفس نہیں جا رہا۔“ ”کیوں؟“ ”ممانے آنکھوں سے بازو ہٹایا۔“

”آج کا دن تمہارے۔۔۔“ ”مجھے ضرورت نہیں۔“ وہ اجنبیت سے بولیں۔

”پیانے کچھ کہنے کو لب کھولے مگر زارا بول اٹھی۔“ ”پیانے پلین۔“ ”مما اس وقت تیار ہونا چاہتی ہیں۔“

”میں نے ایک عمر اس کی جدائی کا دکھ تھما سہا ہے۔ اس کی موت کا دکھ اگر ہاتھوں کی تو۔۔۔“ وہ زیر لب برہماتے ہوئے خاموش ہو گئیں۔

”اوکے۔ اپنا خیال رکھنا۔“ پیانے نے کہا اور پھر وہ بنا

ناشتہ کیے آفس چلے گئے تھے۔ جیسے ہی ان کی گاڑی باہر

”نہیں بتاؤں گی۔۔۔“

”یہ۔۔۔ یہ صبح کب ہوگی؟۔“ انہوں نے بے تابی سے گھڑی کی طرف دیکھا۔ پھر بند کھڑکی کو۔ ”کھڑکی کھول دو زارا!“ انہوں نے یوں کہا جیسے صبح کا رستہ اس بند کھڑکی نے روک رکھا ہوگا۔

”نہیں بتاؤں گی۔۔۔“

”یہ۔۔۔ یہ صبح کب ہوگی؟۔“ انہوں نے بے تابی سے گھڑی کی طرف دیکھا۔ پھر بند کھڑکی کو۔ ”کھڑکی کھول دو زارا!“ انہوں نے یوں کہا جیسے صبح کا رستہ اس بند کھڑکی نے روک رکھا ہوگا۔

زارا نے کچھ بھی کیے بغیر کھڑکی کھول دی تھی۔ باہر تاریک رات بہہ رہی تھی اور ممانے اس رات کو تکتے تکتے صبح کی تھی۔ کتنا جاں کسل اور لذت ناک انتظار تھا۔ جب صبح کی پہلی کرن نے کھڑکی سے جھانکا تو ممانے تالی سے بولی تھیں۔

”چلیں۔“

زارا انہیں بے بسی سے دیکھ کر رہ گئی۔ پیانے آئے تھے اور یوں لگتا تھا وہ بھی ساری رات جاگتے رہے تھے۔

”آپ سوئے نہیں پیانے۔؟“ زارا نے ان کی سرخ آنکھیں دیکھیں۔

”ساری رات وہ واقعات پھر سے دہراتا رہا۔“ ”سارے جرم تب بھی اسی کے نام نکلے ہوں گے۔“ ”مما کالج چھٹتا ہوا تھا۔“

”سارے جرم اسی کے نام نکلے ہوتے تو میں سو نہ جاتا۔“ انہوں نے آہستگی سے کہا پھر پوچھنے لگے۔

”کیسی طبیعت ہے تمہاری؟“ ”ٹھیک ہوں۔“ ”ممانے رکھائی سے کہہ کر بازو آنکھوں پر رکھ لیا۔“ ”آپ آفس جائیں۔“

”میں آج آفس نہیں جا رہا۔“ ”کیوں؟“ ”ممانے آنکھوں سے بازو ہٹایا۔“

”آج کا دن تمہارے۔۔۔“ ”مجھے ضرورت نہیں۔“ وہ اجنبیت سے بولیں۔

”پیانے کچھ کہنے کو لب کھولے مگر زارا بول اٹھی۔“ ”پیانے پلین۔“ ”مما اس وقت تیار ہونا چاہتی ہیں۔“

”میں نے ایک عمر اس کی جدائی کا دکھ تھما سہا ہے۔ اس کی موت کا دکھ اگر ہاتھوں کی تو۔۔۔“ وہ زیر لب برہماتے ہوئے خاموش ہو گئیں۔

”اوکے۔ اپنا خیال رکھنا۔“ پیانے نے کہا اور پھر وہ بنا

ناشتہ کیے آفس چلے گئے تھے۔ جیسے ہی ان کی گاڑی باہر

”نہیں بتاؤں گی۔۔۔“

”یہ۔۔۔ یہ صبح کب ہوگی؟۔“ انہوں نے بے تابی سے گھڑی کی طرف دیکھا۔ پھر بند کھڑکی کو۔ ”کھڑکی کھول دو زارا!“ انہوں نے یوں کہا جیسے صبح کا رستہ اس بند کھڑکی نے روک رکھا ہوگا۔

”آپ کو کس نے بتایا؟“ انہوں نے استفسار کیا۔

”جس نے بھی بتایا۔ جھوٹ نہیں بولا۔ یہ آج کا صبح ہے کہ جمشید حیات ختم ہو گیا۔“

”تو آنٹی اور زارا۔۔۔“

”سنو سلیمان! آئمہ نے ساری زندگی ہماری لگائی پابندی کو نبھایا ہے۔ وہ سمجھی اپنے بھائی سے نہیں ملی۔ لیکن آج اگر وہ اس کی قبر پر جانا چاہے تو میں روک نہیں سکتا۔“ پیانے نے قطعی لہجے میں کہا۔

”اوکے۔ خدا حافظ۔“ سلیمان نے مزید کوئی بھی بات کیے بغیر فون بند کر دیا۔ کچھ لمحے وہ بند فون کو گھورتے رہے پھر ان کے لبوں پر ایک پراسرار سی مسکراہٹ ابھری۔

”تو کمانی ختم ہو گئی۔ بہت بزنس نکلے جمشید حیات۔ بہت بزنس لیکن اچھا ہوا خود ہی ختم ہو گئے۔ یہ کام مجھے نہیں کرنا پڑا۔“

وہ مسکرائے۔ پھر کھڑے ہو گئے۔ اپنا والٹ نکال کر انہوں نے پانچ سو کا نوٹ گھسیٹا اور امجد کے ہاتھ میں تھما دیا۔

”جاؤ عیش کرو۔“

”یہ کس لیے سرجی؟۔“ اس نے حیرت سے پانچ سو کا نوٹ دیکھا۔

”آج میں آزاد ہوں۔ مکمل آزاد۔۔۔“ عجیب سی طمانیت ان کے لہجے و انداز میں تھی۔ امجد نے انہیں جاتے دیکھا پھر نوٹ سنبھال کر جیب میں رکھ لیا تھا۔

گیت یونہی کھاتا تھا۔ وہ لوگ اندر چلی آئیں۔ گلوں میں پانی ڈالتا سلیمان انہیں حیرت سے دیکھتے ہوئے سیدھا ہو گیا۔ پھر ان کے قریب آگیا۔

”زین کہاں ہے؟۔“ ”زارا نے پوچھا۔“

”وہ تو اپنے کمرے میں ہی بند ہیں صبح سے نکلے ہی نہیں۔“ اس نے افسردگی سے بتایا۔

”اب نکلے گا۔ اس سے کہو۔ اس کی پیچھے آتی ہیں۔“ ممانے نے تالی سے کہا۔ سلیم نے خیر سے انہیں دیکھا۔

گیت یونہی کھاتا تھا۔ وہ لوگ اندر چلی آئیں۔ گلوں میں پانی ڈالتا سلیمان انہیں حیرت سے دیکھتے ہوئے سیدھا ہو گیا۔ پھر ان کے قریب آگیا۔

”زین کہاں ہے؟۔“ ”زارا نے پوچھا۔“

”وہ تو اپنے کمرے میں ہی بند ہیں صبح سے نکلے ہی نہیں۔“ اس نے افسردگی سے بتایا۔



”آپ بھائی جان کی۔۔۔“  
 ”ہاں۔ ہاں میں اس کی پچھو ہوں۔“ وہ جھنجھلا گئیں۔

”لیکن آپ پہلے تو کبھی نہیں آئیں۔؟“  
 ”اب تو آئی ہوں نا۔“ وہ ترخ کر بولیں۔ سلیم سر ہلاتے ہوئے پلٹ گیا۔  
 ”آئیں میرے ساتھ۔“

وہ انہیں لاؤنج میں بٹھا کر سامنے والا دروازہ کھٹکھٹانے لگا۔

”بھائی جان! باہر آئیں۔ دیکھیں آپ سے ملنے کون آیا ہے۔“

اندر گہری خاموشی چھائی رہی۔  
 ”بھائی جان! آپ کی پھوپھو آئی ہیں۔“ سلیم نے پھر پکارا۔ جواب نہ ارد۔ زارا نے ماما کی طرف دیکھا۔ ان کا دل ان کی آنکھوں میں دھڑک رہا تھا۔ پھر وہ بے تاب ہو کر خود دروازہ کھٹکھٹانے لگیں۔

”زین۔۔۔! دروازہ کھولو۔ پلیز دیکھو“ میں تم سے ملنے آئی ہوں۔ پچھو ہوں تمہاری۔“

”کوئی نہیں ہے میرا۔۔۔“ وہ اندر سے چلا یا۔  
 ”ایسا مت کہو۔ مت کہو یوں زین۔۔۔! میں میں ہوں نا تمہاری پچھو۔ خدا کے لیے ایک بار تو دروازہ کھول دو۔“ وہ بلک بلک کر رو دیں۔ تڑپتے ہوئے اسے پکار رہی تھیں اور وہ بے حس بنا بیٹھا تھا۔

”زین۔۔۔! زین! خدا کے لیے دروازہ کھول دو۔“ وہ بار بار پکار رہی تھیں۔

”آپ چلی جائیں یہاں سے۔ مجھے کسی سے نہیں ملنا۔ کسی سے کبھی۔۔۔“ وہ چیخ رہا تھا پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا۔ ماما بلک رہی تھیں۔ اسے پکار رہی تھیں اور درمیان میں بس ایک دروازہ حائل تھا۔ سلیم حیران تھا اور زارا پریشان۔

”میں نہیں جاؤں گی۔“ وہ روتی رہیں۔ اندر گہری خاموشی چھا گئی تھی۔ وہ تھک کر وہیں بیٹھ گئیں۔ مگر ان کا ہاتھ اب بھی تھکے تھکے انداز میں دروازے پر دھک دھک رہا تھا اور وہ خود آنکھیں بند کر کے دروازے سے

لپٹی زرب لب بڑبڑا رہی تھیں۔

”مجھے یہ دکھ تمہارے ساتھ رونا ہے۔ یہ میرا دکھ ہے اور تمہارا۔ وہ تمہارا باپ تھا اور میرا بھائی۔ بس یہاں یہی دورشتے تھے اس کے۔ مجھے اور تمہیں مل کر رونا ہے زین۔“

”بس کریں ماما! وہ نہیں کھولے گا۔“ زارا نے انہیں زبردستی دروازے سے الگ کیا۔ عین اسی لمحے دروازہ ایک جھٹکے سے کھلا۔ اگر زارا انہیں ہٹانہ چکی ہوتی تو وہ گر جاتیں۔ ماما نے تڑپ کر چہرہ اوپر اٹھایا۔ شدت گریہ سے زین کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ وہ ان کے سامنے بچوں کے بل بیٹھا۔ ماما کی بائیں پھلیں مگر وہ انہیں دیکھتا رہا۔  
 ”زین آؤ۔“

وہ نفی میں سر ہلا کر پیچھے ہٹا۔ ”آپ کہیں کہ میرے بابا قاتل نہیں تھے۔“  
 ”نہیں تھے۔ اس نے کسی کو نہیں مارا۔ وہ معصوم تھا۔ بے گناہ تھا۔“

اور وہ ان کی بانہوں میں بکھر گیا۔ بچوں کی طرح لپٹ کر ان سے رویا اور کھل کر رویا۔

”کوئی ایسا نہیں تھا جو میرے ساتھ مل کر روتا۔ میں بالکل تنہا تھا۔“ وہ بھی اس کے ساتھ روتی رہیں۔  
 ”ماما پلیز! خود کو سنبھالیں۔“ زارا نے اپنے آنسو پونچھ کر انہیں تسلی دینے کی کوشش کی۔ ”زین کو اس وقت آپ کے سہارے کی ضرورت ہے۔“

”تم تنہا کہاں ہو بیٹا! میں ہونا بد قسمت تمہارے ساتھ“ اپنے بھائی کا دکھ دیکھنے کے لیے۔ ہائے۔۔۔ میں فائقہ کو کیسے بتاؤں گی۔ ابھی تو وہ شوہر کا صدمہ نہیں سہ پائی۔“ وہ پھر سے رونے لگیں۔

”بتائیے گا ضرور بتائیے گا۔ رائے ہاؤس کے ایک ایک شخص کو بتائیے گا۔ ان کے اندھے انتقام کو کچھ تو تسکین ملے گی۔“ زارا نے زہر خند لہجے میں کہا۔ وہ اس وقت جذباتی ہو رہی تھی۔

”نام بھی مت لینا زارا۔“ ماما ایک دم خوفزدہ ہو گئیں۔



”کیوں ماما۔؟“

”نہیں پتا بھی نہیں چلنا چاہیے کہ ہم یہاں زین سے ملنے آتے ہیں۔ یا زین تمہارے ماموں کا بیٹا ہے۔“

زارا نے حیرت سے انہیں دیکھا۔

”ماموں اب نہیں رہے اور زین کا اس پورے واقعہ میں کوئی قصور نہیں۔ وہ تو بمشکل سال بھر کا تھا تب۔“

”میں نے کہہ دیا تھا۔ نام بھی نہیں لینا۔ کبھی بھول کر بھی نہیں۔“ ان کے لہجے میں سختی دور آئی۔

”کیا آپ بلاوجہ خوفزدہ نہیں ہو رہیں۔“ اسے اس بات پر یقین نہ تھا کہ وہ لوگ ایک بے قصور شخص کو سزا دیں گے۔

”تم انہیں نہیں جانتیں۔ میں جانتی ہوں۔ وہ زین کو نہیں چھوڑیں گے۔ سلیمان نے قرآن پڑھا رکھا کہ اپنے باپ کے قاتل سے بدلہ لینے کی قسم کھائی تھی۔“

”قاتل سے۔“ زارا نے یاد دہانی کرائی۔

”وہ تو انہیں ہی قاتل سمجھتے ہیں۔“

”ایک ڈیڑھ سال کے بچے کو کس طرح قاتل سمجھ سکتے ہیں وہ۔ زین کا تو کوئی قصور نہیں۔“ اس نے جرح کی۔

”تم سے کہہ دیا تھا۔ بھولے سے بھی نام نہیں لینا۔“ ماما کے لہجے میں سختی دور آئی۔

”ماما! آج کے دور میں بھی یہ دشمنیاں زمانہ جاہلیت کی طرح چنپ سکتی ہیں۔“ وہ حیران تھی۔

”کیا یہ ایک مثال کافی نہیں۔ انسان کے اندر کا وحشی حیوان تو ہر دور میں زندہ رہا ہے اور آج اس کی وحشت کی دھجکیں بھی ایک گولی کر دیتی ہیں۔“ ان کے لہجے میں کئی کئی گونے کی سختی تھی۔ تب ہی زین نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔

”میں تو جانتی ہیں کہ بابائے قتل نہیں کیا۔“ وہ گویا پھر سے یقین دہانی چاہتا تھا۔

”وہ میرا بھائی تھا۔ اس کی دیکھنا کہ وہ کتنا اچھا

ہوں میں۔ وہ کبھی کسی کو نہیں مار سکتا۔“ وہ گلوگیر لہجے میں بولیں۔ زین نے بڑے سکون ہو کر آنکھیں موند لیں۔

”بیگم صاحبہ! بھائی نے کئی دنوں سے کچھ نہیں کھایا۔“ سلیم اندر آیا۔

”ہاں۔ تم ناشتہ لگاؤ۔ میں اپنے ہاتھوں سے اپنے بیٹے کو کھلاؤں گی۔“ ماما نے پیار سے اس کی پیشانی چومی۔ کتنا اہم ہو گیا تھا وہ۔ انہوں نے تیزی سے آنسو صاف کیے۔

”یہ رشتے ناتے تو ایک دوسرے کا حوصلہ اور سہارا ہوتے ہیں نبھانے ہم انہیں کس طرح توڑ پھوڑ دیتے ہیں۔“ زارا اپنی ہی سوچوں میں گم رہی۔ ماما نے اپنے ہاتھوں سے اسے ناشتہ کروایا تھا۔ اسے کھلاتی تھیں اور خود روٹی جاتی تھیں۔

”پھر کب آئیں گی؟“ جب وہ جانے کو اٹھیں تو زین نے بے تاب ہو کر پوچھا۔

”روز آیا کروں گی۔“ ماما نے پھر سے اسے پیار کیا۔ وہ انہیں چھوڑنے دروازے تک آیا تھا۔

”زین کو اس وقت ہماری کتنی ضرورت ہے ناممما۔“ گاڑی اشارت کرتے ہوئے اس نے دروازے میں کھڑے نمازین کو دیکھا۔

”ہاں۔۔۔“ ماما کی آنکھیں پھر سے برس پڑیں۔

”کاش ہم اسے گھر لے جاسکتے۔“ زارا نے بے حد مایوسی سے کہا۔ ماما اپنی بے بسی پر روٹی رہیں۔

”اوہ نو۔“ گھر پر رضوان کو دیکھتے ہی زارا کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ حقیقت تو یہ تھی کہ وہ لوگ اس وقت کسی کا سامنا نہیں کرنا چاہتی تھیں۔ رضوان شاید انتظار کر کر کے اب واپس جانے کے ارادہ سے اٹھا تھا۔ وہیں لان میں رک گیا اور کیونکہ وہ انہیں دیکھ

چکا تھا۔ سو مجبوراً انہیں وہاں تک آنا پڑا۔

”کہاں تھیں آپ۔ میں کافی دیر سے انتظار کر رہا تھا۔“

”ہاں بس۔ خیریت تو تھی۔۔۔؟“ ماما نے پوچھا۔ وہ بری طرح چونک گیا۔ پھر بے اختیار پوچھنے لگا۔

”کیا ہوا؟۔۔۔“ اسے شاید ماما کی حالت کی خبر نہ تھی۔

شدت گریہ سے ماما کی حالت تو خستہ تھی ہی۔ خود زارا کی آنکھیں سو جی ہوئی تھیں۔ زارا نے گڑبڑا کر ماما کو دیکھا۔

”میری طبیعت خراب ہو گئی تھی۔ زارا یونہی پریشان ہو گئی۔“ انہیں بروقت بہانہ سوچا۔

”تو آپ ڈاکٹر کے پاس کیوں نہیں گئیں۔“

”تھوڑا رست کروں گی تو ٹھیک ہو جاؤں گی۔“ انہوں نے آہستگی سے کہا تو رضوان نے تھیر سے انہیں دیکھا۔ ان کی ایک ایک حرکت سے اضطراب اور بے چینی مترشح تھی۔ اس نے ایک نظر زارا پر ڈالی۔

”اوکے آپ پھر آرام کریں۔“ اس نے زیادہ کرید نہیں کی اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا چلا گیا۔



”آئی اب کیسی ہیں؟۔۔۔“ صبح ناشتے سے بھی پہلے رضوان کا ٹون آیا تھا لیکن ایک ہفتے بعد۔

”خیال آگیا آپ کو۔۔۔“ زارا نے حتمی۔

”خیال تو بہت تھا۔ پر میں نے سوچا تم کون سا ج بولو گی۔“ وہ شامی لہجے میں بولا۔

”واش ڈویو مین؟۔۔۔“ وہ شٹھٹھک گئی۔

”کیا ہوا تھا؟۔۔۔“ رضوان سہلے بھی بے خبر تھا۔

اب بھی شاید سلیمان نے اسے کسی معاملے کی خبر نہ ہونے دی تھی۔

”ماما کی طبیعت۔۔۔“

”طبیعت تو ان کی واقعی خراب تھی۔ مگر کس وجہ سے۔ کوئی نہ کوئی وجہ تو ہوگی۔“

”وجہ کیا ہوئی تھی بس یونہی۔“ وہ گڑبڑا سی گئی تھی۔

”خیر تم نہ بتانا چاہو تو میں اصرار نہیں کروں گا۔ ورنہ تم لوگوں کے چہرے بتا رہے تھے کہ کوئی حادثہ پیش آیا ہے۔“

”اگر کوئی بات ہوتی تو کیا میں آپ سے چھپاتی۔“

زارا پزل سی ہو گئی تھی۔

”اچھا چھوڑو۔ یونیورسٹی جاری ہو۔؟“ اس نے بات بدلی۔

”ہاں۔ اب تو ایگزام بھی نزدیک ہیں۔“

”بہت اچھی پوزیشن لانا۔ پھر اپنا اخبار نکالنا۔“

”ریلی رضوان!۔“ وہ خوش ہو گئی۔

”کیوں اعتبار نہیں ہے۔“ رضوان متبسم لہجے میں بولا۔

”آپ پر تو خود سے بھی زیادہ ہے۔“ زارا نے بے ساختہ کہا۔ رضوان کا قہقہہ اس سے بھی بے ساختہ تھا۔

”یہ جملہ ڈائری میں نوٹ کرنے کے قابل ہے۔“

”تو کر لیں روکا کس نے ہے۔“ وہ بے نیازی سے بولی۔

”ہم ایسے جملے ڈائری پر نہیں دل پر لکھا کرتے ہیں۔“

”آپ ایسی باتیں بھی کر لیتے ہیں۔“ وہ جھینپ گئی۔

”ہم ایسی ویسی سب باتیں کر لیتے ہیں۔ بس وقت کا انتظار ہے۔“ اس کا لہجہ معنی خیز تھا۔

”بس یا کچھ اور۔۔۔“ وہ فون رکھنے والی تھی۔

”فی الحال بس۔۔۔“

اس نے کہا تو زارا نے تیزی سے فون بند کر دیا۔

”اوہ گاڈ۔ کیا ہو گیا آج رضوان کو۔“ وہ حیرت سے مسکراتے ہوئے سوچ رہی تھی۔ پھر مسرور سی تیار ہونے چلی گئی۔

”مما ہر روز زین کے پاس جاتیں۔ گھر کی صفائی کروا تیں۔ اس کے لیے خود کھانا بنواتیں۔ ایک دن

مما کو اس کی شرٹ خود دھوتے دیکھ کر تو زارا حیرت سے پوچھ کر رہ گئی۔

”مما! ایسی محبت کا اظہار آپ نے کبھی مجھ سے تو نہیں کیا۔“

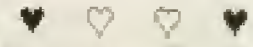
”تمہارے ماموں زندہ ہوتے تو وہ تم سے ایسی ہی محبت کا اظہار کرتے۔“







اور یہ روز کا معمول بن گیا تھا۔ ماما پہلے ہی یہاں آجاتیں۔ وہ دونوں یونیورسٹی سے آتے۔ کھانا کھاتے۔ کچھ دیر گپ شپ چلاتی۔ پھر زارا دانستہ زین سے آٹسکریم کی فرمائش کر دیتی۔ ماما گھر چلی جاتیں اور وہ زین کے ساتھ شہر کی سڑکیں ٹاپتی۔ مقصد صرف اور صرف زین کو اس بات کا احساس دلانا تھا کہ زندگی اب بھی جیسے جانے کے لائق ہے اور وہ بھی ان کی بے تحاشا محبت اور توجہ کے نتیجے میں اب نہ صرف سنبھلنے لگا تھا بلکہ زندگی کی رعنائیوں میں حصہ بھی لینے لگا تھا لیکن وہ یہ نہیں جانتی تھیں کہ وہ اپنی تمام تراخیات کے باوجود سلیمان بھائی نے اسے کتنی بار زین کے ساتھ دیکھا تھا اور پاپا ماما کے بدلے ہوئے معمولات پر کس قدر حیران تھے۔



”آج کل کہاں ہوتی ہو آئم۔؟“ پاپا کے ایک سرسری سے سوال نے جہاں ماما کو بوکھلا کر رکھ دیا۔ وہیں زارا بھی پریشان ہو گئی۔ ”کہاں ہوں گی۔ یہیں تو ہوتی ہوں۔“ ماما نے سنبھل کر قدرے لاپرواہی سے جواب دیا۔ ”جب بھی فون کرو۔ تم گھر پر ہی نہیں ہوتیں۔“ پاپا کا لہجہ اب بھی سرسری ہی تھا۔ وہ بڑی رغبت سے برائی کھا رہے تھے۔ ”آپ ہی تو کہتے ہیں کہ گھر میں رہنے کے بجائے لوگوں سے ملا جلا کروں۔“ وہ قصداً مسکرائیں۔ ”ہوں۔۔۔“ انہوں نے پانی کا گلاس منہ کو لگایا۔ ”اور تمہاری اسٹڈی کیسی جارہی ہے؟“ وہ ایک دم زارا کی طرف متوجہ ہوئے۔

”اچھی جارہی ہے۔“ زارا نے ششک کر جواب دیا۔

”کافی لیٹ آرہی ہو گھر۔ ایکسٹرا کلاسز ہو رہی ہیں۔“

”جی۔۔۔“

”ان کے اگلے سوال نے زارا کو بوکھلا دیا۔“

”جی۔۔۔“

”اچھی بات ہے۔ پاپا نے سر ہلایا۔“

اور ماما نے چونک کر زارا کو دیکھا تھا۔ پاپا اتنے مصروف تھے کہ وہ سوچ بھی نہ سکتی تھیں کہ انہیں ان کے معمولات کے بارے میں کچھ معلوم ہو سکتا تھا۔ ماما بہت ڈسٹرب سی ہو گئیں۔

”ہم کچھ بھی غلط نہیں کر رہے۔“

زارا نے خود کو مطمئن کیا اور کھانا کھانے لگی۔ پاپا بھی خاموشی سے کھانے میں مصروف ہو گئے تھے۔

زارا کا دل چاہا وہ پاپا کو زین کے بارے میں بتا دے مگر ماما کو دیکھ کر خاموش رہی۔ انہوں نے اس کے بعد ایک لقمہ بھی نہ لیا تھا۔

”تمہارے پاپا کو کیا ہوا؟“ جیسے ہی پاپا اٹھے۔

”ماما اپنی پریشانی چھپانہ سکیں۔“

”آئی ڈونٹ نو۔“ زارا نے کندھے اچکائے۔

”مجھے نہیں یاد۔ پاپا نے اس سے پہلے کبھی لیٹ آنے کے بارے میں یوں پوچھا ہو۔“

”کیس انہیں کچھ معلوم تو نہیں ہو گیا۔“ ماما بہت فکر مند تھیں۔ ”کہ ہم روز زین سے ملتے ہیں۔“

”ماما۔“ زارا نے چیخ کر انہیں دیکھا۔ ”ہم دن میں کتنے ہی لوگوں سے ملتے ہیں۔ اب کب پاپا ہر ایک کے بارے میں انکوائری کروائیں گے۔ انہوں نے یونیورسٹی پوچھ لیا ہو گا۔ ہماری رومین بھی تو ایک دم چیخ ہو گئی ہے۔“ اس نے ماما کو تسلی دینی چاہی مگر ان کی تشفی نہیں ہوئی۔

”ہم کچھ دنوں کے لیے وہاں نہیں جائیں گے۔“ انہوں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ”میں زین کو فون کر دوں گی۔“

”صحیح یونیورسٹی میں ملے گا تو میں بتا دوں گی۔ مگر ماما اب کب تک چلے گا۔ وہ میرے اور آپ کے لیے کتنا ضروری ہوتا جا رہا ہے۔ ہم کب تک چھپا پائیں گے۔“ وہ الجھ کر بولی۔

”میں نے سوچ لیا ہے۔ وہ ماسٹرز کر لے۔ تو اسے باہر بھجوا دوں گی۔“

”ماما۔“ زارا نے حیرت سے انہیں دیکھا۔

”آپ اسے خود ہی دور کر دیں گی۔“

”اتنے برس اسی کے سہارے کھڑے کیے کہ میرا بھائی جہاں بھی ہے زندہ سلامت ہے تو کیا زین کے لیے دل پر پتھر نہ رکھ سکوں گی۔“

زارا اس انہیں دیکھ کر رہ گئی اور اگلے دن جب زین نے اس کے پاس آکر پوچھا۔

”چلیں۔“

تو اس نے نفی میں گردن ہلادی۔

”آج چھپو نہیں آئیں گی۔؟“

”نہیں زین! ماما اب کچھ دنوں تک نہیں آسکیں گی۔“

”کیوں؟ طبیعت تو ٹھیک ہے ان کی۔“ وہ بے چین ہو گیا۔

”طبیعت تو ٹھیک ہے مگر۔۔۔ انہیں لگتا ہے کہ اگر وہ یونیورسٹی آتی رہیں تو پاپا کو شک ہو جائے گا اور پھر۔۔۔“

”زارا! مجھے اب کسی سے ڈر نہیں لگتا۔“ زین نے سر اٹھا کر کہا اس کا لہجہ عجیب سا تھا۔

”ماما کو تو لگتا ہے نا۔۔۔ شاید۔۔۔ شاید مجھے بھی۔“

وہ اب تک کسی نہ کسی کو تمہارے بارے میں ضرور بتا چکی ہوتی۔ ”وہ آہستگی سے بولی۔ وہ کچھ لمحے اسے دیکھتا رہا۔“

”آپ لوگوں کی محبتیں مجھے کمزور کر دیتی ہیں۔“

”کچھ دنوں کی تو بات ہے۔ ہم تو روز یونیورسٹی میں ملیں گے اور ماما بھی خود کو روک نہیں پائیں گی۔“

زارا نے تسلی دی تھی۔ اس نے اثبات میں سر ہلادیا۔

”ماما روز اسے فون کرتی تھیں مگر وہ خود کو روک نہ سکا۔ تیسرے دن وہ ان کے گھر تھا۔ ماما نے سنا تو حواس باختہ کی بھانگی ہوئی آئیں۔“

”تم یہاں۔ اور وہاں کاؤس۔“

”سوری پچھو! لیکن رہا نہیں گیا۔“ وہ اطمینان سے بولا۔ ماما اسے گھسیٹتی ہوئی اپنے بید روم میں لے گئیں۔

”کیا گل تو نہیں ہو گئے زین! جانتے ہو اگر کسی کو جھک بھی پڑ گئی۔ اوم۔۔۔ سارے ملازمین نے دیکھ لیا۔“ وہ ٹوکریا ہاتھ پاؤں ہی چھوڑ بیٹھی تھیں۔ جیسے

ابھی کہیں سے کوئی کوئی نکل آئے گی۔ ”پچھو!۔۔۔“ زین نے خاصی دلچسپی سے ان کا گھبرانا دیکھا۔ ”کیا میرے ماتھے پر لکھا ہے کہ میں رائے جمشید حیات کا بیٹا۔۔۔“

ماما نے بے اختیار اس کے منہ پر ہاتھ رکھا۔ زین نے ان کا ہاتھ ہٹایا۔ پھر رازداری سے پوچھنے لگا۔

”کیا دیواروں کے بھی کان ہیں۔“

”نہیں مذاق سوچ رہا ہے۔“ وہ گھبرا کر باہر نکلیں۔ وہ سمولت سے بیڈ پر نیم دراز کمرے کا جائزہ لینے لگا۔

”افوہ ماما! کیا ہو گیا آخر۔۔۔ ارے زین تم۔۔۔“

زین پر نظر پڑی۔ ”ارے۔۔۔ تم۔۔۔“ ماما کی نسبت اس کے رسپانس میں حیرت کے ساتھ خوشی کا عنصر بھی تھا۔

”جی۔۔۔ میں۔۔۔“ وہ سیدھا ہو بیٹھا۔

”اب۔۔۔ اب کیا ہو گا زارا!۔۔۔“ ماما نے پسینہ صاف کیا۔

”افوہ ماما! یہاں بیٹھیں۔“ اس نے ماما کو تھام کر بیڈ پر بٹھایا۔ ”ریلیکس۔ کیا ہم سے ملنے کوئی ممان نہیں آتا۔ یوں تو کسی کو معلوم ہو یا نہ ہو، مگر آپ کی حالت ضرور بتا دے گی۔“

”زین بیٹا! تم جاؤ اب۔ میں خود ملنے آؤں گی تم سے۔“ انہوں نے زین کی طرف ہلکی نگاہوں سے دیکھا۔

”ماما! وہ پہلی بار ہمارے گھر آیا ہے۔ ایسے کیسے جاسکتا ہے۔ اینڈ ڈونٹ وری ماما کچھ نہیں ہو گا۔ زین! آؤ ہم ڈرائنگ روم میں بیٹھتے ہیں۔“

وہ ماما کو تسلی دیتی۔ زین کو ڈرائنگ روم میں لے آئی۔

”رضیہ۔ رضیہ! بہت اچھی سی چائے لاؤ اور فریئر میں جو کچھ ہے سب لے آؤ۔“ اس نے ملازمہ کو آواز دے کر کہا۔

”یہ ہوئی نا بات۔۔۔“ زین نے خوش ہو کر کہا اور جب تک وہ چائے پیتا رہا۔ ماما ہولتی رہی تھیں اور



جب اس نے گھر سے قدم نکالا۔ وہ شکرانے کے نفل پڑھنے چلی گئی تھیں۔



زین نے دروازہ کھولا۔ پھر بے اختیار مسکرا دیا۔ ماما سخت غصے میں کھڑی تھیں۔

”معزز خاتون! آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے۔“ ماما نے اسے پیچھے کیا اور اندر داخل ہو گئیں۔

”اب آئی میری شامت۔“ زین نے سر جھاتے ہوئے سوچا۔ پھر دروازہ بند کر کے آیا۔ وہ کمرے کے بیچوں بیچ انتہائی غصے میں کھڑی اسے گھور رہی تھیں۔

”بچ بتاؤں پچھو! آپ اتنے غصے میں بھی بہت گریس نفل اور پیاری لگتی ہیں۔“ وہ مسکرایا۔

دوسرے معنوں میں ان کے غصے کا یوں تھوڑا کم کرنے کی کوشش کی۔ جبکہ وہ کچھ مزید چپ کر رہی تھیں۔

”یہ کل کیا حرکت کی تھی تم نے؟“ ”میں نے۔۔۔!“ زین نے حیرت سے سینے پر انگلی رکھی۔ پھر دونوں ہاتھ پھیلا کر بولا۔ ”میں نے تو کوئی حرکت نہیں کی۔ بس آپ سے ملنے آیا تھا۔“

”میرے منع کرنے کے باوجود۔۔۔“ ”کیا کرتا آپ کو دیکھنے کو دل چاہ رہا تھا۔“ وہ سر جھکا کر مصیبت سے بولا۔ انداز ایسا تھا گویا اپنی غلطی تسلیم کر رہا ہو۔ وہ ڈھیلی پڑ گئیں۔

”میری محبتوں کو مذاق سمجھتے ہو تم۔“ ”باخدا! ہرگز نہیں۔“

”تمہیں نہیں پتا زین! تم میرے لیے کیا ہو۔ حبشہ کا دوسرا جنم تمہیں اگر خراش بھی آئی تو میں مرجاؤں گی۔“ وہ دونوں ہاتھوں میں چروچھپا کر سسک اٹھیں۔ وہ گھبرا کر آگے بڑھا اور بچوں کی طرح ان سے

”انچھو! میری دیری دیری ساری۔“ لیکن ان چند دنوں میں آپ کا اتنا عاری ہو گیا ہوں کہ دونوں

”تم اور زارا میرے احساسات نہیں سمجھ سکتے۔“

”تو کبھی اس کے اندر ایک جرات مند بے خوف

سامنے پلا بڑھا ہے وہ۔ میں جانتی ہوں۔ وہ جتنا مذہب نظر آتا ہے۔ اس سے زیادہ وحشی ہے۔ کبھی زمینوں پر جا کر دیکھو۔ اپنے مزار عین کو بے جان جانور کی طرح استعمال کرتا ہے اور صلہ کچھ بھی نہیں۔“

”آپ کی محبت اپنی جگہ، مگر پچھو! یوں کب تک چلے گا۔ میں اب آپ سے دور نہیں ہو سکتا۔“

”زین۔۔۔! تم ملک سے باہر چلے جاؤ۔“ ماما نے اچانک کہا۔ زین بس دیا۔

”گویا بابا کی طرح میں بھی ساری زندگی روپوشی میں گزار دوں۔“

”تم میرے بھائی کی آخری نشانی ہو۔“ ”پچھو!۔۔۔“ وہ سنجیدہ ہو گیا۔ ”جب تک بابا زندہ

تھے مجھے نہیں معلوم تھا۔ میں کیا ہوں کیا چاہتا ہوں۔ کیا سوچتا ہوں۔ میں ساری زندگی ایک شخصے بچے کی طرح بابا کی انگلی پکڑ کر چلا ہوں۔ میں نے وہی کیا۔

جو انہوں نے چاہا لیکن اب۔۔۔ اس مرحلے پر اگر مجھ پر میری سوچیں واضح ہونی ہیں۔“

”کیا چاہتے ہو تم؟۔۔۔“ ماما نے ڈرے ڈرے لہجے میں پوچھا۔

”جینا چاہتا ہوں۔ سرائھا کر۔ اپنی مکمل شناخت کے ساتھ اور اس الزام کے بغیر کہ میں کسی قاتل کا بیٹا ہوں۔“ وہ ٹھوس لہجے میں گویا ہوا۔

”زین۔۔۔!“ ماما خوفزدہ ہو گئیں۔ ”میرے لیے زندگی آزادی ہے، شناخت ہے۔ عزت نفس ہے۔ میں ایک بار اس ڈری سہمی زندگی سے باہر نکل کر مکمل کر سانس لینا چاہتا ہوں۔ خواہ اس کے بعد ایک سانس بھی نہ ملے۔“

”زندگی بہت اہم ہے زین۔“ ”زندگی کی حقیقت موت ہے اور مجھے اس سے پہلے ڈر لگتا تھا اب نہیں۔“

زین کی شخصیت دورخی ہو گئی تھی۔ کبھی وہ ننھے

بصوم بچے کی طرح زندگی کے میلے میں کسی نہ کسی

انگلی کا متلاشی نظر آتا۔ جسے تھام کر وہ سارا سفر تمام کر

دے۔ تو کبھی اس کے اندر ایک جرات مند بے خوف

اور نڈر مرد جاگ اٹھتا۔ شاید ”بابا اور وقت“ نے اس کے ساتھ یکساں سلوک نہیں کیا تھا۔ بابا نے اسے انگلی پکڑنا سکھایا تھا اور وقت کتنا تھا زندگی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جیو۔ زین نے ماما کو دیکھا اور

مسکرایا۔

”آپ پریشان ہو گئی ہیں پچھو۔۔۔؟“ ”تم کیا کرنے والے ہو زین۔۔۔؟“ ماما نے ڈری

سہمی آواز میں پوچھا۔

”رائے سلیمان کے سامنے جا کر کہوں گا۔ میں رائے حبشہ کا وارث ہوں۔“

”مما کا دل اندر کیسے ڈوب گیا۔ زین ان کی کیفیت دیکھ کر ہنس دیا۔ پھر ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر نسلی آمیز لہجے میں بولا۔

”ایسا کچھ نہیں کرنے والا میں۔۔۔۔۔“ ”مگر اس کی آنکھوں میں ابھرتی چمک بتا رہی تھی۔ وہ جو کچھ کرنے والا ہے اس سے کم بھی نہیں۔“

”بی بی! کھانا لاؤں آپ کے لیے۔“ ملازمہ نے آکر پوچھا۔ وہ ابھی ابھی یونیورسٹی سے لوٹی تھی۔

”مما گھر پر ہیں؟۔۔۔“ زارا نے بالوں سے بینڈ کھینچا۔

”ہاں جی۔۔۔۔۔“ ”کھانا کھا لیا انہوں نے؟۔۔۔“ اس نے سینڈل اتارتے ہوئے پوچھا۔

”کہاں باجی! صبح آپ کے جانے کے بعد کہیں گئی تھیں۔ تھوڑی دیر کے بعد واپس آئیں تو بہت پریشان تھیں۔ تب سے کمرے میں بند ہیں۔ کھانا تو

ایک طرف انہوں نے تو ناشتہ بھی نہیں کیا تھا۔“ ملازمہ نے بتایا۔ تو وہ چونک گئی۔ اتنی صبح وہ کہاں جا سکتی ہیں۔ زارا جانچتی تھی مگر وہ پریشان کیوں ہیں؟

”تم کھانا لگاؤ۔ میں دیکھتی ہوں۔“ وہ جو تاپسن کر ماما کے کمرے کی طرف آئی۔ دروازہ بند تھا۔

”مما!۔۔۔“ اس نے ناک کر کے ساتھ ہی پکارا۔

”کیا ہوا ماما۔۔۔؟“ وہ اندر داخل ہوئی۔ ماما پلٹ کر

”زین آیا تھا آج؟۔۔۔۔۔“ ”ہاں۔۔۔۔۔“ زارا ان کے قریب گئی۔ ”آپ صبح اس کی طرف گئی تھیں۔ خیریت تھی یا کل کا غصہ نکالنے گئی تھیں۔“ وہ مسکرائی۔

”زین نے کوئی بات نہیں کی تم سے۔۔۔۔۔“ انہوں نے بینڈ کی بیک سے سر نکالیا۔

”آپ کے آنے کے متعلق تو کوئی بات نہیں کی۔“ ”کچھ اور نہیں کہا؟۔۔۔۔۔“ وہ نچلے کیا پوچھنا چاہ رہی تھیں۔ زارا نے الجھ کر انہیں دیکھا۔

”اور کیا کہتا۔۔۔۔۔“ ”بس روٹین کی باتیں ہوتی رہیں۔“ ”وہ کچھ کر بیٹھے گا زارا۔۔۔!“ ”مما نے کچھ کر بیٹھے گا زارا۔۔۔!“ ”مما نے ایک دم سیدھا ہو کر اس کے ہاتھ تھام کر بے حد پریشانی سے کہا۔

”کیا؟۔۔۔۔۔“ زارا نے حیرت سے انہیں دیکھا۔

”وہ کہتا ہے میں سلیمان کے سامنے جا کر اسے بتاؤں گا کہ میں رائے حبشہ کا بیٹا ہوں۔“

”مما!۔۔۔“ زارا ہنس دی۔ ”مذاق کیا ہو گا اس نے۔ وہ پاگل تو نہیں ہے کہ خود بھیڑیے کی کچھار میں گھس جائے۔“

”وہ ایسا کر سکتا ہے زارا۔۔۔۔۔“ ”اس میں اتنی جرات ہی نہیں ہے ماما! وہ تو کسی کے مشورے کے بغیر قدم بھی نہیں اٹھا سکتا۔“ زارا کو

زین سے اس جرات کی امتیاز ہی نہیں تھی۔

”میں نے آج اس کی آنکھوں میں ایک خاص چمک دیکھی ہے۔ بالکل وہی چمک جو اپنے باپ کے قاتل کا تذکرہ کرتے ہوئے سلیمان کی آنکھوں میں ابھرتی ہے۔“ ماما نے جھرجھری لی اور وہ ماما کے خوفزدہ لہجے سے خائف سی ہوئی تھی۔ تب ہی کچھ لمحے بول ہی نہ سکی۔ پھر گہری سنجیدگی سے پوچھنے لگی۔

”کیا واقعی زین ایسا کر سکتا ہے۔۔۔۔۔“

”کیا ہوا ماما۔۔۔؟“ وہ اندر داخل ہوئی۔ ماما پلٹ کر

”زین آیا تھا آج؟۔۔۔۔۔“ ”ہاں۔۔۔۔۔“ زارا ان کے قریب گئی۔ ”آپ صبح اس کی طرف گئی تھیں۔ خیریت تھی یا کل کا غصہ نکالنے گئی تھیں۔“ وہ مسکرائی۔

”زین نے کوئی بات نہیں کی تم سے۔۔۔۔۔“ انہوں نے بینڈ کی بیک سے سر نکالیا۔

”آپ کے آنے کے متعلق تو کوئی بات نہیں کی۔“ ”کچھ اور نہیں کہا؟۔۔۔۔۔“ وہ نچلے کیا پوچھنا چاہ رہی تھیں۔ زارا نے الجھ کر انہیں دیکھا۔

”اور کیا کہتا۔۔۔۔۔“ ”بس روٹین کی باتیں ہوتی رہیں۔“ ”وہ کچھ کر بیٹھے گا زارا۔۔۔!“ ”مما نے کچھ کر بیٹھے گا زارا۔۔۔!“ ”مما نے ایک دم سیدھا ہو کر اس کے ہاتھ تھام کر بے حد پریشانی سے کہا۔

”کیا؟۔۔۔۔۔“ زارا نے حیرت سے انہیں دیکھا۔

”وہ کہتا ہے میں سلیمان کے سامنے جا کر اسے بتاؤں گا کہ میں رائے حبشہ کا بیٹا ہوں۔“

”مما!۔۔۔“ زارا ہنس دی۔ ”مذاق کیا ہو گا اس نے۔ وہ پاگل تو نہیں ہے کہ خود بھیڑیے کی کچھار میں گھس جائے۔“

”وہ ایسا کر سکتا ہے زارا۔۔۔۔۔“

”کیا ہوا ماما۔۔۔؟“ وہ اندر داخل ہوئی۔ ماما پلٹ کر

”زین آیا تھا آج؟۔۔۔۔۔“ ”ہاں۔۔۔۔۔“ زارا ان کے قریب گئی۔ ”آپ صبح اس کی طرف گئی تھیں۔ خیریت تھی یا کل کا غصہ نکالنے گئی تھیں۔“ وہ مسکرائی۔

”زین نے کوئی بات نہیں کی تم سے۔۔۔۔۔“ انہوں نے بینڈ کی بیک سے سر نکالیا۔

”آپ کے آنے کے متعلق تو کوئی بات نہیں کی۔“ ”کچھ اور نہیں کہا؟۔۔۔۔۔“ وہ نچلے کیا پوچھنا چاہ رہی تھیں۔ زارا نے الجھ کر انہیں دیکھا۔

”اور کیا کہتا۔۔۔۔۔“ ”بس روٹین کی باتیں ہوتی رہیں۔“ ”وہ کچھ کر بیٹھے گا زارا۔۔۔!“ ”مما نے ایک دم سیدھا ہو کر اس کے ہاتھ تھام کر بے حد پریشانی سے کہا۔

”کیا؟۔۔۔۔۔“ زارا نے حیرت سے انہیں دیکھا۔

”وہ کہتا ہے میں سلیمان کے سامنے جا کر اسے بتاؤں گا کہ میں رائے حبشہ کا بیٹا ہوں۔“

”مما!۔۔۔“ زارا ہنس دی۔ ”مذاق کیا ہو گا اس نے۔ وہ پاگل تو نہیں ہے کہ خود بھیڑیے کی کچھار میں گھس جائے۔“

”وہ ایسا کر سکتا ہے زارا۔۔۔۔۔“

”اس میں اتنی جرات ہی نہیں ہے ماما! وہ تو کسی کے مشورے کے بغیر قدم بھی نہیں اٹھا سکتا۔“ زارا کو

زین سے اس جرات کی امتیاز ہی نہیں تھی۔

”میں نے آج اس کی آنکھوں میں ایک خاص چمک دیکھی ہے۔ بالکل وہی چمک جو اپنے باپ کے قاتل کا تذکرہ کرتے ہوئے سلیمان کی آنکھوں میں ابھرتی ہے۔“ ماما نے جھرجھری لی اور وہ ماما کے خوفزدہ لہجے سے خائف سی ہوئی تھی۔ تب ہی کچھ لمحے بول ہی نہ سکی۔ پھر گہری سنجیدگی سے پوچھنے لگی۔

”کیا واقعی زین ایسا کر سکتا ہے۔۔۔۔۔“

”کیا ہوا ماما۔۔۔؟“ وہ اندر داخل ہوئی۔ ماما پلٹ کر

”زین آیا تھا آج؟۔۔۔۔۔“ ”ہاں۔۔۔۔۔“ زارا ان کے قریب گئی۔ ”آپ صبح اس کی طرف گئی تھیں۔ خیریت تھی یا کل کا غصہ نکالنے گئی تھیں۔“ وہ مسکرائی۔

”زین نے کوئی بات نہیں کی تم سے۔۔۔۔۔“ انہوں نے بینڈ کی بیک سے سر نکالیا۔

”آپ کے آنے کے متعلق تو کوئی بات نہیں کی۔“ ”کچھ اور نہیں کہا؟۔۔۔۔۔“ وہ نچلے کیا پوچھنا چاہ رہی تھیں۔ زارا نے الجھ کر انہیں دیکھا۔



”اگر اس نے ایسا کیا تو۔۔۔!“ ماما کی آواز ایک دُری سہمی سرگوشی میں بدل گئی۔ ”تو وہ اسے نہیں چھوڑیں گے۔“

”ماما! پلیز! ایسا کچھ نہیں ہو گا۔“ اس نے گویا خود کو تسلی دی۔

”ایسا ہی ہو گا زارا۔۔۔ ایسا ہی ہو گا۔ مجھے آثار نظر آرہے ہیں۔ زین کے اندر ہی اندر ایک لاوا ایک رہا ہے اور یہ لاوا کسی دن ہمہ نکلے گا اور کون اس کی پلیٹ میں آئے گا۔۔۔“ وہ جیسے سوچ کر ہی کانپ گئیں۔

”ماما! پلیز ایسی باتیں مت کریں۔“ زارا دُری گئی۔ ”زین ایک سمجھ دار لڑکا ہے۔ وہ کبھی بھی ایسا قدم نہیں اٹھائے گا۔“

”ایسا قدم جنون میں اٹھایا جاتا ہے اور جنون میں انسان وہ کچھ کر لیتا ہے جس کی اجازت عام طور پر انسان کی سمجھ نہیں دیتی۔“

”ماما! وہ آپ کی بات سے انکار نہیں کر سکتا۔ میں اور آپ اسے سمجھالیں گی۔“

”ہاں زارا! اسے سمجھاؤ۔ وہ امریکہ چلا جائے۔ وہیں سیٹل ہو جائے۔ یہاں رہا تو کچھ نہ کچھ ہو جائے گا۔“ وہ بے تابی سے بولیں۔

”میں صبح ہی اس سے بات کروں گی۔“ زارا نے تسلی دی۔

”بات نہیں کرنی اسے فورس کرنا ہے۔“

”ہم اسے منالیں گے۔ لیکن اس طرح۔۔۔ آپ نے صبح سے کچھ نہیں کھایا۔“

”دل نہیں چاہتا زارا! ہم کھائیں۔۔۔“ وہ بے زاری سے بولیں۔

”آپ کے بغیر نہیں کھاؤں گی۔“ زارا نے قطعی لہجے میں کہا۔ تو ماما مجبوراً صرف اسی کی خاطر ٹیبل تک نہیں گئیں۔ لیکن برائے نام ہی کھائیں۔

”آپ آپ فریش ہو کر بہت اچھی سی ڈرینک پئیں۔“ زارا نے یقیناً پوچھیں۔ ”آپ کی کوئی فریڈنگ آئی تو پہچاننے سے انکار کر دیں گی۔“ اس نے ہلکے ہلکے لہجے میں کہا تو انہوں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

حقیقت تو یہ تھی کہ زین نے ان دونوں کو ایک دوسرے کے بہت قریب کر دیا تھا۔ پیار تو ماما پہلے بھی اس سے بہت کرتی تھیں۔ مگر یوں اس کے سامنے اپنے دل کی بات نہیں کرتی تھیں۔ زارا کو اچھا لگتا۔ ماما اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ تو وہ فون لے کر صوفے پر آ بیٹھی۔ وہ زین سے بات کرنا چاہتی تھی۔ مگر کئی بار ٹرائی کرنے کے بعد بھی اس نے فون ریسیور نہیں کیا۔

”کمال ہے ابھی تک پہنچا نہیں۔“ فون بند کرتے ہوئے زارا نے سوچا۔ لاشعوری طور پر وہ پریشان ہو گئی تھی۔ شاید ماما کی باتوں کا اثر تھا۔

”اب تک تو اس کو گھر پہنچ جانا چاہیے تھا۔“ اس نے وال کھاک پر نگاہ دوڑائی۔ ٹھیک چندرہ منٹ کے بعد وہ پھر کال کر رہی تھی۔ دوسری ٹیکل پر ہی ریسیور اٹھالیا گیا۔

”زین! کہاں تھے؟۔۔۔“ اس کی آواز سنتے ہی وہ پوچھنے لگی۔

”ابھی تک تو زندہ سلامت اسی کڑا ارض پر موجود ہوں۔“ اس کی چمکتی ہوئی فریش آواز آئی۔

”میں کب سے ٹرائی کر رہی تھی۔“

”میں نہا رہا تھا اور ابھی مجھے کھانا بھی کھانا ہے۔“

”تم نے ابھی تک کھانا نہیں کھایا۔ فوراً نکالو کھانا۔“ اس نے حکمانہ لہجے میں کہا۔

”مجبوری ہے فون کا ٹارگٹن تک نہیں جاتا۔“

”میں بند کر رہی ہوں۔۔۔“

”لیکن آپ نے فون کیا کیوں؟۔۔۔“

”یونہی بس۔ تمہاری آواز سننا تھی۔“ وہ اس سے بات کرنا چاہتی تھی مگر اب ارادہ بدل گئی۔

”میری آواز اتنی خوبصورت ہے۔ آج سے قبل کسی نے نہیں سنا۔“ وہ خوش ہو کر بولا۔

”اتنی بھی نہیں ہے۔ اب تم کھانا کھاؤ۔“

”کیسے کھانے کو دل نہیں چاہتا۔“ اس نے مجبوری بتائی۔

”میں کھانا کھا چکی ہوں۔“ وہ اس کا مطلب سمجھ گئی تھی۔

”اوہ۔ تب تو مجبوری ہے۔۔۔“ اس نے سر دھو بھری تو زارا نے ہائے کہہ کر فون بند کر دیا۔ حالانکہ اس کا دل چاہ رہا تھا وہ جائے اور پسا نوالہ اسے اپنے ہاتھوں سے بنا کر کھائے۔ مگر وہ ضبط کر گئی۔

♥ ♥ ♥ ♥

”میں جب تک آپ سے ملا نہیں تھا۔ مجھے احساس ہی نہیں تھا کہ یہ رشتے اتنے اہم ہوتے ہیں۔ بابا بہت ذکر کرتے تھے پھپھو کا۔ آپ کا۔ لیکن میرا بھی دل نہیں چاہا۔ میں آپ لوگوں سے ملوں۔ میں نے سوچا تھا ابھی سربراہ یونہی چلتے چلتے وقت آپ لوگوں کو میرے سامنے لے بھی آیا تو میں اجنبی بن جاؤں گا۔“

زارا نے آتی جاتی لہروں سے نظریں ہٹا کر زین کو دیکھا۔ وہ اپنی ہی دھن میں کہہ رہا تھا۔

”مجھے آپ لوگوں پر غصہ آتا تھا۔ جنہوں نے بابا کو اتنا تنہا کر دیا۔ میرے لیے تو ہر رشتہ بابا کی ذات میں ختم تھا۔ وہی سب کچھ تھے۔ باقی ہر رشتہ بے معنی۔ لیکن اب۔۔۔“ وہ بات اوھوری چھوڑ کر نجانے کیا سوچنے لگا۔

”اب؟۔۔۔“ زارا کی سوالیہ نظریں اس کی طرف اٹھیں۔

”اب تو سارا منظر ہی بدل گیا ہے۔ بابا نہیں رہے۔ یہ گھر جو میرے لیے کسی جنت سے کم نہ تھا۔ اب کات کھانے کو دوڑتا ہے۔ مجھے وحشت ہوتی ہے یہاں آنے سے اور آپ۔۔۔“ اس نے ذرا کی ذرا نظروں کا زاویہ بدل کر زارا کو دیکھا۔ جو اڑتے دوپٹے کو سنبھالتے ہوئے اسی کو دیکھ رہی تھی۔

”اب مجھے افسوس ہوتا ہے۔ ہم لوگ پہلے کیوں نہ ملے۔“

”مل تو گئے۔۔۔“ زارا مسکرائی۔ ”درد نہ زندگی بھر انجان رہتے۔“

”فائدہ۔ اس خوف میں لپٹے ہوئے رشتے اور تعلق کو کب تک نہا سکیں گے۔“

”زین!۔“ زارا نے سنجیدہ نظروں سے اسے دیکھا۔ ”کیا یہ کافی نہیں کہ ہم لوگ ایک دوسرے کو

دیکھ سکتے ہیں۔ ایک دوسرے کے ساتھ اپنی پراہلرز شیئر کر سکتے ہیں دیکھ بانٹ سکتے ہیں۔“

”مجبوری چھپے۔ ڈر ڈر کے۔“ زین کے لہجے میں تنہائی در آئی۔ ”میں کسی کو یہ نہیں بتا سکتا کہ آپ کون ہیں۔ کیوں ملنے آتی ہیں مجھ سے۔ میں پھپھو سے ان کے گھر ملنے نہیں جاسکتا۔ وہ مجھ سے ملنے آتی ہیں تو چوری چھپے۔ جیسے کوئی گناہ کوئی جرم کیا جا رہا ہو۔“

”زین! سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تم اچھے وقت کا انتظار تو کرو۔“ زارا نے رسائیت سے کہا تو ایک استغرائیہ مسکراہٹ زین کے لبوں پر بکھر گئی۔

”اچھے وقت کا انتظار تو بابا نے بھی کیا تھا۔ کیا صلہ ملا۔ نہیں۔ میرا گزارا اب کم میں نہیں ہوتا۔ یہ احساس تو اب جاگ اٹھی ہے۔ میرا دل چاہتا ہے میں کھلے عام اپنی پھپھو کے گھر آؤں۔ ان سے لاڈ اٹھواؤں۔ ساری دنیا کو چیخ چیخ کر بتاؤں کہ میں تنہا نہیں ہوں۔ یہ مسز آئمہ عمید میری پھپھو ہیں۔ یہ زارا عمید۔۔۔“

”زین! پلیز۔“ زارا نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو وہ لب بھینچ کر رہ گیا۔

”یہ سب کچھ ہم تمہارے لیے ہی تو کر رہے ہیں۔“ وہ بے چارگی سے بولی۔ ”ایسی ہی کوئی آگ ہمارے اندر بھی تو جل رہی ہے۔ کیا ماما کا دل چاہتا ہے کہ وہ اپنے اکلوتے بھائی کی اولاد کو یوں تنہائیوں کے سپرد کریں مگر ہم کیا کریں ہم ڈرے ہوئے خوفزدہ لوگ ہیں۔“

”کس بات کا خوف ہے آپ کو۔ میری زندگی چھن جانے کا۔ ارے ایک بار تو سراٹھا کر بیٹھیں دیں۔ یہ زندگی تو ہر صورت بھی نہ کبھی ختم ہونی ہی ہے۔“ وہ چڑ کر بولا تھا۔ زارا نے بے حد خفگی سے اسے دیکھا۔

”تمہیں ہمارے احساسات کی ذرا بھی پروا نہیں۔ تمہاری ان ہی باتوں نے ماما کو بڑا شرب کر دیا ہے۔“ وہ سر جھٹک کر اپنی پیشانی مسکے لگا۔

”تم تھوڑا انتظار تو کرو زین! کوئی نہ کوئی رستہ نکل ہی آئے گا۔“ روشنی کی کوئی کرن اس کے پاس نہیں

98



تھی مگر وہ بھر بھی پرامید تھی۔  
 ”رستہ تو اب میں نکالوں گا۔“ وہ زیر لب بڑبڑایا۔  
 ”کیا کہہ رہے ہو؟۔۔۔۔۔“  
 ”مجھے بابا کو بے گناہ ثابت کرنا ہے۔“ وہ مصمم  
 ارادے سے بولا۔  
 ”کیا کرو گے تم۔۔۔۔۔!“ زار نے قدرے حیران ہو کر  
 اسے دیکھا۔

”ثبوت۔۔۔ ثبوت اکٹھے کروں گا۔“  
 ”زین! اتنے برسوں کے بعد۔۔۔۔۔“  
 ”ہاں اتنے برسوں کے بعد۔ سچ کبھی نہیں چھپتا  
 اسے کبھی نہ کبھی عیاں ہونا ہی ہوتا ہے اور میں اسے  
 منظر عام پر لا کر ہی رہوں گا۔“ زین کی آنکھوں میں  
 ایک خاص چمک ابھری۔  
 (میں نے آج اس کی آنکھوں میں ایک خاص  
 چمک دیکھی ہے بالکل وہی چمک جو اپنے باپ کے  
 قاتل کا تذکرہ کرتے ہوئے سلیمان کی آنکھوں میں  
 ابھرتی ہے)

زار بالکل ان ہی کی طرح خوفزدہ ہوئی۔  
 ”تم کیا سوچ رہے ہو۔۔۔۔۔؟“  
 زین نے اچھ کر اسے دیکھا۔ پھر تھکے ہوئے لہجے  
 میں بولا۔  
 ”پتا نہیں۔ مجھے کچھ بھائی نہیں دیتا۔ چار سو  
 اندھیرا ہے۔ بہت گمراہ اندھیرا۔“  
 ”زین پلیز! تم ہمیں بتائے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھاؤ  
 گے۔“

زین نے اثبات میں سر ہلادیا۔  
 ”ایک وعدہ آپ کو بھی کرنا ہو گا؟۔۔۔۔۔“ زین نے  
 کہا تو وہ چونک گئی۔  
 ”کیسا وعدہ؟۔۔۔۔۔“  
 ”آپ مجھے روکیں گی نہیں۔۔۔۔۔“  
 زار نے کچھ لمحے سوچا۔ پھر آئی میں سر ہلادیا۔  
 ”میں ایسا وعدہ نہیں کر سکتی۔“  
 زین کی نگاہوں میں غفلت سی اتر آئی۔ وہ کھڑا ہو گیا۔  
 ”آئیے۔ آپ کو گھر چھوڑ آؤں۔ کسی نے دیکھ لیا  
 ”میں جانتی ہوں۔ میں نے اس دن ذرا سی بات کی

تھی۔ اس نے یوں انور کیا جیسے میں نے کچھ کہا ہی  
 نہیں۔“ وہ مایوسی سے گویا ہو گیا۔  
 ”مما! ہم اسے روک نہیں سکیں گے۔“ زار نے  
 آہستگی سے کہا تو وہ خاموش سی ہو گئیں۔  
 ”مجھے اسے روکنا ہے ہر صورت میں۔۔۔۔۔“  
 ”سچ پوچھیں تو میری ہمت نہیں ہوئی اس سے یہ  
 کہنے کی۔ وہ بگڑ جاتا۔“

”ہاں۔۔۔۔۔“ ممانے گھڑی پر نگاہ دوڑائی۔ ”تم اٹھو  
 تیار ہو جاؤ۔ رضوان آتا ہی ہو گا۔“  
 ”اوکے۔“ ممانے بات بدلی تو وہ بھی خاموشی سے  
 اٹھ گئی۔ ابھی تیار ہو رہی تھی جب رضوان کے آنے  
 کی اطلاع ملی۔ وہ لپ اسٹک کو آخری ریج دے کر  
 ڈرائنگ روم میں آگئی۔

”سیلو۔۔۔۔۔“  
 ”رضوان نے ایک بھر پور نگاہ اس کے  
 سر پہ میں ڈالی۔ رائل بلیو کمر کے ڈریس کے ساتھ  
 سلور نازک سی جیولری میں وہ ہمیشہ سے زیادہ منفرد اور  
 خوبصورت لگ رہی تھی۔  
 ”چلیں۔۔۔۔۔“ زار نے اثبات میں سر ہلادیا۔ تو وہ ممانے  
 کو خدا حافظ کہہ کر اسے ساتھ لیے باہر نکلنے لگا کہ  
 فون کی بیل گونج اٹھی۔

”سیلو۔۔۔۔۔“ وہ ایک دم کسی کا نام لیتے لیتے  
 خاموشی ہوئی تھیں۔ زارا مضمک کر ممانے کو دیکھنے  
 لگی۔

دوسری طرف زین تھا۔  
 ”کیسی ہیں پچھو آپ؟۔۔۔۔۔“  
 ”میں بالکل ٹھیک ہوں۔“ انہوں نے چور نظروں  
 سے رضوان کو دیکھا۔ پھر اس کی طرف سے بالکل  
 اشعوری طور پر رخ بدل لیا۔  
 ”زارا کہاں ہے؟۔۔۔۔۔“  
 ”زارا۔۔۔۔۔“ وہ تذبذب کا شکار ہو گئیں۔ زار نے  
 آگے بڑھ کر ریسیور تھام لیا۔  
 ”سیلو۔۔۔۔۔“  
 ”تھینک گاڈ۔ میں تو سمجھا۔ آپ مجھ سے بات

بھی نہیں کریں گی۔“  
 ”کیوں؟۔۔۔۔۔“ وہ بہت سہولت سے بات کر رہی  
 تھی۔  
 ”مجھے لگا کل آپ خفا ہو کر گئی ہیں۔“  
 ”کیا نہیں ہونا چاہیے تھا۔ حالانکہ تمہاری باتیں  
 تو ایسی ہی تھیں۔۔۔۔۔“

”اچھا چھوڑیں نا۔ صلح کر لیں۔“  
 ”سوچوں گی۔“  
 ”اچھی آپ پچھو کو لے کر آ سکتی ہیں۔“  
 ”اچھی۔ کیوں؟۔۔۔۔۔“  
 ”بس آجائیں نا۔ ایک چھوٹا سا سر براؤز ہے۔“  
 اس کا لہجہ مسکراتا ہوا تھا۔

”اچھی کیوں نہیں بتا دیتے۔“  
 ”آئیں گی تو بتاؤں گا۔“  
 ”اچھی تو ممکن نہیں ہے۔ شام میں آؤں گی۔“  
 ”اچھی کیوں نہیں۔۔۔۔۔“ وہ بضد تھا۔  
 ”اوکے۔ میں شام میں ضرور آجاؤں گی۔“  
 رضوان اس کے سامنے کھڑا تھا۔ وہ جواب دینے کے  
 بجائے خدا حافظ کہہ گئی۔ پھر رضوان کی طرف پلٹی۔  
 ”سوری۔ میری فریڈ کا فون تھا۔ چلیں۔۔۔۔۔“  
 چائینز رستوران میں ان کی ٹیبل پہلے ہی ریزرو  
 تھی۔ وہ بیٹھنے ٹیبل تک ان کی رہنمائی کی۔ ریزرو کا  
 کارڈ اٹھا کر ان کے سامنے مینو کارڈ رکھ دیئے۔  
 ”کیا لوگی؟۔۔۔۔۔“

”ایریولا ٹک۔“ وہ اس وقت زین کے متعلق سوچ  
 رہی تھی۔ کارڈ کھولے بغیر ہی بے توجہی سے بولی۔  
 رضوان نے ایک بل کو اس کی بے توجہی محسوس کی۔  
 پھر خود ہی آرڈر لکھوائے لگا۔  
 ”کیا سر براؤز ہو گا۔ رضوان سامنے نہ ہوتا تو  
 اصرار کر کے پوچھ ہی لیتی۔ پوچھنا کیا اب تک وہاں پہنچ  
 بھی گئی ہوتی۔“  
 رضوان نے اس کے چہرے پر ہلکے سے سوچ کے  
 رنگوں کو بڑھنے کی کوشش کی۔ نبھانے وہ کس بات پر  
 الجھ رہی تھی۔ اس نے انگلی سے ٹیبل بجایا۔ زارا



چونک کر اس کی طرف متوجہ ہوئی۔

"اچھی لگ رہی ہو؟"

ایک مدھم سی مسکان زارا کے لبوں پر بکھری۔

"کیا سوچ رہی ہو؟"

"کچھ خاص نہیں۔"

"میں جانتا ہوں تم مجھے نہیں سوچ رہیں۔"

رضوان برجستہ بولا تو وہ کھکھلا کر ہنس دی۔

"آپ تو میرے سامنے ہیں۔"

"بعض اوقات سامنے رکھی چیز نظر نہیں آتی۔"

"آپ چیز نہیں۔" وہ بھرپور اعتماد سے بولی تو

رضوان مسکرا دیا۔

"کبھی کبھی بونسی خوش گمان کر دیتی ہو مجھے۔"

"گمان کیوں۔ آپ کا اور میرا بہت واضح رشتہ

ہے۔" گلدان میں سجے اودھ کھلے گلاب کی پتیوں کو

چھوتے ہوئے زارا نے ذرا نظریں اٹھا کر انہیں

دیکھا۔ وہ مسرور سا ہو گیا۔

"تم عام لڑکیوں کی طرح اپنی فیلنگز چھپانے کی

کوشش کیوں نہیں کرتیں۔"

"کیونکہ میں عام لڑکی نہیں ہوں۔" وہ مبہم سا

مسکرائی۔

"بس تمہارا یہی اعتماد تو پسند ہے مجھے۔"

ویٹر کھانا سرو کرنے لگا تو وہ خاموش ہو گئے۔

"ویسے آج آپ کو مجھے لچ کر دوانے کا خیال کیسے

آگیا۔"

"اچھا نہیں لگا۔"

"ایسی تو کوئی بات نہیں۔" اس نے نیپکن کھولا۔

"کھانے کے بعد شاپنگ کے لیے چلیں گے۔"

حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔ رضوان ہنس دیا۔

"یقین جانو۔ ساری شاپنگ اپنے پیسوں سے

کرنا ہواں گے۔"

زارا جھینپ گئی۔

"اس کی کوئی خاص ضرورت نہیں۔"

"ضرورت تو تب سے ہے جب تم میرے نکاح میں

آئی تھیں۔ میری ذمہ داری تھیں مگر میں اپنے پیسے کا

انتظار کر رہا تھا۔"

"رضوان! آپ تو بات پکڑ کر بیٹھ گئے ہیں۔ میں

نے بونسی کہہ دیا تھا۔" وہ بے چارگی سے بولی۔

"لیکن مجھے اچھا لگا تھا۔ میری لائف پارٹنر کو ایسا

یہ خود ار ہونا چاہیے تھا۔"

"اور اگر میں ایسی نہ ہوتی تو۔"

"تو میں بنا دیتا۔" اس نے برجستہ کہا تو وہ ان کے

جملے سے مفلوظ ہوتی کھانے کی طرف متوجہ ہو گئی۔

"سوچ تو کافی دنوں سے رہا تھا۔ مگر آتے ہی سلیمان

بھائی نے مختلف کاموں میں الجھا دیا۔ تو وقت ہی نہ

نکال سکا۔ بھائی کو انکار اس لیے نہیں کر سکتا تھا کہ

انہوں نے ایک عرصہ تک یہ سب بالکل ٹھاپینڈل کیا

ہے۔ اب وہ کہتے ہیں رضوان میرا بازو ہے۔"

"ہاں۔" تایا ابو ہوتے تو سلیمان بھائی کو اتنی چھوٹی

عمر میں اتنی بڑی بڑی ذمہ داریاں نہیں اٹھانی پڑتیں۔"

"ہاں یہ تو ہے۔"

"کبھی کبھی مجھے تایا ابو بہت یاد آتے ہیں۔"

"تب تو تم بہت چھوٹی تھیں۔"

"ہاں شاید ان کی باتیں سنتی ہوں اس لیے۔" وہ

بہت سہولت سے رضوان کو اس موضوع کی طرف لے

آئی تھی۔

"حالانکہ بابا مجھے کبھی یاد نہیں آئے۔ سلیمان

بھائی نے مجھے کبھی احساس ہی نہیں ہونے دیا کہ

ہمارے والد نہیں ہیں۔ میرے لیے تو وہ بابا کا دوسرا

روپ ہیں۔"

"رضوان! کیا سلیمان بھائی کسی کو قتل کروا سکتے

ہیں؟" بہت اچانک سوال کیا تھا اس نے۔ رضوان

نے چونک کر اسے دیکھا۔ رضوان کو اس لمحے وہ بہت

الجھی ہوئی لگی۔

"کیا مطلب؟"

"آئی مین۔ اگر تایا ابو کے قاتلوں کو پتا چل

جائے تو کیا وہ انہیں۔۔۔ اصولاً تو انہیں پولیس کے

حوالے کرنا چاہیے نا۔ تفتیش ہونی چاہیے۔"

"زارا! کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔" رضوان کا لہجہ بے

حد سنجیدہ تھا۔ وہ اس کے لمحے سے خائف سی ہو کر

پلیٹ پر جھک گئی۔ باقی سارا وقت وہ خاموش ہی رہے

تھے لیکن شاپنگ کے درمیان زارا خاموش بھی اور

رضوان نے ساری شاپنگ اپنی پسند سے کر دائی تھی۔

شام ڈھلے وہ شاپنگ بیگز لیے گھر میں داخل ہوئی تو ماما

ٹی وی دیکھ رہی تھیں۔ اس نے بددلی سے ساری چیزیں

صوفے پر ڈھیر کر دیں۔

"یہ کیا ہے؟"

"پتا نہیں۔ رضوان نے خریدا ہے میرے لیے۔

میرے منع کرنے کے باوجود بھی شاپنگ پر لے گیا تھا۔"

وہ صوفے پر نیم دراز ہو گئی۔

"ارے تو کھول کر دیکھو نا۔" ماما نے حیرت سے

اسے دیکھا۔

"میں دیکھ چکی۔ آپ دیکھ لیں۔"

"کیا ہوا؟" خلاف توقع اسے بٹاش نہ پا کر

انہوں نے سوال کیا۔

"کچھ نہیں ماما۔ تھک گئی ہوں۔"

"تو یہاں کیوں کھڑی ہو۔ نہا کر تھوڑی دیر سولو۔

بالکل فریش ہو جاؤ گی۔" ماما نے پیار سے کہا تو وہ اٹھ

گئی۔ پھر پہلی سیڑھی پر قدم رکھ کر واپس پلٹی۔

"ماما! آپ نے زین کو فون کیا تھا؟"

"تمہارے جانے کے بعد کئی بار زرائی کیا، لیکن

سلیم کہتا ہے وہ گھر پر نہیں ہے۔" ماما نے بتایا تو کچھ

سوچنے لگی۔ پھر سر جھٹک کر بولی۔

"دوبارہ زرائی کیجیے گا۔ وہ بے چارہ کوئی سربراہ

دنا چاہ رہا تھا۔ بلا رہا تھا مجھے اور آپ کو۔"

"ارے تو تم مجھے تو بتا دیتیں۔" ماما جھنجھلا

ئیں۔

"رضوان کے سامنے کس طرح بتاتی۔ پھر مجھے

یقین تھا آپ بعد میں اسے فون ضرور کریں گی۔"

"کیا تو تھا مگر وہ اسی وقت کہیں نکل گیا۔ ذرا موبائل

تو نہ ملا۔" ماما نے کہا تو زارا پلیٹ کر صوفے تک آئی۔

شاپنگ کے ساتھ اس کا شولڈر بیگ بھی رکھا تھا۔ اس

نے بیگ کھول کر موبائل نکالا۔ پھر خود ہی زین کا نمبر

ڈائل کرتی ہوئی ماما کے قریب آ بیٹھی۔ تین چار منٹ

کے بعد سلیم نے فون اٹھایا تھا۔

"سلیم! زین کہاں گیا ہے۔؟" زارا نے چھوٹے

ہی پوچھا۔

"پتا نہیں باجی۔ وہ تو دوپہر ہی میں نکل گئے تھے۔ پھر

لوٹے ہی نہیں۔"

"کچھ بھی بتا کر نہیں گیا۔"

"میں بازار سبزی لینے گیا تھا۔ واپس آیا تو گھر پر

نہیں تھے۔ ویسے صاحب کی موت کے بعد وہ اکثر اسی

طرح پورا پورا دن گھر سے غائب رہتے ہیں اور پھر خود

ہی واپس بھی آجاتے۔" سلیم کا لہجہ کہتا تھا فکر کی کوئی

بات نہیں۔ وہ اس قسم کے معمول کا عادی ہے۔

"ٹھیک ہے سلیم! زین آئے تو اس سے کہنا گھر فون

کر لے۔"

"بالکل کہہ دوں گا باجی۔ باجی۔" اس نے

بات کرتے کرتے پھر پکارا۔

"کہو۔"

"مجھے لگتا ہے آج بھائی جان بہت اداس ہیں۔"

"کیوں؟"

"آج ان کی سالگرہ تھی نا۔ جب صاحب ہوتے

تھے تو ضرور مناتے تھے۔ آج انہیں صاحب بہت یاد

آئے ہوں گے۔ یہ پہلی سالگرہ ہے جو ان کے بغیر

گزری۔"

"اوہ نف۔" تو یہ تھا وہ سربراہ۔ وہ اپنے سونے اور

خالی گھر کی وحشت دور کرنے کو انہیں بلا رہا تھا اور وہ

آج بھی نادانستگی میں اسے دکھ دے گئی تھی۔

"کیا ہوا؟"

"ماما نے وہل کر پوچھا۔

زارا نے مرے مرے انداز میں موبائل آف

کر کے صوفے پر رکھا۔

"کیا ہوا۔ زین ٹھیک تو ہے۔؟"

"آج اس کا برتھ ڈے تھا۔ ماماں کے بعد پہلی

سالگرہ اور اس نے صرف ہمیں انوائٹ کیا تھا۔ وہ

ہمیں سربراہ دنا چاہتا تھا۔" وہ بے حد تاسف سے

بولی۔ ماما کادل دکھ سے بھر گیا۔







ہو گئی تھی۔ سلیم اسے کئی بار خود سے باتیں کرنے پر ٹوک چکا تھا۔ مگر عادت تھی کہ جاتی ہی نہ تھی۔ اس نے سیف کھول کر پیسے نکالے۔ راستے میں اسے افتخار مل گیا۔

”کدھر کو شہزادے۔۔۔“

”بس کپڑے خریدنے نکلا تھا۔“

”چلو آؤ۔ تمہیں منے حلوائی کا خاص سوہن حلوہ

کھاؤں۔“ افتخار نے دعوت دی۔

”سوہن حلوہ۔“ زین نے ذرا دیر کو سوچا۔ ”نہیں۔

افتخار بھائی آج میں آپ کو چائے پلوؤں گا۔“ اسے

افتخار اچھا لگتا تھا۔ نڈر اور بے خوف۔ اسے لگتا وہ

زندگی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتا ہے۔

”کس خوشی میں؟۔۔۔“

”آج میرا برتھ ڈے ہے۔“ وہ مسکرایا۔

”خیر سے بچہ کتنے سالوں کا ہو گیا ہے۔“

”اتنے سال تو ہو گئے ہیں کہ آپ مجھے جوانوں میں

شمار کرنے لگیں۔“ زین نے برجستہ کہا تو افتخار نے دل

کھول کر قہقہہ لگایا۔

”ہاں بھئی۔ لگ رہا ہے۔ چلو پھر چائے ہو

جائے۔“ افتخار نے اس کے کندھے پر ہاتھ مارا۔

چائے پی کر وہ دونوں مارکیٹ آگئے تھے۔ افتخار کو

اپنے ابا جی کے لیے سوٹ خریدنا تھا۔ وہیں زین نے

زارا کو کسی کے ساتھ دیکھا۔ وہ دونوں شاپنگ کر رہے

تھے۔ وہ نوجوان ایک ایک چیز اس کے مشورے سے

خرید رہا تھا اور وہ بس ہوں ہاں کر رہی تھی۔ زارا کی نظر

اس پر نہیں پڑی تھی۔

وہ مسکرا دیا۔

”تو یہ بھی مصروفیت۔۔۔“ زین نے انہیں گاڑی

میں بیٹھتے دیکھا۔

”کون ہو سکتا ہے وہ کیا رائے ماؤس کا کوئی

ملکین۔۔۔“ اس کی پیشانی کی رگیں تن گئی۔ نجانے

کیوں ان میں سے کسی بھی شخص کو زارا کے ساتھ

دیکھنا اس کے لیے ناقابل برداشت تھا۔ اسے لگتا وہ

پچھو اور زارا ایک ٹکون ہیں جس کا چوتھا کونہ کوئی

نہیں۔ زین نے بغور اس خوبصورت شخص کو دیکھا۔

”ہاں یہ بھی ان ہی میں سے ہے۔“

اس کے دل نے نفرت سے کہا۔ اسے زارا پر بے

حد غصہ آیا۔

”وہ کیوں مسکرا رہی ہے۔“

”ہاں بھئی کیا کہتے ہو اچھی ہے۔“ افتخار نے اس

کے ہاتھ میں پکڑی شرٹ کو ہلایا۔

”اچھی ہے لیکن مجھے نہیں لینی۔“ اس نے بے

زارا سا ہو کر شرٹ رکھ دی۔

”کیوں؟۔۔۔“ افتخار نے حیرت سے اسے دیکھا۔

”بس میرا موڈ نہیں ہے۔“ افتخار کو اس کا مزاج بگڑا

بگڑا سا لگا۔

”میرا تو ہے۔“ افتخار نے وہ شرٹ خرید کر پے

منٹ کر دی۔ زین منع ہی کرتا رہ گیا۔

”میری طرف سے سالگرہ کا تحفہ سمجھ لو۔“ وہ دکان

سے باہر آ گیا۔

”متھینک یو افتخار بھائی۔“ زین نے باہر آ کر کہا۔

”اچھا میں چلتا ہوں۔“ خواجہ خواہ میں اتنا وقت لے لے

تمہارا۔“

”گھر جائیں گے۔؟“

”ہاں اور تم؟۔۔۔“

”میں۔۔۔“ زین نے دور تک پھیلی سڑک پر آتے

جاتے لوگوں اور ٹریفک کو دیکھا۔ اسے اپنا آپا ایک

دم بہت تنہا لگا۔

”پتا نہیں۔“

افتخار نے بغور اسے دیکھا۔

”کوئی ایسا نہیں جو میرا انتظار کرے۔۔۔“ وہ بائیں

سے بولا۔

”تو چلو پھر آج کی شام ہمارے نام کر دو۔“ افتخار

کہا اور زین کو ہمیشہ اپنا غصہ، غم اور دکھ شیر کرنے

لیے کسی نہ کسی کی ضرورت تو رہتی تھی سو جو اس

سمت ہاتھ بڑھاتا وہ اسی کے ساتھ ہو لیتا تھا۔

باقی آئندہ شمار دے میں



# لے وقت کی دے

## ناولٹ

یونیورسٹی میں ایک زین کا ٹکٹلی باندھ کر پکھنا زارا کو شدید ناگوار گزر رہا تھا۔ لیکن اس نے بھی کوئی ناز یا حرکت نہیں کی تھی۔ اس کی دوست بھی متوجہ ہونے لگی تھیں۔ ایک دن زین نے اسے مخاطب کر کے کہا کہ اس کے بابا اس سے ملنا چاہتے ہیں۔ زارا حیران رہ گئی۔ وہ اس کے بابا سے ملنے اسپتال گئی وہ سو رہے تھے۔ زارا واپس آگئی۔ اسے اسلام آباد جانا پڑا۔ دوبارہ وہ ان کے پاس نہ جاسکی۔ اسلام آباد سے واپس آئی تو پتا چلا کہ زین کے ابو کی وفات ہو گئی ہے۔ زارا زین کے گھر گئی تو اس پر انکشاف ہوا کہ زین کے ابو رائے جمشید حیات تھے۔ جن پر زارا کے تباہی کے قتل کا الزام تھا۔ رائے جمشید حیات اس کے سگے ماموں تھے۔ زارا کی امی کو پتا چلا تو وہ رورو کر بے حال ہو گئیں۔ زارا کے تباہی کی زمینیں تھیں جو اس کے تباہی زاد بھائی سلیمان سنبھالتے تھے۔ سلیمان نے ہی رائے جمشید حیات پر الزام لگایا تھا زارا کا نکاح سلیمان کے چھوٹے بھائی رضوان سے ہو چکا تھا۔ رضوان باہر بڑھنے گیا ہوا تھا۔ زین کی زارا سے بہت دوستی ہو گئی تھی۔ رضوان بھی باہر سے پڑھ کر آگیا تھا۔ وہ سلیمان سے بہت مختلف مزاج رکھتا تھا۔ اور سلیمان کی نسبت بہت روشن خیال اور فراخ دل تھا۔

### ۳ تیسری قسط

”بھئی برتھ ڈے ٹو یو۔۔۔“  
وہ ہڑبڑا کر جاگا۔  
”پہلی تک بستر میں ہو لیزی بوائے۔۔۔“ چپھوٹنے  
پیار سے اس کا گال تھپتھپایا۔ پھر اس کی پیشانی چوم  
لی۔ ”بھئی برتھ ڈے جان۔۔۔“  
”تھینک یو۔ لیکن میری سالگرہ تو کل گزر گئی۔“  
وہ سنجیدہ سا اٹھ بیٹھا۔  
”ایک دن سے کوئی فرق نہیں پڑنے والا۔“ زارا





نے بو کے اس کی طرف بڑھایا۔

"فرق تو ہے۔ خیر۔" وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

"سوری بیٹا! لیکن تم مجھے تو بتا دیتے اور ساری شام کہاں غائب رہے؟" ممانے پوچھا۔

"افتخار بھائی لے گئے تھے۔"

"کتنی بار میں نے فون کیا۔ تم رات گئے تک گھر نہیں آئے تھے۔ میں پریشان ہو گئی تھی۔" پھپھو نے اس کے بال سنوارے۔ "اتنی دیر تک باہر مت رہا کرو۔"

"خالی گھر کاٹنے کو دوڑتا ہے پھپھو! تھک جاتا ہوں ان خالی دیواروں کو تکتے تکتے۔" وہ بے زاری سے گویا ہوا۔ ممانے کچھ کہنا چاہا۔ زارا بول اٹھی۔

"پلیز آپ لوگ اتنی سنجیدہ گفتگو مت کریں اور تم ہنسنا بڑھ کر۔"

وہ کہہ کر کچن میں آئی۔ ممانے روم کی سیٹنگ ٹھیک کرنے لگی تھیں۔ وہ نہا کرنی شرٹ پہن کر آیا تو ممانے خوبصورت سی ریسٹ وائچ اس کی طرف بڑھا دی۔

"تمہارا ہر تھوڑے گفت۔"

"بہت خوبصورت ہے۔" زین نے پرانی گھڑی اتار کر میز پر رکھی۔

"زارا کہاں ہے؟" اس نے نئی گھڑی کا پانی پر باندھتے ہوئے کہا۔

"کچن میں ہے شاید تمہارے لیے کچھ بنا رہی ہے۔" پھپھو نے بتایا تو وہ کچن میں چلا آیا۔

زارا انڈے پھینٹ رہی تھی۔

"نہا لیے؟" اس نے آہٹ پر پلٹ کر دیکھا۔

"ہاں۔"

"ایچھے لگ رہے ہو۔ یہ کلر تم پر سوٹ کرتا ہے۔"

اس نے شرٹ کی طرف اشارہ کیا۔

"افتخار بھائی نے لے کر دی تھی کل۔" زین نے بتایا پھر پوچھنے لگا۔ "آپ نے مجھے کوئی گفت نہیں دیا۔"

"میں تمہارے لیے کیک بنانے کی کوشش کر رہی تھی۔"

ممانے نے کہا۔ "آپ کا جانا"

ہوں۔ اور گفت تمہارا ڈیو ہے۔ اپنی مرضی کا لے لیتا۔"

"کوشش کر رہی ہیں۔"

"ہاں۔ کیونکہ مجھے کیک بنانا نہیں آتا۔" وہ ہنسی۔

"ویسے مجھے پتا ہے کہ کیسے بناتے ہیں۔" میں نے سوچا

"آج زرائی کرنی ہوں۔"

"ہائیں۔ میں سکھاتا ہوں۔ کیک کیسے بناتے ہیں۔"

"تمہیں بنانا آتا ہے؟" وہ بادل اسے تمہارا ایک طرف ہو گئی۔

"کل بنایا تھا۔" زین نے کپ میں میدہ نکالا۔

"سوری زین! مجھے جانا تھا لیکن میں نے شام کو آنے کا وعدہ کیا تھا۔ تم غائب ہی ہو گئے۔"

"آپ کے وعدے پر کون اعتبار کرتا۔" وہ آہستگی سے ہنسا۔ زارا نے خفگی سے دیکھا تو سنجیدہ ہو گیا۔

"میرا دل نہیں چاہتا تھا۔"

"مجھ سے ملنے کو؟" زارا نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"ہاں! وہ صاف گوئی سے گویا ہوا۔

"کیوں؟"

وہ خاموش ہی رہا۔ کچھ لمحوں کے بعد جھجکتے ہوئے پوچھنے لگا۔

"کل آپ کے ساتھ کون تھا؟"

زارا نے چونک کر گہری نظروں سے اسے دیکھا۔

"تم نے دیکھا تھا؟"

"ہاں۔"

"اسی لیے گھر نہیں لوٹے تھے۔"

"ہاں۔"

"کیوں؟"

"پتا نہیں۔" اس نے اوون گرم ہونے کے لیے آن کر دیا۔

"بہر حال وہ رائے رضوان حیدر ہے۔" تایا ابو کا پھوٹا بیٹا۔

"میں تمہارے لیے کیک بنانے کی کوشش کر رہی تھی۔"

ممانے نے کہا۔ "آپ کا جانا"

ہوں۔ اور گفت تمہارا ڈیو ہے۔ اپنی مرضی کا لے لیتا۔"

"کوشش کر رہی ہیں۔"

"ہاں۔ کیونکہ مجھے کیک بنانا نہیں آتا۔" وہ ہنسی۔

"ویسے مجھے پتا ہے کہ کیسے بناتے ہیں۔" میں نے سوچا

"آج زرائی کرنی ہوں۔"

"ہائیں۔ میں سکھاتا ہوں۔ کیک کیسے بناتے ہیں۔"

"تمہیں بنانا آتا ہے؟" وہ بادل اسے تمہارا ایک طرف ہو گئی۔

"کل بنایا تھا۔" زین نے کپ میں میدہ نکالا۔

"سوری زین! مجھے جانا تھا لیکن میں نے شام کو آنے کا وعدہ کیا تھا۔ تم غائب ہی ہو گئے۔"

بہت ضروری تھا۔" وہ جھنجھلا کر بولا۔

"ہاں۔ تمہیں اچھا نہیں لگا۔"

"میں آپ کو ان لوگوں کے ساتھ برداشت نہیں کر سکتا۔"

زارا نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"میرا تعلق بھی تو رائے فیملی سے ہے۔"

"میں آپ اور پھپھو کو بابا کے حوالے سے دیکھتا ہوں۔"

"رضوان بہت اچھے انسان ہیں۔"

"ہو نہ۔" وہ آمیزے کو آئینہ کی شکل والے سانچے میں ڈالنے لگا۔

"میری ان کے ساتھ شادی ہونے والی ہے۔"

زارا نے اطمینان سے بتایا۔ وہ پورے کا پورا اس کی طرف گھوم گیا۔

"کیا؟"

زارا نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ "وہ سلیمان سے بہت مختلف ہے۔"

"آپ ان سے شادی مت کریں۔" وہ ضدی لہجے میں بولا۔ زارا مسکرا دی۔

"اب تو مجبوری ہے۔"

"کیسی مجبوری ہے؟" وہ جھنجھلا یا۔

"پسند کرتی ہوں اس کو۔" زارا آرام سے بولی۔

"محبت تو نہیں کرتیں؟"

"پسندیدگی محبت کی پہلی سیڑھی ہے۔ ہو سکتا ہے۔"

زین نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔

"تو آپ اس شخص سے ضرور شادی کریں گی۔"

"کرنی پڑے گی کیونکہ ہمارا نکاح ہو چکا ہے۔ اب تو بس رخصتی ہی باقی ہے۔"

زین نے عدد درجہ بے یقینی سے اسے دیکھا۔ پھر سانچہ یونسی چھوڑ کر باہر نکل گیا۔ زارا نے کیک اوون میں رکھا اور باہر آئی۔ وہ چپ چاپ سا پھپھو کے پاس بیٹھا تھا۔ بعد میں اس نے زارا سے کوئی بات نہیں کی۔

ممانے نے کہا۔ "آپ کا جانا"

ہوں۔ اور گفت تمہارا ڈیو ہے۔ اپنی مرضی کا لے لیتا۔"

"کوشش کر رہی ہیں۔"

"ہاں۔ کیونکہ مجھے کیک بنانا نہیں آتا۔" وہ ہنسی۔

"ویسے مجھے پتا ہے کہ کیسے بناتے ہیں۔" میں نے سوچا

"آج زرائی کرنی ہوں۔"

"ہائیں۔ میں سکھاتا ہوں۔ کیک کیسے بناتے ہیں۔"

"تمہیں بنانا آتا ہے؟" وہ بادل اسے تمہارا ایک طرف ہو گئی۔

"کل بنایا تھا۔" زین نے کپ میں میدہ نکالا۔

"سوری زین! مجھے جانا تھا لیکن میں نے شام کو آنے کا وعدہ کیا تھا۔ تم غائب ہی ہو گئے۔"

"آپ کے وعدے پر کون اعتبار کرتا۔" وہ آہستگی سے ہنسا۔ زارا نے خفگی سے دیکھا تو سنجیدہ ہو گیا۔

"میرا دل نہیں چاہتا تھا۔"

"مجھ سے ملنے کو؟" زارا نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"ہاں! وہ صاف گوئی سے گویا ہوا۔

♥ ♥ ♥ ♥

"افتخار! تم نے زین کو دیکھا ہے۔" کارڈر میں جلتے جلتے اچانک رک کر اس نے ہلو کے ساتھ نیک لگا کر کھڑے افتخار سے پوچھا۔

"کئی بار دیکھا ہے۔"

"میرا مطلب ہے کہ ابھی۔" وہ ہنس دی۔

"ابھی تو لاہوری میں جا کر سب کو دھوکا دینے کی کوشش کر رہا ہے کہ وہ بہت بڑھنے لگا ہے۔"

افتخار نے جواب دیا تو وہ مسکرا کر آٹے بڑھ گئی۔ وہ واقعی لاہوری کی کوٹنے والی ٹیبل پر کتاب کھولے نوٹ بک پر آڑی ترچھی لکیریں کھینچ رہا تھا۔ زارا کو دیکھتے ہی اس نے کتاب اٹھا کر چہرے کے سامنے کر لیا۔ وہ مسکراتی ہوئی سامنے آئی تھی۔ وہ تب بھی نظر انداز کرتا رہا۔ زارا نے انگلی سے ٹیبل بجائی۔ تب کتاب کے عقب سے اس نے خفا نظروں سے اسے دیکھا۔

"تمہیں رضوان واقعی اچھا نہیں لگا۔"

"آپ یہاں مجھ سے کیسی پوچھنے آئی ہیں۔" اس نے جھنجھلا کر کتاب ٹیبل پر پٹی۔

"ہاں۔" وہ اطمینان سے بولی۔

"مجھے رائے باؤس کا کوئی فردا اچھا نہیں لگتا۔"

"میں بھی۔"

"اس وقت آپ بھی۔" وہ منہ پھلا کر بولا۔

"اتنے بڑے بڑے سچ نہیں بولا کرتے۔" زارا متحسم لہجے میں بولی۔ "دل دکتے لگتا ہے۔"

"اور تو میرا دل دکھ رہا ہے۔"

"تو اس میں کیا کر سکتی ہوں۔"

"اس سے شادی مت کریں۔"

زارا ہنس دی۔

"کیسی بچوں جیسی ضد ہے تمہاری۔"

"آپ مجھے بچہ ہی سمجھتی رہیں۔" وہ تنقید کراٹھ گیا۔ زارا بھی اس کے پیچھے چلی آئی۔

"تم اس سے ملو گے تو تمہیں وہ اچھا لگے گا۔"

زین درمیان والی سیڑھی پر چڑھ کر پلٹ کر دیکھا۔

زین نے عدد درجہ بے یقینی سے اسے دیکھا۔ پھر سانچہ یونسی چھوڑ کر باہر نکل گیا۔ زارا نے کیک اوون میں رکھا اور باہر آئی۔ وہ چپ چاپ سا پھپھو کے پاس بیٹھا تھا۔ بعد میں اس نے زارا سے کوئی بات نہیں کی۔

ممانے نے کہا۔ "آپ کا جانا"

ہوں۔ اور گفت تمہارا ڈیو ہے۔ اپنی مرضی کا لے لیتا۔"

"کوشش کر رہی ہیں۔"

"ہاں۔ کیونکہ مجھے کیک بنانا نہیں آتا۔" وہ ہنسی۔

"ویسے مجھے پتا ہے کہ کیسے بناتے ہیں۔" میں نے سوچا

"آج زرائی کرنی ہوں۔"

"ہائیں۔ میں سکھاتا ہوں۔ کیک کیسے بناتے ہیں۔"

"تمہیں بنانا آتا ہے؟" وہ بادل اسے تمہارا ایک طرف ہو گئی۔

"کل بنایا تھا۔" زین نے کپ میں میدہ نکالا۔

"سوری زین! مجھے جانا تھا لیکن میں نے شام کو آنے کا وعدہ کیا تھا۔ تم غائب ہی ہو گئے۔"

"آپ کے وعدے پر کون اعتبار کرتا۔" وہ آہستگی سے ہنسا۔ زارا نے خفگی سے دیکھا تو سنجیدہ ہو گیا۔

"میرا دل نہیں چاہتا تھا۔"

"مجھ سے ملنے کو؟" زارا نے حیرت سے اسے دیکھا۔



”مجھے صرف اتنا معلوم ہے۔ وہ شخص آپ کو مجھ سے دور کر دے گا۔ کبھی نہیں ملنے دے گا اور میں آپ سے محبت کرتا ہوں کیونکہ بابا آپ سے محبت کرتے تھے۔“

”اب بھی تو ملتی ہوں۔“

”ابھی آپ رائے ہاؤس میں نہیں رہتیں۔ تب آپ اس شخص کے سامنے جواب دہ ہوں گی۔“ وہ دو دو سیڑھیاں اتر گیا۔

”زین۔۔۔ زین۔۔۔!“

زارا نے پکارا۔ آخری سیڑھی پر انعم نے اسے روکا۔

”یہ تم تو لگتا ہے اپنے ماموں زاد کو ہی پیاری ہو گئی ہو۔“

”نہیں بس۔۔۔“ وہ رک گئی۔ ”زارا زین کو دیکھنے آئی تھی۔“

”کبھی ہمیں بھی دیکھ لیا کرو۔ زین کوئی بچہ نہیں ہو بھیر میں پھر سے گم ہو جائے گا۔“

”سارا دن تو تمہارے ساتھ ہوتی ہوں۔“

”ہاں اور تمہیں پھر بھی یہ نہیں پتا کہ وہ افتخار کا بچہ عظمیٰ کے ہاں پھر سے جا پٹنچا ہے۔“

”کیا؟۔۔۔“ زارا نے تحیر سے اسے دیکھا۔

”ہاں جی کل شام کی بات ہے یہ۔۔۔“ انعم کو حسب معمول مڑا آ رہا تھا۔

”عظمیٰ کہاں ہے؟۔۔۔“

”رورہی ہے۔۔۔“ اس نے آرام سے کہا۔

”دانت۔۔۔!“ انعم اسے وہاں لے آئی جہاں عظمیٰ تمام پھلائے تخت غصے میں بیٹھی تھی۔

”یہ میں کیا سن رہی ہوں عظمیٰ۔۔۔“ زارا اس کے قریب پہنچی۔

”میں اسے قتل کروں گی۔“ وہ چیخ اٹھی۔

”بائی دادو اب کہ کیا لے کر گیا تھا۔۔۔“ زارا نے پوچھا۔

”اچار کا مرتبان۔۔۔“ انعم دل کھول کر ہنسی۔ زارا نے بڑی مشکل سے مسکراہٹ ضبط کی۔

”کیا وہ بھی سارے دوستوں میں بانٹے تھے۔“

”نہیں اسے عظمیٰ کے لبا بہت اچھے لگے۔ بقول اس کے۔ آج کے دور میں ایسے ساہو اور درویش منش انسان کہاں ملتے ہیں سو وہ تو لایا کی محبت میں لبا سے ملنے گیا تھا مرتبان لے کر۔۔۔“

”تو عظمیٰ کے لبا نے کیا کہا۔۔۔“ اب تو زارا کو بھی اس ساری کہانی میں دلچسپی محسوس ہو رہی تھی۔

”چٹخارے لے لے کر اچار کھایا۔ افتخار کو عظمیٰ کے ہاتھ سے بنوا کر پکوڑے کھلائے۔ بقول لبا آج کے دور میں ایسے سعادت مند اور بزرگوں کا احساس کرنے والے نوجوان کہاں دستیاب ہوتے ہیں۔“

”تمہیں یہ سب کیسے معلوم ہوا؟۔۔۔“

”کیونکہ میں وہیں موجود تھی۔“ انعم کو عظمیٰ کی حالت سوچ سوچ کر ہنسی آرہی تھی۔

”تمہارے بہت دانت نکل رہے ہیں۔“ عظمیٰ تاؤ کھا کر بولی۔

”ہاں۔ عظمیٰ دانت پس پس کر اسے گھور رہی تھی اور وہ مزے سے پکوڑے کھاتا ہوا کہہ رہا تھا۔ پکوڑے بہت مزے کے بنے ہیں۔ لگتا ہے عظمیٰ نے نہیں بنائے۔“ اس کے لبوں سے ہنسی کا فوارہ چھوٹ گیا۔

”عظمیٰ نے ہاتھ میں پکڑی فائل اسے کھینچ ماری۔“

”اللہ کرے یہ سب تمہارے ساتھ بھی ہو۔“

”ہائے اللہ کرے۔“ اس نے فوراً ”دعا یہ انداز میں ہاتھ بلند کیے۔ عظمیٰ غصے میں اٹھ کر جانے لگی۔

زارا نے ہاتھ پکڑ کر روکا۔

”تم کیوں اپنا خون جلاتی ہو۔ میں بات کروں گی اس سے۔۔۔“

”وہ کہہ دے گا۔ اچھا نہیں لگا اچار۔ کوئی بات نہیں اگلی بار سہی۔“ انعم نے کہا اور دوسرے بل بچاؤ بچاؤ کا نعرہ لگاتی وہاں سے بھاگی تھی کہ عظمیٰ نے ہاتھ

اپنے سٹنڈل کی طرف بڑھایا تھا۔

”عظمیٰ۔۔۔“ زارا نے اس کا ہاتھ پکڑا۔ عظمیٰ نے دور جاتی انعم کو دیکھا۔ وہ شائستہ و غیور کے گروپ میں جا کھسی گئی۔ پھر سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

”تمہیں واقعی افتخار کا اتنا اچھا نہیں لگتا۔۔۔“

”میں مذاق نہیں کر رہی زارا! اور نہ ہی بن رہی ہوں۔ مجھے واقعی اس کا یوں گھر آنا اچھا نہیں لگتا۔“ وہ جھنجھلا کر بولی۔

”تمہیں لوگوں کی پروا ہے افتخار کی نہیں۔۔۔“

”مجھے اپنے لوگوں کی پروا ہے۔ مجھے اس بات کی فکر ہے کہ وہ میرے بارے میں کیا سوچتے ہیں۔“ وہ زور دے کر بولی۔

”کیا وہ تمہیں جانتے نہیں۔“ زارا نے پوچھا تو عظمیٰ نے دونوں بازو گھٹنوں کے گرد لپیٹ کر ان پر ٹھوڑی نکالتے ہوئے سنجیدہ نظروں سے زارا کو دیکھا۔

”غلط فہمیاں کہاں سے جنم لیتی ہیں۔ قریبی رشتے شکر کی نذر کس طرح ہو جاتے؟۔۔۔“

”عظمیٰ کے سوال نے زارا کے ذہن کو رائے ہمیشہ حیات کی طرف موڑ دیا۔

ہاں میں جانتی ہوں۔ یہ غلط فہمیاں یہ شک قریبی رشتوں کو کس طرح کھا جاتے ہیں۔ ماموں بھی تو اسی آگ میں جل کر راکھ ہو گئے۔

”شک کا ناگ بالکل اسی طرح اعتبار کو بھی دس لیتا ہے۔“ وہ عجیب سے لہجے میں بولی۔

زارا نے چونک کر انہیں دیکھا۔

”کس کا اعتبار؟۔۔۔“

”میرے اپنے لوگوں کا۔“ وہ آہستگی سے بولی۔

”زارا! تم میرے خاندان اور گھر کے بارے میں کچھ نہیں جانتیں۔“

”میں سمجھتی ہوں دوستی میں کرید نہیں ہونی چاہیے۔ جتنا تم نے مناسب سمجھا بتا دیا۔“

”بنیادی طور پر ہمارا خاندان زمیندار ہے۔ تعلیم کا رواج نہیں۔ خاص طور پر لڑکیوں میں تو بالکل نہیں۔ میرے ابا نے اپنے شوق میں میٹرک کے بعد

پی سی۔ سی کر کے استاد بننے کو ترجیح دی تھی۔ یوں بھی وہ باقی لوگوں سے ذرا مختلف اور تیل واقع ہوئے ہیں اور بہت نرم دل بھی۔ ان کی تعلیم یوں ادھوری رہ گئی کہ دادا نے ان کی مزید فیس دینے سے انکار کر دیا تھا۔

ان کا خواب ادھورا رہ گیا اور یہ ادھورے خواب بہت تکلیف دیتے ہیں زارا! ابا نے چاہا۔ وہ یہ خواب اپنے بچوں کی صورت میں پورے کریں۔ میں بڑی بیٹی تھی۔ انہوں نے مجھے اسکول میں داخل کروایا۔ یہاں تک تو خیر تھی کہ اتنی تعلیم تو ہر کوئی دلوالیتا ہے۔ آفت

تو تب ہوئی۔ جب میں میٹرک کے بعد کالج میں چلی آئی۔ خاندان میں کوئی بھونچال آگیا۔ ہر کوئی لبا کو سمجھانے آ رہا تھا۔ ابا ہنس ہنس کر ٹالتے رہے۔ دادا نے تو یہاں تک کہہ دیا۔

”اپنی بیٹیوں کی کمائی کھائے گا عبد الجبار۔ اس سے بہتر ہے ڈوب کر مر جا۔“

”ابا پھر بھی کچھ نہیں بولے۔ انہوں نے مجھے کبھی کچھ نہیں کہا۔ کبھی لمبی چوڑی نصیحتیں نہیں کی۔

ہاں جب بھی میں نئی کلاس میں جاتی تھی۔ ابا پہلے دن سر پر ہاتھ رکھ کر کہتے۔

”پترا سیدھے کالج جانا اور سیدھے گھر آنا۔“

”اور بس۔ میرے لیے یہ ایک جملہ نہیں تھا۔ ان کے اعتماد کا حصار تھا۔“

گھاس کی ایک ایک پتی توڑتے ہوئے وہ بہت آہستگی سے بول رہی تھی۔ اسے معلوم بھی نہ ہوا کہ اب انعم آکر پھر سے اس کے پاس بیٹھ گئی۔

”پورے خاندان کی نظریں مجھ پر لگی ہیں کہ کہاں میں لڑکھڑاؤں اور وہ ابا کو منہ کے بل گرا دیں۔ میرے ایک ایک عمل اور ایک ایک حرکت پر ان کی نظر ہے۔ میں اگر کبھی بھولے سے گننا بھی لوں تو ان کی نگاہوں میں شک اترنے لگتا ہے۔ میرے لباس میں اگر کوئی معمولی سی تبدیلی بھی نظر آجائے تو وہ ہونٹوں میں انگلی دبا کر فیشن کو کوٹنے لگتی ہیں۔ ”فیشن“ ان کی نظر میں فاشی ہے برائی ہے اور فیشن کرنے والے کو بھٹا ان کی لغت میں نہیں۔ واضح رہے کہ فیشن کے







گھما کر اسے دیکھا۔ تکلیف کی شدت سے منہ سے  
سکاری نکل آئی۔ وہ جلد ہی واپس آیا تو اس کے  
ہاتھ میں رومال تھا۔ اس کے قریب بیٹھ کر اس نے  
چادر ہٹائی اس پر رومال باندھ دیا۔ پھر اس کا بازو تھام کر  
بولی۔

"اوتی باندھ دوں۔"  
وہ بکلی کی سی تیزی سے پیچھے ہٹی اور خوفزدہ لہجے میں  
بولی۔

"مہم میں چلی جاؤں گی۔"  
"ایسے تو گھر تک نہیں پہنچ پاؤ گی۔ بس یہیں  
برآمدے تک چلی آؤ۔ چند منٹ لگیں گے۔" وہ  
پراسرار لہجے میں بولا۔ لڑکی نے ایزی پر بندھا رومال  
دیکھا۔ جو خون سے سرخ ہو رہا تھا۔ مجبوراً اس کے  
سمارے وہ برآمدے تک چلی آئی۔ برآمدے میں ایک  
ہی کرسی تھی۔ وہ اسے چھوڑ کر اندر غائب ہو گیا۔ ذرا  
سی دیر میں واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں فرسٹ  
ایڈ باکس تھا۔ نیچے بیٹھ کر اس نے باکس کھولا۔ رومال  
کھولتے ہوئے زین نے ذرا کی ذرا اسے دیکھا۔ پھر  
مسکرا دیا۔

"اتنی بڑی ہو کر رو رہی ہو۔"  
وہ شرمندہ ہو گئی۔ چادر کے کونے سے آنسو صاف  
کرنے لگی۔

"شرمندہ ہونے والی بات نہیں۔ تکلیف میں  
بڑے بڑے رو دیتے ہیں۔" پھر ہنس کر شرارتی انداز  
میں بولا۔ "میں بھی۔"

لڑکی کے لبوں پر مسکراہٹ کی رمتی بھی نہ جاگی۔ وہ  
لب بچھے اپنی ایزی کو گھورتی رہی۔ زین نے پٹی کی پھر  
باہر نکل آیا۔ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کی سی سی کی

اندر آیا۔

"بہنو! ہوئی چپل پہن کر گھر کے کچھ کپڑے لے کر  
نکلا ہے۔" اس نے کتابیں اس کی طرف بڑھائیں۔

چپل پہن کر وہ کچھ دیر بیٹھی رہی۔

انھنے لگی۔

"پانی پیو گی۔؟"

"اس نے پہلے نفی پھر اثبات میں سر ہلایا تھا۔ زین  
مسکراتا ہوا پھر سے اندر گھس گیا۔ وہ خاموشی سے  
کھڑی کتابیں جھاڑتی رہی۔ پھر اس نے بے بسی سے  
ٹوٹی ہوئی چپل کو دیکھا اور لب کاٹنے لگی۔ ایزی سے  
درد کی ٹیس اٹھ رہی تھیں۔

"لو۔" اس نے شربت کا گلاس اس کی طرف  
بڑھایا۔ مینگو اسکوئش میں برف کے ٹکڑے تیر  
رہے تھے۔ اسے ایک دم شدید پیاس کا احساس ہوا۔  
تو گلاس تھام لیا۔

"ساتھ یہ ٹیباٹ لے لو۔" تکلیف نہیں ہو گی۔"  
اس کے ہاتھ میں بلا کی اپناہٹ تھی۔ جو اس کے  
لے قطعی اجنبی تھی۔ زین نے گولی اس کی پھیلی ہتھیلی  
پر رکھی۔ وہ غٹا غٹا گلاس چڑھا گئی۔

"اور لو گی۔؟" اس نے نفی میں سر ہلایا اور چادر  
ٹھیک کرنے لگی۔

"یہ میری چپل پہن جاؤ۔ تمہاری تو پہننے کے قابل  
نہیں رہی۔"

"نہیں یونہی ٹھیک ہے۔" اس نے ایک چپل  
پاؤں میں ڈالی اور دوسری ہاتھ میں پکڑ لی۔

"نیوں جاؤ گی۔ پاؤں میں کچھ اور لگ گیا تو میں  
دوسری بار پٹی نہیں کروں گا۔"

اس کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ ابھری۔  
"تھوڑی بڑی ہیں مگر گزارا ہو جائے گا۔ اگلے دن  
واپس کر دینا۔ روز تو گزرتی ہو یہاں سے۔ نہیں بھی  
کرو گی تو کوئی بات نہیں۔ میرے پاس اور بھی چپل  
ہیں۔"

وہ متذنب سی کھڑی اس کے چپل دیکھتی رہی۔  
"یہ پسنی پڑیں گی۔ خود بخود پاؤں میں نہیں  
چھینیں۔" زین نے کہا تو اس نے اپنی چپل اتار کر  
اس کی پہن لی۔ وہ اسے دروازے تک چھوڑنے نہیں  
تیا۔ بس وہیں کھڑا کھتا رہا۔ وہ دروازے کے قریب  
جا کر بیٹھی۔

"شکریہ۔"

"وہ مسکرایا پھر دروازہ کھول کر اندر غائب  
ہو گیا۔ اس کے قدم ٹھکے ٹھکے انداز میں اپنے رستے پر  
چل دیے۔

"کون تھیں بھائی جان۔؟" سلیم نے اسے نکلتے  
دیکھا۔ اتے ہی پوچھنے لگا۔ زین نے فریج کھول کر  
چائزہ لیا۔

"کون؟"  
"جو ابھی ابھی یہاں سے گئی ہیں۔" اس نے گھی  
کا ڈبہ اور سوڈے کا لفافہ رکھا۔  
"وہ پتا نہیں۔" اس نے تھوڑے سے انگور  
بیٹ میں نکالے۔

"وہ یہاں سے ہو کر گئی ہیں اور آپ کو پتا ہی  
نہیں۔" سلیم نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔

"میں واقعی نہیں جانتا۔ وہ کون تھی۔"  
"اب آپ یہ بھی کہیں گے کہ وہ یہاں آئی ہی  
نہیں تھیں۔"

"خیر آئی تو وہ تھی۔" زین نے انگور کا دانہ منہ میں  
ڈالتے ہوئے اطمینان سے کہا۔ سلیم کچھ خفا ہو کر  
برتنوں کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔ زین باہر نکلتے لگا تو  
جھنجھلا کر بولا۔

"جانتے نہیں تو اپنی چپل کیوں اس کو دی۔"

زین نے پلٹ کر حیرت سے اسے دیکھا پھر سراپنے  
والے انداز میں بولا۔

"یار! بڑی تیز نظر ہے تیری۔ دیے تمہیں کس  
بات پر غصہ آ رہا ہے چپل پر یا اسے دینے پر۔"

"آپ پر؟" سلیم نے جھنجھلا کر کڑاھی  
چوسے پر رکھی۔ زین ہنس دیا۔

"میں نے کیا کیا ہے۔؟"

"کچھ نہیں صاحب! ہم نے تو یونہی پوچھ لیا۔ ہمیں  
معاف کر دیں۔" وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر بولا۔ زین کا  
تقدمہ بہت بلند تھا۔ نجائے کیا تھا مگر اس کی کچھ سمجھ  
پکڑ والی وہ بے زاری اور یاسیت بالکل ختم ہو گئی  
تھی۔

♥ ♥ ♥ ♥

"بس میں نہیں کھیل رہی۔"  
زارا نے ریکٹ پیچھا کا اور خود پلٹ کر میٹرھیوں پر جا  
بیٹھی۔

"اب بارے لگی ہیں تو۔"  
"میں بارے نہیں لگی۔ تمہیں کھیلنا نہیں آتا۔"  
"جھوٹ بھی بولتی ہیں آپ۔" وہ اس کے برابر  
آ بیٹھا۔

"زندگی بھر میں نے اتنے جھوٹ نہیں بولے جتنے  
تمہاری خاطر بولے ہیں۔" وہ ہنس پڑی۔  
"میری خاطر۔" زین نے گردن گھما کر اسے  
دیکھا۔

"اپنی سہیلی کے گھر جا رہی ہوں۔ لا بھری جانا  
ہے۔ یونہی لانگ ڈرائیو پر نکل گئی تھی وغیرہ وغیرہ۔"

"ایک سچ کو چھپانے کے لیے اتنے جھوٹ کیا  
خیال ہے۔ میں اور آپ مل کر ایک سچ بول ہی نہ  
دیں۔" وہ متبسم لہجے میں بولا۔

"خدا کا خوف کرو۔" زارا جلدی سے بولی۔

"ابھی تو لگتا ہے صرف انسانوں کا خوف سر پر سوار  
ہے۔ بلکہ صرف ایک انسان "رائے سلیمان حیدر۔"

لیکن جس دن میں نے اس خوف کے حصار کو توڑ دیا۔  
وہ دن کوئی اور ہی تاریخ نکھے گا۔" اس کا لہجہ عجیب سا  
ہو گیا۔

"جب تم اس لہجے میں بات کرتے ہو تو مجھے تم سے  
خوف آنے لگتا ہے۔" وہ تھمر تھمری لے کر بولی۔ زین  
مسکرا دیا۔

"خیر آپ کو تو مجھ سے ڈرنے کی ضرورت  
نہیں۔"

"خیر قتل کی دھمکیاں تو تم مجھے بھی دے چکے ہو۔"

زارا کی نگاہوں میں شرارت چلی۔

"اب جانے بھی دیں۔" وہ جھینپ گیا۔

"اس دن تو تم اتنے دعوے کر رہے تھے کہ مجھے لگا  
بس کچھ کر ہی دو گے۔"

زین نے بعد خندہ نظروں سے اسے دیکھا۔



”میں بہت بزدل انسان ہوں۔ بابا کی محبت نے مجھے واقعی بزدل بنا دیا ہے۔ میں واقعی وہی کرنا چاہتا ہوں جو کہتا ہوں مگر مجھے میں ہمت نہیں ہے۔ پھر آپ لوگ۔۔۔ آپ لوگوں نے مجھے کچھ اور بزدل کر دیا ہے۔ مگر کبھی نہ کبھی تو میں خود میں ایسا حوصلہ پاؤں گا ہی کہ ان کے سامنے جا کھڑا ہوں کہ دیکھو میں اس شخص کا بیٹا ہوں جس نے کچھ نہیں کیا مگر ساری زندگی ایک بے جرم سزا کی طرح کاٹ دی۔“ اس کا چہرہ دہکنے لگا تھا۔

”ریلیکس زین! اس کا فیصلہ تو ہونا ہی ہے اور وقت بہتر منصف ہے۔“ زارا نے رسانیت سے سمجھایا۔

”جو ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے وقت کے انصاف کا انتظار کریں۔ وقت انہیں کچھ بھی نہیں دیتا۔“ وہ تشریح کر بولا اور زارا کے لیے اس کے مزاج کا آثار چڑھاؤ بہت تکلیف دہ تھا۔ وہ اچھے بھلے خوشگوار موڈ میں بیٹھا بیٹھا ایک اذیت میں اتر جاتا تھا۔ تب ہی کسی نے بیرونی گیٹ دھڑو دھڑایا تھا۔

”شاید لائٹ نہیں ہے۔“ ٹیل کی آواز نہ سن کر زین بولا۔ پھر سلیم کا انتظار کیے بغیر خود ہی گیٹ کھولنے چلا گیا تھا۔ کھڑکا ہٹاتے ہی اس سے قبل کہ وہ گیٹ کھولتا۔ کسی نے دھکا دے کر چھوٹا دروازہ کھولا تھا۔

”کیا بے ہودگی ہے یہ۔۔۔“ زین جھنجھلا یا۔ دوسرے بل آنے والے نے اسے گریبان سے پکڑ کر زور دار دھکا دیا۔ زین پشت کے بل زمین پر گر اٹھا۔ اس کے ساتھ ہی دوسرا آدمی بھی اندر داخل ہو گیا۔ زارا ہڑبڑا کر کھڑی ہوئی۔

آنے والوں کے تیور بہت خطرناک تھے۔

زارا بے اختیار آگے بڑھی۔

”تم وہیں رکوئی! یہ تمہارا معاملہ نہیں ہے۔“ عقب سے آنے والے نے ہاتھ اٹھا کر سرودھک لگے۔ میں کہا۔ زارا کے قدم تھم گئے تھے۔ وہ کچھ متوجش کی رکت کر زین کو دیکھنے لگی۔

”ہو کون تم لوگ۔۔۔؟“ زین کھڑا ہو گیا تھا۔ دونوں چہرے اس کے لیے بالکل اجنبی تھے۔ ایک بل کو اس کا دھیان رائے سلیمان کی طرف گیا تھا۔

”تمہارا باپ۔۔۔“ دوسرے شخص نے جارحانہ انداز میں اس کا گریبان دو جا۔

احساس توہین سے زین کا چہرہ سرخ ہو کر کنپٹیاں سلگ اٹھی تھیں۔ اس نے ایک جھٹکے سے اپنا گریبان پھڑپھڑایا۔

”زبان سے بات کرو۔“

”ابھی تو زبان سے ہی بات کر رہے ہیں، لیکن آج کے بعد تم نے اس لڑکی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا تو زندہ زمین میں گاڑ دیں گے۔“

”کون لڑکی؟۔۔۔“ زین نے الجھ کر انہیں گھورا۔

”یہ۔۔۔“ پہلے شخص نے چپل کی جوڑی اس کے آگے پھینکی۔ وہ اس کے گھٹنوں سے ٹکرا کر نیچے

گری۔ زارا کا خیال تھا کہ زین اب ان سے بھڑ جائے گا۔ مگر اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ جب زین مٹھیاں بٹینچے ان چپلوں کو گھورتا رہا۔ پھر اس نے سر اٹھا کر سامنے غصے میں پھرے شخص کو بے حد حیرت سے دیکھا۔

”تمہیں شاید کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔“

”غلط فہمی کے پتر۔۔۔“ وہ پھر سے پھرنے لگا تھا۔

دوسرے شخص نے اس کا بازو پکڑا۔ پھر زین کو گھورتے ہوئے سخت دھمکین لہجے میں بولا تھا۔

”ہم غیرت پر قتل ہو بھی جاتے ہیں، قتل کر بھی

دیتے ہیں۔ بہتر ہے اپنا راستہ بدل لو۔“

”میں نے صرف اس کی مدد کی تھی۔“ زین قدرے

جھنجھلا سا گیا تھا۔ نجانے کون لوگ تھے ایک بے بنیاد

سی بات کو لے کر مرنے مارنے پر اتر آئے تھے۔

”کیوں سن لگتی تھی وہ تیری۔“ پہلے والا تشریح کر

بولا تھا۔

”اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ وہ میری کیا لگتی تھی۔

وہ مصیبت میں بھی اور میں نے انسانیت کے بارے

کی مدد کر دی۔“ زین نے بے حد حیرت سے انہیں دیکھتے ہوئے وضاحت کی تھی۔ جیسے سمجھ نہ پا رہا ہو کہ میں وہ لوگ اتنی سی بات کو اتنا بڑا اثنا بنا رہے تھے۔

”آئندہ اس قابل ہی نہیں رہو گے انسانیت کے برابر۔۔۔“ وہ کچھ زیادہ ہی مشتعل تھا اور بہت کچھ کر

پنے پر آمادہ۔ اس دوسرے شخص نے اسے بازو تھام

رہنے کیا۔

”یہ صرف ایک وارننگ تھی۔ اس کے بعد

رنگ نہیں دیں گے۔ ٹکڑے ٹکڑے کر کے دریا

کی بادیں گے۔ بے غیرت مت سمجھنا ہمیں۔“

زین نے چاہا کہ وہ ان لوگوں کی غلط فہمی دور کر دے

کہ وہ کچھ بھی سننے پر آمادہ نہ تھے۔ دھمکیاں دیتے جیسے

لئے تھے ویسے ہی ٹیٹ گئے۔ وہ کچھ متحیر سا سرخ چہرہ

لے غصہ ضبط کرنے کی سعی کرنے لگا۔ زارا تیزی سے

اس کے قریب آئی۔

”کون تھے یہ لوگ؟“

زین نے ایک طویل سانس لے کر خود کو پرسکون

لے کی کوشش کی۔ پھر آہستگی سے بولا۔

”معلوم نہیں۔۔۔“

”تم سے کیوں جھگڑ رہے تھے۔“

”میں غلط فہمی ہو گئی تھی۔“ اس کا لہجہ اب

کامد ہم اور پرسوج تھا۔ زارا نے تعجب سے اسے

دیکھا۔

”کیسی غلط فہمی؟“

زین نے خاموشی سے آگے بڑھ کر گیٹ لاک کیا۔

”میں وہ سلیمان بھائی۔۔۔؟“ زارا زیر لب

پتائی۔

”میں اس کے بندے نہیں تھے۔“ وہ بس خود کو

بھڑکانے کی کوشش کر رہا تھا۔

”تو پھر کون تھے۔ یوں تمہارے گھر میں گھس کر

نیک دھمکیاں دینا۔ تم پولیس کو انفارم۔۔۔“

”اس کی ضرورت نہیں۔“ وہ قصداً مسکرایا۔

”کیوں ضرورت نہیں۔ کیا جنگل میں رہتے ہیں کہ

جس کا دل چاہے۔ گھر میں گھس کر مار کٹائی کرنے لگے۔“ وہ تھکلا کر بولی۔ اسے زین کے انداز پر حیرت اور غصہ آ رہا تھا۔

”آئیں اندر چلتے ہیں۔۔۔“ وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر

قصداً مسکرایا۔ زارا نے خفگی سے اپنا ہاتھ چھڑایا اور

مشکوک نگاہوں سے اسے گھورتے ہوئے پوچھنے لگی۔

”تم مجھ سے کیا چھپا رہے ہو؟“

”بائے گاؤ۔ کچھ بھی تو نہیں۔ ایک لڑکی کی مدد کی

تھی ذرا سی۔ یہ لوگ نجانے کس غلط فہمی کا شکار ہو

گئے۔“

”یونہی تو کوئی غلط فہمی کا شکار نہیں ہوتا زین

العابدین! خاص طور پر کسی لڑکی کے معاملے میں۔“

”حالانکہ یہی وہ معاملہ ہے جہاں لوگ۔۔۔“ زارا

نے ہاتھ اٹھا کر اسے مزید بولنے سے روک دیا تھا۔

”تم مجھے نال رہے ہو۔۔۔“

”اوہ گاؤ۔ تو آپ کو مجھ پر یقین نہیں۔ بھلا میں

آپ سے کیا چھپا سکتا ہوں۔“ وہ بے حد بے چارگی

سے بولا تھا۔

”شاید بہت کچھ۔۔۔“ وہ اسے شک بھری نگاہوں

سے گھورتی تھی۔ زین محض کندھے اچکا کر رہ گیا۔

”اب میں مزید کیا کہوں۔“

”کچھ مت کہو۔ میں اب چلتی ہوں۔“ وہ یقیناً ”خفا“

ہو کر کہہ رہی تھی اور زین نے اسے روکا بھی نہیں۔

وہ خود اس وقت بہت الجھ رہا تھا۔ بس اتنا کہا۔

”چھپو کو مت بتائیے گا۔ وہ خوا مخواہ پریشان ہو

جائیں گی۔“

زارا نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ پھر قدرے جتانے

والے انداز میں بولی تھی۔ ”اور جو میں پریشان ہوں

گی۔“

”تو کیا حل ہو اس کا۔۔۔“

”کاش تم۔۔۔“ وہ اسے اپنے ہاں شفٹ ہونے کا

کہتے کہتے رک گئی۔ وہ بات سمجھتے ہوئے مسکرا دیا۔

”آپ پریشان مت ہوں۔ مجھے کچھ نہیں ہو گا۔“



”وہ لوگ۔۔۔“

”جو گرجتے ہیں وہ برستے نہیں۔ یہ محاورہ تو سنا ہی ہے۔“  
گاہ آپ نے۔۔۔ زارا کی تشویش و پریشانی پر طمانیت کی  
اک لہری اس کے اندر پھیل گئی۔  
”بس اپنا خیال رکھنا۔۔۔“

(اور جس پل بابائے اس دنیا سے منہ موڑا، میں نے  
سوچا تھا شاید یہ بد نصیبی میری قسمت میں لکھ دی گئی  
ہے کہ اس دنیا میں کوئی ایسا نہ ہو جو میری کسی تکلیف  
پر رنج و آہ اور اب۔۔۔ وہ پرسکون انداز میں مسکرایا۔  
”محببتوں کے اس خزانے کو کہاں سنبھال رکھوں۔“  
زارا کے جانے کے بعد وہ بیڈ روم میں آگیا۔ اس کا  
دھیان اس کالی چادر والی لڑکی کی طرف چلا گیا۔ اس  
کے ماتھے پر شکنوں کا جال سا بچھ گیا تھا۔

♥ ♥ ♥ ♥

زارا گھر آئی تو رضوان بیٹھا تھا۔ اسے دیکھ کر بھرپور  
انداز میں مسکرایا، جبکہ زارا کچھ بے زار سی ہو گئی۔ وہ  
اس وقت رائے باؤس کے کسی کمین کا سامنا نہیں کرنا  
چاہتی تھی۔

”کہاں رہ گئی تھیں زارا۔ رضوان کافی دیر سے  
انتظار کر رہا تھا۔“ ممانے یونہی پوچھا جبکہ وہ جانتی  
تھیں کہ زارا کہاں ہو سکتی ہے۔

”نعم کی طرف گئی تھی۔“ زارا نے مختصراً کہا، پھر  
رضوان کی طرف دیکھتے ہوئے قصداً ”مسکرائی۔“  
”کیسے ہیں آپ؟“

”جیسا نظر آتا ہوں۔۔۔“ اور وہ ہمیشہ کی طرح بہت  
فریش نظر آ رہا تھا۔

”کھانا لگو دو تمہارے لیے۔“ ماما کھڑی ہو  
گئیں۔

”ماما جان، بھوک نہیں ہے۔ رہنے دیں۔“ وہ  
انہیں ٹال کر رضوان کے عین سامنے صوفے پر بیٹھنے  
لگی۔

”میرا خیال تھا۔ ہم لوگ آج اونٹن کے لیے  
نکلنے گئے۔“

”آج۔۔۔“ وہ کچھ متذبذب سی اسے دیکھنے لگی۔  
وہ اس وقت کہیں، خاص طور پر رضوان کے ساتھ  
کیس بھی جانے کے لیے ذہنی و دلی طور پر تیار نہیں  
تھی۔ نہ جانے کیوں زارا کو ان لوگوں سے چڑھی ہوئے  
لگی تھی۔

”مگر موڈ نہیں تو پھر کبھی سہی۔۔۔“ وہ شاید اس کا  
تذبذب پا گیا تھا۔ تب ہی فوراً ”بول اٹھا۔“

”میں واقعی آج کچھ تھکی ہوئی ہوں۔ آپ پلیز  
مانڈیٹ۔“ کچھ گال۔ ”اب کے وہ ذرا دو ٹوک لہجے میں  
بولی تھی۔ ممانے قدرے حیرت سے اسے دیکھا۔  
رضوان پھر کچھ دیر ہی رکا۔

”کیا ہوا۔ کوئی پر اہلم ہے؟۔۔۔“ رضوان کے  
جانے کے بعد ممانے نے پوچھا۔

”پر اہلم کیا ہو گی۔“ وہ النان ہی سے پوچھنے لگی۔  
”تو پھر رضوان کے ساتھ کیوں نہیں گئیں۔“

”بس میرا موڈ نہیں تھا۔“ زارا بیزار کن لہجے میں  
بولی۔

”تمہیں کم از کم رضوان کے ساتھ ایسا سلوک  
نہیں کرنا چاہیے تھا۔ وہ تمہارا شوہر ہے۔“

”جانتی ہوں۔ مگر یہ بھی تو ضروری نہیں کہ جب  
اس کا موڈ ہو تب ہی میں۔۔۔“

”چھا جانے دو۔ یہ بتاؤ۔ زین کیسا ہے؟“ ممانے  
اس کے موڈ کے پیش نظر بات بدلی۔

”زین۔۔۔“ ایک پل کو اس کا ذہن بھٹک کر آج  
کے واقعہ کی طرف چلا گیا۔

”کیا سوچنے لگیں۔“ ماما کی آواز نے اسے چونکا  
دیا۔ تو وہ الجھ کر بولی تھی۔

”مما! زین کتنا اکیلا ہے۔“  
”کیلا کیوں۔ کیا ہم نہیں ہیں۔“ ماما فوراً ”بولیں۔“  
”ہم۔۔۔“ زارا استغناءً یہ انداز میں مسکرائی۔ ”ہم  
کیا ہیں اس کے۔ جس رشتے کا وہ اعلان نہیں کر سکتا۔

ہم کسی کو بتا نہیں سکتے تو کیا معنی رکھتا ہے۔ ہمارا اور  
اس کا تعلق۔ فرض کریں، اگر اسے کوئی پر اہلم ہو۔ کیا

بد کر سکتے ہیں ہم اس کی؟ کیا رائے فیملی اس کے لیے  
کچھ کرنے کو تیار ہوگی۔ نہیں۔۔۔ ہرگز نہیں۔ وہ تنہا  
تھا اور تنہا ہے۔“

”کیا ہوا زارا! زین کو کوئی پر اہلم ہے کیا۔“ ماما فوراً  
اس کی منشن پا گئی تھیں۔ زارا نے سر جھٹکا۔

”بھی بھئی مجھے لگتا ہے۔ ہم نے بہت غلط کیا۔  
خواجہ اہ اسے اپنی محبتوں کا پابند کر دیا۔ وہ آزاد ہوتا تو  
ضرور اپنے لیے کوئی نہ کوئی رستہ ضرور ڈھونڈ لیتا۔“

”تم کیا کہہ رہی ہو۔ زارا؟“ ماما پریشان سی ہو کر  
اسے دیکھنے لگیں۔

”کچھ نہیں۔ بس کبھی کبھی مجھے چڑھی ہونے لگتی  
ہے۔ اس ساری رو میں سے۔“ وہ اپنا بیگ اٹھا کر  
کھڑی ہو گئی۔ کچھ بھی بتا کر وہ ماما کو پریشان نہیں کرنا  
چاہتی تھی اور یہ نہیں جانتی تھی کہ وہ انہیں پریشان کر  
گئی ہے۔

♥ ♥ ♥ ♥

ٹھنڈا رخ فرش تھا۔ گھنی خاموشی سے گلے ملتی  
میب تاریکی، کہیں روشنی کی کوئی کرن، کوئی ننھا سا  
جگنو تک نہ تھا۔ بس کبھی کبھی کوئی دلی دلی سی کراہ ایک  
خوفزدہ سی سسکی تھی۔ جو اسی خاموشی سے ٹکرا کر آکر  
اندھیرے میں بکھر رہی تھی۔

وہ کون تھی؟  
کیوں تھی؟  
اور کہاں تھی؟

اندھیرا ان سارے سوالوں کو نگل گیا تھا۔  
جواب کہاں سے آتے؟۔۔۔

”کیا یہ سارا فساد میرے ہونے کا ہے۔“ ایک زشتی  
کی سوچ نے اس کے خوابیدہ اوٹھتے جاگتے ذہن کو  
بیدار کیا۔ اس کے سہارے کے متلاشی بازو بے  
اختیار پھیلے۔ اندھیرے نے انہیں تھما اور پھر ملی دیوار  
نے اسے سہارا دیا۔ اس نے جلتی آنکھوں کو میچ کر  
کھولا۔ مگر کہیں کوئی منظر نہ جاگا تھا۔ بس وہی ایک  
اندھیرا۔

اس کے لبوں پر سسکیاں منجمد ہو گئی تھیں۔ اس

نے اپنے لرزتے ہاتھوں سے اپنے وجود پر لگے ایک  
ایک زخم کو شمار کرنا شروع کیا۔ پھر تھک کر ٹھنوں میں  
چہرہ چھپا لیا۔ اس کے سوچے ہوئے چہرے پر گرم سیال  
اگ لگانے لگا تھا، اور ہر زخم بے حد حیرت سے اپنا  
قصور پوچھنے لگا تھا۔

وہ جواب کیا دیتی۔ بس زور زور سے رونے لگی  
تھی۔  
اسے اپنی ماں پر غصہ آ رہا تھا، جس نے اسے جنم دیا  
اور خود مر گئی۔  
اسے اپنے باپ سے نفرت محسوس ہو رہی تھی۔  
کہتے تھے اسے اس کی ماں سے بڑی محبت تھی۔ تب  
ہی زمانے کے سمجھانے پر اسے سوئلی ماں کی گود میں  
دے کر خود بھی چلا گیا۔  
پھر وہ ایک دم چپ ہو کر سوچنے لگی۔  
کیا ہوا تھا؟

نیون سائن کی طرح ایک کے بعد دوسرا منظر اس  
اندھیرے میں جھلکانے لگا۔  
وہ مہمان اجنبی، جسے اس نے نظر بھر کے دیکھا بھی  
نہ تھا۔ کہیں کوئی دیکھ نہ لے کے خوف نے اسے نظر  
اٹھانے کی مہلت ہی نہ دی تھی۔ وہ بس گھر آ گئی تھی۔  
جب ترکاری کا مٹی بھا بھی نے اسے خشمگین نگاہوں  
سے گھورتے ہوئے سوال کیا تھا۔  
”تی دیہ۔۔۔“

اس نے خاموشی کا پہلا سبق پانچ سال کی عمر میں  
سیکھا تھا۔ جب پانچ انگلیوں کے نشان اس کے زرد گال  
پر پہلی بار ثبت ہوئے تھے۔ آج بھی کبھی وہ نشان  
خلفے لگتے تھے۔ وہ خاموشی سے آگے بڑھ گئی۔ مگر اس  
کی چال کی لڑکھڑاہٹ نے سارے راز فاش کر دیے۔  
بھابھی کی نگاہیں اس کے چہرے سے پھسل کر ایڑی پر  
بندھی پٹی اور پھر مڑا نہ فیملی چیلوں پر رکی تھیں۔ مگر  
رکی نہیں پھرے اٹھ کر اس کے چہرے پر جمی تھیں۔  
”ارے ماں۔۔۔ یہ کیا ہے؟“ اس ایک، جیلے میں ان  
گنت سوال تھے۔ شک کے کوڑیا لے سانپ اس کے  
گر د پھنکارنے لگے۔ وہ ساری جان سے لرز گئی۔

222



”شش۔ شیش لگ گیا تھا۔“

”چھا۔“

”میرا جوتا ٹوٹ گیا تھا۔“ نجانے کیا بات تھی کہ کوئی خوف اسے جھوٹ بولنا نہ سکھا سکا۔ وہ ہمیشہ ڈر کر سارے سچ اگل دیتی تھی۔

بھابھی کی آنکھوں میں ایک شاطرانہ سی چمک ابھری۔ بہت عرصہ ہوا گھر میں کوئی ہنگامہ نہ جاگا تھا اور قدرت نے یہ موقعہ پلیٹ میں رکھ کر پیش کیا تھا۔ اس قابلِ نفرین وجود سے ہمیشہ کے لیے نجات حاصل کرنے کا ایک خوبصورت موقعہ۔ ان کے ذہن نے پل بھر میں اس ڈرامے کے سارے ڈائیلاگ ترتیب دیے۔

”کوئی مال۔۔۔ میں مر گئی۔“

یہ پہلا ڈائیلاگ تھا جو انہوں نے نین تارا کے کندھے پر وہ ہتھڑا مارتے ہوئے بولا تھا۔ پھر وہ لپک کر بھائی کے گمرے میں گھس گئیں۔ پتا نہیں وہاں کون سا سین لکھا گیا۔ بس وہ پھرا ہوا باہر آیا تھا۔ اور اس نے وہی چپل اٹھائی تھی۔ وہ ہکا بکا سی پتی رہی۔ پھر چیخ چیخ کر معافی مانگنے لگی۔ بنا کسی قصور کے۔ بس اسے عادت سی ہو گئی تھی۔ مار کے خوف سے وہ جرم کی نوعیت جانے بغیر معافی مانگنے لگتی تھی۔ جو اس کے ناکرہ جرم کو ثابت کرنے کے لیے کافی ہوتی۔

تب بھی وہ بس چیخ چیخ کر کہتی رہی۔

”اب نہیں کروں گی۔ اب نہیں کروں گی۔“

”اب تمہیں کچھ کرنے کے قابل ہی کہاں

چھوڑوں گا میں۔۔۔“ اس نے اسے گھسیٹ کر کمرے

میں رومی مال کی طرح پھینک کر دروازہ بند کر دیا تھا اور

اب وہ پھر سے اپنے اللہ سے شکوہ کناں تھی۔

”کیوں بھی وہ۔۔۔ کیا اس کا ہونا اتنا ہی اہم تھا۔“

اگر تھا تو کس کے لیے؟

اگر وہ نہ ہوتی تو کہاں کی واقع ہوتی۔ شاید کہیں بھی

نہیں۔ اس نے ایک بار پھر سوچا اسے مرجانا چاہیے۔

مرجانا اتنا ہی تنہا نہیں ہے جتنا کہ زندہ رہنا۔

اس نے تھک کر گھٹنوں میں چوہ چھپا لیا۔ شاید

اسے وہ ہمت درکار تھی۔ جو اسے کوئی انتہائی قدم اٹھانے پر مجبور کر دے۔

♥ ♥ ♥ ♥

”مر جائے گی وہ۔۔۔“

”مر جانے دو۔“ کیسی سفاکی تھی اس کے لہجے میں۔ بتول نے ہنڈیا میں ڈوکی گھمائی پھر ڈھکن رکھ کر مکمل طور پر ظہور کی طرف متوجہ ہوئی۔

”اے سر کیوں لیتے ہو۔ بلاؤ اس کے مامے کو۔ آجاتا تھا نصیحتوں کے ٹوکے اٹھاے۔ بیم کے سر پر ہاتھ۔۔۔ یہ انجام ہوتا ہے۔“ وہ متغیر لہجے میں کہتی ظہور کو کچھ اور متغیر کر رہی تھی۔

”بلوایا ہے اسے بھی۔ بس یہی ڈر ہے کہیں وہ ساتھ لے جانے کی بات نہ کرے۔“ ظہور کے لہجے میں ایک بل کو تشویش جھلکی۔

”تو فوج کرنا۔۔۔!“

”ایسے کیسے کر دوں۔ پانچ مرلے کا مکان ہے اس کے نام۔ وہ آج میرے نام کر دے۔ پھر میری بلا سے جہاں مرضی دفع ہو۔“ وہ ایک دم بھڑک کر بولا تھا۔

بتول کی تیوری چڑھ گئی۔

”مجھے تو اس بڑھے کی عقل پر حیرت ہے۔ لے کر پوتی کے نام مکان کر دیا۔ کل کو بیاہ ہو تو جائیداد تو چلی گئی ناغیروں کے قبضے میں۔“

”اس کی تو مت ماری گئی تھی۔ پر میری سمجھ میں

نہیں آتا۔ میں کیا کروں۔“ ظہور کچھ الجھ کر بولا۔

”گرتا کیا ہے۔ کچھ ڈرا دھکا کر مکان اپنے نام

لکھواؤ اور اسے اس کے مامے کے ساتھ رخصت کر

دو۔ ہم کہاں اس کی رکھوالی کرتے رہیں۔ نجانے کون

کون سے گل کھلانے والی ہے۔ ہم تو یوں بھی بدنام

ہیں سو تیلے جو ہوئے۔“

”اپنے نام لکھوالوں اور وہ جو نیاز ہے۔“ وہ طنز کے

ساتھ گویا ہوا۔

”اسے اپنے ساتھ ملاؤ۔ ورنہ وہ کچھ بھی نہیں

کرنے دے گا۔“ بتول نے مشورہ دیا۔ ”آج بھی مل

مکان۔۔۔ کئی لاکھ کا ہو گا۔ پھر نیاز پڑھا لکھا ہے۔ کوئی بہتر رستہ ہی نکالے گا۔“ بتول نے مشورہ دیا۔ ظہور کی ڈور تو یوں بھی اس کے ہاتھ میں تھی۔ جو وہ کہتی آنکھیں بند کر کے عمل کرتا۔

”ہوں۔ کہتی تو تم ٹھیک ہو۔“ ظہور نے پر سوچ انداز میں سر ہلایا۔

”بہتر یہ ہے کہ اس کے مامے کے آنے سے پہلے کچھ کر لو۔ کہیں وہ ساتھ ہی نہ لے جائے۔“

”یوں جانے دیں گے بھلا۔“ ظہور نے کہا پھر اٹھ کر چپل پہنے لگا۔ ”میں مشورہ کرتا ہوں نیاز سے۔ تم اسے کچھ کھلا پلا دو۔ کہیں مرمرا ہی نہ جائے۔“

ظہور کے جانے کے بعد بتول کچھ دیر یونہی بیٹھی سوچتی رہی۔ چولے میں آگ بجھ گئی تھی۔ پھر اس نے سر جھٹک کر دوپٹے کے پلو سے ہنڈیا نیچے اتاری۔ چنگیر اٹھا کر دیکھا۔ اس میں دوپہر کی روٹیاں پڑی تھیں۔

بتول نے روٹی پر آلو گا جروں کا سالن ڈالا۔ پھر چنگیر اٹھا کر کونے والے کمرے کی طرف چل دی۔ کھڑکا اٹھا کر اس نے دروازہ کھولا۔ دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھی نین تارا نے گھٹنوں سے سراٹھا کر اسے دیکھا۔ بتول نے چنگیر اس کے قریب رکھی۔

”روٹی کھالے تارای۔“ بتول کے لہجے میں خلاف معمول ہلکی سی نرمی تھی۔ نین تارا کی آنکھوں میں خوف جاگا۔

”تم تو مجھے ہی قصور وار سمجھتی ہو گی۔ میری بھی عقل ماری گئی اس لیے جو جا کر تمہارے بھائی سے کہہ بیچی۔ وہ تو یوں بھی غصے میں پاگل ہو جاتا ہے۔ صبح سے دروازہ کے سامنے چارپائی ڈالے بیٹھا تھا۔ ابھی باہر نکلا تو میں روٹی لے آئی ہوں۔“

نین تارا یونہی چنگیز کو گھورتی رہی۔ وہ کہنا چاہتی تھی کہ بھابھی یہ کہانی اسے سنانا جو تمہیں جانتا نہ ہو۔

میں نے تو بچپن سے آج تک تمہارا ہر ہر روپ دیکھا ہے۔ مگر وہ لب بستہ روٹی کو گھورتی رہی۔ اسے بے حد بھوک لگی تھی مگر وہ متذبذب تھی۔ شاید جانتی تھی کہ اس پر روٹی کے معنی کچھ اور ہیں۔ کیا اتنا معلوم

ہو سکتا ہے؟

نہیں تھا؟

”روٹی سے کیسی دشمنی۔ ابھی ظہور آگیا تو مجھ پر برسے گا۔“ بتول نے پکارا۔

”نوالہ بنا کر منہ میں رکھنے والا باپ نہیں۔ کھانے سے ناراضی پر سو سو منٹیں کر کے کھلانے والی ماں بھی نہیں۔ جسم و جاں کا رشتہ تو قائم رکھنا ہے تارا بی بی۔“ اس نے آہستگی سے ہاتھ پڑھا کر نوالہ توڑا۔ بتول قدرے مطمئن ہو گئی۔

”سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں سمجھاؤں گی ظہور کو۔“ بتول نے سر پر ہاتھ رکھ کر تسلی دی۔

نین تارا کا دل چاہا وہ اس کا ہاتھ جھٹک دے۔ مگر وہ بت بنی بیٹھی رہی۔ بتول باہر نکل گئی۔ دروازہ ایک بار پھر بند ہو گیا تھا۔

♥ ♥ ♥ ♥

سب سے چھپ کر بیٹھ جانے کی خواہش اسے لا بھرری کے کونے تک لے گئی تھی اور اب وہ بے مقصد لکیریں کھینچتا ہوا نجانے کن سوچوں کے گرداب میں الجھا تھا۔ کسی سوچ کا چہرہ واضح نہ تھا۔ وہ ابھی ابھی سوچوں کے درمیان کبھی بابا سے شکوہ کرنے لگتا۔ کبھی زارا اور پچھو کی محبتوں پر غور کرنے لگتا۔ تو کبھی سیاہ چادر کی اوٹ سے موہنا سا سماں کھدرا جھانکنے لگتا اور پھر وہ لوگ۔

”کون ہو سکتے تھے؟“

وہ سب کچھ بھول کر پھر سے ان ہی کے بارے میں سوچنے لگا۔ حقیقت تو یہ ہی تھی کہ پچھلے دو دنوں میں زین نے اس لڑکی کے بارے میں سوچا بہت تھا۔ وہ اب بھی حیران تھا۔ بغیر کسی معقول وجہ کے ایک ذرا سی بات کی بنیاد پر وہ لوگ کس طرح غلط فہمی کا شکار ہو گئے تھے۔

”عجیب جاہل اور شکی مزاج لوگ تھے۔ زارا وہاں نہ ہوتی تو میں ہوتا۔“ وہ ایک دم جھنجھلا سا گیا۔

”کیا تم نے ہواؤں سے بھی لڑنا شروع کر دیا ہے۔“ زین نے چونک کر سراٹھایا۔ پھر زارا کو دیکھ کر مسکرا

دیا۔



”مجھے کس سے لڑنا ہے میں کس سے لڑ سکتا ہوں۔“ اس کا لہجہ مایوس سا تھا۔

”ہو نہ۔۔۔“ زارا نے ہلکے سے سرزنش کی۔ ”یہ مایوسی کس سے ہے؟“

”بھئی مجھے لگتا ہے۔ بابا نے مجھے بہت بڑا ہونا دیا ہے۔ میں کبھی کسی سے نہیں لڑ سکتا۔“ اس نے بہن کو زور سے دہرایا اس کی نپ ٹوٹ گئی۔

”لڑنا کوئی اچھی بات بھی نہیں۔“

”جو لڑنا نہیں جانتے۔ وہ ہمیشہ ہار جاتے ہیں۔“

میرے بابا کی طرح۔“ اس کے لہجے میں طنز اتر آیا۔

زارا نے دانستہ اس کا جملہ نظر انداز کیا اور بات بدلتے ہوئے بولی تھی۔

”میں کافی دیر سے تمہیں تلاش کر رہی تھی۔“

”کیوں۔۔۔“ زین نے نظروں کا زاویہ بدل کر اسے دیکھا۔

”یوں ہی میں نے سوچا۔ آج ہم لٹچ باہر کرتے ہیں۔ کوئی کلاس تو نہیں ہے تمہاری۔“ زارا دیکھ رہی تھی وہ پھر ریاست کا شکار ہو رہا تھا۔ سو اس کا موڈ بدلنے کو اچانک ہی پلان بنا بیٹھی۔

”کلاس تو کوئی نہیں ہے۔“

”تو بس پھر اٹھ جاؤ۔۔۔“

”میں تو تیار ہوں۔ مگر کہیں جو آپ کے رضوان صاحب مل گئے تو۔۔۔“ زین نے کھڑے ہوتے ہوئے چھیڑا۔

”تو کیا ہوا انہیں بھی ساتھ لے لیں گے۔۔۔“ زارا نے قدرے لا پرواہی دکھائی۔

”چھ متعارف کیا کہہ کر کروائیں گی مجھے۔۔۔“

”ہم اچھے دوست بھی تو ہو سکتے ہیں۔“ زارا نے مسکراتے ہوئے اسے دیکھا۔

”سوچ لیں۔ میں اچھی خاصی پریکٹس رکھتا ہوں اور عمر میں آپ سے کچھ بڑا ہی لگتا ہوں گا۔ موصوف جیلس ہو جائیں گے۔“ زین نے چھیڑا۔

”جسٹ شٹ اپ۔ رضوان ایسے نہیں ہیں۔“ زارا نے اسے گھور کر دیکھا تو وہ ہنس دیا۔

”اب بھیج کر پوچھنے لگا۔“

”رازے قبیلے میں اچھے لوگ بھی ہوتے ہیں۔“

”رازے قبیلے انسانوں پر ہی مشتمل ہے۔ ہائے دلوے میرے اور ماما کے بارے میں کیا رازے ہے تمہاری۔۔۔“

”آپ دونوں تو اسپیشل ہیں۔“ وہ اس کی خفگی محسوس کر کے ہنس دیا۔

”اچھا چائینز چلو گے۔“ وہ لوگ پارکنگ میں پہنچ گئے تھے۔ زارا نے گاڑی کا لاک کھولتے ہوئے پوچھا تھا۔

”جہاں آپ لے چلیں گی کیونکہ میں تو غریب سا بندہ ہوں۔ یہ ہوٹلنگ وغیرہ تو انورڈی نہیں کر سکتا۔“ وہ کندھے اچکا کر بولا تھا۔ زارا ہنس دی۔ وہ دونوں چائینز رستوران میں آگئے۔

”کیا لوگ؟“ مستعد بیرے نے ان کے سامنے مینو کارڈ لارکھے تھے۔

”کچھ بھی ایسا جو سمجھ میں آسکے کہ کیا کھا رہے ہیں۔“ زین نے رستوران کا جائزہ لیتے ہوئے یوں ہی جواب دیا۔ حالانکہ وہ اور بابا اکثر چائینز آیا کرتے تھے۔

زارا نے مسکراتے ہوئے آرڈر دیا۔ زین اب بھی رستوران میں آتے جاتے لوگوں کا معائنہ کر رہا تھا۔ جب زارا نے آستنی سے پوچھا۔

”وہ لوگ پھر تو نہیں آئے۔۔۔“

”وہ کون۔۔۔؟“ زین نے چونک کر پوچھا۔ ایک بل کو اس کے ذہن سے نکل گیا تھا کہ زارا کس کے بارے میں پوچھ رہی ہے۔ پھر ایک دم یاد آنے پر نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا تھا۔

”نہیں آئے۔۔۔“

”وہ لڑکی کون تھی۔۔۔“ زارا نے پوچھا۔ زین مسکرا دیا۔

”آپ کو شاید میری بات پر یقین نہیں آیا تھا۔ میں واقعی خاصا شریف نوجوان ہوں۔ کسی لڑکی کو اس انداز میں نہیں جانتا۔ وہ تو اس کے پاؤں میں شیش لگ گیا تو

میں۔۔۔۔۔“

”لوگ۔ لیو اٹ۔ مجھے یہ کہانی بار بار نہیں سننی۔۔۔“ زارا چڑ کر وسطی طرف متوجہ ہوئی۔ جو سوپ سرو کر رہا تھا، زین ایک طویل سانس لے کر رہ گیا۔

حقیقت بس اتنی سی ہی تھی جسے زارا قبول نہیں کر رہی تھی۔ سو وہ لوگ خاموشی سے سوپ پینے لگے۔ تب ہی زارا کی نگاہ بھٹک کر داخلی دروازے کی طرف گئی۔ ایک بل کو اسے لگا اس کی روح فنا ہو گئی ہو۔

”سلیمان بھائی۔۔۔“ اس کی آواز سرگوشی سے زیادہ نہ تھی۔ زین نے چونک کر پہلے اسے پھر اس کی نظروں کے تعاقب میں پلٹ کر دیکھا۔ واٹ کاٹن کے شلوار سوٹ اور واسکٹ میں ملبوس اس سنجیدہ، خوبصورت اور پروقار شخص کو دیکھ کر اس کی کپٹی کی رگیں تن گئیں۔ اس کے ساتھ رضوان بھی تھا۔ زین نے پلٹ کر زارا کو دیکھا۔ وہ کچھ بزل سی نظر آئی۔ زین لب لہجے سوپ میں چبچب گھمانے لگا۔

”اب دیکھتے ہیں آپ ہمیں کس طرح متعارف کرواتے ہیں۔“ زارا نے چونک کر زین کو دیکھا۔ وہ قدرے سنجیدہ نظر آیا۔ زارا نے بنا کچھ بولے سوپ کے پیالے کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے ان لوگوں کو نظر انداز کرنے کی دانستہ کوشش کی۔ جبکہ دھیان پورے کا پورا اسی طرف تھا۔ کچھ لمبے کے بعد اسے احساس ہوا کہ وہ لوگ اب وہاں نہیں ہیں۔ اس نے ذرا کی ذرا نظرس اٹھا کر دیکھا۔ وہ لوگ اب وہاں نہیں تھے۔ شاید ان کا ارادہ بدل گیا تھا یا کوئی امپورٹنٹ کال۔ کیونکہ جس بل زارا نے انہیں دیکھا سلیمان بھائی فون پر بات کر رہے تھے۔ زارا کے چہرے پر اطمینان سا بکھر گیا، جبکہ زین کے لبوں پر بکھری طنزیہ مسکراہٹ کچھ اور گہری ہو گئی تھی۔

”یہ ہے میرا اور آپ کا رشتہ، ڈر اور خوف کی چادر میں لپیٹا ہوا۔“ سوپ کے پیالے میں چبچب گھماتے ہوئے اس کا لہجہ گہرے طنز کا غماز تھا۔

”جانتی ہیں۔ اس بل میرا کیا دل چاہا تھا۔“ وہ دونوں ہتھیلیاں میز کے کنارے پر نکا کر ذرا سا اس کی

طرف جھکا۔ ”میں رائے سلیمان حیدر کے پاس جاؤں اور کہوں ”ہائے! میں ہوں زین العابدین۔ رائے سکندر حیات کا اکلوتا فرزند۔ کیا آپ کیسٹیشن ہوتے اس کے۔ اور کیا کرتے وہ اس لمحے پمپل نکالتے اور گولی دلغ دیتے میرے سینے پر۔ رہا جواز تو خاصا معقول جواز ہے ان کے پاس۔۔۔ میں ان کے باب کے قاتل کا بیٹا ہوں اور اپنے باپ کے قاتل کی نسل ختم کرنے کا پورا حق حاصل ہے انہیں۔۔۔ ہے نا۔۔۔“

زارا جزیرہ ہو گئی۔

”یہ ہے میری زندگی۔ اور آپ کہتی ہیں زین العابدین تم ایسی زندگی جیو۔۔۔ یہ زندگی ہے زارا۔ اسے۔۔۔ اسے زندگی کہتی ہیں آپ۔ کیا اس سے زیادہ پرسکون لمحے موت کے نہیں ہوں گے اور پھر میں کیوں جیوں ایسی زندگی۔ میرا جرم کیا ہے۔ کوئی تو جرم نکلے میرے نام خواہ معمولی کیوں نہ ہو۔ میں کسی طرح تو اس فرار پر خود کو آمادہ کر سکوں۔“ وہ ایک طیش میں بولے چلا گیا۔ اس کی آنکھوں میں ایک وحشت سی جاگ اٹھی تھی۔

”زین پلین۔۔۔ کنٹرول یور سیلٹ۔۔۔“ زارا نے لجاہنت سے کہا۔ زین نے سوپ کا پیالہ دھکیلا اور خود ایک جھٹکے سے کھڑا ہو گیا۔

”سواری۔ مجھے اب بھوک نہیں ہے۔“

یہ کہہ کر وہ رکنا نہیں تھا۔ لمبے لمبے ڈگ بھرتا چلا گیا۔ زارا لب لہجے سوپ کے پیالے میں جھانکتی رہی۔

♥ ♥ ♥ ♥

نیم تاریک کمرے کی ٹھنڈک میں اترتے شام کے گہرے سایوں میں باہر سے آتی آوازوں کے جھوم نے ایک شور برپا کر رکھا تھا۔ وہ نیم جاں سی چارپائی کی پیٹی پر سر نکالے اپنے اوپر لگے الزامات کی فہرست سنتے ہوئے دم بخود تھی۔

کبھی کبھی اسے شک سا ہوتا۔ جس نین تارا کی وہ لوگ بات کر رہے ہیں، وہ نہیں کوئی اور ہے اور وہ محض جس کے ساتھ اسے منسوب کیا جا رہا ہے۔

227

لب بھیج کر پوچھنے لگا۔

”رازے قبیلے میں اچھے لوگ بھی ہوتے ہیں۔“

”رازے قبیلے انسانوں پر ہی مشتمل ہے۔ ہائے دلوے میرے اور ماما کے بارے میں کیا رازے ہے تمہاری۔۔۔“

”آپ دونوں تو اسپیشل ہیں۔“ وہ اس کی خفگی محسوس کر کے ہنس دیا۔

”اچھا چائینز چلو گے۔“ وہ لوگ پارکنگ میں پہنچ گئے تھے۔ زارا نے گاڑی کا لاک کھولتے ہوئے پوچھا تھا۔

”جہاں آپ لے چلیں گی کیونکہ میں تو غریب سا بندہ ہوں۔ یہ ہوٹلنگ وغیرہ تو انورڈی نہیں کر سکتا۔“ وہ کندھے اچکا کر بولا تھا۔ زارا ہنس دی۔ وہ دونوں چائینز رستوران میں آگئے۔

”کیا لوگ؟“ مستعد بیرے نے ان کے سامنے مینو کارڈ لارکھے تھے۔

”کچھ بھی ایسا جو سمجھ میں آسکے کہ کیا کھا رہے ہیں۔“ زین نے رستوران کا جائزہ لیتے ہوئے یوں ہی جواب دیا۔ حالانکہ وہ اور بابا اکثر چائینز آیا کرتے تھے۔

زارا نے مسکراتے ہوئے آرڈر دیا۔ زین اب بھی رستوران میں آتے جاتے لوگوں کا معائنہ کر رہا تھا۔ جب زارا نے آستنی سے پوچھا۔

”وہ لوگ پھر تو نہیں آئے۔۔۔“

”وہ کون۔۔۔؟“ زین نے چونک کر پوچھا۔ ایک بل کو اس کے ذہن سے نکل گیا تھا کہ زارا کس کے بارے میں پوچھ رہی ہے۔ پھر ایک دم یاد آنے پر نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا تھا۔

”نہیں آئے۔۔۔“

”وہ لڑکی کون تھی۔۔۔“ زارا نے پوچھا۔ زین مسکرا دیا۔

”آپ کو شاید میری بات پر یقین نہیں آیا تھا۔ میں واقعی خاصا شریف نوجوان ہوں۔ کسی لڑکی کو اس انداز میں نہیں جانتا۔ وہ تو اس کے پاؤں میں شیش لگ گیا تو

228



کون تھا۔۔۔؟ وہ تو اس کا نام بھی نہیں جانتی تھی۔  
دروازہ کھلا تھا اور نین تارا یہ دروازہ بند کر دینا چاہتی  
تھی۔ ہمیشہ کے لیے۔ لیکن وہ یوں ہی پڑی مگر مگر کھلے  
دروازے سے باہر جھانکتی رہی۔ جہاں صحن کا ایک  
حصہ اس کی نگاہوں کی زد میں تھا۔ جہاں افسردہ و پرشمرہ  
سی شام بکھری تھی۔ اس نے پھر سے آوازوں پر کام  
دھری۔

”تھی سو تلی پر میں نے سگی سے بڑھ کر چاہا۔“  
”اچھا۔۔۔“ وہ عجیب سے انداز میں مسکرائی اور  
جس شخص کو وہ یہ کہانی سنائی جا رہی تھی۔ کیا وہ بالکل  
ہی انجان ہے۔

”کسی شریف لڑکی کے یہ پھتن تو نہیں ہوتے کہ  
یوں جا کر لڑکوں سے ملے۔ میری تو ناک کٹ گئی۔ محلے  
والے تو باتیں۔۔۔“

اور یہ کیسی زندگی ہے جو میں جی رہی ہوں کیا یہ  
واقعی جیسے جانے کے قابل ہے۔ ”ایک بار پھر کچھ کھا  
کر ہمیشہ کے لیے سو رہنے کی خواہش نے بڑی شدت  
سے اس کے اندر سراٹھایا۔

”اور یہ لوگ جو اس کے اپنے ہونے کے دعوے  
دار ہیں۔ کیا اسے جانتے نہیں۔ یا نہ جانے کا ڈھونگ  
رچا رہے ہیں۔“

اس نے کان بند کر لیے۔

نجانے کتنا وقت گزرا تھا۔ جب دروازے سے آتی  
شام کا رستہ کسی وجود نے روک لیا تھا۔ اندھیرے کا  
احساس برہما۔ تو نین تارا نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔  
تہ بند کرتے میں ملبوس ادھیڑ عمر شخص کے سانولے  
چہرے کی چند جھریوں میں عجیب سی یاسیت دکھ اور  
ہمدردی کا احساس بہہ رہا تھا۔ وہ نہ کر جانہ برسانہ  
اسے لعن طعن کیا۔ بس خاموشی سے اگر اس کے  
قریب آئی۔

”ماما۔۔۔“ نین تارا نے سراٹھا کر خاموش بیٹھے  
شخص کو خوف کے عالم میں دیکھا۔  
”یہ تو نے کیا کیا تارا پتر۔۔۔“

ہائے کیسا دل کو چیرتا ہوا لہجہ تھا۔ نین تارا ترپ

انھی۔  
”اس دنیا میں کوئی تو ایسا ہو جو بنا کے میری سبے  
گناہی پر اعتبار کرے۔“

”میں نے کچھ بھی نہیں کیا ماما۔۔۔“ اس کا کمزور  
وہ بے بس لہجہ شاید اس کا دفاع کرنے کے قابل نہ تھا  
تب ہی ماما نے اگلا سوال کیا تھا۔  
”تو تو پڑی صابر دھی تھی۔۔۔“

”تھی۔“ نین تارا کے دل میں تیرکی طرح لگا تھا۔  
”کون ہے وہ۔۔۔؟“ تب نین تارا نے بے اختیار  
خواہش کی تھی۔

”کاش واقعی کوئی ہوتا۔ شاید تب یہ بے جرم سزا کا  
احساس تو نہ مارتا۔“

”ماما! کیا میں ایسی ہوں۔“ اس نے کس بے چارگی  
سے سوال کیا تھا۔ اس کا دل کج بھی اتنا ہی پاکیزہ  
و مصفا تھا۔ کہیں کوئی ذرا سی بھی بے ایمانی نہ تھی اس  
کے دل میں۔ مگر اس کا ماما بھی تو مرد تھا۔  
”تو کیا یہ سارے جھوٹ بولتے ہیں۔“

”یہ ان سے پوچھو یا اپنے دل سے۔ بس مجھ سے  
کچھ مت پوچھو ماما کہ میرے پاس تو کہنے کو بھی کچھ  
نہیں۔ یہ ایک زخم لگ گیا تھا۔“ اس نے اپنا باؤں  
آگے کیا۔ ”بس بٹی باندھی تھی اس نے میری جگہ کوئی  
بھی ہوئی شاید وہ یوں ہی مدد کرتا اور میں نے تو پہلے  
اسے کبھی دیکھا بھی نہیں تھا بلکہ اس دن بھی نہیں  
دیکھا تھا۔ میں تو یہ بھی نہیں جانتی۔ اس کا نام کیا ہے۔  
وہ کیا کرتا ہے۔ ماما! یہ لوگ مجھے جینے نہیں دیں گے۔ پتا  
نہیں یہ ایسا کیوں کر رہے ہیں۔“ وہ روئے گئی تھی۔  
”مجھے اپنے ساتھ لے چلو ماما۔ مجھے یہاں نہیں رہنا۔“  
اس نے سراٹھا کر مٹی لہجے میں کہا۔ ماما دم سادھے  
مگر صبر بیخا نجانے کیا سوچ رہا تھا پھر ایک طویل سانس  
لے کر کھڑا ہو گیا۔

”ماما! میں تمہارے ساتھ جاؤں گی۔“ نین تارا  
نے پھر سے کہا۔ یہی ایک رشتہ تھا۔ اس کی آس  
کی امید۔

ماما نے اثبات میں سر ہلایا۔ پھر ہر نکل گیا۔ سب

کی سوائے نظریں اس کی طرف انھیں وہ تھکے تھکے  
انداز میں چارپائی پر بیٹھ گیا۔ بہت دیر جوتے کی نوک پر  
نظریں جمائے رکھنے کے بعد مامے مقبول زیر لب  
بڑبڑایا۔

”وہ ایسی تو نہیں لگتی۔“

”ایسی دیکھی کے سر پر سینک نہیں ہوتے۔ قدم  
بھٹکتے دیر لگتی لگتی ہے۔“ بتول چمک کر یوں۔

”غلط فہمی بھی تو ہو سکتی ہے۔“ مامے مقبول نے  
آہستگی سے کہا۔

”کوئی غلط فہمی نہیں ہے ماما۔ بتول کو اس نے ڈر  
کے مارے سب کچھ بتا دیا ہے۔“ ظہور بے زاری سے  
بولے۔

”تو اب کیوں مکر رہی ہے۔۔۔“

”میں سنی ہے اور پھر کس کا حوصلہ ہو گا کہ خود  
اپنے کرتوت سب کے سامنے کھولے۔ کبھی چور نے  
بھی کہا کہ اس نے چوری کی ہے۔“ بتول نے بات کہہ  
کر تائید کے لیے ظہور کی طرف دیکھا۔

”میں نے تو اس پر اعتبار کیا۔ صبح و شام نکلتی تھی  
پڑھائی کے بہانے۔ کون جانے کہاں جاتی تھی۔ اب  
میں اپنی دکان دیکھوں یا گھر بیٹھ کر اس کی نگرانی  
کروں۔“ ظہور بھڑک کر بولا تھا۔ تب ہی بیرونی  
دروازے پر ہلکی سی دستک کے بعد نیا زائر داخل ہوا۔  
”سلام ماما۔۔۔“

”و علیکم السلام۔“ مامے مقبول نے ذرا سا سراٹھا  
کر اسے دیکھا اور پھر سے جوتے کی نوک پر نظریں جما  
دیں۔

”آگئے ماما۔ چل گیا پتا۔ اپنی بھانجی کے کرتوتوں  
کا۔۔۔“ نظریہ لہجے میں کتنا وہ اس کے قریب بیٹھا۔  
”تمہاری بھی تو کچھ لگتی ہے۔“ اس نے آہستگی  
سے کہا۔

”یہی تو مصیبت ہے کہ کچھ لگتی ہے ہماری۔ ورنہ  
اب تک گلزے گلزے کر کے دریا میں بہا دیتے۔“  
نیا زانی ہتھیلی پر مکار سید کرتے ہوئے غرایا۔

”پھر ہم جوتے بھی کون ہیں۔ سوتیلے کا تو نام ہی

بدنام ہے۔“ بتول ہاتھ نچا کر بولی۔  
”پھر تم لوگوں نے سوچا کیا ہے۔“ مامے مقبول نے  
قدرے بیزار لہجے میں پوچھا۔ وہ بار بار کی دہرائی گئی  
باتوں سے آگیا تھا۔

”سوچنا کیا ہے۔ بیاہ کرنا ہے اس کا۔ کوئی لڑکا دیکھو  
پنڈ میں۔ اوھر شہر میں رشتے ملنا بہت مشکل کام ہے اور  
اب پہلے والی تو بات بھی نہیں رہی۔ بدنام لڑکی کو  
تو۔۔۔“ لگتا ہی نہ تھا کہ ظہور اپنی بہن کے متعلق بات  
کر رہا تھا۔

”میرے ساتھ بھیج دو۔ میں خود ہی کوئی مقبول لڑکا  
دیکھ کر اسے رخصت کر دوں گا۔“ مامے نے آہستگی  
سے کہا۔

”وہ راضی ہوگی تب نا۔“ بتول بڑبڑائی۔

”تو چپ رہ۔“ ظہور نے اسے گھر کا۔ پھر مامے کی  
طرف متوجہ ہوا۔ ”تمہارے ساتھ بھیج کر جگ کی  
باتیں سنیں لوگ تو یہی کہیں گے سوتیلی بہن کا بوجھ نہ  
اٹھا سکے۔ اس نے تو ہمیں کہیں کا نہیں رکھا۔ پر ہمیں  
تو دنیا کا منہ رکھنا ہے۔“

”مرتے ہوئے باپ کی کہی بات کا لحاظ ہے  
درنہ۔۔۔“ نیا زکچھ زیادہ ہی جذباتی تھا۔

”تو اب میں کیا کروں۔ اس کے ساتھ جو سلوک  
بھی تم لوگوں نے کرنا تھا کر لیا۔“ ماما اس وقت خود کو  
بے حد بے بس محسوس کر رہا تھا۔ وہ جانتا تھا تارا ایسی  
لڑکی نہیں۔ مگر وہ ان لوگوں کی بات بھی نہیں ٹال سکتا  
تھا۔

”کرنا کیا ہے۔ بس کوئی لڑکا دیکھو۔ برادری میں  
بیٹھے ہو کوئی تو ہو گا۔“

”برادری میں اب کون رہا ہے۔“ مامے مقبول کا  
ذہن دور دور تک سوچ رہا تھا۔ مگر ہر طرف مایوسی ہی  
نظر آرہی تھی۔

”یہ اب ہم کیا جانیں۔ حالات تمہارے سامنے  
ہیں۔ تم خود سیرانے ہو۔ اس سے پہلے کہ پانی سرے  
گزر جائے کوئی سدباب کر لو۔ ورنہ ہمارے پاس تو  
ایک ہی حل ہے کہ اس بے غیرت کو زندہ زمین میں



گاڑ دیں۔“  
”اللہ کے واسطے پتر۔ اب مزید اس کے ساتھ کچھ مت کرنا۔ میں کرتا ہوں کچھ۔“ اس کی بوڑھی آنکھوں میں نمی اتر آئی۔ مری ہوئی بہن کی ایک ہی نشانی تھی۔

”جلدی کرنا ماما! ہم سے اب اس کی زیادہ عمرانی نہیں ہوتی۔۔۔“ نیاز کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔

”بیٹھو نیاز بھائی! میں چائے کا پانی رکھتی ہوں۔ بس اس چکر میں دھیان ہی نہیں رہا۔“ بتول نے جلدی سے جیٹھ کو روکنا چاہا۔

”نہیں۔ اس کی ضرورت نہیں۔ میں ہوٹل اکیلا چھوڑ آیا تھا۔“ اس کا چائے کا چھوٹا سا ہوٹل تھا ماما مقبول بھی اٹھ کھڑا ہوا تو ظہور بول اٹھا۔

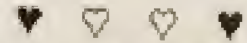
”تم کہاں ماما! روٹی پانی کھا کر جانا۔“

”اب روٹی کس کے گزرنی ہے پتر۔“ ماما نے دل گرفتگی سے کہا۔ ”بس چلتا ہوں شام گہری ہونے سے پہلے گاؤں پہنچتا ہے۔“

”ٹھیک ہے ماما! پر ذرا جلدی آنا۔ یہ نہ ہو کہ۔۔۔“

اس کے بات اوھو رنی چھوڑنے پر مامے نے بھی انداز میں اسے دیکھا۔ جیسے کہتا ہو ”اسے کچھ مت کہنا۔“ پھر خاموشی سے باہر کی سمت بڑھ گیا۔

نمین تارا ایک سوہم سی امید کے سہارے بیٹھی تھی کہ شاید ماما اسے ساتھ ہی لے جائے۔ مگر وہ اس سے ملے بغیر ہی چلا گیا تھا۔



”لو بھائی ظہور! کاغذات تو سارے تیار ہیں۔“ نیاز صبح ہی صبح وارد ہوا تھا۔ چوہے کے پاس پر اٹھا کھاتے ظہور نے چونک کر دیکھا۔

”اتنی جلدی؟“  
”کوئی کام مشکل نہیں ہے۔ بس کچھ پیسے خرچ کرنے پڑتے ہیں۔“ وہ بڑھی کھینچ کر قریب بیٹھا۔

”تو اب بس اس کے دستخط چاہئیں۔“ نیاز نے ہاتھ میں پکڑی فائل پر ہاتھ مارا۔

”کروے گی۔“

”کیوں نہیں کرے گی۔“

”نہ کہے تو۔۔۔“ بتول نے خدشہ ظاہر کیا۔

”کیسے نہیں کرے گی۔ ہڈیاں توڑ دوں گا اس کی۔“

نیاز بھڑک کر بولا۔

”تو بس پھر چلو پہلے دستخط ہی کروالیں۔ ہو سکتا ہے آج ماما پھر چکر لگائے۔ اس کے آنے سے پہلے یہ کام ہو جائے تو اچھا ہے۔“ ظہور نے چٹگیر پرے دھکیلی۔

بتول نے بھی تو بے سے روٹی اتار کر روٹال میں لپیٹی۔ تو اتار کر آئے والے ہاتھ رگڑتی ان کے پیچھے چلی آئی۔

نمین تارا ان تینوں کو ایک ساتھ دیکھ کر سہم سی گئی۔ ظہور نے شاید پھر بھی اس سے کبھی نرم لہجے میں بات کر لی ہو۔ لیکن نیاز نے جب بھی اس پر ڈالی تھرکی نظر ہی ڈالی تھی۔ اس کے باپ نے نمین تارا کی ماں سے دوسری شادی کی تھی۔ اس کی ماں نے اپنی سوکن سے نفرت کی تو بہت کھل کر کی اور ہمیشہ واشگاف الفاظ میں اس کا اظہار بھی کیا۔ یہی نفرت ظہور اور نیاز کے دلوں میں بھی موجزن تھی۔ نمین تارا کا نام اس کے باپ نے رکھا تھا۔ وہ واقعی ان کی آنکھوں کا تارا تھی۔

پھر اس کے دادا تھے جو ہمیشہ اسے اپنے کندھے پر سوار رکھتے۔ اس نے واقعی بہت محبتیں سمیٹی تھیں۔ شاید قدرت اسے ایک ہی بار نوازا نا چاہتی تھی کہ اس کے بعد اسے محبت کی بوند بوند کو ترسنا تھا۔ تقدیر نے وہ ساری محبتیں ایک ایک کر کے چھینی تھیں۔ وہ باشعور تھی۔ تڑپ تڑپ کر روتی اور کسی دوسری محبت کا دامن کس کر پکڑ لیتی لیکن ایک کے بعد دوسری پھر تیسری۔ باپ کی وفات کے بعد جب دادا کی گود میں پناہ ملی تو انہوں نے سب کے بدلے ہوئے روپیے دیکھ کر انتہائی بے بسی و بے چارگی کے ساتھ یتیم پونی کی طرف دیکھا۔

عمر ایک ایک سال کر کے ہاتھوں سے نکلتی جا رہی تھی اور وہ بے بس تھے۔ کوئی ایسا سائیا نہ تھا کہ وہ مطمئن ہو جاتے۔ موت کے قدموں کی آہٹ تیز

ہونے لگی تو وہ کچھ نہ کر سکے۔ بس ایک مکان اس کے نام لگا گئے۔ ان کا یہی خیال تھا کہ اس کے کرائے سے نمین تارا کی تعلیم کے اخراجات اور اسے بچ کر اس کی شادی کا خرچ نکل آئے گا۔ کم از کم کسی پر بوجھ تو نہ بنے گی وہ۔ مگر وہ یہ بات نمین تارا کو نہ بتا سکے اور وہ ان کے زیر بار آگئی۔ اسے اپنی چھوٹی سی ضرورت کے لیے گھنٹوں محنتیں کرنی پڑتیں۔ اس پر خرچ ہونے والی معمولی سی رقم بھی اس پر احسان تھی۔ زندگی بوجھ بن کر رہ گئی تھی۔ پھر شکر ذات گالی لگوچ جس نے نمین تارا سے اس کی ذات کا اعتماد بھی چھین لیا تھا۔

”یہ کاغذ ہیں۔ ان پر دستخط کر دو۔۔۔“ نیاز نے کاغذات اس کی سمت بڑھائے۔ نمین تارا نے بے حد حیرت سے ان کاغذات کو دیکھا۔ پھر ان سب کی طرف۔

”یوں آنکھیں نکال نکال کر کیا دیکھ رہی ہو۔ دستخط کر۔۔۔“ وہ غرایا۔ ساتھ ہی قلم کھول کر اس کی سمت بچایا تھا۔

”یہ کیا ہے؟۔۔۔“ نمین تارا نے خوف زدہ سا ہو کر انہیں دیکھا۔

”سوال مت کرو۔ جو کہا ہے بس وہ کر۔۔۔“ ظہور ہاڑا۔ وہ اب بھی متذبذب و خوفزدہ سی کبھی قلم دیکھ رہی تھی کبھی کاغذ۔ ان چروں کی سمت دیکھنے کی ہمت نہ نہ تھی۔ جو حد درجہ بیگانگی کی چادر اوڑھے اسے ہشت زدہ کر رہے تھے۔

”کروے کروے۔ کیوں اپنی شامت کو آواز دے رہی ہے۔“ بتول نے کہا تو اس نے بمشکل پلکیں اٹھا کر سوال دہرایا تھا۔

”یہ کیا ہے بھابھی؟۔۔۔“

غوابا ”نیاز کا بھرپور پھپر اس کے گال پر لگا۔ وہ منبر قرار نہ رکھ سکی۔ ایک طرف الٹ گئی۔ نیاز اسے گردن سے دبوچ کر سیدھا کیا۔

”گناہ نامہ ہے۔ حیرے اس یار کے ساتھ نکاح لانے لگے ہیں۔“ نمین تارا نے ایک اذیت کے تو آنکھیں بند کر لیں۔

”تم لوگ کچھ بھی کہو۔ میں ان پر سامن نہیں کروں گی۔ وہ مکان دادا نے میرے نام کیا ہے۔“ پتا نہیں ڈر پوک سی نمین تارا کے اندر اتنا غصہ کہاں سے آگیا تھا کہ وہ ہر خوف سے بے نیاز ہو کر کہہ گئی۔

”نہیں کرے گی دستخط۔“ نیاز کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔

”نہیں کروں گی۔ نہیں کروں گی۔“ اس نے ہڈیانی انداز میں چیختے ہوئے کاغذات جھپٹے اور وہ

”دستخط کر دے سیدھی طرح سے ورنہ گردن توڑ دوں گا۔“ نیاز نے ایک جھٹکے سے گردن چھوڑی۔ نمین تارا کے منہ سے جھجھک گئی تھی۔

”درا سنبھل کے نیاز! کیوں آپے سے باہر ہو رہے ہو۔ اس نے انکار تھوڑی کیا ہے۔“ بتول نے آگے بڑھ کر اسے ساتھ لگایا اور بائیں ہاتھ سے اس کی گردن سہلانے لگی۔ نمین تارا نے خود کو اس کی گرفت سے آزاد کر کے اسے دونوں ہاتھوں سے پیچھے دھکیلا۔ بتول نے قدرے حیرت سے اسے دیکھا۔ مگر برا نہیں مانا۔

”دیکھو تارا۔۔۔“

”جب تک مجھے پتا نہیں چلے گا یہ کیسے کاغذ ہیں۔ میں دستخط نہیں کروں گی۔“ نمین تارا چیخ اٹھی تھی۔

نیاز اور ظہور نے اچھنبے کے ساتھ ایک دوسرے کو دیکھا۔ وہ سوچ بھی نہ سکتے تھے کہ وہ یوں انکار کر سکتی ہے۔

”تارا تو کیا کرے گی اس مکان کا۔ یہ تیرے بھائی ہیں کوئی غیر نہیں۔ تو۔۔۔“

”مکان۔۔۔“ نمین تارا چونک اٹھی۔ ”وہ مکان تو دادا نے میرے نام کیا تھا۔“

”تمہیں کس نے بتایا۔۔۔“ اب چونکنے کی باری ان کی تھی۔ وہ تو بتول کو گھور رہے تھے کہ اس نے کیوں بتایا کہ تارا کے نام کوئی مکان بھی ہے۔

”یہ ضرور اس کے مامے کی کارستانی ہوگی۔ اسی لیے اتنا اچھل رہی ہے۔“ بتول نے زہر خند لہجے میں کہا۔

”تم لوگ کچھ بھی کہو۔ میں ان پر سامن نہیں کروں گی۔ وہ مکان دادا نے میرے نام کیا ہے۔“ پتا نہیں ڈر پوک سی نمین تارا کے اندر اتنا غصہ کہاں سے آگیا تھا کہ وہ ہر خوف سے بے نیاز ہو کر کہہ گئی۔

”نہیں کرے گی دستخط۔“ نیاز کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔

”نہیں کروں گی۔ نہیں کروں گی۔“ اس نے ہڈیانی انداز میں چیختے ہوئے کاغذات جھپٹے اور وہ



کھڑے کر دیے۔

”ہاں تو اپنے اس یار کے نام کرے گی۔“ نیاز وحشیوں کی طرح مل پڑا اور ایک بار پھر اس کا ہاتھ روکنے والا کوئی نہ تھا۔

♥ ♥ ♥ ♥

آسمان پر تیرتے کھلے ملے سرمستی بادلوں نے موسم کے تیز چاٹک ہی بدلے تھے۔ ہلکی سی خوشگوار ت نے ٹھنڈک کا روپ دھار لیا۔ درختوں کے سبز پیرہن کے رنگ دھندلانے لگے اور ان میں ہلکی سی زردی جھلکنے لگی۔ قریب ہی کہیں خزاں زندہ موسموں کی آہٹیں سنائی دینے لگی تھیں۔

زارا نے بالوں کو برش کر کے کلب کیا۔ پھر شولڈر بیگ اٹھا کر باہر نکل آئی۔

مما لان میں شام کا اخبار دیکھ رہی تھیں۔ ٹھنڈک کے پیش نظر ہلکی گرم شمال ان کے کاندھوں پر تھی۔ آہٹ پر انہوں نے سر اٹھا کر زارا کو دیکھا۔

”کہاں کی تیاری ہے؟“

”زمین کی طرف جارہی ہوں۔“ وہ ان کے پاس رک گئی۔

”بیٹھو ذرا۔“ ممانے قدرے سنجیدہ لہجے میں کہا تو وہ ان کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔

”کہتے ہیں۔“ ممانے اخبار تہہ کر کے ٹیبل پر رکھا۔ پھر کچھ سوچتے ہوئے پوچھنے لگیں۔

”زمین کے ساتھ کوئی پر ایلیم ہے؟“

”کیسی پر ایلیم؟“ زارا نے چونک کر انہیں دیکھا۔

”میں کل گئی تو وہ اکھڑا اکھڑا سا تھا۔ کچھ خاموش بھی۔ زیادہ بات نہیں کر رہا تھا۔“

”یونہی ممما موڈ ٹھیک نہیں ہو گا اس کا۔“ زارا نے کوئی نہ کوئی۔

”موڈ کیوں خراب تھا۔“ وہ اتنی پریشانی سے بولی کہ زارا نے اختیار مسکرا دی۔

”مما! آپ اسے بچوں کی طرح حشر مت کریں۔“ وہ اب جوان ہو گیا ہے اور اس کی اپنی ایک پریشانی

لائف ہے۔ ضروری تو نہیں کہ وہ ہم سے ہر بات شیئر کرے۔“

”تم اس سے پوچھنا تو سہی۔ کیا پر ایلیم ہے؟“

”آپ نے نہیں پوچھا۔“

”بہت۔۔۔ بہت پوچھا۔ مگر وہ کچھ بتانے پر آمادہ ہی نہ تھا۔ بس کہنے لگا کہ پچھو آپ کو وہم ہو گیا ہے۔“

”آپ کو کچھ نہیں بتایا تو مجھے کہاں بتائے گا۔“

”پھر بھی تم پوچھنا تو۔“ وہ ہنسنے لگی۔

”پوچھ لوں گی۔“ زارا اکھڑی ہوئی۔ پھر مسکراتے ہوئے پوچھنے لگی۔

”بانی دادوے ماما۔ یہ آپ نے اتنی پروا کبھی میری تو نہیں کی۔“

”ممانے اسے گھور کر دیکھا۔“ تم جیلس مت ہوا کرو میرے بیٹے۔“

”گاڑ۔ پھر بھی آپ کہتی ہیں کہ میں جیلس مت ہوا کروں۔“

”زارا۔۔۔“ ممانے چڑ کر اسے دیکھا تو اس نے مسکراتے ہوئے جھک کر ان کے گال پر پیار کیا۔

”میں کبھی جیلس نہیں ہوتی ماما۔“ ممانے مسکراتے ہوئے اس کے گال تھپتھپائے۔

”میں جانتی ہوں۔ ہر انسان اور ہر رشتے کی ہمارے دل میں ایک الگ جگہ ہوتی ہے جہاں کوئی دوسرا رشتہ کوئی دوسرا انسان جھانک بھی نہیں سکتا۔“

”کتنا اہم ہو گیا ہے وہ ہمارے لیے۔“ زارا نے بے حد حیرت سے سوال کیا۔

”ہاں۔ اور شاید ہم اسی لیے اتنا خوفزدہ رہتے ہیں۔“ ممانے ایک طویل سانس لے کر کہا تو زارا بہت کچھ سوچتی ہوئی گاڑی تک آئی تھی۔

زمین لان میں ہی بیٹھا تھا۔

”ہیلو اینگری بیگ مین۔“ زارا نے کہا۔ زمین نے چونک کر سر اٹھایا۔ پھر زارا کو دیکھ کر ہنسا جواب دیے اٹھ کر اندر جانے لگا۔ زارا نے اس کا ہاتھ پکڑ کر روک۔ پھر سامنے آتے ہوئے قدرے گھور کر کہنے

لگی۔

”اچھا تو اب تم مجھے نخرے بھی دکھاؤ گے۔“ زمین نے ہنسا پھر بولے بس اپنا بازو چھڑایا تھا۔

”فون اتنی خفگی۔“

”آپ یہاں کیوں آئی ہیں؟۔۔۔“ وہ خفگی سے پوچھنے لگا۔

”تم سے ملنے۔“ زارا اطمینان سے بولی۔

”مجھ سے ملنے مت آیا کریں۔“ وہ نروٹھے پن سے بولا۔

”کیوں؟۔۔۔“ زارا کو اس کی خفگی پر ہنسی آرہی تھی۔

”پہلے رائے سلیمان حیدر سے اجازت نامہ لکھوا لیں۔“

”یہ بات اپنی پچھو سے کہتے۔“ زارا ذرا سنجیدہ ہوئی۔

”ان سے نہیں کہہ سکتا۔“ زمین جزبز ہو کر بولا۔

”ہاں ان سے نہیں کہہ سکتے۔ لیکن مجھ سے لڑ سکتے ہو اور اپنے گھر آنے سے منع بھی کر سکتے ہو بس اتنی ہی پروا ہے میری یعنی کہ اکلوتی کزن کی کوئی قدر ہی نہیں۔“

”میں واقعی بے حد سنجیدگی سے کہہ رہا ہوں۔ آپ یہاں مت آیا کریں۔ مجھ سے مت ملا کریں۔ جب تک کہ۔۔۔“ وہ لب بھینچ کر جملہ ادا ہو رہا تھا۔

زارا نے چونک کر اسے دیکھا۔

”جب تک کہ۔۔۔“

”جب تک میں بابا کو بے گناہ ثابت نہیں کر لیتا۔“ زمین کا لہجہ مصمم تھا۔ زارا جھنجھلا گئی۔

”اگر ان کی بے گناہی کا کوئی ثبوت ہوتا۔ تو آج سے بیس بائیس برس پہلے سامنے آچکا ہوتا۔“

”کیسے سامنے آتا۔ بابا تو بزدلوں کی طرح بھاگ نکلے۔ ان کے فرار نے ہی تو انہیں مجرم ثابت کیا تھا۔“

”تو تم اب کہاں سے ثبوت نکالو گے۔“

”کسی نے تو دیکھا ہو گا۔ کسی کو تو کچھ معلوم ہو گا۔“

”اگر ایسا ہوتا تو کیا تب کوئی نہ بولتا۔“

”خوف بڑے بیٹوں کی زبانیں بند کر دیتا ہے۔ ہم نے تو اس کا عملی تجربہ کیا ہے۔“ زمین کا لہجہ عجیب سا ہو گیا تھا۔

”کیس نہ کہیں کچھ نہ کچھ ایسا ضرور مل جائے گا جو بابا کی بے گناہی کو ثابت کر سکے اور اب یہ میں کر کے رہوں گا۔“

”زمین۔۔۔“ زارا نے اسے بغور دیکھا۔ ”کیا تم وقت کا انتظار نہیں کر سکتے۔“

”اب نہیں۔ اور آپ۔۔۔ آپ واقعی یہاں مت آیا کریں۔ ہو سکے تو پچھو کو بھی منع کر دیجئے گا۔ ان سے کہئے گا کہ اب زمین ان کے پاس آئے گا۔“

”تم خواہنا اموشنل ہو رہے ہو زمین۔۔۔“

”نہیں۔ میں اموشنل نہیں ہو رہا۔ حقیقت کو کھلی آنکھوں سے دیکھنے لگا ہوں اور میرا خیال تھا کم از کم آپ تو مجھے انڈر اسٹینڈ کریں گی۔“ زمین العابدین نے شکوہ کنال لگا ہوں سے اسے دیکھا۔ وہ کچھ لمبے اسے دیکھتی رہی، پھر سر جھٹک کر سنجیدہ لہجہ وانداز میں بولی تھی۔

”میں چلتی ہوں اب۔۔۔“ زمین العابدین نے تعجب سے اسے دیکھا پھر بے اختیار پوچھنے لگا۔

”آپ خفا ہو کر جارہی ہیں۔“ زارا رک گئی۔

”تمہیں پروا ہے اس بات کی۔“

”بہت۔۔۔ بہت ہے۔“ وہ بے تاب سا ہوا۔

زارا مسکرا دی۔

”نہیں میں خفا ہو کر نہیں جارہی۔ شاید۔۔۔ تم ٹھیک کہہ رہے ہو زمین العابدین۔ بس ہم لوگ ہی خود غرض ہو کر سوچ رہے ہیں۔ تمہیں جو بھی کرنا ہے کرو۔ میں تمہارا ساتھ دوں گی۔“

”تھینک یو۔۔۔ تھینک یو سوچ۔“ وہ بھرپور انداز میں مسکرایا۔

”میں اب چلتی ہوں اور کیا ممما کو منع کروں کہ۔۔۔“

”میں جانتا ہوں۔ میں یا آپ انہیں روک نہیں سکیں گے۔“ زمین نے جملہ ادا ہو رہا تھا۔

”میں جانتا ہوں۔ میں یا آپ انہیں روک نہیں سکیں گے۔“ زمین نے جملہ ادا ہو رہا تھا۔



چارگی سے کندھے اچکائے تھے۔

♥ ♥ ♥ ♥ ♥  
 ماما مقبول اس کے زخم گنتے گنتے رو پڑے تھے۔  
 ”کیا حال کر دیا ظالموں نے۔۔۔“  
 ”کیا سر آنکھوں پر بٹھاتے اس کو۔۔۔“ کہیں کوئی  
 پشیمانی کا احساس تک نہ تھا۔ کھوڑے مروت لہجے  
 ”میں نے کہا تھا اسے میرے ساتھ بھیج دو۔“  
 ”ہم نے بھی کہا تھا کوئی لڑکا دیکھو۔“  
 ”اب اتنی جلدی اچھا رشتہ کہاں سے ڈھونڈوں۔  
 تم لوگ تو اسے مار ہی ڈالو گے۔“

”کوئی تو ہو گا۔ اب اچھے رشتے کا انتظار مت کرتے  
 رہنا۔ بس دو وقت کی روٹی دے دے اس مردود کو۔  
 بھلے کوئی بھی ہو۔“ ظہور نے حد درجہ بے مروتی  
 دکھائی۔  
 ”ایسے کیسے دھکا دے دیں۔ کیسی لاڈلی دھمی تھی  
 زینون اور احمد کی۔“ ماما رندھی ہوئی آواز میں بولا۔  
 ”یہاں ہی نرم دل ہے تیرا ماما۔ اتنا کچھ ہو گیا اور تو  
 اب بھی۔“ نیاز کا لہجہ مذاق اڑاتا ہوا تھا۔  
 ”وہ اکرام بھی تو ہے ذرا اس سے بات کر کے  
 دیکھو۔“ ظہور نے یاد دلایا تو مامے مقبول نے تڑپ کر  
 اسے دیکھا۔

”اس سے تو اچھا ہے تم اس کا گلا گھونٹ دو۔  
 شادیوں کرنے کا شوق ہے اسے۔ ابھی بچھلے دنوں اس  
 کی چوٹھی بیوی اسے چھوڑ کر بھاگی ہے۔“  
 ”یہ بھاگ گئی تو سر پر ہاتھ رکھ کر رونا۔“ بتول چڑ  
 کر بولی۔

”میرے ساتھ بھیج دو۔ میں خود اس کی شادی  
 کروا دوں گا۔“ مامے مقبول نے ایک بار پھر ممت  
 کی۔  
 ”وہ مامے کی تب نہ۔ اس کے دماغ پر تو وہ بھلے والا  
 سوار ہے۔۔۔ ماما نہ یہ تیرے بس کی بات  
 نہیں۔ شیریں زین اسے اور راہ دکھائے گی۔“ ظہور نے

صاف بے اعتباری کا اظہار کیا۔ ماما مقبول پھر سے بے  
 بس ہو گیا۔ وہ رو رو کر کستی رہی۔

”ماما! مجھے اپنے ساتھ لے جاؤ۔“ ان لوگوں نے اتنا  
 موقع ہی نہیں دیا کہ وہ بتا سکتی کہ یہ لوگ اس سے  
 مکان کے کاغذات پر دستخط کروا رہے ہیں۔  
 ”بس ماما! اب تم کے آؤ تو کوئی رشتہ دیکھ آنا۔ ورنہ پھر  
 میں خود اکرام سے بات کرتا ہوں۔“ نیاز نے رکھائی  
 سے کہا۔ مامے مقبول نے بڑی بے بسی سے ان سب  
 کی طرف دیکھا۔ پھر چارپائی کا سہارا لے کر کھڑا ہو گیا۔  
 نجانے کیوں ٹانگیں بے جان سی ہو گئی تھیں۔  
 ”میں چلتا ہوں۔۔۔“

اب کے بتول نے اسے چائے کے لیے بھی نہیں  
 روکا تھا۔ باہر نکل کر بہت دیر تک وہ نجانے کیا سوچتا رہا  
 تھا۔ اس کے قدم بار بار ایک ہی رستے پر اٹھتے اور پھر  
 رک جاتے تھے۔ انا اور خودداری کستی تھی۔  
 ”مت جاؤ۔“ عزت نفس قدموں کی زنجیر بنی  
 ہوئی تھی۔ مگر نیند تارا کی حالت اسے اسی رستے کی  
 طرف دھکیل رہی تھی۔  
 ”نہیں مجھے وہاں نہیں جانا۔“ اس نے خود کو  
 گھر کا۔ اسے خبر بھی نہ ہوئی اور قدم چپکے چپکے اس  
 رستے کی طرف اٹھ گئے تھے۔ بس اس نے خود کو اس  
 گھر کے سامنے پایا۔ جس کے بارے میں اس نے چپکے  
 چپکے معلومات کی تھیں۔

سب کہتے تھے وہ پڑھا لکھا اور بے حد شریف لڑکا  
 ہے۔ وہ کچھ ششدر سا بند گیٹ کو گھورتا رہا۔  
 ”کیا بتاؤ بیچ بچ مارا سے شادی کرنا چاہتا ہو۔“  
 اس نے ایک نظر اس پر اٹے مگر خوبصورت گھر پر ڈالی۔  
 اس کا ہاتھ متذبذب سا اٹھا اور پھر جھک گیا کچھ کے  
 سوچنے کے بعد اس نے مایوسی سے سر ہلایا اور پلٹ جانا  
 چاہا۔ مگر نیند تارا کی سسکیوں کی صدا نے اس کے  
 قدموں کو زنجیر کر دیا۔ اس کے بوڑھے ہاتھ نے بے  
 اختیار تیل پر انگلی رکھی۔

”نن۔۔۔ نن۔۔۔“ دور کہیں تیل گونجی اور یہ آواز  
 اس کے دل پر ہتھوڑے کی طرح لگی تھی۔ اس کی  
 عزت نفس انا اور خودداری پر بڑی کاری ضرب تھی۔  
 گیٹ کھلا تو وہ سر نہ اٹھا سکا۔

”جی بابا جی۔۔۔“ سلیم نے پوچھا۔ تو اس نے ذرا سا  
 نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ ملازم نما لڑکا ہاتھ میں  
 جھاڑن پکڑے منتظر سوالیہ نظروں سے اسے دیکھ رہا  
 تھا۔

”تمہارا صاحب ہے۔“ اس نے آہستگی سے  
 پوچھا۔

”جی بھائی جان ہیں۔ اندر آجائیں۔“ سلیم نے  
 سر تپا اس کا جائزہ لیا اور رستہ چھوڑ دیا۔ وہ اس کے  
 پیچھے چل پڑا۔

”بھائی جان یہ آپ سے ملنے آئے ہیں۔۔۔“ سلیم  
 نے کہا۔ وہ بک ریک میں کتابوں کو ترتیب دے رہا  
 تھا۔ زین نے پلٹ کر دیکھا پھر کھڑا ہو گیا۔  
 شکل و صورت اور وضع قطع سے دیہاتی نظر آنے  
 والا یہ شخص اس کے لیے بالکل اجنبی تھا۔ مامے  
 مقبول نے ایک نظر بغور سامنے کھڑے ٹینس چوہیں  
 سالہ خوبرو اور خوش شکل نوجوان کو دیکھا۔ مامے مقبول  
 نے ساری زندگی ایک چھوٹے سے گاؤں میں گزاری  
 تھی۔ مگر وہ انسانوں کی پہچان رکھتا تھا۔ اسے لگا یہ  
 نوجوان کبھی کسی کو دھوکا نہیں دے سکتا۔  
 ”جی بابا۔۔۔“

اور مامے مقبول کو یاد آیا کہ وہ یہاں کس لیے آیا  
 ہے۔ تو پیشانی پر پسینے کے قطرے جھلکانے لگے۔  
 اس نے صاف سے پسینہ صاف کیا۔ اس کے ایک  
 ایک انداز سے ابھرنے پریشانی اور تذبذب کا اظہار ہو  
 رہا ہے۔

”اُٹھو بابا۔۔۔ کوئی پریشانی ہے۔“ وہ اسے جانتا نہ  
 تھا مگر کس قدر اپنائیت بھرا لہجہ تھا۔ ماما مقبول سک  
 اٹھا۔

”میں اس بد نصیب کا ماما ہوں۔۔۔“ زین العابدین  
 نے اچھ کر اسے دیکھا۔

”کس کی بات کر رہے ہیں۔“  
 ”نین تارا۔ ظالموں نے بڑا برا سلوک کیا ہے اس  
 کے ساتھ۔ مجھے پتا ہے تم دونوں کوئی کھیل نہیں کھیل  
 رہے۔ وہ کبھی تم سے ملنے یہاں نہیں آئی۔ سب کہتے  
 ہیں تم ایک شریف باپ کا خون ہو۔ سب تمہارے  
 کردار کی تعریف ہی کرتے ہیں۔“

زین ایک طویل سانس لے کر رہ گیا۔ وہ غصے میں  
 لال پیلے ہوتے دو جاہل مرد اور یہ آنسو آنسو روتا  
 بوڑھا۔ کہانی نجانے کیا رخ بدل رہی تھی اور وہ  
 زبردستی ہی اس کہانی کا اک اہم کردار بن گیا تھا۔ زین  
 نے ایک طویل سانس لے کر سامنے کھڑے شخص کو  
 دیکھا۔ وہ اس لڑکی پر گزری مصیبتوں اور مظالم کا ذکر کر  
 رہا تھا۔ زین دم بخود تھا۔ یہ کون لوگ تھے۔ ایک ذرا  
 سی بات کی بنیاد پر یہ کیا ظلم ڈھارہے تھے۔ اس کا نرم  
 دل اس مظلوم لڑکی کے لیے گداز ہونے لگا۔

”بابا! جو کچھ وہ کہہ رہے ہیں جھوٹ ہے۔“  
 ”ہاں۔۔۔“ مامے مقبول نے نظر اٹھا کر اسے  
 دیکھا۔ ”لیکن وہ لڑکی تو ماری گئی نا۔“

زین کے دل کو ایک تاصف نے گھر لیا۔ اسے پہلی  
 بار کسی کی مدد کرنے پر افسوس ہونے لگا۔ شاید وہ اس  
 لیے اتنی ڈری سہمی اور خوفزدہ سی لگتی تھی۔

”اب۔۔۔ میں کیا کر سکتا ہوں اس کے لیے۔۔۔“  
 زین نے قدرے افسوس سے سر ہلاتے ہوئے پوچھا۔  
 ”تم۔۔۔“ مامے مقبول نے تذبذب کے عالم میں  
 اسے دیکھا۔ پھر اپنی ساری بھری قوتوں کو مجتمع کیا۔  
 ”اگر تم واقعی اس کو پسند کرتے ہو تو اس سے شادی  
 کر لو۔۔۔“

”جی۔۔۔“ زین بھونچکا رہ گیا۔  
 (باقی آئندہ)



# لے وقت لے لے

یونیورسٹی میں ایک زین کا نمٹکی باندھ کر دیکھنا زارا کو شدید ناگوار گزر رہا تھا۔ لیکن اس نے کبھی کوئی ناز با حرکت نہیں کی تھی۔ اس کی دوست بھی متوجہ ہونے لگی تھیں۔ ایک دن زین نے اسے مخاطب کر کے کہا کہ اس کے بابا اس سے چاہتے ہیں۔ زارا حیران رہ گئی۔ وہ اس کے بابا سے ملنے اسپتال گئی وہ سو رہے تھے۔ زارا واپس آگئی۔ اسے اسلام آباد پر ڈا۔ دوبارہ وہ ان کے پاس نہ جاسکی۔ اسلام آباد سے واپس آئی تو پتا چلا کہ زین کے ابو کی وفات ہو گئی ہے۔ زارا زین کے گھر گئی تو اس پر انکشاف ہوا کہ زین کے ابو رائے جمشید حیات تھے۔ جن پر زارا کے تباہی کے قتل کا الزام تھا۔ رائے جمشید حیات اس کے سگے ماموں تھے۔ زارا کی امی کو پتا چلا تو وہ رو رو کر بے حال ہو گئیں۔ زارا کے تباہی کی زمینیں تھیں جو اس کے تباہی زاد بھائی سلیمان سنبھالے تھے۔ سلیمان نے ہی رائے جمشید حیات الزام لگایا تھا زارا کا نکاح سلیمان کے چھوٹے بھائی رضوان سے ہو چکا تھا۔ رضوان باہر بڑھنے گیا ہوا تھا۔ زین کی زارا سے بہت دوستی ہو گئی تھی۔ رضوان بھی باہر سے پڑھ کر آگیا تھا۔ وہ سلیمان سے بہت مختلف مزاج رکھتا تھا۔ اور سلیمان کی نسبت بہت روشن خیال اور فراخ دل تھا۔

## ناولٹ

### ۴ چوتھی قسط

وہ مرجائے گی۔ ”ماما مقبول سک اٹھا۔  
”کیا کہہ رہے ہیں آپ۔۔۔؟“ وہ بمشکل خود کو سنبھال پایا لیکن نہیں۔ وہ اب بھی حیرت میں گہرا سامنے کھڑے شخص کو یوں دیکھ رہا تھا جیسے اس کی سماعتیں سننے میں دھوکا کھا رہی ہوں۔  
”وہ اس کو مار ڈالیں گے۔“ اس کی لرزیدہ آواز میں التجا تھی۔

”یہ۔۔۔ یہ کسے ہو سکتا ہے۔؟“

”وہ بڑی مشکل میں ہے پتر اللہ کے واسطے اس کی مدد کرو۔ اس سے شادی کر لو۔“ وہ پھوٹ پھوٹ کر





روئے لگا تھا۔

”دیکھیں بابا! میں۔۔۔ یا اللہ“

وہ ایک دم گھوم کر بیک ریک پر اپنے ہاتھ جما کر سنبھلنے کی کوشش کرنے لگا۔ یہ سب اس کے لیے بہت غیر متوقع تھا۔ اس کے عقب میں ماما مقبول اب بھی خاموش نہیں ہوا تھا۔ اس کی سسکتی ہلکتی آواز زین کے دماغ پر ہتھوڑے کی طرح برس رہی تھی۔ اس کا دل چاہا وہ اس بوڑھے کو اٹھا کر باہر پھینک دے۔ مگر وہ بڑے ضبط سے پلٹا اور دونوں ہاتھ اٹھا کر اسی متحمل لہجے میں بولا۔

”دیکھیں بابا! آپ سب لوگ بلاوجہ بات کا ہتھکڑیا رہے ہیں۔ میرا اور اس لڑکی کا نہ تو ایسا کوئی تعلق تھا نہ ہے اور نہ آئندہ ہو گا۔ آپ خدا کے لیے بات کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ وہ مشغل میں تھی۔ میں نے اس کی ذرا سی مدد کر دی۔ اس کی جگہ کوئی بوڑھی اماں کوئی بزرگ کوئی بچی بھکاری کوئی بھی ہوتا میں یہی کرتا۔ مدد کرنا گناہ نہیں ہے۔ خدا کے لیے آپ لوگ اسے جرم مت بنائیں۔“

”اس پر یہ مصیبت تمہاری وجہ سے ٹوٹی ہے۔“ وہ اب بھی بغد تھا۔

”میں نے مان لیا۔ میں ہاتھ جوڑ کر معافی مانگ لوں گا۔ اس سے بھی اور اس کے بھائیوں سے بھی۔ تاہم ہو جاؤں گا کسی کی بھی مدد کرنے کے خیال سے۔“

”کچھ بھی نہیں لے گی تمہارا۔ یہیں کسی کو نے میں پڑی رہے گی۔ بھلے دو وقت کی روٹی بھی نہ دے۔ بس اپنا نام دے دو۔“

مقبول کو ایسا ہونے کی ضرورت تھی۔ یہ ”فادر گاؤسیک“ زین ایک دم مشتعل ہو گیا۔ ”یہ کیا اور کر رہے ہیں آپ لوگ مل کر۔ کیا میں جس کی مدد کروں اسی کے ساتھ شادی رچانا شروع کر دوں۔ کچھ تو خدا کا خوف کریں۔ کچھ تو سوچیں یہ بات کرنے کے لیے آپ مجھے جانتے نہیں۔ میں کون ہوں۔“

کیسا ہوں، میری عادات و کردار کیا ہے اور مجھ سے اگر کہہ رہے ہیں کہ میں اس لڑکی سے شادی کر لوں۔ آپ پلیز چلے جائیں یہاں سے۔۔۔ کوئی اور دیکھیں۔۔۔ میں اس سلسلے میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتا۔“

اس کے یوں چنچ اٹھنے پر ماما مقبول ایک دم خاموش ہو کر اسے دیکھنے لگا تھا۔ زین کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ نچلا لب و انتوں میں چہاتے ہوئے وہ بے حد مضطرب نظر آ رہا تھا۔ ماما مقبول کی ڈبڈبائی ہلکی نگاہیں اسے کچھ اور ڈسٹرب کر رہی تھیں۔ وہ کچھ لمحے خاموشی سے اسے دیکھتا رہا پھر ملٹ گیا۔ اس نے اپنے بستے آنسو صاف کرنے کی کوشش بھی نہ کی تھی اور اپنے تمام تر غصے کے باوجود اس کی آخری نگاہ زین کے اندر گز گئی۔ وہ کچھ لمحے یونہی کھڑا لب کاٹا نجانے کیا سوچتا رہا۔ پھر بے اختیار باہر کی طرف لپکا۔ ماما مقبول کو اس نے گیٹ کے پاس روکا تھا۔

”دیکھیں بابا! میں کسی کا دل نہیں دکھانا چاہتا۔ میری کسی بات سے آپ ہرٹ ہوئے ہوں۔ تو میں ہاتھ جوڑ کر معافی مانگتا ہوں لیکن میں وہ نہیں کر سکتا جو آپ چاہتے ہیں۔“

ماما مقبول نے خاموشی سے اس کی بات سنی پھر چھوٹا دروازہ کھلیں کر باہر نکل گیا۔

”کیا ہوا بھائی جان؟“ سلیم نے قریب آکر حیرت سے پوچھا۔

”کچھ نہیں۔“ وہ سر جھٹک کر ڈسٹرب سا اپنے کمرے میں چلا گیا تھا۔

ماما مقبول بہت دیر تک اپنے سامنے پھلے دریا کے چوڑے پاٹ کو دیکھتا رہا۔ کنارے کی پھیلی گھاس کے ساتھ بوسیدہ ویرانی سی گشتی رکی تھی۔ جس میں پوچھا ملاج چہرے پر گہرا ڈالے اونگھ رہا تھا۔ سورج کی کرنیں چھدرے درختوں سے چھن چھن کر دریا کے

نیا لے پانیوں میں رنگ گھول رہی تھیں۔ ہوا دھیرے دھیرے درختوں کے پتوں سے سرگوشیاں کر رہی تھی۔ ماما مقبول نے صاف سے اپنی جلتی آنکھیں رگڑیں۔ ہوا کی سرگوشی ایک واضح آواز میں ڈھل گئی تھی۔

”پتا نہیں بیٹی کیا چیز ہوتی ہے مقبول! نیاز بھی ہے اور ظہور بھی۔ پر جب وہ مجھے ابانتی ہے تو مجھے لگتا ہے میرا دل بھر گیا ہے۔ کیسا کرم کیا رہا ہے میرے گھر میں رحمت اتار دی۔ پتا نہیں کون لوگ ہیں جو بیٹیوں کو دھڑکارتے ہیں انہیں بوجھ سمجھتے ہیں۔“

محبت کا دریا بہتا تھا اس آواز میں۔

”پراپا دھن ہوتی ہیں احمد۔۔۔“ مقبول نے اپنی آواز سنی۔

”ہاں تو دھندلوں گا تا میں بھی اس کے لیے کوئی شہزادہ سدا سکھ کا جھولا جھولے گی میری تارہ۔“

”آؤ! دیکھ احمد! کیسا سکھ کا جھولا جھولی ہے تیری نین تارہ۔“ ٹپ ٹپ کئی آنسو اس کے ہاتھ کی پشت پر گرے۔ ماما مقبول کو لگا یہ آنسو اس کے نہیں احمد کے ہیں۔ تب ہی ایک اور آواز الفاظ کا روپ دھار کر اس کی سماعتوں پر آگری۔

”دیکھ تو بھرا مقبول! میری نینو کیسا پاؤں پاؤں چلنا سکھ رہی ہے ایک۔ دو۔ تین۔۔۔ ماں صدے۔“

”ماں واری۔۔۔ بھلا کرنے دے گی اپنی دھی رانی کو۔۔۔“

”آؤ پاگلے! کتنی بار سمجھایا ہے نہ کیا کرنا پیار۔ بیٹیوں سے اتنا پیار نہیں کرتے۔“

”نہ بھرا! ایسے تو مت بولو۔ سب کہتے تھے زیتون بانجھ ہے اس نے تو میرا بھرم رکھ لیا۔ میرے قدموں تلے جنت آگئی اس کے آنے سے۔ میری تو آنکھوں کا تارہ ہے، میرے دل کی ٹھنڈک۔“ اور اس سے اگلی آواز ماما مقبول کے دل کو مسلطی چلی گئی۔

”میری نینو کا خیال رکھنا مقبول! میں نے کبھی اس سے سخت آواز میں بات بھی نہیں کی۔ بڑی ملوک سی رہی ہے میری۔ اسے کبھی کوئی تکلیف نہ پہنچے۔ خدا

کے بعد بس ایک تیرا آسرا ہے۔“

”اللہ سوئے! تیرے بھید تو ہی جانے۔“ اک آواز اس کے لبوں پر ٹوٹ کر نکھری۔ آنکھیں پھر سے ساون رونے لگی تھیں۔ ”تیری قسمت میں یہی خواری لکھی تھی نین تارہ! کاش تو مر جاتی۔ کاش تو بھی زیتون اور احمد کے ساتھ ہی مر جاتی۔“

وہ گھٹنوں کے بل ریت پر گر کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

♥ ♥ ♥ ♥

ہمارے بعد کیا گزری عزیزو سناؤ شہر کیسا رہ گیا ہے ان تینوں کے اندر قدم رکھتے ہی افتخار نے بے اختیار شعر پڑھا۔ عظمیٰ نے ایک دم سے سر اٹھا کر اسے دیکھا اور پھر سے انجان بن کر فائل کر سی بر رکنے لگی۔ افتخار کے لبوں پر مبہم مسکان کچھ اور گہری ہوئی۔ ایک بازو کر سی پر پھیلائے وہ قدرے ریلیکس انداز میں بیٹھا تھا۔ اس کے ساتھ بیٹھا آصف جھنجھلا گیا۔

”ہمارے شہر کا حال تو تمہیں سنا چکے۔ اب مزید کیا سننا باقی ہے کہ ایک ہفتے میں لاہور لاہور نہیں رہا، سوئزر لینڈ ہو گیا ہے۔“ افتخار نے جواب نہیں دیا۔ یونہی مسکراتا رہا۔

”خدا کا شکر ہے افتخار بھائی! تم لوٹے تو۔ اس ایک ہفتے میں ڈیپارٹمنٹ میں کوئی رونق نہیں تھی۔“ انعم اپنے بے ساختہ انداز میں بولی۔

”اچھا!“ افتخار کی آنکھوں میں چمک کچھ اور بڑھ گئی تھی۔

”اچھا بھلا سکون تھا۔“ عظمیٰ چڑ کر برورائی تھی۔

”عظمیٰ بی بی کیا فرما رہی ہیں؟“ اس نے کان میں انگلی چلاتے ہوئے وہ سیدھا ہو بیٹھا۔ جیسے عظمیٰ کے بات دہرانے کا منتظر ہو۔

”کچھ نہیں کہہ رہی۔ تم سناؤ۔ کب واپس آئے ملتان سے۔؟“ زارا نے اچھٹی سی نظر اٹھتی کستی



عظمیٰ پر ڈال کر بات بدلی۔ افتخار ابھی اپنے ملتان کے نور کے بارے میں بتانے ہی لگا تھا۔ جب میڈم مجسم آگئیں۔ دورانِ پھر زار نے دیکھا تھا۔ عظمیٰ ایک لفظ بھی نوٹ نہیں کر پائی تھی۔

”کوئی پر ابلمس۔“ زار نے ذرا سا اس کی طرف جھک کر پوچھا۔ عظمیٰ نے چونک کر اسے دیکھا پھر نفی میں سر ہلا کر نوٹ بک پر جھک گئی۔ جیسے ہی میڈم باہر نکلیں وہ بھی بیک اٹھا کر باہر نکل گئی تھی۔ زار نے ایک طویل سانس لے کر افتخار کو دیکھا۔ اس نے حسب معمول عظمیٰ کے جانے کو ایک سرسری نگاہ سے دیکھا تھا۔ پھر آصف کی طرف متوجہ ہوا جو اس سے کسی پنجابی نظم کی فرمائش کر رہا تھا۔

”ہاں تو سنو۔“ وہ فوراً شروع ہو گیا۔

”میرے دل دیاں سونیاں کنداں تیری آس دے پتکے پکھیرو میری رات۔“

زارا سر جھٹک کر باہر نکل آئی۔ انعم پہلے ہی جا چکی تھی۔ اب کارڈور میں نجانے کس بات پر عظمیٰ سے جھگڑ رہی تھی۔ زارا حیز حیز قدموں سے ان کے قریب آئی۔

”کیا ہو گیا ہے تمہیں؟“ زار نے اسے آہستگی سے ٹوکا پاس سے گزرتی شہلا بھی رک گئی تھی۔

”خیریت؟“ انعم بہت غصے میں لگ رہی ہے۔

”نوشی ہمیں نخرے دکھا رہی ہے۔“ عظمیٰ مسکرائی۔ زارا کو اس کی مسکراہٹ خود ساختہ لگی۔

شہلا کو آصف نے آواز دے لی تو وہ اس کی طرف چلی گئی۔

”اچھا۔ مجھے لا بیرری جانا ہے۔ تم لوگ چل رہے ہو۔“ عظمیٰ نے اپنا بیگ لٹکاتے ہوئے پوچھا تو انعم تاؤ

نے اسی طرح انعم کا سوال عظمیٰ کی طرف ٹرانسفر کیا۔

”میں کس سے بھاگوں گی۔“ عظمیٰ نے قدرے حیرت سے زارا کو دیکھا۔ جواباً وہ کندھے اچکا کر بولی تھی۔

”مجھے کیا پتا؟“ انعم پوچھ رہی ہے۔

”انعم تو بے وقوف ہے، خواہ مخواہ اسوشنل ہو رہی ہے۔“

”اور تم بہت خوش ہو۔۔۔؟“ انعم نے پوچھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

”کیا مجھے خوش نہیں ہونا چاہیے۔ ایک ٹھیک کام ٹھیک وقت پر ہونے جا رہا ہے۔“ عظمیٰ کا لہجہ مطمئن سا تھا۔

”ہاں تمہاری انا سر بلند رہے بس۔ لیکن ایک بات یاد رکھنا عظمیٰ بی بی! تم ساری عمر ترسو گی۔ جو لوگ اس بے دردی سے محبت کو ٹھکراتے ہیں۔ محبت انہیں کبھی معاف نہیں کرتی۔“

”انعم! بد دعا تو مت دو۔“ عظمیٰ کا لہجہ عجیب سا تھا۔

انعم ایک دم چپ ہو گئی۔ پھر گویا ٹھک کر پوچھنے لگی۔

”کیوں کر رہی ہو عظمیٰ اس طرح؟“

اور عظمیٰ کی نگاہیں بے حد خاموشی سے اپنی ہاتھ کی لکیروں سے الجھنے لگیں۔

”وہ اب بھی تمہاری قسمت بن سکتا ہے۔ تم کوئی اشارہ تو دو۔“ انعم نے اس کے دونوں ہاتھ تھام کر آہستگی سے کہا۔ عظمیٰ نے نظروں کا زاویہ بدل کر اسے دیکھا پھر آہستگی سے ہاتھ چھڑا دیے۔

”تم سے کس نے کہا میں اسے اپنی قسمت بنانا چاہتی ہوں۔“

انعم بری طرح چڑ گئی۔

”ہاں تم کسی سے بھی شادی کر سکتی ہو، بس افتخار کو کھڑے نہیں۔“

اس کے سامنے آئی۔

”اب مجھے بھی کچھ بتاؤ گی۔“

”کیا بتاؤں۔ خود تو منگنی کروانے پر تلی ہے اور میرا ایک پر پونل اس سے ہضم نہیں ہو رہا۔ اب تم ہی بتاؤ۔ ہمارے جیسے سفید پوش گھرانوں میں تو یوں بھی پر پونل بلکہ اتنے پر پونل خال خال ہی آتے ہیں۔ امی! ابو کا خیال ہے کہ رشتہ ٹھیک ٹھاک ہے انہیں ہاں کر دینی چاہیے تو میں کیسے انکار کر دوں۔“

وہ نظریں چرائے بظاہر نارمل سے لہجے میں کہہ رہی تھی۔ زار نے حیرت سے کہا۔

”اب تم بھی زارا کی طرح مجھے ہی سمجھاؤ گی۔“ وہ جھنجھلا گئی۔

”ہمیں۔ تم خود سمجھ دار ہو۔ زیادہ بہتر جانتی ہو کہ کیا فیصلہ کرنا ہے۔ بس اتنا کہوں گی کیا یہ زیادہ بہتر نہیں کہ ہم اپنی زندگی ایسے شخص کے ساتھ بسر کریں جو ہم سے محبت کرتا ہو۔“

”اس سے زیادہ بہتر ہے کہ ہم سر اٹھا کر جنیں۔ کہیں کوئی پچھتاوا کہیں کوئی کمی نہ ہو۔“ عظمیٰ کا لہجہ مضبوط تھا۔

”سراٹھا کر تو تم جی لو گی۔ مگر زارا غور کرنا کیا واقعی کوئی پچھتاوا کہیں کوئی کمی نہ ہو گی۔“ زارا کے سوال پر اس نے نظریں چرائیں اور بس اتنا کہا تھا۔

”تو لا بیرری چلتے ہیں۔“

اور زارا نے مزید کچھ بھی کہنے کا ارادہ ملتوی کر کے اس کے ساتھ قدم بڑھا دیے تھے۔ لا بیرری میں زین بیٹھا تھا۔ زارا نے دانستہ نظر انداز کیا تھا۔ وہ زین کو

نورِ اذیت دینا چاہتی تھی ماکہ جو کچھ اس نے کل زارا سے کہا تھا اس پر غور کر سکے۔ عظمیٰ نے کچھ کتابیں لٹکوائی تھیں۔ سو وہ کتابیں لے کر واپس آگئیں۔

انہی سونوں میں کم زین نے اسے دیکھا ہی نہ تھا۔

جمل کے پاس کوئی ہمسائی بیٹھی تھی۔ صحن میں

داخل ہو گیا۔

بلب کی زبرد تیز روشنی پھیلی تھی۔ چوبیسے میں آگ جل رہی تھی۔ وہ دونوں ہاتھ پھیلائے آگ سینکنے میں مصروف تھی۔ پاس ہی موٹنگ پھیلی کے چٹکوں کی چھوٹی سی ڈھیری لگی تھی۔ ماما مقبول گھر میں داخل ہوا تو بتول کی تیوری چڑھ گئی۔

”لو ماما! تم ابھی تک بیٹیں پھر رہے ہو۔“

ماما مقبول خاموشی سے کونے میں لگے ٹکے کی طرف بڑھ گیا۔ ٹھنڈے پانی کی دھار نکلی تو وہ جلتی آنکھوں پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے ڈالنے لگا۔

”تم گاؤں نہیں گئے ماما۔؟“ بتول نے پوچھا۔

”نہیں۔“ مامے نے ذرا سا ہاتھ روک کر مختصراً

کہا اور پھر سے منہ دھونے لگا۔ تب ہی ہمسائی بتول کی طرف جھک کر ازداری سے پوچھنے لگی۔

”اس کو پتا ہے۔“

”سب پتا ہے۔“ بتول نے اس کا ہاتھ دبایا اور پھر سے مامے مقبول کی طرف متوجہ ہوئی۔

”پنڈ کیوں نہیں گئے ماما۔؟“

”کام تھا۔“ مامے مقبول نے کمرے کے بند دروازے کو دیکھا۔

”کون سا کام ماما؟“ بتول کو نجانے کون سی کھدب لگی تھی۔ مامے مقبول نے پلٹ کر دیکھا۔ تو جلدی سے بولی۔

”میرا مطلب تھا گاؤں نہیں جانا تھا تو ذرا جلدی گھر آ جاتے۔ اب تو روٹی بھی ختم ہو گئی۔“

”روٹی کھا آیا ہوں۔“ اس نے یونہی کہہ دیا۔

چند قدم آگے بڑھائے پھر رک کر پوچھنے لگا۔

”ظہور کہاں گیا ہے۔“

”بیٹھا ہو گا کہیں منہ چھپائے۔ چار بندوں میں بیٹھنے کے قابل کہاں چھوڑا اس کلمہ ہی نے۔“ وہ زہر خند لہجے میں بولی۔ ماما مقبول سر جھٹک کر بند دروازے کی طرف بڑھا۔ وہ فوراً سہول اٹھی۔

”اب اس سے کیا مذاکرات کرنے ہیں۔“

ماما نے بغیر جواب دیے باہر لگی چٹنی کھولی اور اندر



”پتا نہیں کیسا بے غیرت اور ڈھیٹ بندہ ہے۔“ وہ سر پر ہاتھ مار کر رہ گئی۔

گھر سے میں گھپ اندھیرا تھا۔ مائے مقبول نے سوچ بوری ٹٹول کر بٹن دبایا تو کمرہ تیز روشنی سے بھر گیا۔ وہ اب بھی اسی دیوار کے ساتھ کٹھڑی بنی پڑی تھی۔ مائے مقبول کے دل پر گھونسا پڑا۔ اس نے بے بسی سے ادھر ادھر دیکھا۔ کونے میں چارپائی پر لحاف پڑا تھا۔ وہ مرے مرے قدموں سے چارپائی تک آیا اور لحاف اٹھا کر اس پر ڈال دیا۔ اس کے بے جان سے وجود میں کوئی جنبش نہ ہوئی۔ وہ اس کے قریب بیٹھ کر دونوں ہاتھوں میں چہرہ تھام اس کے گال تھپتھپاتے ہوئے دھیرے دھیرے پکارنے لگا۔

”تارہ! تارہ! تارہ! تارہ!“ اس کی گھٹی پلکیں آپس میں جڑی تھیں۔ چہرے پر زردی کھنڈی تھی۔

بتول دروازے میں آکھڑی ہوئی۔ ماما مقبول نے پلٹ کر دیکھا۔ پھر چکر بولا تھا۔ ”کیا ہے۔ سو جاؤ جا کر۔ میں ہوں اس کے پاس۔“ کہیں بھاگی نہیں جا رہی۔ ”میں تو دیکھنے آئی تھی کس۔“

مائے مقبول نے اب کے یوں دیکھا جسے کہتا ہو۔ دفع ہو جاؤ یہاں سے۔ وہ بڑبڑائی ہوئی چلی گئی۔ مائے مقبول نے تارہ کی ساکت پلکوں کو دیکھا اور ڈر گیا۔ ”تارہ! تارہ! تارہ! آ نکھیں تو کھول۔“ اس نے تارہ کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ اس کے ساکت وجود میں ذرا سی جنبش ہوئی۔ نم پلکوں میں لرزش سی ابھری اور اس کے ساتھ ہی آہوں اور سسکیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ نجانے کہاں کہاں سے درد کی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔

یونہی اپنے اوپر جھکے ہوئے چہرے کو تکتی رہی۔ یہ چہرہ اپنے خدو خال بدل لیتا تھا۔ یہ نم دکھی آنکھیں کسی اور کی آنکھوں میں ڈھل جاتی تھیں۔ ہاں ایک ممانکت تھی ان سارے چہروں میں۔ دھند کی اوٹ سے چپکے چپکے جھانکتے یہ سارے چہرے غم زدہ تھے اور ساری آنکھیں رو رہی تھیں۔ اس نے پلکیں جھپکیں۔ گرم سیال اس کی کپٹی پر بہہ نکلا۔

”نہ رو تو تو بڑی صابر دھی ہے۔“ مائے مقبول نے اپنی ہتھیلی سے اس کا چہرہ صاف کر کے پیشانی چومی۔ اس نے ایک بل کو آسودگی سے آنکھیں بند کیں۔ پھر بدقت اٹھ بیٹھی۔

”ماما! یہ لوگ مجھے مار ڈالیں گے۔“ ”لحاف اچھی طرح اوڑھ لو۔ سردی بہت ہے۔“ مائے مقبول نے آہستگی سے کہا۔

”ماما! یہ لوگ۔ یہ کہتے ہیں مکان ان کے نام لکھ دوں۔“ اس نے آہستگی سے لحاف اپنے کندھوں تک کھینچ لیا۔

”کیا؟“ ماما مقبول بری طرح چونکا۔ ”ماما! میں مکان ان کے نام لکھ دوں؟“ وہ اس سے گویا پوچھ رہی تھی۔

”تو اس لیے یہ حال کیا ہے ان وحشیوں نے تیرا۔“ ماما مقبول زیر لب بڑبڑایا۔ ”ماما! یہ۔۔۔ یہ مجھے مار ڈالیں گے۔ تم مجھے اپنے ساتھ لے چلو۔“ اس نے خوفزدگی کے عالم میں التجا کی۔

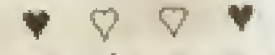
”بٹی کیوں اتار دی۔“ ماما تڑپ اٹھا۔ ”بٹی تو فساد کی جڑ تھی۔“ وہ دیوار کا سہارا لے کر کھڑی ہو گئی۔ بمشکل خود کو گھسیٹ کر چارپائی تک لائی۔ ماما مقبول نجانے کس سوچ میں ڈوب گیا تھا کہ اسے سہارا بھی نہ دیا۔

”میں آج اس کے پاس گیا تھا۔“ ”نہیں تارہ! اسے چارپائی پر گرتے ہوئے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔“

”میں نے اس سے کہا وہ تم سے شادی کر لے۔“ اور میں تارہ کا دل چاہا وہ ان دیواروں سے سر ٹکرا کر مر جائے۔

”اور کتنا ذلیل کرو گے مجھے۔“ جو اپنے تھے سر سے چادر کھینچ رہے تھے اور یہ شخص اس کے لیے عزت کی بھگ مانگ رہا تھا اور وہ بھی اس سے جو اس کا کچھ بھی نہ لگتا تھا۔ یا اللہ اور کتنی خواری لکھی ہے۔

پتا کس جرم کے معتب تھرائی گئی۔ ایسا کون سا گناہ سرزد ہو گیا کہ جیتے جی دوزخ میں ڈال دیا۔ بے بسی بے بسی۔ بس ایک آنسوؤں پر اختیار تھا اور رات کا دامن آنسوؤں سے بھینکا رہا۔



فائنل ایگز ام جیسے جیسے نزدیک آرہے تھے ہر کوئی افزا تفری کا شکار ہو رہا تھا۔ افتخار کی شاعری بھی کم ہو گئی تھی۔ شہلا اور آصف کے گروپ نے شاید ابھی کتابیں کھولی تھیں۔ وہ ایک ایک سے نوٹس مانگتے پھر رہے تھے۔ کوئی تھیسس میں مصروف تھی کسی کی اسائنمنٹ ادھوری۔ عظمیٰ کو اپنی پوزیشن کی فکر لاحق ہو گئی تھی سو وہ ہمیشہ لاہوری کے کسی نہ کسی کوئے میں پائی جاتی۔ پروفیسرز کے لیکچرز کے ساتھ ساتھ کلاسروں میں اضافہ ہو گیا تھا۔ انعم کی لاپرواہی کا وہی عالم تھا۔ وہ دن گنت گنت گرا اپنی خالہ کا انتظار کر رہی تھی۔ زارا بھی سنجیدگی سے اسٹڈی میں مصروف تھی۔ عظمیٰ اپنے نوٹس بانٹنے میں لگی رہتی اور انعم اس سے رستے میں۔

”تتی محنت سے بنائے گئے نوٹس کتنی آسانی سے بانٹ دیتی ہے یہ لڑکی۔“ ”تمہیں بھی تو دیتی ہوں۔“ عظمیٰ نے اپنی عینک ٹھیک کی۔

”میں تو خیر تمہاری سہیلی ہوں۔“ اس نے ڈھٹائی سے کندھے اچکائے۔

”ہاں اپنے پاس ڈھیر جمع کیا ہے۔ کبھی انہیں پڑھنے کی زحمت بھی کر لیا کرو۔“ زارا نے ڈانٹا۔

”پاس ہونا ہے نا ہو جاؤں گی۔“ اس نے لاپرواہی سے کہہ کر میز پر ہاتھ مارا اور چھوٹے کو بلا کر چائے کا کہنے لگی۔ پھر دونوں ہاتھ رگڑتے ہوئے ان کی طرف پلٹی۔

”یار! سردی بڑھتی جا رہی ہے۔“ ”ہاں یہ تو ہے۔“ زارا نے تائید کی تو وہ عظمیٰ سے پوچھنے لگی۔

”تمہاری امی نے ابھی تک بیسن نہیں بنایا۔“ ”ہاں تو نہیں بنایا۔“

”بنایا تو مجھے ضرور بھجوانا۔“ پھر زارا سے کہنے لگی۔ ”عظمیٰ کی امی بیسن بہت مزے کا بناتی ہیں۔“ ”کچھ ہاتھ پیر خود بھی ہلا لیا کرو۔“

”ہلائی تو ہوں مگر صرف دعا مانگنے کے لیے کہ اللہ میاں جی خالہ جلد آجائیں۔ ویسے زارا! عظمیٰ! مجھے لگتا ہے خالہ کی نیت خراب ہو گئی ہے۔ تب ہی تو اب مقننی کا ذکر بھی نہیں کر رہیں۔“ وہ بے حد تشویش سے کہہ رہی تھی۔ تب ہی افتخار ان کے پاس آگیا۔

”اور سنائیں کیا حال چال ہے؟“ خالی کرسی کی پشت پر دونوں ہاتھ ٹکاتے ہوئے اس نے اپنے مخصوص انداز میں پوچھا۔

”ہمارے حال تو ٹھیک ہیں۔ مگر تم آج کل کچھ موڈ میں نہیں لگتے۔“ زارا نے مسکراتی نگاہوں سے عظمیٰ کو دیکھا۔ وہ پہلو بدل کر رہ گئی۔

”دو سال یونیورسٹی میں یونہی گزار دیے۔ اب تھوڑا پڑھنے بھی دس زارا ابی۔“ ”اگر کوئی پراہم ہو تو عظمیٰ کے پاس کافی اچھے نوٹس



”میں نے انہیں منع کر دیا تھا۔“

”آپ نے مگر کیوں؟“

زارا نے قدرے حیرت سے اس کا جھنجھلاؤ دیکھا۔  
”زمین یا تو تم کہنے سے پہلے سوچ لیا کرو یا پھر جو کچھ  
کہتے ہو اس پر قائم رہا کرو۔“

”مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔ مجھے کیا کرنا ہے۔  
مجھے کیا کرنا چاہیے۔ بس میں آپ لوگوں سے دور  
نہیں رہ سکتا۔ آپ اور پچھو دو دن تک نہیں آئیں۔  
میں انتظار کرتا رہا۔ پھر مجھے لگا میں اکیلا ہو گیا ہوں۔  
کوئی بھی نہیں میرا۔ آپ۔ آپ کیوں نہیں میری  
مدد کرتیں۔“ وہ پھر سے ڈبل مابند ڈھو رہا تھا۔ پھر سے  
وہی اضطراب اس کے لب و لہجہ میں اتر آیا تھا۔ جو  
زارا کو ہیشہ تکلیف دیتا تھا۔

”کروں گی۔ ضرور تمہاری مدد کروں گی۔ مگر اس  
وقت تم سیدھے گھر جاؤ۔ کھانا کھاؤ۔ کافی پیو اور آرام  
کرو۔“

”آپ آج بھی نہیں آئیں گی۔“ اس نے شکوہ  
کناں لگا ہوں سے زارا کو دیکھا۔ ایک بل کو وہ سوچ  
میں ڈوب گئی۔ آج تائی جان کو آنا تھا۔ شاید وہ ابھی  
چکی ہوں گی اور اس کا انتظار کر رہی ہوں گی۔ مگر وہ یہ  
زمین سے نہیں کہہ سکتی تھی۔  
”آج گھر میں کچھ کام ہے مجھے۔ مگر میں کل ضرور  
آؤں گی۔“

”اوکے۔“ حسب معمول وہ فوراً ہی مان گیا تھا  
اور زارا تب تک وہیں کھڑی رہی۔ جب تک اس کی  
بانیک نظروں سے اوچھل نہ ہو گئی۔ پھر سر  
جھٹک کر لاک کھولنے لگی۔

♥ ♥ ♥ ♥

رضوان والی جارہا تھا۔ اسے دیکھ کر روک گیا۔  
”اسلام علیکم۔“ زارا روک کر ہر نکل آئی۔  
”وعلیکم السلام۔“ وہ وہیں اپنی گاڑی سے ٹیک لگا  
کر کھڑا ہو گیا۔

”آپ واپس جارہے ہیں۔“  
”تم کہو تو نہ جاؤں۔“ دونوں ہاتھ سینے پر

باندھتے ہوئے اس نے برجستہ پوچھا تو وہ مسکرا کر  
قدرے بے نیازی سے گویا ہوئی۔

”آپ کی مرضی ہے۔“

”مگر ہم آپ کی مرضی پر چلنا چاہیں تو۔۔۔“ اس  
نے مجسم لب و لہجہ میں پوچھا۔

”تو۔۔۔“ زارا نے اسے دیکھا پھر نظروں کا زاویہ  
بدل کر بولی تھی۔ ”ممت جائیں۔“

”اوکے۔۔۔“ وہ دونوں ایک ساتھ چلتے ہوئے اندر  
داخل ہوئے۔ تو تائی جان نے قدرے حیرت سے  
اسے دیکھا۔

”ابھی تو تم جلدی جلدی کا شور مچا رہے تھے۔“  
وہ مسکرا کر دیوار پر لگی پینٹنگ دیکھنے لگا۔ زارا تائی  
جان سے ملتے ہوئے شکوہ کرنے لگی۔

”کتنے دنوں بعد آئی ہیں آپ۔۔۔“

”ہاں تم تو جیسے روز آتی ہو۔۔۔“ انہوں نے اس کی  
پیشانی پر ہوسہ دیتے ہوئے جواب دیا۔

”مجھے تو ماما منع کرتی ہیں۔“ وہ اطمینان سے کہہ کر  
ان کے قریب بیٹھ گئی۔

”کیوں آئمہ! تم کیوں منع کرتی ہو۔ یہ میری بیٹی  
پہلے ہے اور ہوبعد میں۔“ تائی اماں نے کہا تو ممانے  
اسے گھور کر دیکھا۔

”میں نے کب روکا ہے۔ خود اسی کے پاس وقت  
نہیں ہوتا۔“

زارا ہنس دی پھر بھابھی اور سعد کے بارے میں  
پوچھنے لگی۔

”میں نہیں کیوں نہیں لائیں۔“  
”بھئی ان سے ملنا ہے تو جا کر مل لینا۔ میں تو اس  
لیے آئی کہ صبح گاؤں جارہی ہوں۔ سوچا جاتے جاتے  
ملتی جاؤں۔“

”ابھی آپ کو آئے ہوئے دن ہی کتنے ہوئے ہیں۔“  
”پھر جارہی ہیں۔“

”وہاں حویلی کا حشر کر دیا ہو گا تو کروں۔“ چار دن  
کے لیے آجاؤں تو سارے کام رک جاتے ہیں ویسے

بھی یہاں میرا دل نہیں لگتا اور تمہارا امتحان کب  
مطلب ہے۔۔۔“ وہ ذرا سا اس کی طرف جھکا۔ ”وہ

تک ہے۔۔۔؟“ انہوں نے کہتے کہتے بات بدلی۔

”بہت تھوڑے دن رہ گئے ہیں۔“

”بس آئمہ! اب رخصتی کی تاریخ دے دو۔ جیسے ہی  
اس کا امتحان ختم ہوتا ہے۔ یہ مبارک کام بھی ہو ہی  
جائے۔ نئے سال تک رضوان کی فیکٹری میں کام بھی  
شروع ہو جائے گا۔ یہ نیا سال ہماری حویلی میں بس  
خوشیاں ہی خوشیاں لائے گا۔ انشا اللہ۔“ تائی جان  
حسب معمول جذباتی ہو گئیں۔ زارا نے ایک طویل  
سانس لے کر رضوان کو دیکھا۔ وہ مسکرا رہا تھا۔

”جاؤ زارا! تم چیخ کر کے کھانا کھاؤ۔۔۔“ ممانے  
سوچا، کہیں زارا اپنی کسی بات سے ناگواری کا اظہار نہ  
کر دے۔ سوائے بہانے سے ہٹا دیا۔

”کھانا تو۔۔۔ خیر۔ رضوان آپ کافی پیئیں گے۔“  
زارا نے اٹھتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں مگر لان میں۔“ وہ اٹھتے ہوئے بولا۔

”ہاں تم لوگ باتیں کرو جا کر۔۔۔“  
زارا نے پہلے خانساں کو کافی بنانے کا کہا۔ پھر چیخ  
کر کے اور فریش ہو کر آئی تو ساتھ ہی ملازم کافی دے  
گیا۔ رضوان پہلے ہی لان میں بیٹھا اخبار دیکھ رہا تھا۔

”آپ کی فیکٹری کہاں تک پہنچی۔“ زارا نے مک  
اس کی طرف بدھایا۔

”بس غنقریب کام شروع ہو جائے گا۔“ اس نے  
اخبار تہہ کر کے ٹیبل پر رکھا اور مک تھام لیا۔ زارا اس  
کے سامنے بیٹھ گئی۔ سبز لباس میں کھلے بالوں اور  
شفاف چہرے کے ساتھ خاصی فریش لگ رہی تھی۔

وہ نجائے کیا سوچ کر مسکرا دیا۔ زارا اس کی نگاہوں کی  
تپش محسوس کر کے ایک پل کو پزل سی ہوئی۔ ابھی کوئی  
بات ڈھونڈ رہی تھی جب وہ زیر لب بڑبڑایا۔

”صرف نکاح نہیں ہونا چاہیے تھا۔“  
”مجھ سے کچھ کہا۔۔۔“

”تم سے کیا کہنا ہے۔ اب تو جو کچھ بھی کہنا ہے،  
ابنہ اللہ محترمہ سے کہنا ہے۔“

”مطلب۔۔۔؟“  
”وہ ذرا سا اس کی طرف جھکا۔“ وہ

تک ہے۔۔۔؟“ انہوں نے کہتے کہتے بات بدلی۔

”بہت تھوڑے دن رہ گئے ہیں۔“

”بس آئمہ! اب رخصتی کی تاریخ دے دو۔ جیسے ہی  
اس کا امتحان ختم ہوتا ہے۔ یہ مبارک کام بھی ہو ہی  
جائے۔ نئے سال تک رضوان کی فیکٹری میں کام بھی  
شروع ہو جائے گا۔ یہ نیا سال ہماری حویلی میں بس  
خوشیاں ہی خوشیاں لائے گا۔ انشا اللہ۔“ تائی جان  
حسب معمول جذباتی ہو گئیں۔ زارا نے ایک طویل  
سانس لے کر رضوان کو دیکھا۔ وہ مسکرا رہا تھا۔

”جاؤ زارا! تم چیخ کر کے کھانا کھاؤ۔۔۔“ ممانے  
سوچا، کہیں زارا اپنی کسی بات سے ناگواری کا اظہار نہ  
کر دے۔ سوائے بہانے سے ہٹا دیا۔

”کھانا تو۔۔۔ خیر۔ رضوان آپ کافی پیئیں گے۔“  
زارا نے اٹھتے ہوئے پوچھا۔

”جو بھی سوچ رہی ہیں بالکل ٹھیک سوچ رہی ہیں۔“ اس  
کا لہجہ وانداز مجسم تھا۔

”اتنی جلدی کیا ہے؟“ وہ ٹالنے کو بولی۔  
”بہت جلدی ہے۔“ وہ زور دے کر بولا۔

”اور وہ آپ کا وعدہ۔“  
”کون سا؟۔۔۔“ رضوان چونکا۔

”میرے اخبار والے۔“  
”ہو جائے گا یا رہا! کہاں منع کر رہا ہوں لیکن میں  
بہت سنجیدگی سے کہہ رہا ہوں۔ اب ای کو مزید ٹالنا  
ممکن نہیں۔۔۔ اور شاید خود کو بھی۔۔۔“ آخری جملہ  
مدھم مدھم گہیر لہجے میں کہا گیا تھا۔

”مجھے کم از کم آپ سے یہ امید نہیں تھی۔“ زارا  
نے خفگی سے اسے دیکھا۔

”اچھا۔۔۔“ رضوان نے دلچسپی سے اسے دیکھا۔  
”اور کون کون سی امیدیں وابستہ کر رکھی ہیں ہم  
سے۔“ زارا نے بنا کوئی جواب دیے کافی کا مک لہوں  
سے لگایا۔

♥ ♥ ♥ ♥

رات کو اپنے تمام کاموں سے فارغ ہو کر وہ لاؤنج  
میں آگئی۔ ممانی ہی بیٹھ رہی تھیں۔ اسے دیکھ  
کر ریموٹ اٹھا کر آواز ہلکی کر دی۔

”پاپا نہیں آئے ابھی تک۔“ زارا قدرے مطمئن  
موڈ میں ان کے پاس بیٹھ گئی۔ کشن اٹھا کر گود میں رکھ  
لیا۔

”وہ کہاں آتے ہیں اتنی جلدی۔“ وہ قدرے  
ہنزاری سے بولیں۔ ”حالانکہ آج میں نے ان سے  
بہت کچھ ڈسکس کرنا تھا۔“

”اتنی نو ماما! آپ کو کیا ڈسکس کرنا تھا۔ جب بھی  
تائی جان یہاں سے ہو کر جاتی ہیں۔ آپ کی ڈسکشنز  
کافی بڑھ جاتی ہیں۔“

”تم اتنا الٹ بکت کیوں ہو اس ٹاپک سے؟۔“ ماما  
نے مسکرا کر اسے دیکھا۔

”اور آپ کو اتنی جلدی کیوں ہے مجھے نکالنے  
کی۔“



”فرغ کی ادائیگی جتنی جلدی ہوا تھا ہی اچھا ہے۔  
تمہاری۔۔۔“ فون کی بیل نے ان کا جملہ کاٹ دیا۔  
زارا زبیک تھی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر ریسیور اٹھالیا۔  
”ہائے۔ شیراز بھائی۔“  
”کیسی ہو زارا۔۔۔“ ان کا باشا لہجہ ان کی کامیاب  
اور خوشگوار زندگی کا ضامن تھا۔  
”میں بالکل ٹھیک ہوں۔ آپ سنائیں، بھابھی اور  
میرا بھتیجا کیسا ہے۔ کب لے کر آرہے ہیں اسے  
ہمارے پاس۔“  
”دھیرج گڑیا! بھابھی تمہاری بہت اچھی ہیں۔  
کیونکہ ہماری بیوی ہیں، بھتیجا تمہارا بہت خوبصورت  
ہے کیونکہ مجھ پر گیا ہے۔“  
”اوہ۔۔۔“

”باقی رہا ہمارے آنے کا سوال تو وہ تمہاری شادی پر  
ہی ممکن ہے۔“ انہوں نے اطمینان سے اس کے  
سوالوں کے جواب دیے۔  
”گویا ابھی آپ کے آنے کا کوئی ارادہ نہیں۔“  
”مجھ سے بات کرو۔“ ممانے کہا تو اس نے  
ریسیور ان کی طرف بڑھا دیا اور خود پگن میں آگئی۔  
پلیٹ میں کاجو اور تلی ہوئی مونگ پھلی نکال کر لائی تو  
مما مصروف تھیں۔  
”بس تم تیار رہو۔“

”ہاں اس کے ایگزائمز کے فوراً بعد۔“  
”یہی کوئی دو تین ماہ ہیں بس۔۔۔“  
”کچھ لمحے دوسری طرف کی بات سننے کے بعد وہ پھر  
بولی تھیں۔  
”ہاں تمہارے بھائی کسی بزنس ٹور کے سلسلے میں  
شکاگو جا رہے ہیں۔ یہی کوئی ایک ہفتے کے بعد۔“

”ہاں، تم راجا اور فہم کو میرا پیار دینا۔“  
”خدا حافظ۔ اللہ تمہیں خوش رکھے۔“ انہوں نے  
ریسیور رکھا۔ پھر کاجو کھاتی زارا سے خوشگوار موڈ میں  
کہنے لگیں۔  
”شیراز کہہ رہا ہے۔ وہ مارچ میں آنے کی کوشش  
کرنے لگا۔“

”چلیں اچھی بات ہے۔“ زارا نے پلیٹ ان کی  
طرف بڑھائی۔ انہوں نے مونگ پھلی کے چند دانے  
منہ میں رکھے۔ ”اس نے جب سے شادی کی ہے۔  
پاکستان آتا تو بالکل ہی چھوڑ دیا ہے۔“ ان کے کنبے میں  
ہلکا سا شکوہ تھا۔  
”ان کی اپنی لائف سیٹل ہو گئی ہے اور آپ کو تو  
بھائی کئی بار بلا چکے ہیں۔“  
”ہاں پہلے میں سوچتی تھی، تمہاری شادی کے بعد  
ہم لوگ وہیں چلے جائیں گے مگر اب زین یہاں بالکل  
اکیلا ہو جائے گا یا پھر وہ بھی۔“ جملہ ادھورا چھوڑ کر وہ  
نجانے کیا سوچنے لگیں۔ پھر سر جھٹک کر پوچھنے  
لگیں۔

”تم زین سے ملی تھیں۔؟“  
”ہاں، بہت خفا ہو رہا تھا کہ پچھو آئیں کیوں  
نہیں۔“  
”تم نے مجھے خواہ مخواہ روک دیا۔۔۔“

”میں چاہتی تھی۔ وہ ایک بار تنہا بیٹھ کر اچھی طرح  
سوچ لے کہ آخر وہ کرنا کیا چاہتا ہے۔ ڈبل مائنڈ  
ہے۔ ایک بار سوچ لے اسے کیا کرنا ہے۔ لیکن ممما!  
اس کی شخصیت میں کوئی استحکام نہیں، اس کے  
فیصلوں میں کوئی مضبوطی نہیں۔ وہ آج کچھ کہتا ہے تو  
کل کچھ اور۔ ایک بل کو لگتا ہے وہ ساری دنیا کو ٹھوکر  
میں اڑا دے گا۔ کوئی نہ کوئی امیٹیپ ضرور لے گا اور  
دوسرے بل وہ پھر سے کسی نہ کسی سہارے کا متلاشی  
نظر آتا ہے، ایک دن وہ کہتا ہے کہ اسے کوئی یہ نہ  
بتائے کہ اسے کیا کرنا ہے اور دوسرے دن وہ چاہتا ہے  
کہ کوئی اس کا ہاتھ تھامے اور منزل تک لے  
جائے۔“

”مما بے حد خاموشی سے سنتی رہی تھیں پھر ایک  
طویل سانس لے کر بولیں۔  
”ذرا غور کرو زارا! ہم میں سے ہر کوئی ایک  
دوسرے کے ساتھ منسلک ہے۔ ہر کوئی دوسرے کو  
سہارا دے رہا ہے۔ کسی کا نام، کسی کا سٹینس، کسی کی  
محبت ہمیں مضبوط کر دیتی ہے۔ تنہا انسان کیا ہے؟“

بھی نہیں۔ یونہی تو اسے معاشرتی حیوان نہیں کہا گیا۔  
یہ اس کا ماحول ہوتا ہے جو اسے مضبوط کرتا ہے۔ یہ  
اس سے منسلک رشتے ہوتے ہیں۔ جو اس میں سر اٹھا  
کر چھینے کا حوصلہ پیدا کرتے ہیں۔ زین کے پاس کیا  
ہے۔ گناہ ماضی، حال کی کشمکش اور غیر یقینی مستقبل،  
وہ بہت اکیلا ہے۔ اس کے ہاتھ میں تو کچھ بھی نہیں۔  
اسی لیے۔ اسی لیے تو میں اسے تنہا نہیں چھوڑ  
سکتی۔“ ممما کا لہجہ اور آنکھیں دونوں بھیگ گئیں۔  
”مما! ماموں بھی ایسے ہی تھے۔“ زارا نے کچھ  
سوچتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں۔۔۔ لیکن حالات۔۔۔ حالات تو ڈر دیتے ہیں  
انسان کو۔“

”لیکن ہم کر بھی کیا سکتے ہیں زین کے لیے۔“ زارا  
نے قدرے بے چارگی سے کہا۔ ممما نے نظروں کا  
زاویہ بدل کر اسے دیکھا۔ پھر مبہم سا مسکرائیں۔  
”ہاں۔ تم تو واقعی کچھ نہیں کر سکتیں۔ مگر میں۔۔۔  
میں ضرور کروں گی۔“

زارا کو ان کا لہجہ کچھ عجیب سا لگا۔  
”آپ کیا کریں گی۔“  
”وقت آئے گا تو بتاؤں گی۔“

”آخر یہ وقت کب آئے گا۔۔۔“ زارا جھنجھلا سی  
گئی۔

”بہت جلد۔ اب تو بہت جلد آئے گا۔“ وہ مبہم سا  
مسکرا رہی تھیں۔ زارا نے الجھ کر انہیں دیکھا۔ کچھ  
پوچھنا چاہا مگر نجانے کیا سوچ کر ارادہ ملتوی کر دیا تھا۔  
شاید وہ جانتی تھی کہ ممما سے کچھ نہیں بتائیں گی۔ تب  
ہی اکتے ہوئے کہنے لگی۔

”میں کل جاؤں گی زین کی طرف۔۔۔“  
”ضرور جانا۔ میں بھی جاؤں گی۔ اس وقت اسے  
صرف ہماری محبت اور توجہ کی ضرورت ہے ورنہ وہ بکھر  
جائے گا۔“

”اور ہم اسے کبھی بکھرنے نہیں دیں گے۔“ زارا  
نے ذرا سا جھک کر ان کے گال پر پیار کیا۔ پھر شب خیر  
کہہ کر اپنے بیدروم میں چلی گئی۔

♥ ♥ ♥ ♥  
مما نے مقبول نے انہیں بہت کچھ کہا تھا۔ مگر دوسری  
طرف بھٹائی تھی۔  
”شرم کس۔۔۔ شرم کر، یتیم کا مال کھا رہا ہے۔“  
مما نے مقبول کا سانس پھول گیا تھا۔ ظہور نے کان میں  
ماچس کی تیلی چلاتے ہوئے بے زاری سے اسے  
دیکھا۔  
”اس میں شرم کی کیا بات ہے۔ ضرورت ہے  
مجھے۔“

”اور اپنی ضرورت کے لیے اس پر ظلم کر رہے ہو۔  
تمہیں لگا رہے ہو۔“

”کون تمہیں لگا رہا ہے۔“ ظہور بھڑک اٹھا۔  
”تمہاری اپنی لاڈلی کے کروتوت ہیں جو سامنے آئے  
ہیں۔ کل کلاں کو کسی اور کے نام لکھ دے گی تو؟  
ہمارے باپ دادا نے اس لیے خون پیوند ایک نہیں  
کیا۔“

”تمہارے دادا نے یہ مکان خود اس کے نام کیا  
ہے۔“

”ہاں تو اس بہشتی کو کیا معلوم تھا کہ یہ گل کھلائے  
گی۔“

”ایک بات یاد رکھ ظہور! میں یہ مکان تمہارے نام  
نہیں ہونے دوں گا۔“

”تو کیا اپنے نام لکھوائے گا۔“ اس کا لہجہ  
استہزاء تھا۔

”دیکھیم کمال کسی کو ہضم نہیں ہوتا۔ خدا کے قہر کو  
آواز نہ دے۔“ غصے کی شدت سے ماما مقبول کا  
بوڑھا جسم کانپ کانپ گیا۔ اندر مین تارہ کا دل بے تکی  
طرف لرز رہا تھا۔ اسے پتا تھا، ماما مقبول کا سہارا بس  
تنگے جتنا ہے۔ پھر بھی اس لگائے بیٹھی تھی۔ کیا معلوم  
ماما اسے اس جہنم سے نکال ہی لے۔

”کیا ہنگامہ ہے پیسے۔؟“ نیاز اندر داخل ہوا۔ تو  
بتول لپک کر آگے ہوئی اور ساری بات اس کے گوش  
گزار کر دی۔  
”اوہ ماما! کھپ نہ ڈال۔ جو کام تجھے کہا ہے جا کر وہ



کہ "اس نے گویا کان سے مکھی اڑائی۔"

"کون سا کام؟"

"رشتہ ڈھونڈ اس کے لیے۔"

"میں اسے ساتھ لے کر جاؤں گا۔ جہاں مناسب سمجھوں گا بیاہ بھی کروں گا۔" مامے مقبول نے دو ٹوک لہجے میں بات کی۔

"نہ۔ نہ یہ بات نہ کرتا۔ اس دنیا میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل بھی چھوڑنا ہے یا نہیں۔ لوگ کیا کہیں گے یہی کہ بیاہ کا خرچ نہ اٹھایا گیا تو مامے کے ہاں نکال پھینکا۔"

"لوگ تو یہ کہیں گے غیرت مند بھائیوں نے جان چھڑائی۔" ناما زرب لب بڑبڑایا۔

"ہاں جان تو چھڑائی ہے۔ پر کسی طریقے سے۔ ماما! تو رشتہ ڈھونڈ لا ہم بیاہ کر دیں گے۔"

"اور مکان۔۔۔۔۔" مامے نے چیختی نگاہوں سے اسے دکھا۔

"مکان کی پھر دیکھی جائے گی۔" نیاز نے لاپرواہی دکھائی۔

"اسے میرے ساتھ نہیں بھیجو گے۔" مامے مقبول نے باری باری سب کی طرف دیکھا۔

"دیکھ ماما! ہے تو تو تارہ کا ماما۔ ہمارا تمہارا کوئی رشتہ بنتا نہیں ہے۔ پر میں نے ہمیشہ تمہاری عزت کی ہے۔"

پر ایک بات کبوں بندے کی عزت اپنے ہی ہاتھ ہوتی ہے۔ ایک بار ہم نے جوابات کہہ دی سو گھم دی۔"

نیاز نے گویا بات ہی ختم کر دی اور ماما مقبول کمزور تھا۔ ہمیشہ کی طرح وہیں سے پلٹ گیا کہ تارہ کو تسلی دینے کے لیے وہ حرف بھی نہ تھے۔

"یہ بڑھا کوئی پھڑانہ کر دے۔" ظہور کے لہجے میں تشویش تھی۔

"میں کرے گا۔ پر اب یہ کام تھوڑا جلدی کرنا ہو گا۔" نیاز نے سوچتے ہوئے کہا۔

"میری تو یہ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ وہ انکار کس کی شہ پر کر رہی ہے۔" ظہور جھنجھلا کر بولا۔

"خیر و غیور خط کرتی ہے تو ٹھیک ہے ورنہ۔"

"ورنہ۔۔۔۔۔" ظہور اور بھول دونوں چونک گئے۔

"ٹھکانے لگا دیں گے۔ مکان تو اس صورت میں بھی ہمارے پاس ہی آئے گا۔" نیاز نے اطمینان سے کہا جبکہ بھول اور ظہور دم بخود سے ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے تھے۔

♥ ♥ ♥ ♥

"گیا ہوا پایا کو آج آفس نہیں جاتا۔" زارا تیار ہو کر ناشتے کی ٹیبل تک آئی۔ تو فاطمہ بچن سے ٹرے میں ناشتہ لگائے باہر نکلی تھی۔ زارا کے پوچھنے پر کہنے لگی۔

"صاحب کے لیے ہے۔ وہ ناشتہ اپنے کمرے میں کریں گے۔" زارا نے بے اختیار وال کلاک کی طرف دیکھا۔ ساڑھے نو ہو رہے تھے۔ اس کے پہلے دو بیڑی فری تھے۔ اس لیے وہ خود بھی لیٹ اٹھی تھی۔

"چتا نہیں جی۔ ویسے مجھے لگتا ہے ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"

"چھا۔ رات کو کب آئے تھے پایا۔"

"چتا نہیں۔ میں تو اپنے کوارٹر میں جا چکی تھی۔ لگتا ہے خاصی دیر سے آئے تھے۔"

"ٹھیک ہے۔ میرے لیے بھی ناشتہ وہیں لے آؤ۔" زارا نے ٹرے اس کے ہاتھ سے تھام لی۔ ہلکی سی دستک کے ساتھ وہ اندر داخل ہوئی۔

"گڈ مارننگ۔"

"گڈ مارننگ جانو۔" پیانکی کے سہارے نیم دراز تھے۔ اسے دیکھ کر مسکرا دیے۔ ماما سائیڈ ٹیبل کی بوراز سے شاید کوئی میڈیسن نکال رہی تھیں۔ پلٹ کر دیکھا پھر خفگی سے پوچھنے لگیں۔

"فاطمہ کہاں ہے؟"

"فاطمہ میرے لیے ناشتہ لا رہی ہے۔ آج میں اور پایا اکٹھے ناشتہ کریں گے، لیکن پایا! آپ ابھی تک بیڈ پر کیوں ہیں؟"

"زارا نے ٹرے ٹیبل پر رکھی۔" "یو تھی طبیعت ذرا بوجھل سی تھی۔" انہوں نے پیشانی مسلی۔

بے چین رہے ہیں۔" ماما کی آنکھیں چتا رہی تھیں کہ وہ ساری رات جاگتی رہی ہیں۔

"ڈاکٹر کے پاس نہیں گئے۔" زارا نے تشویش سے ان کی پیشانی پر ہاتھ رکھا۔

"ڈاکٹر کا کیا ہے فوراً" بیڈ ریسٹ بتا دیں گے۔"

"بالکل ٹھیک کریں گے۔" زارا نے تائید کی پھر ماما کی طرف پلٹی۔ "ماما! آج پایا کو گھر سے نہیں نکلنے دیتا۔"

نوفون کالز نو میٹنگ اینڈ نو کیسٹ۔ اوکے۔۔۔۔۔"

"تم اور تمہاری ماما۔" پایا سر پکڑ کر رہ گئے۔

"آج بہت اہم میٹنگ ہے۔"

"ایسا! یہ برس! یہ میٹنگز! یہ پیسہ ہم تب تک انجوائے کر سکتے ہیں جب تک ہماری صحت ہے اور آپ کی صحت ہمارے لیے سب سے اہم ورثہ ہے۔"

اب آپ ناشتہ کریں۔ میں لیٹ ہو رہی ہوں۔" بات کرتے کرتے اس کی نگاہ وال کلاک پر پڑی تو وہ فوراً کھڑی ہو گئی۔

"اور ناشتہ۔" ماما نے ٹوکا۔

"اب وقت نہیں ہے، وہیں سے کچھ لے لوں گی۔"

گڈ بائے پایا! گڈ بائے ماما۔" وہ انہیں پکارتے ہوئے باہر نکلی۔ فاطمہ ناشتہ لیے آرہی تھی۔

"لیلی جی! ناشتہ۔"

"تم کر لو۔۔۔۔۔" وہ جواب دے کر باہر نکل گئی۔ کچھ اہم کلاسز تھیں جن کے بعد افتخار نے ایک دم کھڑے ہو کر پوچھا۔

"روپینے کون کون چل رہا ہے۔" ساری کلاس تیار تھی۔

"نو کیا ہوتی ہے۔۔۔۔۔" مریم نے قدرے حیرت سے دریافت کیا۔ افتخار کا قہقہہ بے ساختہ تھا۔

"مجھے پتا تھا! یہ ضرور بولیں گی۔ گنے کے رس کو کہتے ہیں لیلی۔"

"تو سیدھی طرح بولو نا۔" وہ قدرے جھل سی ہو کر بولی۔ "مگر میں تو وہی بھلے کھاؤں گی۔"

"میں بھی۔۔۔۔۔" شہلا نے اس کا ساتھ دیا۔

"اور میں دونوں چیریں۔۔۔۔۔" انعم بولی۔ پھر عظمیٰ کو

ٹھوکا دے کر بولی۔ "چل رہی ہو؟"

"نہیں بھئی، مجھے سر سہیل سے کچھ کام ہے۔ میں ان کے آفس جا رہی ہوں۔" وہ یوں بھی ایسی سرگرمیوں میں شریک نہیں ہوتی تھی۔

"عظمیٰ چلو نا مزار ہے گا۔" زارا نے بھی زور دیا۔

پھر بھی وہ کہیں مانی۔ افتخار گویا ان کے درمیان ہونے والی گفتگو سے آگاہ تھا۔ تب ہی پکار کر بولا۔

"جو نہیں جائے گا۔ اس کے لیے وہی بھلے پیک کرالیں گے۔"

"میں جا رہی ہوں۔۔۔۔۔" عظمیٰ تھلا کر اٹھ گئی۔ آصف چندہ کرنے لگا تھا۔ جب حیدر بول اٹھا۔

"یہ دعوت میری طرف سے ہے۔۔۔۔۔" اس کی حال ہی میں اپنی خالہ زاد کے ساتھ منگنی ہوئی تھی۔ وہ لوگ کب سے اس کے پیچھے پڑے تھے اور وہ ہمیشہ ٹال جاتا تھا۔

"ہرے" سب نے ایک ساتھ نعرہ لگایا۔ جو نہیں جا رہے تھے۔ وہ بھی ساتھ چل دیے۔

"ستے چھوٹ رہے ہو یا رب۔" کسی نے جملہ کہا۔

حیدر نے والٹ نکال کر پیسے گنے۔ آصف سے سو روپیہ ادھا لیا۔ جو اس نے حیدر کو گھورتے ہوئے اور سب کو گواہ بنا کر دیا۔ ٹھیک ٹھاک سر دی تھی۔ مگر دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ سڑک اور مہر کے کنارے کھلے پھولوں پر ابھی خزاں نہیں آئی تھی۔ بہت سے بے فکرے بونٹک کا شوق پورا کر رہے تھے۔ وہ لوگ کیمپس سے نکل کر شاپنگ سینٹر کی طرف آگئے۔ بے فکری خوش گلیاں، قمقمے اور چھینر چھاڑے۔ آصف بار بار حیدر سے پوچھ رہا تھا۔

"یار! تیری منگنی ہو کس طرح گئی۔ لڑکی والوں نے کچھ بھی نہیں دیکھا۔"

اور جواباً حیدر سے گھونے کھا رہا تھا۔

آدھے لوگوں نے گنے کے رس والے کو گھیر لیا اور کچھ نے وہی بھلے والے کو۔ حیدر نے بڑے جوش میں دعوت دی تھی اور اب اس کے ہوش اڑے جا رہے تھے۔ وہ سب لوگ یوں کھا اور پی رہے تھے جیسے ان



کی زندگی کی آخری دعوت ہو۔  
 ”کوئی رعایت نہ برتا۔“ افتخار کے نعرے پر ان لوگوں اور خاص طور پر لوگوں کی اسپید میں خاصا اضافہ ہو گیا تھا۔ حیدر کبھی آصف اور مریم کے گروپ کے پاس جا کر کہتا تھا۔  
 ”کچھ خیال کرو۔ اتنا تیز مرج مسالہ ہے۔ کیوں اپنے معدے پر اتنا ظلم کر رہے ہو۔“ تو کبھی افتخار کی طرف پلٹتا۔  
 ”یار! سردی بہت ہے۔ اتنا رس پیو گے تو نزلہ ہو جائے گا۔“  
 مگر کوئی اس کی بات سن ہی کہاں رہا تھا۔ سب کے سب مصروف تھے آخر تھک کر وہ بیچ پر بیٹھا اور خود بھی رس پینے لگا۔  
 ”بے چارہ حیدر۔“ زارا نے مسکرا کر انہم کو دیکھا۔  
 تیز مرجوں نے اس کا حشر کر دیا تھا۔  
 ”اتنا رو رو کر دی بھلے کیوں کھا رہی ہو۔“  
 ”تم بھی ٹرائی کرو۔“ اس نے پلیٹ زارا کی طرف بڑھائی اور دوسرے ہاتھ سے آنسو پونچھے۔  
 ”مجھے تو معاف ہی کرو۔“ اس نے خالی گلاس رضا کو تھما دیا۔  
 ”اور لاؤں؟“ رضا نے پوچھا، زارا نے نفی میں سر ہلادیا۔  
 ”یہ کیا آپ ابھی سے میدان چھوڑ گئیں۔“ افتخار ان کے قریب آیا۔  
 ”خدا کا خوف کرو۔ کیوں حیدر کا ہارٹ فیل کرواؤ گے۔“  
 ”اتنا کمزور دل نہیں ہے۔“ پھر مسکرا کر انہم کو دیکھا۔  
 ”اور انہم نے اپنی لکھی تازی۔“  
 انہم نے خالی پلیٹ بیچ پر رکھی۔ پھر نشو سے منہ پونچھتے ہوئے افتخار کو گھورا۔  
 ”کیا سننا چاہتے ہیں افتخار بھائی۔“ اسے غصہ تھا۔  
 ”افتخار آگے کیوں نہیں بڑھتا۔ تب ہی لہجہ کچھ بڑا ہوا تھا۔  
 ”تھیک ہے زارا جی! نہیں جائیں گے۔ مگر میری

بے ضرور جائیں گی انہیں مبارکباد دینے کے لیے۔“  
 ”افتخار۔!“ زارا نے کچھ کہنا چاہا۔ مگر وہ بنا سننے حیدر کے پاس جا پہنچا تھا۔ ”یہ۔“ انہم نے جوش میں اس کا ہاتھ دبایا۔ ”تم دیکھنا۔ اب وہ اپنا پرپوزل ضرور بھجوائے گا۔“  
 ”مگر تم اس کی اتنی سائیڈ کیوں لے رہی ہو۔“ زارا نے اس کے جوش کو پوری طرح محسوس کیا۔  
 ”کیونکہ میرا دل کہتا ہے۔ وہ عظمیٰ کے لیے بہترین ساتھی ثابت ہوگا۔“  
 ”خدا کرے۔“ آونیوایر کارڈ دیکھتے ہیں۔ ”وہ شہلا وغیرہ کے ساتھ شاپنگ سینٹر میں جا گھسیں۔“  
 اور جب عظمیٰ نے سنا تو بھڑک اٹھی۔  
 ”اگر اس کی بے بے میرے گھر آئیں۔ تو میں خود کشی کر لوں گی۔“  
 ”ضرور کرنا۔“ انہم کا اطمینان ہنوز قائم تھا۔ ”مگر ان کی خاطر مہارت میں کوئی کمی مت کرنا۔ بلکہ ایسا کرنا۔ مجھے آواز دے لینا میں کچھ زیادہ بہتر۔“  
 ”میں دیکھ لوں گی۔“ عظمیٰ بیاؤں پختی چلی گئی۔  
 ”مت تنگ کیا کرو انہم۔“ زارا نے کھورا تو وہ معصومیت سے پوچھنے لگی۔  
 ”میں نے کیا کیا ہے۔ صرف اس کی مدد کرنا چاہی تھی۔“  
 ”وہ اپنی مدد خود کر سکتی ہے۔“ زارا نے کلائی موڈ کر گھڑی پر نگاہ دوڑائی۔ پھر بیک سنبھال کر کھڑی ہو گئی۔  
 ”آج میں ڈراپ کروں تم لوگوں کو۔“  
 ”آج یہ مہربانی کیوں؟۔“  
 ”مجھے زین کی طرف جانا ہے۔“ زارا مسکرا دی۔  
 اس صورت میں ان کا گھر راستے میں پڑتا تھا۔  
 ”زین شاید آج آیا نہیں۔“  
 ”ہاں۔!“  
 ”عجیب قنوطی سا ہے تمہارا یہ کزن۔ سال بھر میں شرم کی کوہ دست بھی نہیں بناسکا۔ جب دیکھو، تمہا کسی نہ کسی کتاب میں سر دیے بیٹھا ہوتا ہے۔ کیا یونیورسٹی

کے سارے اگلے پچھلے ریکارڈ اسی کو توڑنے ہیں۔“  
 ”پتا نہیں۔“ زارا مسکرا دی۔ ”پھر تم چل رہی ہو۔“  
 ”نہیں بھئی۔ ابھی تو میں عظمیٰ کو ڈھونڈوں گی۔“  
 اسے مناؤں گی اور تمہیں تو پتا ہے اب کے وہ باقاعدہ مجھ سے ناک سے لکیریں کھینچوائے گی۔ تب جا کر مانے گی۔“ وہ بڑی بے چارگی سے کہہ رہی تھی۔  
 ”تمہارے ساتھ یہی سلوک ہونا چاہیے۔“ وہ اسے خدا حافظ کہہ کر چلی آئی۔ پیپا آج گھر میں تھے اور وہ فوراً گھر جانا چاہتی تھی مگر اسے معلوم تھا۔ کل اس نے زین سے کہہ دیا تھا۔ تو اب وہ ضرور ہی اس کا انتظار کر رہا ہوگا اور وہی ہوا، سلیم اسے دیکھتے ہی بولا تھا۔  
 ”خدا کی قسم باجی! اگر آج آپ نہ آئیں تو بھائی جان نے مجھے کڑائی میں ڈال کر مل دیتا تھا۔“  
 ”ہیں کہاں تمہارے بھائی جان۔۔۔؟“ وہ اندر داخل ہوئی۔  
 ”کہاں ہوں گے۔ کچن میں ہیں۔“ سلیم کا موڈ بگڑا ہوا تھا اور کچن سے زین کے چلانے کی آوازیں آرہی تھیں۔  
 ”سلیم کے بچے! دو منٹ کے اندر اندر ادھر آؤ۔ ورنہ پچھلی کی جگہ تمہیں تل دوں گا۔“ اس کی دھمکی پر سلیم فوراً اڑ پھو ہو گیا۔  
 ”سلیم تمہاری دھمکیوں سے ڈر کر عتاب ہو گیا ہے۔“  
 وہ زارا کی آواز پر پلٹا۔  
 ”آپ کچھ جلدی نہیں آگئیں۔“ اس نے گھڑی پر نگاہ ڈالی۔  
 ”ہاں کیونکہ مجھے جلدی جانا ہے۔“ وہ اس کے قریب آکر کڑائی میں جھانکنے لگی۔  
 ”کیوں؟۔“ وہ پورا اس کی طرف گھوم گیا۔  
 ”پیپا کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ وہ گھر پر ہی ہوں گے۔ اس لیے ذرا جلدی جانا ہے۔“  
 ”آتے ہی۔۔۔“ وہ منہ ہی منہ میں نبھانے کیا



بربر ہونے لگا تھا۔

”کیا کہہ رہے ہو۔“ زارا کے کچھ پلے نہیں پڑے۔  
”اور یہ تم مل کیا رہے ہو؟۔۔۔“  
”مگر مجھ۔۔۔“

”لگ رہا ہے۔“ زارا نے اسے سر تپا دیکھا۔ وہ  
شلوار قمیص میں ملبوس تھا۔ بال پریشان، آستینیں  
کمانیوں تک فولڈ کی ہوئی، بٹن کھلے۔  
”اچھا۔ اب آپ مذاق نہ اڑائیں میرا۔ یہ بتائیں،  
کچھ کھایا تو نہیں آپ نے۔“ اس نے مچھلی کے قتلے  
پلٹے۔

”ناشتہ بھی نہیں کیا۔ صرف ایک گلاس گنے کا  
رس پیا ہے۔“ اسے شدید بھوک کا احساس ہوا۔  
”مجھے پتا تھا۔ اس لیے میں نے سوچا، آپ کو اپنے  
ہاتھوں سے مچھلی فرائی کر کے کھلاؤں گا۔“  
”اور جو میں نہ آئی تو۔۔۔“ زارا نے چھیڑا۔  
”نہ آئیں پھر دیکھتیں میں کیا کرتا ہوں۔“ وہ دھمکی  
آمیز لہجے میں بولا۔

”کیا کرتے؟۔۔۔“  
”یہی مچھلی لے کر آپ کے گھر پہنچ جاتا۔“  
”اچھا۔۔۔“ زارا نے کچھ کہنا چاہا۔ مگر اس کا  
خوشگوار موڈ دیکھ کر خاموش ہو گئی۔

”اچھا آپ کھڑی کیا کر رہی ہیں۔ یہ پکڑیں، پلیٹیں  
لے کر ٹیرس پر چلیں۔ میں فٹ لے کر آتا ہوں۔  
موسم اچھا ہے وہیں انجوائے کریں گے۔“  
زارا نے پلیٹیں پکڑیں پھر اوپر آگئی۔ پلیٹیں اور بیگ  
میز پر رکھ کر وہ خود ریلیکس انداز میں چلتی گرل تک  
آگئی۔ دونوں ہاتھ گرل پر ٹکا کر اس نے سامنے پھیلے  
دریا کے چوڑے پاٹ کو دیکھا۔ آسمان صاف تھا مگر ہلکی  
سرد ہوا چل رہی تھی۔

”سنیں۔۔۔“

”نہایتی آواز پر زارا نے گردن گھما کر دیکھا۔  
ساتھ والے ٹیرس پر تین تین سالہ خوبصورت سی  
بچیاں کھڑی تھیں۔ انہیں اسے دیکھ رہی تھیں۔  
”آپ زمین العابدین کی کیا لگتی ہیں؟“ اس نے

فوراً سوال کیا۔

”وہ میرے ماموں کا بیٹا ہے۔“  
”اچھا، جمشید صاحب آپ کے ماموں تھے۔ گے  
ماموں۔“

”جی ہاں۔ مگر آپ کیوں پوچھ رہی ہیں۔“  
”ہم لوگ پانچ سال سے یہاں ہیں۔ اس سے پہلے  
کبھی آپ کو یہاں آتے نہیں دیکھنا اس لیے۔“  
”ہاں بس۔۔۔“ زین نے پر سے زین کی آواز آ رہی  
تھی۔ وہ بات ادھوری چھوڑ کر اس کی طرف متوجہ ہو  
گئی۔

”یہ لیں گرما گرم ڈیپ فرائڈ فٹس۔ کھائیں گی تو بار  
دیں گی۔ میں نے بابا سے سیکھی تھی۔“ زارا نے پلٹ  
کر دیکھا۔ وہ عورت اب وہاں نہیں تھی۔  
”لوگ اب مجھس ہونے لگے ہیں کہ ہمارا اور  
تمہارا رشتہ کیا ہے۔“ زارا اس کے قریب آئی۔ زین  
نے چونک کر اسے دیکھا۔

”ابھی ایک خاتون مجھ سے پوچھ رہی تھیں۔“  
کرسی پر بیٹھتے ہوئے زارا نے ساتھ والے گھر کی  
طرف اشارہ کیا۔ زین نے سامنے دیکھا۔  
”ہاں تو ٹھیک ہے نا۔ لوگوں کو خبر ہونی چاہیے کہ  
زین العابدین اتنا بھی اکیلا نہیں۔“ وہ قدرے لاپرواہی  
سے کہہ رہا تھا۔

”اور اسی طرح کسی دن یہ بات سلیمان بھائی تک  
بھی پہنچ جائے گی۔“ زارا متفکر سے لہجے میں کہہ رہی  
تھی۔ زین نے اسے دیکھا۔ پھر سر جھٹک کر آہستگی  
سے بربر پایا۔

”مجھے اس دن کا انتظار رہے گا۔“

”کیا کہا؟۔۔۔“

”کچھ نہیں۔ یہ فٹس لڑائی کریں۔ پھر آپ کو جلدی  
جانا بھی تو ہے۔“ زین نے ڈش اس کے آگے کی تو زارا  
کو بے تحاشا بھوک کے احساس نے مزید کچھ بھی  
سوچنے کا موقع نہیں دیا تھا۔

”یہ تو واقعی بہت مزے کی بنی ہے۔“ پہلا نوالہ اپنے  
ہی اس نے بے اختیار تحریف کی۔







تھے۔ پلوں کی بازو پھلائی اور چہرے پر پھسل گئے اور یہاں یہ بھی بندش تھی۔ ”نجانے لوگوں کے دل پتھر کیسے ہو جاتے ہیں۔“

ہتھیائیوں سے چہرہ صاف کرتے ہوئے اس نے کئی بار سوچی گئی بات کو ایک بار پھر دہرایا۔

بھابھی کی بڑبڑائیں اپنے عروج پر تھیں۔

وہ جو کچھ کہتی تھی۔ نین تارہ کو ایک نیا زخم لگا دیتی تھی اور یہ وہ زخم تھے جنہیں کبھی مندمل نہیں ہوتا تھا۔ وہ گناہ گار ہوتی تو اس سب کو اپنے کیے کی سزا سمجھ کر قبول کر لیتی۔ مگر اب؟ کبھی کبھی اس کے اندر بڑی شدت کا احتجاج اٹھتا۔ اس کا دل چاہتا۔ وہ یہاں سے بھاگ جائے۔

”مگر کہاں؟“

وہ بتول کی اگلی بات سننے سے پہلے ہی کھڑی ہو گئی۔ اس کی ایڑی کا زخم بہت بری حالت میں تھا۔ پاؤں گھسیٹے ہوئے اس نے سرسوں کے تیل کی بوتل اٹھائی اور چوڑے کے پاس آگئی۔ بتول نے کچھ کہنا چاہا۔ پھر اسے ہلکی ٹکائی دیکھ کر خاموش ہو رہی۔ اس کا پاؤں ٹھیک ہوتا تو تب ہی اس سے کام نکلوا سکتی تھیں۔ اس نے تو بس ایک عبارت لکھی تھی سارے کا سارا مضمون خود ہی تیار ہو گیا تھا۔ اسے ضرورت سے زیادہ کامیابی ملی تھی۔ مکان بھی ہاتھ آگیا۔ نین تارہ کی پر دھانی بھی چھوٹی، خواجواہ مفت کا خرچ تھا۔ پھر بے دام خادمہ بھی ہاتھ لگ گئی۔ جو کبھی اس کے سامنے نہ تو سر اٹھا سکتی تھی۔ نہ جواب دے سکتی تھی اور وہ جو چاہتی اس کے ساتھ سلوک روا رکھتی۔

تیل میں ہلکی جلا کر ایڑی پر لگاتے ہوئے اس کا ہاتھ ایک بل کو ٹھم گیا۔

”نسی نے مسجانی کرنا چاہی تھی۔ مگر یہ ذرا سا زخم۔ یہ ذرا سا زخم عمر بھر کا ناسور بنا دیا۔ کاش تم نے مجھ پر یہ مہربانی نہ کی ہوتی۔“

اس سے کام کہاں ہوتا تھا۔ قدم اٹھائی تو ایڑی سے لے کر گھٹنے تک دردی لہریں اٹھنے لگتیں۔ نجانے کون

کون سے زخم تھے جو لو دینے لگتے۔ ہاتھ پاؤں میں کچکی سی اتر آتی۔ بخار مستقبل ہڈیوں میں ڈیرے جمائے بیٹھا تھا۔ اس پر لوگوں کی بظاہر ہمدردیوں کی آڑ میں تنقیر اور مذمت کرتی نگاہیں اور باتیں۔ وہ جتنا سوچ رہی تھی۔ زندگی اس سے زیادہ مشکل اور ناقابل برداشت ہو گئی تھی۔

وہ سب کے لیے قابل نفیر تھی۔ مگر کون؟

کیا کیا تھا اس نے اس کی سہیلیاں اس سے منہ موڑے بیٹھی تھیں۔

وہ اپنے ہی گھر میں اجنبی بن گئی تھی۔ لوگ اس کے قریب آتے تو ایک گھنٹا سے تجسس کے تحت انہیں صرف یہ جاننے کا تجسس ہوتا کہ وہ ”اس“ سے کہاں ملتی تھی کون کون سے وعدے وعید ہوئے تھے اور اس کے علاوہ ”کیا کچھ“ ان کے درمیان ہو چکا ہے۔

نین تارہ کچھ بھی کہتی۔ ان کی نگاہوں میں ڈولتی بے یقینی کم ہی نہ ہوتی اور لبوں پر بکھری استہزائیہ مسکراہٹ۔ انہیں اپنی داستانیں خود گھڑنے کی عادت پڑ گئی تھی اور نین تارہ کی پارسیائی کی گواہی کے لیے آسمان سے وحی نہیں اتر سکتی تھی۔

وہ چارپائی سے جا لگی۔

”کس مرنے جائے۔“ بتول نے تشویش سے کہا تھا۔ ظہور نے قدرے بیزارگی سے چارپائی پر پڑے وجود کو دیکھا پھر اٹھ کر اس کے قریب آگیا۔ ذرا سا جھک کر اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا۔ بانو انگاہ چھو لیا ہو۔ وہ پہلے بھی کئی بار اس کیفیت سے گزری تھی۔ اب کے نجانے کہاں سے لہریں اٹھتی تھیں ہمدردی کی کہ وہ محلے کے ڈاکٹر کو بلا لایا۔

”اس پر تشدد کیا ہے آپ لوگوں نے۔“ تیس تیس سالہ ڈاکٹر اجمل نے انہیں گھور کر دیکھا۔

”توبہ کریں جی۔“ ظہور نے کانوں کو ہاتھ لگایا۔

ڈاکٹر توبہ کیا کرتا۔ اس کے جسم کا جو حصہ بھی عیاں تھا نیلویں تھا۔

”مگر کئی تھی کوٹھے کی میزھیوں سے۔“ بتول نے تیزی سے کہا۔ ڈاکٹر نے اس پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ خاموشی سے معائنہ کرنے لگا۔

”اسے اسپتال لے جانا پڑے گا۔“

”نہ ڈاکٹر صاحب! ہم تو غریب آدمی ہیں۔ اسپتال کا خرچہ نہیں کر سکتے۔“

”مر جائے گی یہ۔۔۔۔۔“ وہ جھنجھلا گیا۔

”مر جائے۔ پر خرچہ نہیں ہے۔“ ظہور ڈھٹائی سے بولا۔ ڈاکٹر اجمل رنگ رہ گیا۔ بے حد حیرت سے ان دونوں پھر بے ہوش پڑے وجود کو دیکھا۔

”کیا لگتی ہے تمہاری؟ بیٹی۔۔۔“ اس نے بتول کو لٹھ پالی لانے کو کہا اور خود ظہور سے پوچھنے لگا۔

”بہن ہے۔۔۔۔۔“ ظہور کے لہجے میں بیزارگی در آئی۔ جسے اجمل نے پوری طرح محسوس کیا۔ بتول ٹھنڈا ان خیالی اور پرانا تولیہ لے آئی۔ وہ اس کے ہاتھ سے لے کر خود ہی تولیہ بھگو بھگو کر پٹیاں رکھنے لگا۔

اجمل کو ایفائیڈ ڈاکٹر نہ تھا۔ پہلے ایک ڈاکٹر کے پاس گیا اور پھر اس کے طور پر کام کرتا تھا۔ جب کچھ دوا سیوں اور تیاریوں کے نام یاد ہو گئے تو اس محلے میں اگر ایک دکان کرایے پر لے لی۔ باہر ڈاکٹر اجمل

ایم ایس سی۔ ایس کا بورڈ لگا کر کلینک کھول لیا۔ چھوٹی مٹی کیاریاں خود دیکھ لیتا ورنہ جواب دے دیتا۔ جو لوگ کو ایفائیڈ ڈاکٹر کی نیسیں افورڈ نہیں کر سکتے تھے ان کے لیے اجمل رحمت سے کم نہ تھا۔

نیم پیکڑا کم ہوا تھا۔ اس نے پیڈ نکال کر دوائیاں لکھنی چاہیں۔

”ایک ہی بار اچھی سی دوا لکھ دیں ڈاکٹر صاحب۔ میں بار بار۔۔۔۔۔“

ڈاکٹر اجمل بری طرح جھنجھلا گیا۔ اس نے پیڈ بند کر کے بکس میں رکھا۔

”میڈیسن میں کلینک سے بھجوا دوں گا۔“

”بہت شکریہ۔“ ظہور خوش ہو گیا۔

”میں اب چلتا ہوں شام کو آکر۔“ وہ بس چلنے کو تھا۔ جب نگاہ بھٹک کر پاؤں پر جا رکی۔ اس نے پٹے سے پکڑ کر پیر کو ذرا سا موڑا۔

”مائی گاڑ۔“ بے اختیار اس کے منہ سے نکلا۔ زخم میں پیپ پڑ رہی تھی۔ سارے پاؤں سوج گیا تھا۔

”یہ کیا ہوا ہے؟۔۔۔۔۔“ نین پر رکھ کر اس نے اسٹول کھینچا اور پھر سے بیٹھ گیا۔

”بتایا تو تھا میزھیوں سے گر گئی تھی۔ نیچے کانچ پڑا تھا ایڑی میں لگ گیا۔“ بتول نے جلدی سے بتایا۔

”کب لگا تھا۔۔۔۔۔“

”تھوڑے دن ہوئے۔“

”زخم خراب ہو رہا ہے۔ پی کیوں نہیں کروائی۔“ فطرتاً وہ ایک حساس دل جو ان تھا۔ ان لوگوں کے رویے اسے سخت جھنجھلاہٹ میں مبتلا کر رہے تھے مگر وہ بظاہر نارمل نظر آنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کا سوال یونہی ٹال دیا گیا۔ اجمل نے بیڈ تیج کی۔ ایک ہمدردانہ سی نگاہ اس کے غافل وجود پر ڈالی۔ کچھ ضروری ہدایات جن کے پورا ہونے کا اسے مطلق یقین نہ تھا بتول کو دیں اور کھڑا ہو گیا۔

”شام کو دیکھتے آؤں گا۔“

”پیسی۔۔۔۔۔“ ظہور نے کچھ کہنا چاہا۔

”ضرورت نہیں۔“ اجمل نے مختصراً کہا۔ ”آپ میرے ساتھ آئیں میں دوائیاں دے دوں۔“ ظہور فوراً اس کے ساتھ نکل گیا تھا۔ بتول نے ایک نظر تارہ پر ڈالی۔

”نصیبت۔ گلے ہی پڑ گئی ہے۔“

زیر لب بڑبڑاتی چولہے تک آئی اور بیٹھ کر گو بھی کاٹنے لگی۔ شام کو اجمل پھر آیا تھا۔

”دوائی کھلا دی تھی؟۔۔۔۔۔“ اس نے آتے ہی پوچھا۔

”ہاں کھلا دی تھی۔“ ظہور گھر پر نہیں تھا۔ بتول نے بتایا۔ پھر پاس آکر کھڑی ہو گئی۔

”بخار کب تک اترے گا۔“ وہ یوں پوچھ رہی تھی جیسے بخار نے اجمل کو فلکسڈ ڈیس بتا رکھی ہو۔

”جلدی۔“ وہ زیر لب مسکرایا۔ نین تارہ ابھی بھی



نیم غنودہ سی حالت میں تھی۔ گرم سانسیں بے ترتیب سی تھیں۔ اس نے نمیر پچ چیک کیا ایک انجکشن دیا۔ بتول بڑی دلچسپی سے ساری کارروائی دیکھ رہی تھی۔ ”آپ کے بچے کہیں باہر گئے ہیں۔“ اجمل کا سوال خاصا بے محل تھا۔ بتول سٹپٹا گئی۔ پھر آہستگی سے بولی۔

”میرے بچے نہیں ہیں۔“  
”اوہ آئی ایم سوری۔ میں سمجھا شاید کہیں کھیلنے نکلے ہیں۔“ وہ فوراً معذرت کرنے لگا۔ بتول کو اس کا لہجہ اچھا لگا تو تاسف سے گردن ہلاتے ہوئے اسے بتانے لگی۔

”بس خدا کو ہی منظور نہ تھا۔ پندرہ برس ہو گئے ہیں شادی کو۔ کہاں کہاں منت نہیں مانی۔ کس کس دربار پر نہ گئی۔ ہم پر تو اتنا صاحب نے بھی کرم نہ کیا۔“  
”نجانے کس گناہ کی سزا مل رہی ہے۔“  
اجمل نے ایک نظر نین تارہ کی آنکھ کے نیچے اور گردن کے پاس والے ٹیل کو دیکھا تو مبہم سا مسکرا دیا۔

”اس میں بھی اللہ کی مصلحت ہوگی۔ آپ بس دعا کیا کریں۔“ وہ کھڑا ہو گیا۔ ”رات تک انشاء اللہ بخارا اتر جائے گا۔ میں صبح چکر لگا جاؤں گا۔“  
بتول نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”ویسے آپ بہت اچھی ہیں۔“ وہ جاتے جاتے دروازے میں رگ کر کہنے لگا۔ ”بالکل میری بڑی بہن کی طرح۔ ان کی شادی فیصل آباد میں ہوئی ہے۔ ماشاء اللہ ان کے چار بچے ہیں۔ کیا میں آپ کو باجی کہہ لیا کروں۔“

”ہاں۔۔۔ ہاں کیوں نہیں۔۔۔“ بتول خوش ہو کر

فوراً بولی۔  
”شکریہ۔ میں صبح چکر لگاؤں گا۔“

وہ چلا گیا تو بتول دروازہ بند کرتے ہوئے زیر لب بڑبڑائی۔

”اچھا لڑکا ہے۔ اپنی کوثر کے لیے اچھا رہے گا۔“  
کوثر اس کی پھونکی میں تھی۔ وہ وہیں کھڑے کھڑے

نجانے کون سے منصوبے بنانے لگی۔ رات کو ظہور آیا تو اس سے بھی ذکر کر بیٹھی۔  
”ہاں“ اچھا نوجوان ہے۔ ابھی زیادہ عرصہ نہیں ہوا اسے اس محلے میں آئے ہوئے۔ مگر سب اس کی تعریفیں ہی کرتے ہیں۔ آیا تھا شام کو۔۔۔؟“  
”ہاں ٹیکا لگا گیا ہے۔ کہتا ہے بخارا اتر جائے گا۔“  
”کچھ کھایا تھا اس نے۔۔۔“

”رکا ہی کہاں۔۔۔“ اس کی تان ابھی تک اجمل پر جمی تھی۔

”تارہ کا پوچھ رہا ہوں۔۔۔“ ظہور کو پتا نہیں کیسے خیال آگیا تھا۔ ورنہ اس کی بھوک پیاس یا کسی بھی ضرورت سے انہیں کوئی سروکار نہ تھا۔

”ہاں۔۔۔ لیے کا کہہ گیا تھا ڈاکٹر۔ وہی پکا کر دیا تھا۔“ وہ بد مزاسی ہو گئی۔

”اچھا۔۔۔“ ظہور تکیہ ٹھیک کر کے لیٹ گیا۔  
”تم ذرا پتا تو کرنا۔ کس خاندان کا ہے۔ لگتا تو کسی شریف خاندان سے ہے۔“ بتول دوبارہ سے اجمل پر آئی۔

”تو نے کیا کرنا ہے۔۔۔“ ظہور نے گردن گھما کر اسے دیکھا۔

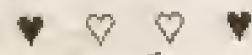
”ماں بہت پریشان رہتی ہے۔ کوثر کے رشتے کے لیے۔“

”نونہ خاندان کا پتا نہ برادری کا اور تم چلی ہو رشتہ جوڑنے۔“

”یہی تو کہہ رہی ہوں ذرا پتا تو کرو۔ خاندان برادری کا پتا چلے تو باقی میں خود سنبھال لوں گی۔ اب کوثر کے سر پر باپ ہو تو وہی کچھ کرے۔ بھائی اپنی دنیا میں مگ ہو چکے ہیں اور تمہیں وہ اپنے باپ کی جگہ بھی سمجھتی ہے اور بھائی کی جگہ بھی۔ اس کے سر پر ہاتھ تم نہیں رکھو گے تو اور کون رکھے گا۔۔۔“

ظہور کا دھیان بھٹک کر تارہ کی طرف چلا گیا ایک خیال سازان میں آیا اگر اجمل۔۔۔ مگر وہ اپنے خیال کا تذکرہ بتول سے نہیں کر سکتا تھا۔ جو ابھی تک کوثر کی مظلومیت کا رونا روتے ہوئے بہنوں کے فرائض بیان

کر رہی تھی۔  
”اچھا دیکھتے ہیں کچھ۔ تم روٹی لے آؤ۔“  
اس نے ٹالا تو وہ اٹھ کر روٹی لینے چلی گئی۔



تین دن کے بعد اسے کچھ ہوش آیا تھا۔ بخارا کا زور ٹوٹا تھا۔ سارا بدن پسینے پسینے ہو رہا تھا، حلق میں گویا کانٹے پڑ رہے تھے۔

”پانی۔۔۔“ اس کے لب بے آواز پھر پھڑپھڑائے۔ ساتھ ہی اک کراہ کے ساتھ آنکھیں کھل گئیں۔

”لو۔۔۔“  
اس نے ذرا سا سر اونچا کرنے کی کوشش کی۔ کسی نے اس کے سر کے نیچے ہاتھ رکھ کر سہارا دیا۔

”شباباش بی لوب۔۔۔“  
وہ غٹا غٹ پانی چڑھا گئی۔

”بخارا اتر گیا ہے انشاء اللہ اب نہیں ہوگا۔“ کسی کی تسلی دیتی آواز ابھری۔ تارہ نے آنکھیں بند کیں اور دونوں آنکھوں پر بازو رکھ لیے اسے اپنے زندہ بچ جانے پر افسوس ہو رہا تھا۔

”تارہ۔۔۔ تارہ۔۔۔ پتر۔۔۔!“ ماے مقبول کی آواز ابھری۔ وہ اس پر جھکا اس کے بازو ہٹانے کی کوشش کر رہا تھا۔ تارہ نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔

”تارہ۔۔۔ پتر۔۔۔ میری بات تو سن۔۔۔“  
”نہیں۔۔۔ بزرگوار! آپ اس کو سونے دیں۔۔۔“  
اجمل نے ماے مقبول کو روکا۔

”یہ ٹھیک تو ہو جائے گی نا۔۔۔“ اس نے ڈبڈبائی آنکھوں سے اجمل کو دیکھا۔

”یہ اللہ کے فضل سے اب ٹھیک ہے بالکل۔۔۔“  
اجمل نے تسلی دی۔ ان تین دنوں میں یہ پہلا شخص تھا جو اس لڑکی کے لیے رو رہا تھا۔ ورنہ اس نے تو کسی کی آنکھ میں تشویش کی ہلکی سی لہر بھی نہ دیکھی تھی۔

”تم مجھے اطلاع نہیں بھجوا سکتی تھیں۔“ ماما مقبول بتول پر اٹ پڑا۔

”ہاں تمہارے ہاں تو جیسے بڑے ٹیلی فون لگے ہیں۔“  
”نا۔۔۔ کوئی آیا نہ گیا۔ اطلاع کس سے بھجواتی۔ اور پھر

کوئی مروت نہ گئی تھی جو اطلاع کرتے۔ ہم بیٹھے جو ہیں اس کی خدمت میں کرنے کے لیے۔“  
بتول کو لمبی بات کرنے کی عادت تھی۔ ماما چپ ہو گیا۔ اجمل تاسف سے سر ہلانے لگا۔

”آپ اس کے کیا لگتے ہیں؟“  
”ماما ہوں اس بد نصیب کا۔“ اس نے صاف سے آنکھیں پونچھیں۔

”آپ میرے ساتھ آئیں۔“ اجمل نے آہستگی سے کہا۔ پھر میڈیکل بکس اٹھا کر کھڑا ہو گیا۔

”اجمل۔۔۔ چائے پی کر جانا۔۔۔“ بتول کے لہجے میں شیرینی تھی۔

”باجی! پھر آؤں گا چائے بنے۔“ اس نے بلیٹ کر کہا اور مائے کو لے کر باہر نکل گیا۔ اسے اپنے کلینک لے گیا اور تارہ کی حالت کے بارے میں پتہ لگا۔ کمزوری اور نقامت بہت زیادہ تھی۔ اسے اس وقت خوراک کی بہت ضرورت تھی اور بتول سے اجمل کو کوئی امید نہیں تھی کہ وہ ان تین دنوں میں اس کی خصلت اچھی طرح جان گیا تھا۔

”یہ لوگ اسے مارتے پیٹتے بھی ہیں۔“  
”سو تیلے ہیں سارے۔“ ماے مقبول نے آہستگی سے جواب دیا۔

”تو یہ بات ہے۔۔۔“ اجمل اب ان کے رویوں کو سمجھا۔

”وہ سو تیلے سہی آپ تو اس کے گئے ہیں۔ کتنا ظلم ہو رہا ہے اس پر، آپ اسے ساتھ کیوں نہیں لے جاتے۔“

”یہ لوگ بھیجیں تب نا۔۔۔“

”تو ایک میری بات مانیں، آپ کچھ دن یہاں رہیں۔ اس کا تھوڑا خیال رکھیں۔ اپنی نگرانی میں کھلا میں پلا میں۔ ورنہ اس کی حالت بگڑ جائے گی۔ یہ لوگ تو مجھ سے علاج بھی صرف اس لیے کروا رہے ہیں کہ میں نے ان سے کوئی پیسہ نہیں لیا۔ ورنہ شاید وہ بو نہی۔“

وہ جملہ ادھورا چھوڑ گیا۔ ماما مقبول اس کی لمبی



جوڑی ہدایات لے کر واپس آیا تو اس کے پاس پھل بھی تھے اور گوشت بھی۔ اس نے گوشت کی پھلی بتول کو دی۔

”کیا کروں اس کا۔“

”بچنی بنانی ہے۔“

”ہاں ہم تو جیسے اس کو بھوکا مارتے ہیں۔“ اس نے بڑبڑاتے ہوئے پھلی پکڑی تھی۔ ماما مقبول نے گرم پانی کر کے تارہ کا ہاتھ منہ دھلایا۔ ایک کیلا تھوڑا تھوڑا کر کے اپنے ہاتھوں سے کھلایا۔

”تیرا حال کیا ہو رہا ہے تارا! لا تیرے بال بناؤں۔“

وہ اس سے بار بار باتیں کر رہا تھا اور وہ اس کی ہر بات مان رہی تھی۔ مگر جواب نہیں دیتی تھی۔ شاید اس سے بہت خفا تھی۔ ماما مقبول اسے اپنی مجبوریاں بتانے لگا۔ اس نے پھر بھی کوئی جواب نہیں دیا۔

لبے بالوں کی چوٹی بہت ابھی ہوئی تھی۔ مامے مقبول نے خود تیل لگا کر بال سلجھائے اور چوٹی بنا دی۔ وہ پھر سے آنکھوں پر بازو رکھ کر لیٹ گئی تھی۔ ماما اس کے پاس بیٹھ کر سروبانے لگا۔ بچنی بننے میں ضرورت سے زیادہ وقت لگا تھا۔ جب بن گئی تو بتول نے پیالے میں اینڈیل کر پیالا اسٹول پر بٹخ دیا اور خود گھر سے باہر نکل گئی۔ مامے مقبول نے چھٹی انتہائی بدمزہ بچنی تھی۔ وہ صبر کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔

”نمین تارہ! لے بچنی پی لے۔ جسم کو طاقت ملے گی۔“ مامے مقبول نے پیار سے کہا تو وہ اٹھ گئی۔ مگر تھوڑی سی لی کر پیالہ ہٹا دیا۔

”میں تمہیں اپنے ساتھ گاؤں لے جاؤں گا۔“ مامے نے گویا تسلی دی۔

”مجھے نہیں جانا۔“ وہ واحد جملہ تھا جو اس کے منہ سے نکلا۔ ماما مقبول دل مسوس کر رہ گیا۔ وہ بہت ناراض تھی۔

گاڑی اچانک رک گئی تھی۔ اور اس کی خرابی بھی مجھ سے بالا تر تھی۔

”کیا مصیبت ہے۔“ وہ جھنجھلا کر گاڑی لاک کرنے لگی۔ موبائل وہ آج گھر بھول گئی تھی۔ ورنہ فون کر کے دوسری گاڑی منگوا لیتی۔

”کیا ہوا۔۔۔؟“ زین کی بانیگ اس کے قریب رکی۔ ”گاڑی خراب ہو گئی ہے۔“ اس نے بے چارگی سے بتایا۔

”تو اب۔۔۔ زین نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

”کوئی ٹیکسی دیکھتی ہوں۔“ اس نے ادھر ادھر دیکھا۔

”آئیں۔۔۔ میں چھوڑ آتا ہوں۔“

”تم۔۔۔ زارا نے قدرے حیرت سے اسے دیکھا۔ ”کیوں یہ خادم آپ کا ڈرائیور بننے کے لائق بھی نہیں۔“

”مگر بانیگ پر۔۔۔“ وہ متذبذب تھی۔

”ہاں یہ سواری آپ کے شایان شان تو نہیں مگر مجبوری ہے۔“

”افوہ میں یہ نہیں کہہ رہی۔ ایک چور تیلی میں بھی بانیگ پر بیٹھی نہیں۔“

”تو آج یہ مڑا بھی چکھ لیں۔“ وہ کچھ متذبذب سی اسے دیکھتی رہی۔

”کسی کے دیکھ لینے کا خوف ہے۔ مگر ہم اچھے دوست بھی تو ہو سکتے ہیں۔“ وہ بظاہر ہنس کر بولا تھا مگر اس کی مسکراہٹ پھٹکی سی تھی۔

”صرف دوست ہوتے تو میں کبھی نہ بیٹھتی۔ مگر بلیز آہستہ چلانا۔“

زین نے واقعی رفتار خاصی ہلکی رکھی تھی۔ زارا کو مڑا آنے لگا۔

”پتا ہے جب ہم لوگ لاہور آئے تو اس بانیگ میں اور بابا پورا لاہور گھومے تھے۔ بہت اچھا لگا تھا۔ ہم لوگوں نے۔“

”تم لوگ ہمیشہ سے لاہور میں نہیں تھے۔ زارا نے قدرے بلند آواز سے پوچھا۔

”نہیں بابا سا ہیوال چلے گئے تھے۔“ وہ ایک بل کو

خاموش ہوا۔ ”نہیں چھپنے کے لیے کسی چھوٹے شہر کی ضرورت تھی۔ جہاں انہیں کوئی نہ جانتا ہو۔ میں نے گریجویشن وہیں سے کیا۔ بابا کو وہاں جاب مل گئی تھی۔ لاہور تو ڈیڑھ سال قبل آئے تھے وہ بھی میری ضد پر کیونکہ میں ماسٹرز پیپخاب یونیورسٹی سے کرنا چاہ رہا تھا۔ حالانکہ بابا کی ضد تھی کہ ہم ملتان جائیں مگر۔۔۔ وہ بھی میری بات نہیں ٹالتے تھے۔“ آخری جملے پر اس کا لہجہ افسردہ سا ہو گیا تھا۔

”تم ہاسٹل میں کیوں نہیں رہے۔“ زارا نے اڑتے دوپٹے کو سنبھالتے ہوئے پوچھا۔ ان کے قریب سے گزرتی مرٹیدیز کی رفتار ایک بل کو ہلکی ہوئی اور پھر سے ہوا ہو گئی۔ زارا کی توجہ مکمل طور پر زین اور اپنے اڑتے دوپٹے کی سمت تھی۔

”اس شہر میں اور بابا مجھے تنہا بھجوا دیتے۔ امپا سبل آپ نے دیکھا نہیں انہوں نے گھر کتنی دور لیا ہے۔“ ”شاید قدرت ہمیں ملانا چاہتی تھی۔“ زارا نے زریب کہا۔

”میں رفتار بڑھانے لگا ہوں۔ ذرا سنبھل جائیں۔“ زین نے کہا تو وہ بے اختیار اس کی جیکٹ ڈانچ کر بولی تھی۔

”بس مجھے زندہ سلامت گھر پہنچاؤں۔“

زین کا قہقہہ بے ساختہ تھا۔

”خاصی ڈرپوک واقع ہوئی ہیں آپ؟“

وہ خاموش ہی رہی۔ بانیگ عین گیٹ کے سامنے رک تو چوکیدار نے خاصی حیرت سے انہیں دیکھا۔

زارا اسے خدا حافظ کہنے کو پلٹی تو وہ بے حد معصومیت سے بوجھنے لگا۔

”کیا نہیں سے واپس چلا جاؤں۔“

زارا نے کچھ سوچ کر نفی میں سر ہلادیا پھر مسکرا کر

”مما سے مل کر جانا۔“

وہ فوراً ”بانیگ سے اتر آیا۔ گویا اس کے کہنے کا منتظر ہو۔

”تم ماما کی خفگی سے اتنا۔۔۔ گیٹ کے اندر قدم رکھتے ہی زارا کا جملہ ادھورا رہ گیا۔ پور ٹیکو میں ماما کی بلیک کرولا کے ساتھ مرٹیدیز بھی گھڑی تھی۔ وہ ساکت سی رہ گئی زین کو اس کے عقب میں رکنا پڑا۔

”کیا ہوا۔۔۔؟“

زارا نے پلٹ کر اسے دیکھا۔ کچھ لمحے متذبذب سی اسے دیکھتی رہی۔ پھر سر جھکا کر آہستگی سے بولی تھی۔

”سلیمان بھائی ہیں۔“

وہ گویا زین کے چہرے کے تاثرات نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ زین کا چہرہ ایک دم سرخ ہوا تھا آگ کی لپٹیں تھیں جو اسے اپنے چہرے کے گرد محسوس ہوئی تھیں۔ اس نے کچھ کہنا چاہا پھر لب بھینچ کر ایک دم واپس پلٹ گیا اور جس اسپڈ میں اس کی بانیگ نظروں کے سامنے سے غائب ہوئی تھی زارا اچھی طرح جانتی تھی۔ یہ خوف نہیں غصہ تھا۔ بہت شدید غصہ۔

وہ بے حد دل گرفتگی سے اندر آئی۔ ماما اور سلیمان لاؤنج میں ہی موجود تھے۔ وہ نجانے کون سی بات کر رہے تھے۔ اسے دیکھ کر خاموش ہو گئے۔

”اسلام علیکم۔“ زارا نے بے حد ہزاری سے کہا۔ وہ فوراً ”اپنے کمرے میں جانا چاہتی تھی۔“

”زارا! سلیمان بھائی کی آواز پر اسے رکنا پڑا۔ ایک بازو صوفے کی پشت پر پھیلائے وہ سنجیدہ نظروں سے اسے ہی دیکھ رہے تھے۔

”جی سلیمان بھائی!“

”یہاں آؤ۔“ انہوں نے نظروں کے زاویے سے اسے اپنے سامنے آنے کا اشارہ کیا۔ وہ کچھ حیران سی ان کے سامنے آ گئی۔

”کس کے ساتھ آئی ہو؟“ ان کے ٹھنڈے لہجے میں کچھ تو ایسا تھا کہ زارا نے بے اختیار سٹپٹا کر ماما کو دیکھا۔

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)



کرتے ہیں اور زمین کو بھی ڈراتے دھمکتے ہیں اور بالآخر زمین تار پر ظلم و ستم کر کے اپنا مقصد یعنی مکان کی منتقلی کے کاغذات بردست خط کروا لیتے ہیں۔ ایک خدا ترس ڈاکٹر انجیل اس کا مفت علاج کر رہا ہے۔  
زارا عظمیٰ اور انعم کلاس فیلو ہیں، انعم کی اپنے خالہ زاد سے نسبت طے پا گئی ہے۔ جب کہ عظمیٰ کو افتخار بے حد پسند کرتا ہے لیکن عظمیٰ اپنی خاندانی پابندیوں کی وجہ سے اس کے التفات کا جواب انتہائی رکھائی سے دیتی ہے۔

## پانچویں قسط

”دکس کے ساتھ آئی ہو ازارا۔“ سلیمان بھائی نے اپنا سوال دہرایا۔ لہجہ اب بھی ٹھنڈا تھا۔ زارا نے ایک لمحے کو سوچا۔ انہوں نے اسے کہاں دیکھا تھا؟ وہ ہنوز منتظر نگاہوں سے اسے دیکھ رہے تھے۔ ایک طویل سانس لے کر اپنے اعصاب کو ڈھیلا چھوڑتے ہوئے زارا نے اپنی فطری خود اعتمادی کے ساتھ انہیں دیکھا۔

”میرا کلاس فیلو تھا۔“  
”ممانے مضطرب کر اسے دیکھا۔“  
”بائیک پیس۔“ سلیمان کا لہجہ چبھتا ہوا تھا۔  
”مجبوری تھی۔ اس کے پاس گاڑی نہیں ہے۔“  
”اور تمہاری گاڑی؟“ سلیمان بھائی نے بے حد غور سے اس کے انداز کو دیکھا۔ وہ ایک پل کی گھبراہٹ رخصت ہو گئی تھی اور اب وہ بے حد سکون اور اعتماد سے ان کے سامنے کھڑی تھی۔ ان کی آنکھوں میں ہلکی سی ناگواری در آئی۔  
”خراب ہو گئی تھی۔“

”ہوں۔۔۔۔۔“ انہوں نے گہری سانس لی۔ وہ اندر ہی اندر ان کے انداز پر پزل سی ہونے کے باوجود اسی انداز میں کھڑی رہی تھی۔  
”ڈرائیور کو ساتھ لے کر جایا کرو۔ واپس رہی وہی جگہ۔“ ان کے فائنٹک بتا دینے کے بعد وہ اس کے لیے اسے اس کے بعد وہ ممان کی طرف لپکتی تھی۔  
زارا نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔ وہ جانتی تھی کہ ممان گئی ہیں۔ تب وہ ہی قصداً ”مسکرائی“ اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ نئی گاڑی خراب نہیں ہو سکتی۔“

”ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا۔ زمین اور سلیمان کا سامنا نہیں ہونا چاہیے تھا۔“ وہ زیر لب بڑبڑاتیں۔  
”ممان! بھی نہ سمجھی تو ایسا ہونا تھا اور زمین کے چرے پر تو نہیں لکھا کہ وہ جمشید حیات کا بیٹا ہے۔ سلیمان بھائی کو غصہ صرف اس بات پر تھا کہ میں اس کے ساتھ بائیک پر کیوں آئی۔ اپنے خاندان کی عظمت اور شان و شوکت کا بہت احساس ہے انہیں۔۔۔ آپ بلاوجہ پریشان مت ہوں۔“

”ممانے دھیرے سے اثبات میں سر ہلایا۔“ میں ڈرائیور سے کہوں گی کس۔۔۔۔۔“  
”ممان۔“ زارا نے سنجیدہ نظروں سے انہیں دیکھا۔  
”سلیمان بھائی نے کہہ دیا اور میں نے خاموشی سے سن لیا۔ لیکن میں کوئی اسکول جانے والی بچی نہیں ہوں کہ ڈرائیور کے ساتھ آیا جایا کروں۔“

”لیکن سلیمان۔۔۔۔۔“  
”وہ کچھ کہیں گے تو میں جواب دے دوں گی۔ آپ پریشان مت ہوں۔“  
”پریشان۔۔۔۔۔ اب تو چوبیس گھنٹے ذہن ابھرنے کا شکار رہتا ہے۔“ انہوں نے کپٹی کو انگلیوں سے مسلا۔  
”فائدہ؟۔۔۔۔۔“

”زمین باہری سے چلا گیا۔“ ممان کو اچانک خیال آیا۔  
”اور کیا کرتا۔ سلیمان بھائی کو بھی تو ابھی آنا تھا۔“  
وہ جھنجھلا گئی۔ زمین کا اس طرح چلے جانا اس کے لیے تکلیف دہ تھا۔  
”اور زمین کے لیے۔۔۔۔۔“ اس کے اندر سے سوال ابھرا تو دل کسی گہرے تاسف کی لپیٹ میں آ گیا۔  
”یہ سب کب تک چلے گا۔۔۔۔۔؟“ اس نے خود سے سوال کیا کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اس طرح دروازے سے لوٹ جانا زمین کے لیے کتنا اذیت ناک ہو گا۔ تب ہی وہ بیگ اٹھا کر خاموشی سے اپنے کمرے میں چلی گئی۔

♥ ♥ ♥ ♥  
دروازہ آہستگی سے کھلا تھا۔ زارا نے پلٹ کر دیکھا۔ ممان کھڑی تھیں۔  
”ممان! آپ سوئیں نہیں ابھی تک۔“  
”تیند کہاں آتی ہے۔“ وہ بہت مضطرب اور بے چین نظر آرہی تھیں اور اسی انداز میں وہ اندر آکر اس کے بستر پر آ بیٹھیں۔  
”تیند کیوں نہیں آرہی؟“ زارا نے ٹائٹ کریم کھولتے ہوئے سوال کیا۔ ممان نے گویا اس کا سوال سنا ہی نہیں۔ سر جھکائے بجائے کیا سوچتی رہیں۔ پھر زیر لب بڑبڑاتیں۔  
”کہاں چلا گیا یہ لڑکا؟“  
”کون زمین؟۔۔۔۔۔“ زارا نے چونک کر پوچھا۔  
”تم نے اسے فون کیا تھا؟“ ممان نے پوچھا۔  
”بچ پوچھیں ممان میری تو ہمت نہیں ہوئی۔ وہ بہت ہرٹ ہوا تھا۔“ زارا نے سنجیدگی سے کہا۔  
”وہ گھر پر نہیں ہے، بلکہ یونیورسٹی کے بعد گھر پہنچی نہیں اور اب کتنی رات ہو گئی ہے۔“ وہ کتنی پریشان تھیں۔ زارا اندازہ کر سکتی تھی۔  
”میں جانتی تھی وہ گھر نہیں جائے گا۔“ زارا آہستگی سے گویا ہوئی۔  
”تو کہاں چلا گیا۔ وہ تو کہتا تھا اس کا کوئی دوست نہیں۔“  
زارا کیا جواب دیتی۔ ست روی سے ہاتھوں پر کریم لگاتے ہوئے بجائے کیا سوچتی رہی۔  
”زارا! یوں کب تک چلے گا۔؟“ ممان نے پوچھا تھا۔ وہ ایک طویل سانس لے کر رہ گئی۔  
”میں بھی یہی سوچ رہی تھی۔“  
”ہاں۔ اب تو کچھ نہ کچھ سوچنا ہی پڑے گا۔“ وہ زیر لب بڑبڑاتیں۔ پھر کھڑی ہو گئیں۔  
”سوچاؤ تم سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ زارا جانتی تھی ممان اس سے زیادہ خود کو تسلی دی تھی۔  
وہ واپس اپنے بستر پر بیٹھیں۔ گہرے میں بیٹھ







دیوانگی اس کے حصے میں نہ آئی تھی۔ وہ تو گویا زمین میں جمشید کو دیکھتی تھیں۔

”کسی دوست کی طرف چلا گیا ہو گا۔ میں دوبارہ فون کرتی ہوں۔“ وہ اٹھنے لگی مگر ممانے اسے روک دیا۔

”میں نے ابھی کیا ہے۔ سلیم نے ہی بتایا تھا کہ وہ رات کو گھر نہیں آیا۔“

زارا کو بھی تشویش تو ہوئی تھی مگر وہ اسے چھپا کر ماما کو دلا سہ دیتی رہی۔

”تمہارے بابا کو معلوم ہو گیا ہے۔“ بہت دیر کے بعد انہوں نے آتشکی سے بتایا۔

”کیا۔۔۔؟“

”یہی کہ ہم زمین سے ملتے ہیں۔“

”اوس۔۔۔“ زارا چونکی۔ پھر ایک طویل سانس لے کر بولی۔ ”میں جانتی تھی۔ پیایہ بات بہت جلد جان لیں گے۔“

”ان کاری ایکشن کیا تھا۔؟“

”کچھ بھی نہیں۔ خاموش ہو گئے تھے۔“

”پیایہ بات بہت پہلے ہی جان گئے تھے۔“

”مہم کیسے کہہ سکتی ہو۔۔۔؟“

”مجھے احساس تھا کہ وہ مصلحتاً خاموش ہیں۔“

”اور اس سے پہلے کہ یہ بات سلیمان کو معلوم ہو۔ میں اسے لے کر بہت دور چلی جانا چاہتی ہوں۔ مگر وہ غائب کہاں ہو گیا ہے۔؟“

”شاید وہ یونیورسٹی آئے۔“

”ہاں۔۔۔ تم جاؤ نا یونیورسٹی۔۔۔! وہ بے تابی سے بولیں۔ زارا کو پہلے ہی دیر ہو رہی تھی۔ پریشان سی یونیورسٹی چلی آئی مگر وہ یونیورسٹی نہیں آیا تھا۔ زارا نے اس کے کلاس فیلو شیراز سے پوچھا تھا۔

”زمین تو نہیں آیا۔ حالانکہ آج خاصی اہم کلاسز تھیں۔“ شیراز نے بتایا تو وہ جھنجھلا گئی۔

”انتہائی جذباتی لڑکھو! یہ یوں فرار ہونے سے کیا ہو گا۔“ اس کا پہلا پریڈ مس ہو گیا تھا۔ دوسرے پریڈ کے شروع میں ہی انہیں لے گئے گھر لیا۔

”کہاں ہو تم زارا کی بچی۔“

”ہاں تھوڑا لیٹ ہو گئی میں۔ تم لوگ یہاں کیا کر رہے ہو۔ سر رضا کی کلاس نہیں لینی؟“

”سر رضا آج نہیں آئے۔“ عظمیٰ بھی اس کے قریب آئی۔

”چلو چھٹی ہوئی۔“ زارا نے گلاسز سر پر نکائے۔ وہ تینوں چلتی ہوئی لان میں آگئیں۔

”یار زارا! میں نے تمہیں ایک خبر سنائی ہے۔“ سفید گلابوں کے تختے کے پاس انعم ایک دم اس کے سامنے آئی۔ ہلکے سبز سوٹ میں وہ معمول سے زیادہ کھلی کھلی لگ رہی تھی۔

”سچ سچ بتاؤں۔ میں تمہیں دیکھتے ہی سمجھ گئی تھی کہ تم آج مجھے کیا خبر دو گی۔“ زارا مسکرائی۔ انعم کا چہرہ تیزی سے سرخ ہوا۔ پھر وہ منہ پر ہاتھ رکھ کر ہنستی چلی گئی۔

”یہ لڑکی گئی کام سے۔“ عظمیٰ بیگ رکھ کر بیٹھ گئی۔

”تمہاری منگنی ہو گی تو پوچھوں گی۔“ انعم بھی پھسکا مار کر بیٹھ گئی۔

”ہمیں اپنی فیملنگز چھپانا نہیں آتیں۔“ وہ لاپرواہی سے بولی۔

”اب بتا بھی دو۔ کب آ رہی ہیں تمہاری خالہ انگوٹھی پہنانے۔“ زارا نے پوچھا۔

”اگلی اتوار کو۔ تم تو گی نا زارا!۔“ انعم نے ساتھ ہی پوچھا۔

”فنکشن اریج کر رہے ہو۔“

”یو نہی دو چار لوگ اکٹھے ہو جائیں گے اور میری فریڈز ہوں گی بس۔“

”یہ تم نے شادی کر کے گھر ہی بیٹھنا تھا تو ماسٹرز کسی بھی سمیکٹ میں کر لیتیں۔ یہ جرنلزم کی سیٹ ضائع کرنے کی کیا ضرورت تھی۔“ عظمیٰ نے عینک کے عقب سے اسے گھورتے ہوئے لڑا لڑا اسے انعم کا منگنی پر اتنا ایکسائڈ ہونا ایک آنکھ نہیں بھایا تھا۔

”ا۔۔۔ ہائے۔“ انعم کا منہ کھلا۔ ”اس وقت تو

میری باقاعدہ ہاتھ جوڑ کر منتیں ہو رہی تھیں کہ انعم میں اکیلی یونیورسٹی کیسے جاؤں گی۔“ اس نے نقل اتاری۔

”ہاں تو مجھے کیا پتا تھا کہ آخر میں تم ڈگری کے بجائے شادی کے لیے مرنا شروع کر دو گی۔“

”یہ صرف۔۔۔ مجھ سے جیسلس ہو رہی ہے۔“ وہ منہ بنا کر زارا کی طرف متوجہ ہو گئی تھی۔ ”تم تو گی نا۔“

”ظاہر ہے۔“ زارا مسکرائی پھر پوچھنے لگی۔

”دانیال بھی آئے گا؟“

”اسے اپنی ٹانگیں تڑوانی ہیں۔“ منگنی کے بعد ہمارے خاندان میں شریف لڑکے سسرال تو کیا سسرالی شہر میں بھی قدم نہیں رکھتے۔“

”ہاں مگر منگنی کے وقت تو۔۔۔ انگوٹھی تو وہ پہنا۔ گانا۔“ زارا نے پوچھا تو انعم نے ایک لمبی سی آہ کھینچی۔

”ہماری ایسی قسمت کہاں زارا ابلی۔“

”یہ لڑکی۔“ عظمیٰ نے اسے غصے سے گھورا۔ پھر دانت پیس کر بولی تھی۔ ”بتا نہیں اس کا دماغ کب خراب ہوا۔ حالانکہ پہلے اچھی بھلی ہوئی تھی۔“

”سچ سچ بتاؤں۔“ وہ نچلا لب دانٹوں تلے دبا کر مقبسم و شریر لہجے میں بولی۔

”بولو۔“ بادل خواستہ کہا گیا۔

”جب میں نے تین سال قبل دانیال کو رحمان بھائی کی شادی میں دیکھا تھا۔“

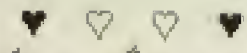
”اوہ نو۔“ عظمیٰ کے لیے یہ بات غیر متوقع تھی اور اس نے کبھی ذکر بھی نہیں کیا تھا۔

”اوہ یس۔!“ وہ کھلکھلا اٹھی۔ پھر لاڈ بھرے لہجے میں بولی۔ ”چلو نا مجھے چاٹ کھلا دو۔۔۔۔۔“ فرمائش زارا سے کی گئی تھی۔

”میں نے تو سنا ہے۔ شدید خوشی اور غم میں بندے کی بھوک مر جاتی ہے۔“ عظمیٰ نے کہا۔

”شدید خوشی تو مجھے ہو رہی۔ یہ شدید غم کیا افتخار کے نہ آنے کا ہے۔“ انعم نے اس کی سمت جھٹک کر سرگوشی کی۔ پھر سر پر پاؤں رکھ کر بھاگی تھی کہ عظمیٰ کا بیگ اس کے ہاتھوں سے اسکاڈ میزائل کی طرح نکلا

تھا۔



یہاں سے بہت دور بھاگ جانے کی خواہش نے اسے نجانے کہاں بھٹکایا تھا۔ مگر وہ جو اندر ایک اذیت اضطراب بن کر لوہ میں سرایت کر گئی تھی۔ وہ اسے چھین نہیں لینے دیتی تھی۔ موٹر سائیکل بہت دور کھڑی کر کے وہ یہاں تک پیدل آیا تھا اور اب اس سوکھے درخت سے ٹیک لگائے اپنی اندراشتی تلخ سوچوں کو سن رہا تھا۔ خزاں گزیدہ موسموں کی زد میں آئے درختوں سے پتے ٹوٹ ٹوٹ کر اس پر برس رہے تھے۔ اس کا دل چاہا یہ خشک و زرد پتے یونہی برستے رہیں۔ یہاں تک کہ اس کا وجود ان پتوں میں جھپ جائے اور کوئی اسے ڈھونڈ نہ پاسکے۔ اس نے سر اٹھا کر خود پر جھکی برہنہ شاخوں کو دیکھا۔

”لیکن کون ہے جو ان خزاں گزیدہ موسموں میں مجھے آواز دے۔“

”کوئی نہیں۔۔۔ کوئی بھی تو نہیں۔“

”کون ہو تم۔۔۔؟“ نجانے کون تھا اور اس کے قریب رک کر کیوں ایسا سوال کر رہا تھا جس کا جواب اس کے پاس نہ تھا۔ اس کے اندر پھر سے وہی الاؤ جانے لگا۔ تو وہ مضطرب سا کھڑا ہو گیا۔ اس کے قدموں کے نیچے خشک پتے چلا چلا کر ایک ہی سوال دہرانے لگے۔

”کون ہو تم؟۔۔۔“

اس نے ایک وحشت کے عالم میں بائیک اشارٹ کی تھی اور خود کو ایک نامعلوم سفر کے حوالے کر کے بھول جانے کی ایک ناکام سی کوشش کی۔ اسے خبر نہیں تھی وہ کہاں ہے؟ زمین پر؟ آسمان پر یا پھر کسی خلائے بسیط میں کہ وہ رکنا تھا یا چل رہا تھا مگر ایک اضطراب مسلسل تھا جو اسے شہر کی ہر ہر سڑک پر بھگائے جا رہا تھا۔

دن کی روشنی بجھنے لگی۔ شام کی آنکھ میں رات اتری تو ایک ٹھکی ٹھکی سی سوچ نے اس کے مضطرب دل و دماغ میں سناٹا سا بھر دیا تو اس نے خود سے اعتراف کیا تھا۔



”ہاں! میں ہوں زین العابدین۔ ایک شکست خورہ انسان کا بزدل بیٹا۔ اور بزدلی کا وصف شاید مجھے ورثے میں ملا ہے۔“

وہ گھر نہیں جانا چاہتا تھا کہ اپنے گھر کے سواکت درو دیوار سے لڑتے لڑتے تھک گیا تھا اور وہ جانتا تھا آج کی رات بھی وہ سو نہ پائے گا۔

”لیکن میں کہاں جاؤں۔“

سڑکوں پر اترتی دھند اس کی منزل کو بے نشان کر رہی تھی اور جب اس کے اعصاب شل ہو گئے اور سرد ہوا میں اس کے وجود کو منجمد کرنے لگیں تو نجانے کیوں۔۔۔ مگر اس نے خود کو افتخار کے گھر کے سامنے پایا۔ افتخار بیٹھک میں ابا کی ٹانگیں دیا رہا تھا اور اس کے ابا حقے کی نے منہ میں دبائے لحاف میں دیکے بابا بلھے شاہ کی کافیاں سنار ہے تھے۔ اٹکھٹھی میں دیکتے سرخ انگاریوں نے کمرے کی فضا میں ہلکی سی حدت پیدا کر دی تھی۔

”ارے زین العابدین۔!“ وہ اپنی روایتی گرم جوشی کے ساتھ اس سے بغل گیر ہوا۔ پھر پلٹ کر اپنے ابا جی سے تعارف کروانے لگا۔ زین پہلے بھی دو بار اس کے گھر آیا تھا۔ مگر اس کے ابا جی سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ وہ یونہی غائب دماغی سے جھک گیا۔ انہوں نے مشفقانہ انداز میں اس کے کندھے پر ہتھکی دی۔ تھیرے اسے دیکھا۔

”کیا اندر اتنی آگ دہکار کھی ہے کہ باہر کی سردی کا احساس ہی نہیں پتر۔“ اس کے وجود پر کوئی جرسی کوئی سویٹر نہ تھا۔

افتخار کو اس کی حالت عجیب سی لگی۔ خود سے لا پروا تو وہ ہمیشہ تھا مگر یہ خاموشی یہ خود فراموشی کی حالت پہلے کبھی نہ تھی۔

”افتخار پتر اپنے دوست کو دوسرے کمرے میں لے جا۔“

انہوں نے اشارہ کیا تو افتخار نے اس کا سر ہاتھ تھاما اور بائیں ہاتھ والے دروازے کو کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ کمرے میں دو پلنگ تھے۔ ایک پر لحاف اوڑھے

کتاب سامنے کھولے بارہ تیرہ سالہ لڑکا اپنا سبق رٹنے میں مصروف تھا۔

”باسط! تم ابا جی کے پاس چلے جاؤ۔“

اس نے ایک نظر زین پر ڈالی اور بغیر کوئی سوال کے اپنی کتاب بند کی اور چپل پین کر کھسٹر کھسٹر۔ کرتا دوسری بیٹھک میں چلا گیا۔

”میرا بھانجا ہے۔ بیٹھو تم۔۔۔“ افتخار نے پلٹ کر کہا۔ وہ خاموشی سے پلنگ پر بیٹھ گیا۔ ٹانگیں بھی اور کرلیں۔ نجانے کیوں۔۔۔ مگر وہ منجمد کیفیت اب ختم ہو رہی تھی۔ سردی کا احساس ایک دم بڑھ گیا تھا اور وہ خود پر کپکپی سے طاری ہو گئی تھی۔ اس نے کھینچ کر لحاف اپنے اوپر کرلی۔

”کیا ہوا زین؟۔۔۔“ افتخار نے ہمدردی سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔ اس نے نفی میں سر ہلا کر سر جھکا لیا۔ مگر وہ اس کی آنکھوں میں چھائی دھند دیکھ چکا تھا۔

”رونا چاہتے ہو۔۔۔ رولو۔۔۔ رونا بزدلی سی مگر کبھی کبھی ہمارے اندر چھائی دھند چھٹ جاتی ہے۔“

اور زین نے بے اختیار اپنا چہرہ بازو میں چھپایا تھا۔ غصہ، نفرت یا اپنی بے بسی کا احساس تھا سب کچھ ہمہ گیا تھا۔

افتخار خاموشی سے اٹھ کر باہر نکل گیا تھا۔ کچھ دیر کے بعد واپس آیا تو وہ خاموشی سے دیوار پر لگانے سال کا کلیڈ رد دیکھ رہا تھا۔ افتخار نے اس کی سرخ آنکھوں کو دیکھا۔ پھر قدرے بشاشت سے بولا تھا۔

”تم بھی کیا یاد کرو گے۔ اپنے ہاتھوں سے بنا کر لایا ہوں۔ کیونکہ بے بے سو گئی تھیں۔“

اس نے دودھ پتی کا پیالہ اس کے ہاتھ میں تھمایا اور پلیٹ اس کے سامنے رکھ دی۔ جس میں تین ابلے ہوئے انڈے تھے۔ زین کو ایک دم شدید بھوک کا احساس ہوا اور جب وہ ان سے فارغ ہوا تو افتخار اس کے پلنگ پر نیم دراز دونوں ہاتھوں کا تکیہ بنائے آنکھیں موندے بلھے شاہ کی کافی گنگنا تا رہا تھا اور جیسے ہی اس نے خالی پلیٹ اور پیالہ پاس پڑی چھوئی میز

پر رکھا تو اس نے آنکھیں کھول کر زین کو دیکھا۔

”اب کو دوست! کیا کہنا چاہتے ہو۔“

زین نے تذبذب سے اسے دیکھا۔ مگر کچھ لوگ ہوتے ہیں ایسے جن کے سامنے آپ بلا خوف و خطر بڑی لا پرواہی اور اعتماد کے ساتھ اپنی زندگی کی کتاب کا ورق ورق کھول کر رکھ دیتے ہیں۔ جو کبھی کسی کے ساتھ دوستی کے دعوے نہیں کرتے۔ مگر ہر کوئی انہیں اپنا دوست سمجھتا ہے اور زین نے بھی اسی اعتماد کے ساتھ اس سے اپنی زندگی کے ہر راز کو شیئر کیا تھا۔

♥ ♥ ♥ ♥

چپ کر کے کریں گزارے نوں  
سچ سن کے لوگ نہ سہندے نی  
سچ آکھیں تاں گل پیندے نی  
سچ مٹھا عاشق پیارے نوں  
چپ کر کے کریں گزارے نوں

لحاف کو سر تک اوڑھے وہ بے حد خاموشی میں ابھرتی آواز کو نیم غنودگی میں سن رہا تھا۔ یہ افتخار کے ابا جی کی آواز تھی۔ پھر وہ خاموش ہوئے اور ہلکا ہلکا کھانسنے لگے۔ پھر حقے کے گڑ گڑانے کی آواز۔

زین نے لحاف سر سے ہٹا کر دیکھا۔ سامنے دیوار پر لگے کلاک میں دس بج رہے تھے۔ وہ تیزی سے اٹھ بیٹھا۔

”کیا میں رات کو یہیں سو گیا تھا۔“

اس نے بے جد حیرت سے سوچا۔ پھر گردن گھما کر دوسرے پلنگ پر نظر ڈالی۔ وہ خالی تھا لحاف ترہ کر کے پائنٹی کی طرف رکھا تھا۔ اسی لمحے افتخار اندر داخل ہوا۔

”اٹھ گئے ہو۔؟“

”عجیب بے خبری تھی۔ میں یہیں سو گیا۔ آپ کو بھی خواہ مخواہ ڈسٹرب کیا۔“ زین کے لہجے میں ہلکی سی شرمندگی تھی۔ افتخار اس کا دوست تو نہ تھا۔

”مجبوری تھی شہزادے! رات تمہاری حالت ایسی تھی کہ میں تمہیں باہر نہیں نکال سکتا تھا۔ مگر اب نکال سکتا ہوں۔ لیکن ناشتہ کرنے کے بعد۔“ افتخار



نے اس کے کندھے پر دھپ لگائی۔

”اٹھ جاؤ۔ منہ ہاتھ دھو لو۔ ناشتہ ٹھنڈا ہو رہا ہے۔“

زین نے ممنونیت سے افتخار کو دیکھا۔ رات وہ نہ ہوتا تو شاید وہ پاگل ہو جاتا۔ ہاتھ روم میں گرم پانی رکھا تھا۔ منہ ہاتھ دھوتے ہوئے وہ سوچ رہا تھا۔ اس نے افتخار کو کیا کچھ بتایا تھا۔

”ابھی جایاں۔۔۔۔۔“

افتخار کی آواز پر وہ تویے سے چہرہ صاف کرتا باہر نکل آیا۔ افتخار ناشتے کی ٹرے میز پر رکھے منتظر تھا۔ اسے دیکھتے ہی بولا۔

”میں تو تمہارے لیے حلوہ پوری لانے والا تھا۔ مگر بے بے نے پرائے بنالیں۔“

گرم گرم پرائے تھے۔ آلیٹ اور آلو کی بھجیا۔ گرما گرم چائے۔ زین کا سر بھاری بھاری سا تھا۔ ناشتہ کرنے کو دل بھی نہیں چاہ رہا تھا۔ مگر افتخار کے اصرار پر جب کھانے پر آیا تو کھانا چلا گیا۔ پرائے گرم اور خستہ تھے۔ چائے مزیدار۔ افتخار اسے اپنی زمینوں اور باغ کے بارے بتا رہا تھا۔ وہ دلچسپی سے سنتا رہا یا شاید دلچسپی لینے کی شعوری کوشش کرتا رہا۔

”کسی دن تمہیں اپنا باغ دکھانے لے جاؤں گا۔“

”ہاں چلوں گا۔“ زین نے خالی کپ میز پر رکھا۔

افتخار نے اس پورے عرصے میں نہ تو کوئی تبصرہ کیا تھا اور نہ ہی کوئی مشورہ دیا تھا۔ بس زین کے دل کا بوجھ ہلکا ہو گیا تھا۔ حالانکہ سر بو جھل تھا آکھیں جل رہی تھیں شاید رات کی سردی اثر دکھا گئی تھی کہ پورے جسم میں اینٹھن اور سلگتی سی کیفیت تھی۔ مگر اس نے افتخار سے ذکر نہیں کیا۔

”بے بے سے کہیے گا۔ میں نے ایسا مزیدار ناشتہ زندگی میں پہلی بار کیا ہے۔“

”بے بے کہہ رہی ہیں تم روز آجایا کرو۔“ افتخار ہنسا۔ پھر اسے کمرے ہوئے دیکھ کر پوچھنے لگا۔

”جار ہے ہو۔“

”ہاں۔۔۔۔۔“

افتخار نے اپنی گرم چادر اسے دی۔

”سرا چھی طرح پیٹ لیٹا۔ ہوا سرد ہے۔“ اس نے ہدایت کی۔ پھر اسے چھوڑنے یا ہر تک آیا تھا۔ وہ سیدھا گھر پہنچا۔ سلیم لان میں ہی کھڑا تھا۔ وہ اسے نظر انداز کر کے اپنے بید روم میں آگیا۔ سلیم اس کے پیچھے بھاگتا ہوا آیا۔

”بھائی جان کہاں تھے آپ۔۔۔۔۔“ اس کے لمبے میں تشویش تھی۔

”کیوں۔۔۔۔۔؟“ زین نے چابی اور والٹ نکال کر سائیڈ ٹیبل پر رکھا۔

”رات میں دیر تک آپ کا انتظار کرتا رہا۔ پھر گھر لاک کر کے چلا گیا۔ صبح آیا تو چابی وہیں رکھی تھی۔ بھائی جان آپ رات کو بھی گھر نہیں آئے؟“

”ہاں۔۔۔۔۔“ زین نے وارڈ روب کھول کر اپنے کپڑے نکالے۔

”کیوں۔ پہلے تو کبھی رات کو گھر سے باہر نہیں رہے۔“

”اپنا کام کرو۔“

سلیم نے خفگی سے اسے دیکھا۔ پھر اسی انداز میں بڑبڑایا۔

”بابا جان ہوتے تو میں دیکھتا۔“

زین نے اسے پلٹ کر دیکھا۔ پھر بگڑے ہوئے لمبے میں کہنے لگا۔ ”بابا جان نہیں ہیں اور تم ان کی جگہ سنبھالنے کی کوشش مت کرو۔“

سلیم اس کے لمبے سے خائف ہو کر خاموش ہو گیا۔ پھر آہستگی سے بتانے لگا۔

”صبح آپ کی پچھو کا فون آیا تھا۔ آپ کا پوچھ رہی تھیں۔“

”تم نے کیا کہا۔۔۔۔۔“ ڈرننگ روم کی طرف جاتے جاتے وہ رک گیا۔

”میں نے بتا دیا کہ آپ رات کو بھی گھر نہیں آئے۔۔۔۔۔ وہ پریشان ہو رہی تھیں۔“ سلیم نے قدم بڑھاتے ہوئے بتایا۔ اس کا خیال تھا زین اسے ڈانٹے گا۔ اس کا برعکس وہ خاموشی سے کپڑے لے کر

ڈرننگ روم میں چلا گیا تھا۔

”کمال ہے۔۔۔۔۔“ سلیم کو حیرت ہوئی تھی۔ وہ کندھے اچکا کر کچن میں چلا گیا۔ دودھ چولہے پر ابلنے ہی والا تھا۔ ایک دو ابال دے کر اس نے برز بند کیا۔ کمرے میں آیا تو زین بیڈ پر کبیل اوڑھے لیٹا تھا۔ کمرے میں بیٹر چل رہا تھا۔

”طبیعت تو ٹھیک ہے بھائی جان۔“ وہ پوچھے بتا رہا نہ سکا۔

”نہیں۔ لگتا ہے بخار ہے، خیر میں نے ٹیبلٹ لے لی ہے۔“ وہ بائیں ہاتھ سے کنپٹی دباتے ہوئے بولا۔

”ناشتے کے بغیر ہی۔۔۔۔۔“ سلیم کے لمبے میں تشویش تھی۔

”ناشتہ کر چکا ہوں۔ اب تم جاؤ، میں آرام کروں گا۔“ زین کا لہجہ ساٹ تھا۔

تب ہی فون کی ٹیل گونج اٹھی۔ زین نے گردن گھما کر فون کو دیکھا۔ سلیم نے اٹھانا چاہا۔ مگر زین نے روک دیا۔ ذرا سی دیر کے بعد نیل خاموش ہو گئی تھی۔

”یہ فون اٹھا کر لاؤنچ میں لے جاؤ۔ کہہ دینا میں گھر پر نہیں ہوں۔“ سلیم نے فون سیٹ اٹھاتے ہوئے پوچھا۔

”پچھو کا آیا تب بھی یہی کہوں۔۔۔۔۔“

”ہاں۔۔۔۔۔“

سلیم نے بے حد حیرت سے اسے دیکھا۔ کچھ پوچھنا چاہا مگر وہ کبیل منہ پر ڈال چکا تھا اور شام تک بخار مکمل طور پر اسے اپنی گرفت میں لے چکا تھا۔



نرم حدت لیے اوائل سرا کی دھوپ اس کی چارپائی پر بکھر گئی تھی۔ وہ بہت دنوں کے بعد اٹھ کر بیٹھی تھی۔ بخار تو اتر گیا تھا۔ مگر نقاہت اور کمزوری ہنوز برقرار تھی۔ پھر باؤں کا زخم۔ ماما مقبول اس سے باتیں کر رہا تھا۔ کبھی اس کے ماں باپ کی، کبھی اپنی زمینوں اور گائے بھینسوں کی۔ کبھی اپنے بیٹے اور پوتے کی۔ ماما کو مرے تو ایک عرصہ گزر گیا تھا۔ وہ

خاموشی سے سن رہی تھی۔

ماما مقبول اس کے لیے سارے کام بھلائے بیٹھا تھا۔ کسی محلے کی عورت کو اس کے پاس نہ پھٹکنے دیتا۔

نہیں تارہ کے کتنے ہی کام تھے جو اپنے ہاتھوں سے کرتا یا بتوں سے کہہ کر کرتا تھا۔ وہ طوعاً کرہاً انجام دے دیتی کہ اس لڑکی سے اب ساری عمر خد متیں تو لینی تھیں۔ ابھی بھی وہ نوکری بھر سنگترے لے کر چھت پر چڑھ گئی تھی۔ جہاں اپنی پڑوسن کے ساتھ کھٹے میٹھے سنگترے کھاتے ہوئے آس پڑوس کی چٹخارے دار خبریں سننی بھی تھیں اور سنائی بھی تھیں۔

”تارہ! تو بولتی کیوں نہیں۔۔۔۔۔“ ماما مقبول تھک کر پوچھنے لگا۔ نجائے کیسی چپ تھی جو ٹوٹتی ہی نہ تھی۔

”انہوں نے پھر تجھ سے مکان کے بارے میں تو کچھ نہیں کہا۔“ نین تارہ نے پلکیں اٹھا کر ساکت نظروں سے اسے دیکھا اور پھر سے جھکا لیں۔ تب ہی دروازے پر دستک ہوئی۔

”کون ہے؟۔۔۔۔۔“ ماما مقبول نے وہیں سے پکار کر پوچھا۔

”ڈاکٹر اجمل۔۔۔۔۔“ نین تارہ نے تیزی سے سر ہانے پر اوپٹے اٹھا کر اوڑھ لیا۔

”آجاؤ۔۔۔۔۔ اندر آجاؤ۔“

اجمل دروازہ کھول کر اندر آگیا۔ پہلی نظر نین تارہ پر ہی پڑی۔ ایک ہلکی سی خوشی کا احساس اسے یوں بیٹھا دیکھ کر ہوا تھا۔ ماما مقبول کو سلام کر کے وہ قریب پڑی کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔

”کیسی طبیعت ہے اب تمہاری۔“ وہ خوش دلی سے پوچھ رہا تھا۔ وہ خاموشی سے گود میں رکھے اپنے ہاتھوں کو گھورتی رہی۔ جواب ماما مقبول کی طرف سے آیا تھا۔

”اللہ کا کرم ہوا۔ بخار تو اتر گیا ہے۔“

”یہ تو اچھا ہوا۔“ اجمل نے نبض چیک کرنا چاہی۔ اسے گویا انگارہ چھو گیا۔ اس نے ہاتھ کھینچ کلائی پھڑائی اور دوپٹے میں چھپائی۔ اجمل کے لیے اس کی حرکت



خاصی غیر متوقع تھی وہ گزرا سا گیا۔ پھر ابھن بھرے انداز میں مامے مقبول کو دیکھتے ہوئے بولا۔  
 ”میں نبض دیکھنا چاہ رہا تھا۔“  
 ماما مقبول نظریں چرا گیا۔ پھر آہستگی سے گویا ہوا۔  
 ”ڈاکٹر ہے تار۔“  
 اس کی مسیحا بھی کہیں زخم نہ لگا جائے اور ایسے زخم تو مندل بھی نہیں ہوتے۔ اندر ہی اندر سارے وجود کو گلا کر رکھ دیتے ہیں۔  
 اس کا بازو پھر بھی یاہرنہ آیا۔ دوپٹے کی اوٹ سے چہرے کی جو جھلک نظر آرہی تھی۔ اس کے تاثرات ساکت و جاہل تھے۔  
 ”ببخار تو نہیں ہے۔ مگر کمزوری بہت زیادہ ہے۔ چکر آتے ہیں۔“ ماما مقبول جانتا تھا۔ وہ کچھ نہیں بولے گی۔ خود ہی بتانے لگا۔  
 ”کھائے پیے گی تو ٹھیک ہو جائے گی۔ بھوک تو کھل کر لگتی ہے۔“ وہ پھر پوچھ رہا تھا۔ وہاں وہ ہی چپ تھی۔  
 ”کہاں۔ کچھ بھی نہیں کھاتی۔“ مامے نے جواب دیا۔  
 ”میں شربت لکھ دوں گا۔ پاؤں کا زخم زیادہ تکلیف تو نہیں دیتا۔“ اس نے زخم کا معائنہ کرنے کی کوشش نہیں کی۔  
 (جہاں پورا وجود زخم بن گیا ہو۔ وہاں یہ دوا بچ کا زخم کیا کرے گا۔) ایک سی سوچ نے پھر ڈنک مارا۔  
 ”زخم ہے درد تو ہوتا ہو گا۔“ مامے مقبول نے جلدی سے کہا۔ اجمل کو یہ جلد چپ عجیب سی لگ رہی تھی۔  
 ”ٹھیک ہے میں کچھ طاقت کی دوائیاں لکھ۔ بلکہ کلینک سے بھجوا دوں گا۔“ وہ کھڑا ہو گیا تب ہی بتول نے اوپر سے جھانکا۔ پھر تیزی سے نیچے اترتی۔  
 ”تم کب آئے اجمل۔“ بتول کا استقبال ہمیشہ کی طرح پڑوسیوں اور غیر معمولی تھا۔  
 ”اب تو جا رہا ہوں۔“  
 ”لو خواجوا ہی۔“ ماما مقبول میں چائے ہوتی ہوں۔ بی بی اب اسے سکون دینے لگا تھا۔

کر جانا۔“  
 ”کلینک کھلا چھوڑ آیا ہوں۔ پھر کبھی سہی۔“ اس نے شائستگی سے انکار کیا۔ بتول مایوس سی ہو گئی۔ وہ کبھی زیادہ دیر تک رکا نہیں تھا۔ اجمل نے ایک ہمدردانہ سی نگاہ نین تارہ پر ڈالی۔ پھر قصداً ”مسکرا کر بتول سے کہنے لگا۔  
 ”کسی دن فراغت سے آؤں گا۔ تو آپ کے ہاتھ کی بنی چائے ضرور پیوں گا۔“  
 ”یتا نہیں تم کس دن فارغ ہو گے۔ مجھے تو لگتا ہے پورا محلہ ہی بیمار ہو گیا ہے۔“ بتول نے شکوہ کیا۔ مامے مقبول نے بے حد حیرت سے بتول کو دیکھا۔ ڈاکٹر کے ساتھ اتنی بے تکلفی اور عنایت اس کی سمجھ سے بالاتر تھی۔ اجمل نے نجانے کیا کہا تھا۔ بتول اسے پھوڑنے دروازے تک گئی تھی۔ پھر دروازہ بند کر کے ان پر نگاہ ڈالے بغیر کمرے میں گھس گئی۔ مامے مقبول نے ایک طویل سانس لے کر نین تارہ کو دیکھا۔ وہ تھک کر پھر سے لیٹ گئی تھی۔  
 ”تم کچھ ٹھیک ہو جاؤ تو میں بھی ایک چکر گاؤں گا گاؤں آؤں۔“ اسے فصل کی بھی فکر ہو رہی تھی۔  
 ”تم چلے جاؤ ماما۔ میری فکر نہ کرو۔“ نین تارہ نے کوٹ بدل کر آنکھیں موند لی تھیں۔ مامے مقبول کو اس کے منہ سے یہ جملہ سن کر خوشی ہوئی۔ اس نے کچھ تو کہا۔  
 ♥ ♥ ♥ ♥  
 مامے مقبول نے جیب تھپتھا کر روپیوں کی موجودگی کا یقین کیا۔ پھر ذرا جھک کر نین تارہ سے کہنے لگا۔  
 ”میں شام تک آ جاؤں گا نین تارہ! تم فکر نہ کرنا۔“  
 نین تارہ نے چادر اتار کر اسے دیکھا۔ وہ یونہی چادر منہ پر ڈالے سارا دن پڑی رہتی۔ دھوپ کا بادل اس پر برتا رہتا اور اس کی گرمی ہڈی ہڈی میں سرایت کر کے سکون بخشتی۔ اس کے ایزی کے زخم سے اب بھی ٹیسس اٹھیں۔ مگر اب ان میں وہ جھپٹ نہ تھی یہ درد اب اسے سکون دینے لگا تھا۔

”ماما! تم بھلے مت آنا۔ میں اب ٹھیک ہوں۔“  
 اس کی آواز میں بے زاری نہیں بلکی سی نرمی در آئی تھی۔  
 ماما مقبول مسکرا دیا۔ اس کے بوڑھے چہرے پر یہ مسکراہٹ نین تارہ کو بہت بھلی لگی۔ اس دنیا میں یہ واحد شخص تھا۔ جو اس کے درد پر تڑپ اٹھتا تھا۔ جو اس کے لیے رو بھی سکتا تھا اور نوبھی۔ چاہے اس کا نتیجہ کچھ بھی نہ نکلتا ہو۔ شاید اس نے بہت دنوں کے بعد مامے مقبول کے چہرے کو غور سے دیکھا تھا۔  
 ”میں شام تک ضرور آ جاؤں گا۔“ مامے مقبول نے دھیرے سے اس کا سر تھپتھا پایا۔ پھر پلٹ گیا۔  
 بتول کے پاس وہ ذرا رک گیا۔  
 ”ذرا خیال رکھنا دیکھو۔“  
 دوپٹے پر کروشیش کی نیل بناتے ہوئے بتول بس لا پرواہی سے ”اچھا“ بولی تھی۔  
 نین تارہ نے مامے مقبول کو دروازے سے باہر نکلتے دیکھا۔ درخت پر بیٹھی چڑیوں نے شور مچا دیا تھا اور اس شور کے باوجود اسے لگا۔ چہار سو گہری خاموشی اور سناٹا ہے۔ ٹھہری ٹھہری سی ہوا گہرا آلود فضا اور اس پر جھکا آسمان۔  
 اسے لگا۔ وہ پھر سے تنہا ہو گئی ہے۔ گھونسلے سے گرے چڑیا کے بچے جیسا خوف اس کے اندر اترتا تو اس نے گھبرا کر چادر میں چہرہ چھپا لیا تھا۔  
 ماما مقبول سیدھا اجمل کے پاس آیا تھا۔ کلینک پر کوئی مریض نہ تھا۔ صفائی کرنے والا لڑکا اسٹول پر بیٹھا دیوار سے ٹیک لگائے اونگھ رہا تھا۔ ڈاکٹر اجمل کسی کتاب کے مطالعے میں مصروف تھا۔ مامے مقبول کو دیکھ کر کتاب میز پر رکھ کر تیزی سے کھڑا ہو گیا۔  
 ”آپ۔۔۔ آئیے نا۔“ اور اس کے لہجے میں موجود سادگی اور خلوص اور اپنی اس پذیرائی سے ماما مقبول خاصا متاثر ہوا تھا۔ وہ صاف کدھے سے اتار کر گود میں رکھتے ہوئے کرسی پر بیٹھ گیا۔  
 ”کیسی طبیعت ہے اب نین تارہ کی۔“  
 ”اللہ کا شکر ہے۔ میں جا رہا ہوں سوچا تم سے ملنا

جاؤں۔“ مامے مقبول نے کہا۔  
 ”گاؤں جا رہے ہیں۔“ اجمل نے پوچھا ساتھ ہی لڑکے کو آواز دی۔ وہ ہڑبکا کر جاگ اٹھا۔  
 ”دو چائے لاؤ۔“  
 ”نہ۔۔۔ نہ پتر۔ چائے کی ضرورت نہیں۔“ مامے مقبول نے دونوں ہاتھ اٹھا کر اسے منع کرنے کی کوشش کی۔ مگر اجمل کے اشارے پر لڑکا تیر کی طرح نکل گیا۔  
 ”الویس تکلف میں پڑ گئے پتر۔“  
 ”ایک چائے کا کپ بھی تکلف میں شمار ہوتا ہے ماما جی؟۔“ اجمل نے مسکرا کر کہا ساتھ ہی بات بدل دی۔  
 ”آپ گاؤں جا رہے ہیں۔“  
 ”ہاں۔ میرے پتر کا بلاوا آ رہا ہے بار بار۔ میں نے بھی سوچا ایک نظر فصل پر ڈال آؤں۔ پانی بند ہے۔ بارشیں بھی نہیں ہوتیں۔ فصل کا تو اللہ ہی حافظ ہے۔“  
 ”کتنے دنوں تک لو نہیں گے۔“ اجمل کا دھیان اس خاموش لڑکی کی طرف گیا۔ تو بے اختیار پوچھنے لگا۔  
 ”دن کہاں پتر۔ دل تو اوھر نین تارہ میں اٹکا رہے گا۔ شام تک آ جاؤں گا۔“ وہ ایک سرو آہ بھر کر بولا تھا۔  
 ”میں بھی یہی چاہتا تھا۔“ وہ زیر لب پڑ پڑایا۔ پھر وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”ابھی اس کی حالت ایسی نہیں کہ اسے تنہا چھوڑا جاسکے۔“  
 ماما مقبول تاسف سے سر جھٹکنے لگا۔  
 ”قسمت ہی خراب ہے اس کی تو۔۔۔“  
 ڈاکٹر اجمل نے وضاحت کے لیے سوال کرنا چاہا۔ پھر خاموش ہو کر پیپر ویٹ گھمانے لگا۔ وہ نین تارہ کے بارے میں بہت کچھ پوچھنا چاہتا تھا۔ بتول سے اس لیے نہیں پوچھ سکتا تھا کہ اس کا رویہ وہ پہلے ہی دن سمجھ چکا تھا۔ مامے مقبول سے پوچھتے ہوئے لحاظ مانع تھا۔ تعلق ہی کیا تھا اس کا۔ بس اتنی ہی بات ہوتی



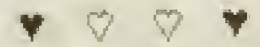
جتنی ایک مریضہ کے بارے میں ہو سکتی تھی۔  
 مائے مقبول نے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ پھر روپے  
 نکال کر اس کے سامنے میز پر رکھ دیے۔ اجمل کا پیپر  
 ویٹ گھماتا ہاتھ رک گیا۔ اس نے سوالیہ نظروں سے  
 مائے مقبول کی طرف دیکھا۔

”یہ کیا ہے؟“  
 ”تم اتنے دنوں سے اس کا علاج کر رہے ہو۔ پھر  
 دوائیوں کا خرچہ۔“

”ماما جی! مجھے اگر پیسے لینے ہوتے تو میں پہلے ہی لے  
 لیتا۔“ ”نجانے کیوں اجمل کو افسوس سا ہوا تھا۔“  
 ”نہ پتر ایہ تو تمہارا حق ہے۔ فیس ہے تمہاری۔“  
 ”میں آپ کو ماما جی کہتا ہوں۔ اب کیا آپ سے  
 پیسے لوں گا۔“ وہ کسی صورت لینے پر آمادہ نہ ہو رہا تھا۔  
 ”اجھا دوائیوں کے تو۔“

”ہرگز نہیں۔“ ”اجمل نے سنجیدگی سے کہا۔  
 تب ہی وہ لڑکا چائے لے آیا۔ ایک کپ اجمل اور  
 دوسرا مائے مقبول کے سامنے رکھ کر دوبارہ اسٹول پر جا  
 بیٹھا۔

”چائے پیسے ماما جی۔“  
 چائے ختم ہونے تک بھی وہ اجمل کو پیسے لینے پر  
 آمادہ نہیں کر پایا تھا۔ اسے اجمل کے طرز عمل پر  
 حیرت بھی ہو رہی تھی۔ مگر پھر مجبوراً اسے پیسے دوبارہ  
 جیب میں رکھنے پڑے تھے۔



کچھ سوچ کر زارا نے گاڑی کا رخ زین کے گھر کی  
 طرف موڑ دیا تھا۔ دروازہ سلیم نے کھولا تھا۔  
 ”زین گھر لو نایا نہیں۔؟“ اس نے وہیں کھڑے  
 کھڑے سوال کیا۔

”آگے ہیں بابی۔۔۔“ سلیم نے بتایا۔ تو زارا نے  
 طہیستان کا سانس لیا۔  
 ”کب آیا تھا؟“ سلیم ایک بل کو جھکا۔ پھر  
 آہستگی سے جانے لگا۔  
 ”کل صبح ہی آگے تھے۔“ اندر کی طرف قدم  
 بھاتی زارا ایک جھٹکے سے رک گئی پھر بے یقینی سے

پوچھنے لگی۔  
 ”کیا کہا۔ وہ کل صبح ہی آیا تھا۔“  
 ”میں کیا کرتا جی! بھائی جان نے منع کر دیا تھا کہ  
 کسی کا بھی فون آئے کہہ دوں کہ وہ گھر پر نہیں ہیں۔“  
 سلیم نے تیزی سے وضاحت کی۔  
 ”تو اب اس نے ہمیں بھی کسی میں شمار کر لیا۔“  
 ”وہ اپنے کمرے میں ہیں اور انہیں بخار بھی  
 ہے۔“

زارا بیدروم کے کھلے دروازے سے اندر داخل  
 ہوئی تو وہ نیم دراز کوئی کتاب پڑھ رہا تھا۔ زارا نے ایک  
 جھٹکے سے کتاب کھینچی۔ وہ گویا اس کی آمد سے واقف  
 تھا۔ تب ہی ایک نظر بھی اس پر ڈالے بغیر دونوں  
 ہاتھوں کی انگلیاں آپس میں الجھا کر سیدھا ہو بیٹھا۔  
 وہ کچھ لمحے اسے خشکیوں نگاہوں سے گھورتی  
 رہی۔ پھر کتاب اس کی گود میں پھینک کر آہستگی سے  
 بولی تھی۔

”ہاں ٹھیک ہے نا۔ تم کر سکتے ہو۔۔۔“  
 ”میں۔۔۔“ زین نے کچھ کہنا چاہا۔

”جب ہم تمہاری توقعات پوری نہیں کر سکتے تو  
 ہمیں بھی کوئی حق نہیں تم سے کوئی توقع وابستہ کرنے  
 کا۔ تم نے جو کیا، ٹھیک کیا زین! تم نے تو دیکھا  
 تھا۔ سمجھا تھا۔ اپنے بابا کی تربت کو محسوس کیا تھا۔ پھر  
 بھی تمہیں ایک بل کے لیے اس عورت کا خیال نہیں  
 آیا کہ وہ ان دونوں میں کس اذیت سے گزری ہوگی۔  
 وہ ان دونوں میں سو نہیں سکی ہیں زین! اور مجبوراً یہ  
 کہ وہ کسی کے ساتھ شیر بھی نہیں کر سکتیں۔“

زارا کا لہجہ مدہم مگر سنجیدہ تھا۔ وہ خاموشی سے سنتا  
 رہا۔ نظریں کتاب پر جمی رہی تھیں یہاں تک کہ وہ  
 خاموش ہو گئی۔

”آپ مجھے ایک کپ چائے کا بنا دیں گی؟“ اس  
 نے نظریں اٹھا کر ڈرتے ڈرتے زارا کو دیکھا اور زارا کو  
 غصہ آ گیا۔ وہ کیا کہہ رہی تھی گویا اس نے سنا ہی نہ  
 تھا۔ کوئی فکر ہی نہ تھی۔  
 ”سلیم سے کہہ دو۔۔۔“ وہ چڑ گئی۔

”نہیں آپ۔۔۔ پلیز۔۔۔“ اور زارا کی مجبوری یہ  
 تھی کہ وہ اس سے خفا بھی نہیں رہ سکتی تھی۔  
 ”کیا چیز ہو تم زین العابدین۔۔۔“ وہ اسے غصے سے  
 گھورتی بکریں میں چلی گئی، جبکہ زین نے فون جو کہ صبح  
 ہی اس نے کمرے میں رکھوایا تھا، اٹھا کر گود میں رکھ  
 لیا۔

”پچھو آرہی ہیں۔“ زارا چائے لے کر آئی تو زین  
 نے بتایا تھا۔

”فون آیا تھا۔۔۔“  
 ”نہیں۔ میں نے کیا تھا۔۔۔“

”تھینک گاؤ! خیال تو آیا۔۔۔“ اس کا لہجہ طنزیہ ہو  
 گیا۔ ”میں نہ آتی تو شاید آج بھی خیال نہ آتا۔“  
 ”شاید۔۔۔“ زین کا لہجہ سپاٹ تھا۔

”جی تو چاہتا ہے، اتنا ماروں کہ ہوش ٹھکانے  
 آجائیں۔“ زارا نے ٹک سائیڈ ٹیبل پر پٹخا۔  
 ”تو ماریں نا۔۔۔“ زین کے لبوں پر ہلکی سی  
 مسکراہٹ جا لی۔

”انتہائی ڈھیٹ ہو تم۔۔۔“ وہ اسے گھورتے ہوئے  
 بولی۔ زین ذرا سا مسکرایا۔

”بیٹھیں۔۔۔“  
 ”نہیں میں جا رہی ہوں۔“

”کیوں؟“  
 ”زین! تم نے ماما کو بت دیا ہے۔ وہ آئیں گی اور  
 پھر روئیں گی۔ اس بار انہیں خاموشی تم کرواؤ گے۔  
 میرے لیے ہر بار انہیں اس حالت میں دیکھنا آسان  
 نہیں۔“ زارا کا لہجہ سنجیدہ تھا۔

زین خاموش ہو گیا۔  
 ”تمہیں بخار ہے۔“ دروازے تک جا کر زارا کو  
 خیال آیا تو پلٹ کر پوچھنے لگی۔

”نہیں ٹھیک ہوں میں۔“ اس نے آہستگی سے کہہ کر  
 مک اٹھا لیا تھا۔

وہ کب سے پچھو کے نرم ہاتھوں کا لمس اپنے  
 ماتھے پر محسوس کر رہا تھا۔ ان کی گود میں سر رکھ کر اسے  
 لگا، اندر بھڑکتی آگ سرد ہونے لگی ہے۔ وہ بار بار ہاتھ

ہٹا کر پوچھتیں۔

”کچھ کھاؤ گے زین۔۔۔؟“

وہ ہر بار بنا کچھ کہے ان کا ہاتھ تھام کر پیشانی پر رکھ  
 لیتا اور وہ پھر سے وہاں لگتیں۔

”پچھو! آخر کب تک۔۔۔ کب تک یہ سب یوں  
 ہی چلتا رہے گا۔“ اس نے اچانک آنکھیں کھول کر  
 پوچھا تھا۔ ان کا ہاتھ ٹھم گیا۔ وہ کچھ لمحے یو کی اس کی  
 آنکھیں دیکھتی رہیں۔

(یہ آنکھیں۔۔۔ یہ آنکھیں جمشید کی ہیں۔۔۔)  
 ”پچھو۔۔۔! زین نے پکارا تو وہ چونک گئیں۔  
 زین اٹھ کر بیٹھ گیا۔

”زارا کی شادی ہو جانے دو۔۔۔“  
 ”پھر۔۔۔ اس کے بعد۔۔۔ اس کے بعد کیا ہو  
 گا؟۔۔۔“

”میں اور تم امریکہ چلے جائیں گے۔“  
 ”فراس۔۔۔“ وہ آہستگی سے ہنسا۔ ”پچھو! یہ کہانی  
 کبھی اپنا عنوان نہیں بدلے گی۔“

”تم کچھ بھی کہو۔ میں اور تم زارا کی شادی کے بعد  
 امریکہ شفٹ ہو جائیں گے۔“ ان کے لہجے کی  
 مضبوطی پر زین نے الجھ کر انہیں دیکھا۔

”یہ لوگ جانے دیں گے۔؟“  
 ”میں سب کو چھوڑ دوں گی۔“ وہ مصمم ارادے  
 سے گویا ہوئیں۔

”پچھو۔۔۔“ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔  
 ”چوبیس برس میں انگاروں پر چلی ہوں۔ تمہیں کیا  
 لگتا ہے، میرے لیے یہ آسان تھا۔ سلیمان سے بات  
 کرنا، بھابھی کی خدمت، میں نے اپنا دل آپ اپنے  
 قدموں میں روندنا ہے۔ میں جب ان لوگوں سے ملتی  
 ہوں میرے اندر غضب کا احتجاج اٹھتا ہے۔ برداشت  
 کا کڑا امتحان تھا۔ چوبیس برس اس جسم میں جلی  
 ہوں۔ صرف تمہارے باپ سے کیا گیا وعدہ نبھانے  
 کے لیے لیکن اب میں بھول جانا چاہتی ہوں کہ میں  
 اس خاندان کی بہو، زارا کی ماں اور عمو کی بیوی  
 ہوں۔“ ان کے لہجے میں وحشت سی تھی۔ ”میں



جمشید کی بہن اور تمہاری پھپھو بھی تو ہوں۔ کب تک خود کو مارتی رہوں گی۔

”آپ نے زارا کو ان لوگوں کے حوالے کیوں کر دیا؟“ اس نے آہستگی سے سوال کیا اور یہ سوال سینکڑوں بار اس کے اندر اٹھتا تھا۔

”میں نے کہاں کیا تھا۔ مجھے تو صرف بتایا گیا تھا۔ ڈرتے تھے وہ مجھ سے۔ حالانکہ میں کیا کر سکتی تھی۔“ ان کے لہجے میں بے بسی اور آئی۔

”مجھے بتائیں نا۔ کیا ہوا تھا؟“

”تمہیں جمشید نے کچھ نہیں بتایا؟“

”انہوں نے مجھ سے کچھ نہیں چھپایا لیکن میں آپ سے سننا چاہتا ہوں۔“

”چھوڑو زین! کیا کرو گے۔“

”ہرگز نہیں! آپ مجھے بتائیں۔ سب کچھ جو آپ کو معلوم ہے۔“ وہ ضدی لہجے میں بولا تھا۔ وہ کچھ لمحے اسے دیکھتی رہیں۔ پھر آہستگی سے بولی تھیں۔

”ٹھیک ہے۔“

اور زین خود کو کچھ نئے انکشافات کے لیے تیار کرتے ہوئے ہمہ تن گوش ہو گیا۔

چنچنی چنگاریوں کی طرح وقفہ وقفہ کے بعد بتوں اور ظہور کی آوازیں اس کے کانوں میں چنچ رہی تھیں۔ فضا میں شام کی اداسی گھل مل گئی تھی۔ وہ دونوں چولے کے پاس بیٹھے تھے۔ ظہور بہت خوش تھا۔ گرم جلیبیاں لایا تھا۔ نین تارہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ سردی ہو رہی تھی۔ اب وہ اندر کمرے میں جانا چاہ رہی تھی۔

”چودہ لاکھ لگائی ہے مکان کی قیمت نیاز نے۔“

ظہور تارہ تھا۔

”چودہ لاکھ میں بک جائے گا؟“ بتوں نے حیرت سے پوچھا۔ وہ دودھ کے بھرے ہوئے چولے میں جلیبیاں ڈال رہی تھی۔

”اٹھ دس میں تو بکے گا۔“ اس نے نین تارہ کو دیکھا۔ پھر بے اختیار پوچھا تھا۔ ”جلیبیاں کھائے گی؟“

تارہ۔

نین تارہ نے خاموشی سے نفی میں سر ہلادیا۔ وہ بھی سرخ بدل کر بتوں کی کسی بات کا جواب دینے لگا اور وہ سر جھکا کر سوچنے لگی تھی۔

”ماما مقبول ابھی تک نہیں آیا۔“

ظہور جلیبیاں کھا کر باہر نکل گیا۔ بتوں گاجریں کاٹنے لگی۔ تب ہی ڈاکٹر اجمل آگیا۔

”لو ابھی میں تمہیں ہی یاد کر رہی تھی۔“

”اور آج میں چائے پیے بغیر جاؤں گا بھی نہیں۔“

”شکر ہے تمہیں فرصت تو ملی۔ دیکھ لو اپنی مریضہ کو۔ میں تب تک چائے بناتی ہوں۔“ بتوں اٹھ کر اندر چلی گئی۔ شاید چائے کا سامان لینے۔ اجمل اس کے قریب آگیا۔

”کیسی ہو نین تارہ؟“ اس کے لہجے کی نرمی نین تارہ کو ہلکا دیتی تھی۔ سو خاموشی سے نچلا لب کاٹنے لگی۔

”لاؤ پیٹی بدل دوں۔“

نین تارہ نے پاؤں کھینچ لیتا چاہا۔ مگر اجمل نے اسے ایسا کرنے نہیں دیا۔

”لوگوں کے رویے تو سمجھ میں آتے ہیں۔ مگر اپنی ذات کے ساتھ اتنی دشمنی۔ میں کرتے نہیں دوں گا۔“ اس کی گرفت میں سختی اور لہجے میں بلا کی نرمی تھی۔ نین تارہ کا دل چاہا۔ وہ اس کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کہے۔

”ممت کرو ایسا۔ تمہاری ہمدردی میری جان لے لے گی۔“

”تمہارا نام بہت خوبصورت ہے۔ کس نے رکھا تھا؟“ وہ آہستگی سے بینڈیج اتارتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

”لیکن جو کچھ ہو چکا ہے۔ اس کے بعد مزید کیا ہونا باقی ہے۔“ نین تارہ نے بے حد یا سیت سے سوچا تھا۔

اجمل کیا پوچھ رہا تھا۔ وہ نہ سن رہی تھی اور نہ سننے کی ضرورت محسوس کر رہی تھی۔

”اتنی چیپ کیوں رہتی ہو۔ ان سے ڈرتی ہو۔“

نین تارہ کی سماعتوں پر بتوں کے قدموں کی چاپ جھٹھوڑے کی طرح گری۔ اجمل بھی خاموش ہو گیا۔

پھر پٹی باندھ کر اٹھ گیا اور بتوں کے پاس جا بیٹھا۔

”ارے۔۔۔ ارے۔۔۔ اندر چل کر بیٹھو۔ میں چائے ادھر ہی لے آتی ہوں۔“ بتوں نے بوکھا کر کہا۔

”ہمیں ٹھیک ہے۔“ وہ دونوں ہاتھ پھیلا کر آگ سینکنے لگا۔

”یہ ٹھیک کب تک ہوگی؟“ بتوں نے بے حد ناگواری سے پوچھا۔

”کون؟“ وہ چونکا۔

”میری۔ میری جان کا عذاب۔۔۔“ تارہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس نے آخری جملہ منہ ہی منہ میں کھالیا۔ وہ اجمل کے سامنے خود کو ظالم ثابت کرنا نہیں چاہتی تھی۔ حالانکہ جملوں سے کیا ہوتا ہے۔

نین تارہ سے نفرت اور بیزاری تو اس کے ہر ہر انداز سے ظاہر تھی۔ اجمل نے گردن جھکا کر نین تارہ کو دیکھا۔ وہ ان سے یکسر بے نیاز اندر جانے کے لیے پاس والی دیوار کا سہارا لے کر کھڑی ہوئی تھی۔

اجمل کے اندر چھپی خواہش نے آہستگی سے سر اٹھایا اور پلکیں جھپک کر اسے دیکھنے لگا۔ اس کا سہارا بن جانے کی خواہش۔ اجمل کو اس خواہش کے جاگ اٹھنے پر کوئی حیرت نہیں ہوئی۔ وہ جانتا تھا ایسا ہی ہو گا۔ یہ اور آگ اسے تب ہی ہو گیا تھا۔ جب اس نے نین تارہ کو پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ کچھ لوگ پہلی نظر میں ہی اپنے وجود کا گمشدہ حصہ گنتے ہیں۔ کچھ لوگ نہیں۔ بس ایک۔۔۔ ان سب لوگوں میں سے بس کوئی ایک۔۔۔

مگر وہ بے حد خاموشی سے اسے اندر جاتے دیکھتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ کمرے کی نیم تاریکی میں گم ہو گئی۔ وہ ایک طویل سانس لے کر بتوں کی طرف متوجہ ہوا۔ جائے اہل گئی تھی اور بتوں اپنا سوال بھی بھول گئی تھی۔ بتوں نے کیتلی چولے سے اتاری اور پیالی میں چائے نکالنے لگی۔ اس میں سے اٹھتی گرم بھاپ پر نظریں جمائے ہوئے وہ ہزاروں بار کی سوچی ہوئی

بات سوچ رہا تھا۔

”یہ لڑکی کبھی مسکرائی بھی ہوگی؟۔۔۔“

”تمہارے گھر میں کون کون ہے؟۔۔۔“

وہ جو بے حد انہماک سے یہ تصور کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ ان ہونٹوں پر مسکراہٹ کیسی لگتی ہوگی، بری طرح چونک گیا۔ بتوں نے چننی کی سفید پلیٹ میں جلیبیاں نکال دی تھیں اور اب کے وہ اپنا سوال بھولی نہیں تھی بلکہ جواب کی منتظر تھی۔ اجمل نے ذرا سا کھنکھار کر پریالی اٹھالی۔ پھر پتائے لگا۔

”اُمی! ابو اور میں۔۔۔“

”بہن بھائی کوئی نہیں۔۔۔؟“ بتوں نے پوچھا۔

”تین بہنوں کی شادیاں ہو گئی ہیں۔ تینوں بڑی تھیں مجھ سے۔ ایک بڑا بھائی ہے پچھلے برس جدہ چلا گیا۔ کہتا ہے امی! ابو کو بھی وہیں بلا لے گا۔“

بتوں کو یہ سن کر بے حد خوش ہوئی تھی۔

”بھائی کی شادی نہیں ہوئی ابھی تک۔۔۔؟“

”مٹکنی ہو گئی ہے۔ چھٹی لے کر آئے گا تو شادی بھی ہو جائے گی۔“ وہ قصداً مسکرایا۔

”اور تم۔۔۔ تمہاری کہیں بات طے نہیں ہوئی؟۔“ بتوں اصل اور اہم سوال کی طرف آئی اور ہمہ تن گوش ہو گئی۔ اجمل نے ایک لمحوں کو کمرے کے بند دروازے کی طرف دیکھا۔ پھر مبہم سا مسکرایا۔

”پہلے تو کبھی خیال ہی نہیں آیا۔۔۔“

”تو یہ کیا بات ہوئی۔ شادی کی عمر ہے تمہاری۔“

”بس بہنیں اپنے اپنے گھروں میں خوش امی بہار۔ میرے لیے لڑکی کون ڈھونڈتا۔“ وہ اب قدرے سہولت سے چائے پی رہا تھا۔

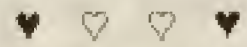
”لو اس میں کیا مشکل ہے۔ مجھے بھی تو باجی کہا ہے تم نے۔ میں دیکھوں گی اپنے بھائی کے لیے لڑکی۔“

بتوں بہت خوش تھی۔ معلومات خاصی تسلی بخش تھیں۔ خود اجمل بھی بہت سادہ مزاج نوجوان لگتا تھا۔ بات بن جائے تو کوثر ساری عمر عیش کرے گی۔ اجمل مسکرا کر خاموش ہو گیا تھا۔ بتوں نے پلیٹ اس کے سامنے کی۔



”لوٹا۔ ابھی گرم ہیں۔“

اجمل نے ایک جگہ بیٹھ لی۔ تو وہ مطمئن سی ہو کر اس کے خاندان کے بارے میں مزید سوالات کرنے لگی تھی۔



زین نے ساری رات بیٹھ کر پچھو سے حاصل شدہ معلومات کو بابا کی بتائی گئی باتوں کے ساتھ ملا کر ایک ترتیب دے کر کمپیوٹر میں فیڈ کیا تھا۔ اسے لگا بابا کے ماضی کا شیرازہ بکھرا ہوا ہے اور اسے ورق ورق سمیٹنا اور ترتیب دینا ہے۔ پچھو اپنے ذہن و دل کے سمندر میں ڈوب کر باہر آتیں۔ تو کچھ ہاتھ آتا، اسے دیکھ کر کبھی روٹی تھیں تو کبھی ہنسی، کبھی بس مسکرا دیتیں تو کبھی او اس ہو جاتیں۔ اور ایک کے بعد دوسرا ورق اسے چھپاتی جاتیں اور جو کتاب اس کے سامنے ترتیب پائی تھی۔ اس کے بہت سے صفحات غائب تھے۔ کچھ ادھورے اور کہیں سے یادداشت کی روشنائی اڑی ہوئی اور آخری باب۔ آخری باب سرے سے ہی غائب تھا۔

وہ ہر روز اسے از سر نو پڑھتا اور گمشدہ صفحات پر قیاس تحریر کرتا رہتا۔ اس دن جب دھوپ ساری دھرتی پر کھل کر برس رہی تھی۔ افتخار چلا آیا۔ وہ بے تکلفی سے سیدھا اس کے پتھر میں آگیا تھا۔ کچھ لمحے کمپیوٹر اسکرین پر لکھی تحریر پڑھتا رہا۔ زین نے بھی اسے بدلنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ افتخار سے کیا چھپا تھا۔ وہ کچھ لمحے پڑھتا رہا۔ پھر دونوں ہاتھ اس کے کندھوں پر جماتے ہوئے بولا تھا۔

”کسی دانا کا قول ہے۔“  
”خوش رہو اور پیچھے مڑ کر نہ دیکھو کہ ماضی راکھ کا ڈھیر ہے۔“  
”مضبوط رکھو کہ حال سمندر کی ریت کی طرح مجھ سے کچھ پھسل رہا ہے اور آنکھیں کھلی رکھو کہ مستقبل تاریک خلا ہے۔“  
”خیال بھراؤ۔“  
”ہاں۔۔۔۔۔“  
”راکھ کا ڈھیر سمندر کی ریت، تاریک خلا۔۔۔۔۔“

بہت دیر ان لفظوں کو دہراتا رہا۔ پھر ایک مجروح سی مسکراہٹ کمر کی طرح اس کے لبوں پر جم گئی۔  
”ہاں“ میری زندگی کا گوشوارہ ان ہی الفاظ سے تشکیل پایا ہے۔ اس سے زیادہ خوبصورت تشریح ہو ہی نہیں سکتی۔“

”Pessimists (توٹیوں) کا المیہ۔۔۔۔۔“  
”مطلب۔۔۔۔۔“

”میرے جیسے لوگ اس میں ان تین باتوں پر عمل کرتے ہیں بادشاہوں۔“ افتخار کی دھپ اس کے کندھے پر پڑی۔

”تین باتیں؟۔۔۔۔۔“ زین نے کمپیوٹر آف کیا اور مکمل توجہ افتخار کی طرف مرکوز کی۔  
”پیچھے مڑ کر نہ دیکھو۔“

”باؤں مضبوط رکھو۔“  
”آنکھیں کھلی رکھو۔“ اپنی مونچھیں سنوارتے افتخار کا لہجہ مستحکم و متنی خیز تھا۔

زین کچھ لمحے افتخار کو دیکھتا رہا۔ پھر بے بسی سے پوچھنے لگا۔

”میں کیا کروں افتخار بھائی؟“  
”یہ سوال ہر کسی سے کرتے ہو۔ کبھی خود سے بھی کیا ہے۔“

زین نے لب بھینچ لیے تو وہ ہنس دیا۔  
”میری نصیحت پر عمل کرو گے۔“  
”کیسے؟۔۔۔۔۔“

”پیچھے مڑ کر مت دیکھو۔“  
”ماضی راکھ کا ڈھیر ہے اور مجھے اس بھی راکھ میں کچھ چنگاریاں تلاشتی ہیں۔“

”اس وقت پیچھے مڑ کر مت دیکھو۔“ افتخار نے ”اس وقت“ پر زور دے کر بات دہرائی۔ زین نے ابھن بھری نگاہوں سے اسے دیکھا۔

”اس سے کیا ہو گا؟۔۔۔۔۔“  
”یہ بھی بتا دوں گا یا رہیہ تم گھر آئے مہمان کی خاطر نہیں کرتے۔ اتنی دور سے تمہارا گھر ڈھونڈنا آ رہا ہوں۔“ وہ بڑے آرام سے بات بدل گیا۔

”ہاں میں کچھ لاتا ہوں۔۔۔۔۔“ زین تیزی سے کھڑا ہو گیا۔

”تمہارا گھر بہت خوبصورت اور مہر سکون جگہ پر ہے۔ مگر در بہت ہے یا۔۔۔۔۔“

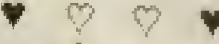
”جگہ سے کیا ہوتا ہے افتخار بھائی! سکون تو دل میں ہونا چاہیے۔“ زین نے آہستگی سے کہا۔ افتخار نے اس کی بات پر غور کیا۔ پھر حسب عادت قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔

”چلو یا را کہیں باہر چلتے ہیں۔“  
”مگر چائے۔۔۔۔۔“

”پھر سی۔۔۔۔۔ ابھی تو تمہارے ساتھ کہیں گھومنے نکلتے ہیں۔“ افتخار نے اسے ساتھ لیا۔ تو پھر وہ رات گئے واپس لوٹ سکا تھا اور خلاف معمول وہ خود کو فریش بھی محسوس کر رہا تھا۔ اس نے مخصوص جگہ سے چابی اٹھا کر لاک کھولا۔ سلیم جاچکا تھا۔

”کیا جاو ہے اس بندے کے پاس۔۔۔۔۔“ فریش ہو کر بیڈ پر دراز ہوتے ہوئے اس نے سوچا۔ ”مجھے یاد بھی نہیں کہ کچھ گھنٹے پہلے کس ٹینشن کا شکار تھا میں۔“

پھر وہ میگزین کھولتے ہوئے زارا کا تازہ آرٹیکل ڈھونڈنے لگا تھا۔



زین کو خبر بھی نہ ہوئی اور افتخار اسے مصروفیت کے جال میں پھنسا کر زندگی کی طرف کھینچ لایا تھا۔ وہ جو ہمہ وقت اپنی ہی ذات کی گتھیاں سلکھانے اور اپنے دماغ کی گرہیں کھولنے میں لگا رہتا تھا۔ ماضی کے تاریک دروازوں پر دی جانے والی دستکوں پر قفل پھنسا کر خاموشی سے افتخار کے ساتھ ہو لیا تھا۔ افتخار وہ انگلی تھا جسے تھام کر وہ ہجوم کے خوف اور کھوجانے کے ڈر سے آزاد ہو جانا چاہتا تھا۔

”پیچھے مڑ کر مت دیکھو۔“  
وہ یہ بات کبھی گمراہ سے نہ باندھتا۔ مگر افتخار نے اسے موقع ہی کہاں دیا۔ وہ اچانک آتا۔ اسے کھینچ کر لے جاتا۔ کبھی ابا کی بیٹھک میں۔۔۔۔۔ جہاں سارا دن

حقہ تازہ رہتا، ایک کے بعد دوسرا۔۔۔۔۔ دوسرے کے بعد تیسرا۔۔۔۔۔ تیسرے کے بعد۔۔۔۔۔ دھیرے دھیرے ساری بیٹھک حقے کی گڑگڑاہٹ اور گرم گرم باتوں سے بھر جاتی۔ صوفی دکان دار بار بار بازار کے اتار چڑھاؤ چیزوں میں ملاوٹ اور منگائی کا رونا روتا۔ انور ماسٹر کوئی نسل میں بڑھتی ہوئی بے راہ روی اور تعلیم کے لیے غیر شجیدہ رویے کا افسوس ستاتا۔ غلام نبی صاحب کیونکہ رشتہ ہو چکے تھے، انہیں کوئی موضوع نہ ملتا تو ملکی سیاست کو سمجھنے لاتے۔ موضوع پلٹتا تو تصوف کے مسئلے شروع ہو جاتے اور اگر اس وقت مولوی اللہ داتا موجود ہوتے تو صوفی ازم کے شائق اور مولوی صاحب کے درمیان گرم گرمی ہو جاتی۔ ان کے ازلی رقابت باہر آتی تو لہجوں میں تندہی اور بحث میں تیزی آ جاتی۔ جسے ختم کرنے کے لیے افتخار کے ابا جی زور سے کھنکھارتے۔ ایک بل کو خاموشی ہوتی اور وہ سر ہانے کے نیچے ہاتھ ڈال کر ”کلیات علیہ شاہ“ نکال لیتے۔ افتخار ابا جی کو عینک تھماتا اور زین کا ہاتھ پکڑ کر باہر نکل جاتا اور اس پورے عرصے میں زین کوٹنے والی کرسی پر بیٹھا رہتا اور افتخار ابا جی کے پلنگ پر بیٹھا ٹانگیں دبا رہتا۔ یونیورسٹی میں سینہ ٹان کر چلنے والا افتخار ابا جی کے سامنے اونچی آواز میں بات بھی نہ کرتا تھا۔ زین کو اس کا یہ روپ بہت عجیب مگر بہت خوبصورت لگتا۔

اور کبھی کبھی وہ اسے مولانا شہاب الدین کے ہاں لے جاتا۔ وہ ایک بزرگ صحافی تھے۔ ایک بڑے سے کمرے میں بیٹھی ہوئی درمی اخبارات کے ڈھیر، ادبی جرائد، سیاسی و فلمی رسائل، اسپورٹس میگزین، پانی کا کولر، گولڈ لیف کے پیکٹ، چائے کی پیالیوں اور سنے پرانے صحافیوں کے درمیان کھڑے شہاب الدین بے اختیار استقبال کرتے ہوئے کہتے۔

”آؤ بھئی افتخار میاں۔“  
اور افتخار ایک انگڑائی لے کر ابا جی کے پلنگ سے اٹھتا اور شہاب الدین کے مقابل جا بیٹھتا اور بھول جاتا کہ اس کے ساتھ کوئی زین العابدین بھی ہے۔



شاید وہ جانتا تھا اسے کہاں زین کی انگلی پکڑنی ہے اور کہاں اپنا دامن جھاڑ کر ایک طرف ہو جانا ہے۔ اس نے ایک بار کہا تھا۔

”میں لوگوں کا ساتھ وہیں تک دیتا ہوں جہاں تک انہیں میری ضرورت ہوتی ہے۔ میں دوسروں کے لیے فیصلہ کرنے اور ان کے فیصلوں پر مسلط ہونے کی کوشش نہیں کرتا۔“

جرنلزم زین کا سبجیکٹ تھا۔ وہ پہلے پہل خاموشی سے سنتا رہا پھر دھیرے دھیرے گفتگو میں حصہ لینے لگا۔ افتخار کی آواز میں زور اور انداز میں جوش ہوتا۔ بحث تنگ پانگ بال کی طرح ان سب کے درمیان ٹپاٹپ کرتی رہتی۔

ورلڈ ٹریڈ سینٹر امریکہ کے حملے، افغانستان کی صورت حال، اسرائیل کی ہٹ دھرمی، بھارت کی دھمکیاں، کشمیری مجاہدوں کے حوصلے، سیاست دانوں کے فیصلے، چشم پوشیاں، چین کا اکنامک کلچر، عثمان فاروقی اسکینڈل، کیبل کے نقصان، کلوننگ، بھارت کی ثقافت سے ہو کر جب گفتگو فلمی اداکاروں تک پہنچتی تو زین اٹھ جاتا۔

”جلس افتخار بھائی۔“ افتخار تیزی سے اٹھتا۔ ”ہاں اب کچھ پڑھ لینا چاہیے۔ میرا تو فاسٹل ایر ہے۔“

وہ لوگ کتابیں اور نوٹس اٹھا کر جناح باغ آجاتے اور ان کی ورق گردانی کرتے ہوئے وہ پلٹ کر دیکھتا چاہتا پھر گڑبڑا کر افتخار کو دیکھنے لگتا۔ وہ مسکراتا ہوا اس کی کیفیت سمجھ رہا ہو۔

”میں نے کہا ناں پیچھے مڑ کر مت دیکھو۔“

”مگر کیوں؟“ میں ماضی سے کیسے ہاتھ چھڑا سکتا ہوں۔ جبکہ میرا نام میری شناخت ماضی کے دھند لگوں میں گھوم چکی ہے۔

اس کے ہاتھ پھر سے دستک دینے کو اٹھ جاتے تو افتخار بول اٹھتا۔

”میں تو یہ کہہ رہا ہوں کہ ماضی کے پیچھے بھاگتے ہوئے تم اپنا حال بھی کھو دو گے۔“

تمہارے مستقبل کی عمارت تعمیر ہونا ہے۔ اپنے قدم مضبوط رکھو یہ آج کا تقاضا ہے۔ بہت ریلیکس ہو کر ایگزرام دو۔ پھر دیکھیں گے تمہارے لیے کیا کرنا ہے۔“

افتخار سے ملنے کے بعد اسے لگتا۔ اس دنیا میں کوئی مسئلہ ایسا نہیں جو حل نہ ہو سکے۔ مگر ایک مناسب وقت۔ اور وہ جو اس بات پر ہمیشہ بھڑک اٹھتا تھا۔ خاموشی و تنہائی سے ایگزٹم کی تیاری میں مصروف ہو گیا تھا۔ یہ مصروفیت بھی ایک نعمت تھی۔ لوگوں سے ملنا، تعلقات، دوستیاں دوسروں کی مشکلات، ان کے غم، اپنی اسٹڈی۔ اسے اتنا وقت ہی کہاں ملتا تھا کہ وہ بند دروازوں پر دستک دے۔ ایسا نہیں کہ وہ سب کچھ بھول گیا تھا۔ مگر ذہن کا تناؤ کم ہو رہا تھا۔ بہت سی نا انصافیوں اور الجھنوں کے ساتھ ساتھ اسے زندگی کی خوبصورتیاں بھی نظر آنے لگی تھیں۔

بے بے کے ہاتھ کے برائے۔ افتخار کی بڑی بہن آفا ظلم سے چھیڑ چھاڑ۔ اباجی کے ساتھ گپ شپ۔ یاسر کی شرارتیں۔

”زندگی خوبصورت بھی ہوتی ہے۔“ نجانے کتنے عرصے کے بعد اس نے یہ بات سوچی تھی اور جب یہی بات زارا سے کہی۔ تو وہ ہنس دی۔ ”تھینک گاڈ! تمہیں بھی زندگی میں خوبصورتی نظر آئی۔ اسی لیے ہمیں آگور کر رہے ہو۔“

”نہیں، میں آگور تو نہیں کر رہا۔ بس میں وہاں جاتا ہوں تو یہ خوف ساتھ نہیں ہوتا کہ مجھے کوئی دیکھ لے گا یا کسی کو مجھے چھوڑ کر جلدی کھر جانا ہے۔“ زارا نے چھیڑا تھا تو اس نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا تھا۔

”اوہ تو اب طنز بھی کرو گے۔“ ”طنز نہیں حقیقت بیانی۔“ وہ اطمینان سے گویا ہوا۔ زارا اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے قدرے غور سے دیکھتے ہوئے بولی۔

”کچھ بدلے بدلے سے لگتے ہو۔“

”کیا سرپر سینگ نکل آئے ہیں؟۔“ ”نہیں۔ تھوڑے خوش۔ تھوڑے مطمئن۔ یہ افتخار کیا جاؤ گے؟“ ”کہہ سکتے ہیں۔“

”تمہاری دوستی کیسے ہو گئی؟۔“ ”بس ہو گئی۔“

”اب تم اور ہو رہے ہو۔“ زارا نے گھورا۔ تو وہ ہنسنے لگا۔ پھر قدرے سنجیدہ ہو کر بولا۔

”میں نے آپ کا آرٹیکل پڑھا تھا۔“ ”کون سا؟“

”وہی جو آپ نے جنید انصاری پر لکھا تھا۔ افتخار بھائی کہتے ہیں۔“ آپ بہت اچھی جرنلسٹ ثابت ہوں گی۔ آپ کے قلم میں بہت کثرت ہے۔“ ”تمہیں کیسا لگا؟۔“

”جنید انصاری پر ہونے والا ظلم۔“ زین نے نظروں کا زاویہ بدل کر اسے دیکھا۔

”آرٹیکل کی بات کر رہی ہوں۔۔۔“ وہ سنجیدہ ہو گئی۔

”اچھا تھا۔۔۔“ وہ سر اٹھا کر آسمان پر اڑتے پرندوں کو دیکھنے لگا۔ ”ایک بات تو بتائیں۔“

”پوچھو۔۔۔“ ”اگر میں بھی یونسی قتل ہو جاؤں تو۔۔۔ تو کیا کریں گی آپ۔۔۔؟“

”رہش۔ کیا فضول بات ہے۔“ ”سوال کو نالیں نہیں۔ جواب دیں۔“

”کوئی اور بات کرنا۔“ زارا نے ٹالنا چاہا۔ ”نہیں، اگر میں واقعی قتل کر دیا جاؤں تو آپ کیا کریں گی۔ یونسی ایک آرٹیکل لکھ کر خاموش ہو جائیں گی۔؟“ وہ اس کے سامنے کھڑا اس کے تاثرات بڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ زارا نے بے حد سنجیدہ نظروں سے اسے دیکھا۔

”کیا تمہارے پاس اس کے علاوہ اور کوئی بات نہیں۔“ ”آپ ڈر گئیں۔ میں تو صرف آپ کا ردِ عمل جاننا چاہتا تھا۔“ وہ آہستگی سے ہنسا۔

”ردِ عمل واقعہ رونما ہونے کے بعد سامنے آتا ہے۔“ ”اس کے لیے تو مجھے قتل ہونا پڑے گا۔“ وہ کان کھاتے ہوئے بولا۔

”کچھ مشکل نہیں۔ سلیمان بھائی کے سامنے جا کھڑے ہو۔۔۔“ وہ چڑ کر کھڑی ہو گئی۔ زین کا قہقہہ بے ساختہ تھا۔

”تم انتہائی احمق لڑکے ہو۔“ اسے غصہ آگیا۔

”آپ کا گزن ہوں۔۔۔“ وہ ہنسی روک کر بولا تھا۔

”حالا نکہ کہیں سے نہیں لگتے۔۔۔“

”ہاں جی۔۔۔ کہاں آپ، کہاں ہم۔۔۔“ وہ کرسی سے اٹھ گیا اور خاموشی سے چلتا ہوا پیرس تک آگیا۔

”ہاں ہے میں اور بابا آپس میں یونسی چھوٹی چھوٹی باتوں پر لڑا کرتے تھے، بلکہ لڑائی لڑائی کھیلا کرتے تھے۔ وہ کہتے تھے روٹھے اور منانے کا ایک اپنا ہی مزاج ہے۔“

”اچھا۔۔۔“ زارا نے سر اٹھا کر زین کو دیکھا۔ وہ آسمان پر اڑتے پرندوں کو دیکھ رہا تھا۔

”خلیل جبران کہتا ہے، ماضی راکھ کا ڈھیر ہے۔“ وہ بابا سے خلیل جبران پر آگیا۔

”تم آج کل خلیل جبران کو پڑھ رہے ہو۔“

”زین نے گویا اس کی بات نہیں سنی۔“

”لیکن۔۔۔ شاید وہ یہ نہیں جانتا کچھ لوگ۔۔۔ کچھ واقعات اور کچھ لفظ کبھی ماضی نہیں بنے، ہمیشہ آپ کے ساتھ چلتے ہیں۔“

زارا اٹھ کر اس کے قریب آئی پھر ساتھ والی عورت کو۔۔۔ جو ٹھٹھک کر انہیں دیکھنے لگی تھی۔

”نظر انداز کرتے ہوئے پوچھنے لگی۔“

”تم کیا سوچ رہے ہو؟۔۔۔“ وہ مبہم سا مسکرا دیا۔ دونوں ہاتھ گرل پر جما کر نیچے جھانکنے لگا۔

”کبھی کبھی وہ لڑکی مجھے بہت یاد آتی ہے۔“

”کون۔۔۔؟“ زارا نے اس کی نظروں کے تعاقب میں نیچے دیکھا۔ وہاں ایک بوڑھا چھابڑی لیے گزر رہا تھا۔



”آرام کہاں پایا! آج العم کی منتفی ہے۔ ابھی دیر

"ہاں۔۔۔ زارا شھید کی عقیقہ۔"

پوچھوں آپ سے۔" وہ چڑ کر بولیں۔

خالہ کے موچھیں لگا۔ "پتھر مٹے پر ہا کھ رہے۔"







کا بیٹا ہے جن پر اس کے تباہی کے قتل کا الزام تھا۔ زار کی ماں کو اپنے بھائی کی موت کا علم ہوتا ہے تو وہ غم سے ہڈیاں ہوجاتی ہیں کیونکہ وہ اپنے بھائی کو بے قصور سمجھتی ہیں۔ زار اور اس کی ماما زین سے ملنے نکلتی ہیں۔ مگر وہ ساتھ ہی رائے سلیمان سے خوف زدہ ہیں۔ سلیمان ہی نے رائے جیش حیات پر اپنے باپ کے قتل کا الزام لگایا تھا اور ہر حالت میں اس سے بدلہ لینے کا عہد کیا تھا۔ اس کے برعکس رضوان تلخی ہوئی طبعیت کا مالک انسان ہے اور ان تمام معاملات سے دور بیرون ملک تعلیم کے سلسلے میں مصروف تھا۔ اس کے لوٹ آنے پر ان کی رخصتی کی تیاریاں شروع ہوجاتی ہیں۔

نیم تارا ایک مظلوم لڑکی ہے۔ جس کا رشتہ صرف ایک ماما مقبول ہے۔ ایک روز زمین تارا کے پیر کا بچے سے زخم آجاتا ہے تو زین اس کے پیر کی مرہم بنی کر دیتا ہے جس پر اس کے سوتلے بھائی بھابھی اس پر الزام لگا کر اسے زبرد کو ب کرتے ہیں اور زین کو بھی ڈراتے دھمکاتے ہیں اور بالآخر عین تارا پر ظلم و ستم کر کے اپنا مقصد یعنی مکان کی بھتیگی کے کاغذات بردستخط کر دیتے ہیں۔ ایک خدا ترس ڈاکٹر اترس اس کا مفت علاج کر رہا ہے۔

زار عظمیٰ اور انعم کا اس فیلوپس انعم کی اپنے خالہ زاد سے نسبت طے پاگئی ہے۔ جب کہ عظمیٰ کو افتخار بے حد پسند کرتا ہے لیکن عظمیٰ اپنی خاندانی پابندیوں کی وجہ سے اس کے التفات کا جواب انتہائی رکھائی سے دیتی ہے۔

## چھٹی قسط

”سہ نہیں ہو سکتا۔“ اس کی آنکھوں اور لہجے میں بے یقینی ہی بے یقینی تھی۔ رضوان کے لیے بھی یہ بہت بڑا شاک تھا۔ اتنا اچانک یہ سب ہوا تھا کہ دل و دماغ ماؤف سے ہو رہے تھے۔ نجانے وہ ڈرائیونگ کس طرح کر رہا تھا۔ اس نے زار کی سمت دیکھا وہ عالم بے یقینی میں نفی میں گردن ہلا رہی تھی۔

”یہ کیسے ہو سکتا ہے رضوان۔ ابھی۔ ابھی ایک آدھ گھنٹہ پہلے میں پایا کو زندہ سلامت چھوڑ کر آئی ہوں۔ انہوں نے مجھ سے کہا تھا تم واپس آؤ گی تو باتیں کریں گے۔ اتنی جلدی۔ اتنی اچانک۔ نو۔ نیو۔ کوئی غلط فہمی ہے۔ ابھی کس کا فون تھا رضوان؟ آپ دوبارہ فون کریں۔“ آنسو تو اترے اس کا چہرہ بھگوٹے لگے تھے جس کا اسے بالکل احساس نہ تھا۔

”زارا۔!“ رضوان کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں مگر وہ ضبط سے کام لے رہا تھا۔ زار نے جھپٹ کر موبائل اٹھایا اور پایا کا نمبر لکھنے لگی مگر دوپہری طرف جلد خاموشی تھی۔ رضوان اس وقت اسے تسلی نہیں دے سکتا تھا کہ سارے لفظ بے معنی ہو گئے تھے۔ وہ بار بار نمبر ملا کر ہار گئی۔

رضوان نے اسے گھر سے باہر اتار دیا۔ ایک امیر پوچھنے لگا۔

”تم بے بے کو عظمیٰ کے گھر لے جاؤ گے؟“ کارڈ پر نام لکھتے لکھتے افتخار نے سر اٹھا کر زین سے پوچھا۔ وہ ہاتھ میں پکڑی مسماں کی لسٹ پر نظر دوڑا رہا تھا۔ جو ابھی ابھی افتخار کے ابا جی نے لکھوائی تھی۔ چونک کر

”کون عظمیٰ۔؟“

افتخار کے لبوں پر ایک مبہم سی مسکراہٹ بکھری پھر وہ سراکار ڈانٹتے ہوئے وہ سنجیدہ دوسری سے انداز میں بولا تھا۔

”زارا کی فریڈ ہے۔“

”اچھا۔ ہاں۔“ اسے یاد آیا۔

”آپ کی شادی کا کارڈ دینا ہے۔“

”آپ کی رشتہ دار ہیں عظمیٰ۔“ زین نے پوچھا۔

”کچھ دور نزدیک کی رشتہ داری ہے تو۔“ اس کی نگاہیں مبہم اور لہجہ عام سا تھا۔

”تو آپ چلے جائیں۔ مجھے تو ان کا گھر بھی نہیں معلوم۔“ زین نے لسٹ میز پر رکھ دی اور کارڈ اٹھا کر اس کا ڈیزائن دیکھنے لگا۔

”میرے جانے پر تو پابندی عائد ہو گئی ہے۔“ افتخار زیر لب بڑبڑایا۔ زین نے سوالیہ نظروں سے دیکھا تو پین ہند کرتے ہوئے کہنے لگا۔

”بہت کام ہیں یا ر! میرے پاس بالکل وقت نہیں ہے اور بے بے نہ جانے کب تک وہاں بیٹھیں۔“

تو فرنیچر والے کے پاس بھی جانا ہے۔ ایڈریس میں سمجھا دیتا ہوں۔ زیادہ مشکل نہیں ہے بلکہ ایسا کرو۔“

اس نے ایک اور کارڈ اٹھا کر اس پر کچھ لکھا۔

”یہ کارڈ آتے آتے انعم رحمان کے ہاں بھی دے دو اور نہ خفا ہو جائے گی۔ اس کا گھر بھی وہیں نزدیک ہی ہے۔ یہ حیدر آصف اور سلیم کے کارڈ ہیں یہ میں خود اسے آؤں گا۔“

تب ہی بیٹھک کے کھلے دروازے سے باسط اندر داخل ہوا۔

”اف ماسوں! پکڑیں جلدی ورنہ میری گردن میں بٹ آجائے گا۔“ اس کے کندھوں پر بالٹوں سے بھرا ڈرکرا تھا۔

”یہ کیوں اٹھائے لا رہے ہو۔“ افتخار نے بیٹھے بیٹھے پوچھا۔ زین نے آگے بڑھ کر نوکرا اتروایا۔

”اف!“ وہ گردن مسلتا ہوا کرسی پر بیٹھ گیا۔ ”اتنا بھاری تھا۔ میں نے عبدل چاچا سے کہا بھی تھا کہ خود دے آئے۔ مگر میری بات تو وہ مانتا ہی نہیں۔“

”مگر لائے کیوں ہو۔ ابھی کل تو میں نے منگوائے تھے گھر کے لیے۔“ افتخار نے پوچھا۔

”پتا نہیں بے بے نے کہا تھا۔“

تب ہی بے بے آگئیں، یاد ای چکن کے سوٹ پر کڑھالی والی چادر لپیٹ رکھی تھی، باسط کو دیکھا تو ڈانٹنے لگیں۔

”کب سے انتظار کر رہی ہوں تم تو جا کر بیٹھ جاتے ہو۔“

”بے بے! سائیکل کا پتھر ہو گیا تھا۔ سر پر اٹھا کر لایا ہوں۔“ وہ احتجاجا پیچھا۔

”اچھا بس، اب اٹھو لڑکے! دیر ہو رہی ہے۔“ انہوں نے افتخار سے کہا۔

”زین لے جاتا ہے آپ کو۔ مجھے فرنیچر والے کی طرف جانا ہے۔“ وہ کھڑا ہو گیا۔

”مگر یہ نوکرا کیا ساتھ لے جاتا ہے؟“

”خالی ہاتھ جاتے کچھ اچھا نہیں لگتا۔ موسم کی سوغات ہے پھر اپنے باغ کے ہیں۔“ بے بے نے رسائیت سے کہا تو وہ سر ہلا کر باسط کی طرف متوجہ ہوا۔

”جاؤ، ٹیکسی پکڑ لاؤ۔“

”ماسوں! میں۔۔۔“ باسط نے احتجاج کرنا چاہا مگر افتخار کے گھورنے پر پاؤں پٹختا ہوا باہر نکل گیا۔

”بے بے! آپ نے وہاں کوئی کوئی بات نہیں کرنی۔“ افتخار نے جھپٹتے ہوئے کہا۔

”بس چپ۔۔۔ زیادہ پٹیاں مت پڑھاؤ۔ پتا ہے مجھے کیا کرنا ہے کیا نہیں۔“ بے بے نے ڈیپٹ کر کہا تو وہ مسکرا کر رہ گیا۔ ٹیکسی آنے پر زین نے نوکرا اندر رکھا۔ افتخار نے ٹیکسی ڈرائیور کو ایڈریس سمجھا دیا۔ ٹیکسی روانہ ہونے پر اندر آیا تو قافلہ تیار تین دھوٹے دھوٹے پوچھنے لگیں۔



”جلی گئیں بے بس۔“  
 ”ہاں۔۔۔“ اس نے کولر پر رکھا گلاس اٹھا کر پانی سے بھرا پھر وہیں بیٹوں کے بل بیٹھ کر پینے لگا۔  
 ”میں نے کہا بھی تھا بے بس ہے مجھے ساتھ لے جائیں اسی ہمارے میں بھی اسے دیکھ لیتی۔“  
 ”پھر دیکھ لیجئے گا۔ کیا جلدی ہے۔۔۔“ اس نے باقی پانی کیاری میں ڈال دیا۔  
 ”نہیں نہیں مجھے تو ہے۔ بے بس بالکل اکیلی رہ جائیں گی۔“ وہ اپنے جانے کے خیال سے اداس سی ہو گئیں تو افتخار نے بات بدل دی۔

”سدرہ آپ کا فون آیا تھا۔ میں شام کو جا کر انہیں لے آؤں گا۔“ سدرہ این کی بڑی بہن تھیں ان کی شادی گاؤں میں ہوئی تھی۔ باسٹ ان ہی کا بیٹا تھا۔ گاؤں میں ڈھنگ کا اسکول نہ تھا سو وہ اسے یہاں اس کے بہتر مستقبل کی خاطر چھوڑ گئی تھیں۔

”مسنو! عظمیٰ شادی پر آئے گی نا۔“ فاطمہ آپا کا سارا دھیان وہیں پر تھا۔

”کبھی نہیں۔۔۔“ وہ فوراً بولا۔ ”البتہ اس کے گھر والوں کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا شاید آجائیں۔“

”ایک تو مجھے تمہاری کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی۔“ وہ جھنجھلا کر گئیں۔

”اگر تم اسے اتنا پسند کرتے ہو اور ہمیں بھی کوئی اعتراض نہیں ہے تو سیدھے سیدھے رشتہ کیوں نہیں جینے دیتے؟“

”میں چاہتا ہوں یہ کام اسی طرح ہو جسے عظمیٰ چاہتی ہے۔ یہ رشتہ صرف میرے اور عظمیٰ کے درمیان نہیں بلکہ دو گھرانوں کے درمیان ہونا چاہیے۔“ وہ مسکرا دیا۔

”تمہاری اس سے کبھی اس لئے میں بات ہوئی ہے؟“ فاطمہ نے پائے پوچھنے ہوئے پا چھاؤ افتخار ہنس دیا۔

”نہیں۔ ہمارے تو ہمیشہ سے۔۔۔“

”انعم گزیرا کر بول اٹھی۔“

”باغ تو باغ ہوتا ہے کیا ماننے کیا آم۔ آپ

”وہ مجھ سے کسی بھی سلسلے میں کوئی بات کرنا پسند نہیں کرتی۔“

”اس کے باوجود تم جانتے ہو کہ وہ کیا چاہتی ہے۔“ فاطمہ نے حیرت سے اسے دیکھا۔

”ہاں۔۔۔“ افتخار کا لہجہ پریقین تھا۔ وہ ایک طویل سانس لے کر رہ گئیں۔

”چلو اچھا ہے۔ تب تک تم یونیورسٹی بھی چھوڑ دو گے اور دونوں گھر ایک دوسرے کو جان بھی لیں گے۔ اللہ کرے وہ تمہارا ہی نصیب ہے۔“

”ایسا ہی ہو گا انشاء اللہ۔۔۔“

”بڑا یقین ہے۔“ انہوں نے چھیڑا۔

”اپنے رب پر یقین ہے۔“ وہ مسکرا کر کھڑا ہو گیا۔

”میں ذرا فریج پر والے کی طرف جا رہا ہوں۔ اباجی آئیں تو بتا دیجئے گا۔“

دروازہ عظمیٰ نے کھولا تھا۔ وہ ابھی ابھی انعم کے ہاں سے آئی تھی۔ امی اور دوسرے بہن بھائی ابھی تک وہیں تھے کہ مہمانوں کے جانے کے بعد عظمیٰ کا سامان از سر نو دیکھا جا رہا تھا۔ زین کو دیکھ کر وہ حیران رہ گئی۔

”تم۔۔۔“ سما خیال یہی آیا کہ وہ زارا کا پیغام لایا ہو گا۔ پھر سر جھٹک کر اس کی طرف متوجہ ہوئی۔ زارا اس طرح پیغام نہیں بھجوا کر گئی تھی۔

”السلام علیکم۔۔۔“

”وعلیکم السلام۔۔۔“ اس نے قدرے حیرت سے ساتھ کھڑی شفیق صورت خاتون کو دیکھا۔ زین العابدین کا خیال تھا ایک دوسرے کو جانتی ہیں کہ افتخار نے انہیں رشتے دار ہی بتایا تھا۔ مگر جب عظمیٰ کے چہرے کا تذبذب اور حیرت دیکھی تو کچھ پزل سا ہو کر کہنے لگا۔

”افتخار بھائی کی والدہ آئی ہیں۔“

عظمیٰ بری طرح بوکھلا گئی۔ افتخار سے کچھ عید نہ تھا مگر والدہ۔۔۔

”نہیں۔ ہمارے تو ہمیشہ سے۔۔۔“

”انعم گزیرا کر بول اٹھی۔“

”باغ تو باغ ہوتا ہے کیا ماننے کیا آم۔ آپ

”اندر آنے کو نہیں کوگی بیٹی!“ وہ مسکراتے ہوئے پوچھ رہی تھیں اس نے بری طرح پزل ہوتے ہوئے پورا دروازہ کھول دیا۔

”آئیے نا۔۔۔“ وہ ابھی بھی نئے سوٹ میں ملبوس تھی۔ لمبے بال کھلے تھے مگر سلیقے سے دوپٹہ اوڑھا ہوا تھا۔ کچھ گھبرائی گھبرائی عظمیٰ کو بے بس نے بے حد پسندیدگی سے دیکھا۔ دل نے کہا ”یہی عظمیٰ ہے۔“ کہ افتخار نے بتایا تھا وہ گھر میں سب سے بڑی ہے۔ باقی بہنیں چھوٹی ہیں پھر بھی تصدیق کے لیے پوچھنے لگیں۔

”تم عظمیٰ ہو۔۔۔“

اس نے اثبات میں سر ہلایا اور ڈیوڑھی میں کھلنے والا ڈرائنگ روم کا دروازہ کھولنے لگی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے جبکہ بے بس نے دل ہی دل میں بیٹے کی پسند کو سراہا تھا۔ زین نے نوکرا ڈیوڑھی میں رکھا۔

”آپ بیٹھیں خالہ! میں امی کو بلاتی ہوں۔ انعم کی منگنی تھی آج۔ سب وہیں گئے ہوئے ہیں۔“ عظمیٰ نے ہتھیلیاں مسلتے ہوئے بتایا تو زین بیٹھتے بیٹھتے رک گیا۔

”پھر تو زارا بھی آئی ہوں گی۔“

”ہاں آئی تو بھی مگر رضوان بھائی اسے لینے آگئے۔ شاید کوئی ایمر جنسی تھی۔“

”کیسی ایمر جنسی۔۔۔؟“ زین چونک کر پوچھنے لگا۔

”معلوم نہیں اس نے جاگروں بھی نہیں کیا میں ابھی کڑوں کی فون پھر کچھ پتا چلے گا۔“ عظمیٰ نے کہا۔

پھر بے بس کو دیکھتے ہوئے بولی تھی۔ ”میں امی کو بلا کر لاتی ہوں۔“

دیوار کے ساتھ اوپر جاتی بیڑھیوں پر چڑھ کر اس نے دوسری طرف جھانکا۔ صحن میں کھیلنے انعم کے بیٹے کو آواز دے کر امی کو بھیجنے کو کہا۔

”کہہ دینا۔ مہمان آئے ہیں۔“ اسی صورت میں وہ جلدی اٹھ سکتی تھیں۔ وہ خود وہیں صحن میں ٹہلنے لگی پزل تو تھی ہی مگر افتخار پر غصہ بھی آ رہا تھا۔

”نہیں۔ ہمارے تو ہمیشہ سے۔۔۔“

”انعم گزیرا کر بول اٹھی۔“

”باغ تو باغ ہوتا ہے کیا ماننے کیا آم۔ آپ

”نہیں۔ ہمارے تو ہمیشہ سے۔۔۔“

”انعم گزیرا کر بول اٹھی۔“

”انتہا درجے کا ڈھیٹ انسان ہے۔“

وہ جھنجھلا رہی تھی۔ تب ہی امی آ گئیں اور ان کے عقب میں انعم کو دیکھ کر وہ جڑ بڑ ہو کر ہتھیلیاں مسلتے لگی۔ جانتی تھی اب وہ کتنا ریکارڈ لگائے گی۔

”کون آیا ہے؟“ امی نے پوچھا تھا جبکہ انعم نوکرے کا معائنہ کر رہی تھی۔

”افتخار کی امی آئی ہیں۔“ وہ نظریں چرا کر بولی۔

”ہیں!“ انعم جھٹ سے اس کے قریب آئی۔ وہ منگنی کا سوٹ بدل چکی تھی اور اس وقت ساہ سے لباس میں ملبوس تھی۔ ”کیا سچ ہے۔۔۔“ اس کے بیٹس کے بیٹس دانست یا ہر تھے۔

”اچھا تم چائے بناؤ۔“ امی اس سے کہہ کر ڈرائنگ روم میں چلی گئیں۔

”سچ سچ اس کی والدہ ہی ہیں نا۔۔۔؟“ لہجے میں اشتیاق ہی اشتیاق تھا جبکہ عظمیٰ چڑ کر کہنے لگی۔

”تمہارا آنا ضروری تھا آج کے دن تو گھر میں تنگ جائیں۔۔۔“

”منگنی ہوئی ہے۔ کوئی مایوں تو نہیں بیٹھی میں جو گھر سے نکلتا ہی ہند ہو جائے۔“ وہ آرام سے بولی۔ پھر شرارت سے اسے کچن کی طرف دھکیلا۔

”تم ذرا اچھی سی چائے بناؤ۔ میں افتخار کی بے بس سے مل آؤں۔“

عظمیٰ بڑبڑاتی ہوئی کچن میں گھس گئی۔ چائے تو بہر حال بنانا ہی تھی۔ انعم آئی تو عظمیٰ کی امی کہہ رہی تھیں۔

”بھلا اس تکلف کی کیا ضرورت تھی بہن۔“

”تکلف کیسا“ اپنے بلغ کا پھل ہے۔“ بے بس نے مسکرا کر کہا۔

”اچھا مگر افتخار تو بتا رہا تھا کہ آموں کا بلغ ہے آپ کا۔۔۔؟“ امی نے حیران ہو کر پوچھا۔ بے بس ان سے زیادہ حیران ہوئی تھیں۔

”نہیں۔ ہمارے تو ہمیشہ سے۔۔۔“

”انعم گزیرا کر بول اٹھی۔“

”باغ تو باغ ہوتا ہے کیا ماننے کیا آم۔ آپ



سنائیں خالہ کیسی ہیں آپ۔ افتخار بھائی تو بہت تعریفیں کرتے ہیں اپنی بے بے کی مجھے تو بہت اشتیاق تھا آپ سے ملنے کا۔“

ان کا دھیان بٹانے کو وہ بولتی چلی گئی تیب ہی نگاہ زمین پر پڑی۔ بے بے کو دیکھنے میں ایسی محو تھی کہ پہلے اس کی سمت توجہ ہی نہ گئی تھی۔

”زین تمہیں۔“  
”تمہیں ک گاؤ۔ آپ نے مجھے دیکھا تو میں بے بے کو لایا تھا۔“ وہ مسکرا دیا۔

”یہ زارا کو کیا ایمر جنسی ہو گئی تھی۔ اتنی جلدی واپس چلی گئی۔“

”مجھے نہیں معلوم۔۔۔۔۔“ وہ کندھے اچکا کر بولا پھر ہاتھ میں پکڑا کارڈ اسے تھما دیا۔

”افتخار بھائی نے آپ کے لیے دیا ہے۔“  
وہ کارڈ کھول کر دیکھنے لگی۔

”یہ بھی آپ کی بیٹی ہے۔۔۔۔۔“ بے بے پوچھ رہی تھیں۔

”عظمیٰ کی سہیلی ہے۔ آج اس کی بات طے ہو گئی ہے۔“ امی نے بتایا۔

”ماشا اللہ اللہ نصیب اچھے کرے۔ میں بھی بیٹی کی شادی کا دعوت نامہ دینے آئی تھی۔ افتخار نے اتنی تعریفیں کیں آپ لوگوں کی میں نے کہہ دیا خود دینے جاؤں گی۔“

”بہت اچھا کیا۔“ امی نے جلدی سے کہا۔  
”ماشا اللہ بہت سلجھا ہوا بیٹا ہے آپ کا۔“

”میں تعریف کروں گی تو لوگ تمہیں گے ماں ہے لیکن حقیقت یہی ہے۔ اکلوتا تھا بہتیرے لاڈ پیار بھی کیے۔ پر اللہ کا شکر ہے بہت ہی فرماں بردار ہے۔ چھوٹا ہی تھا جب زمینوں اور باغ کی دیکھ بھال میں لگ گیا۔ اپنی پردھانی کا شوق بھی ساتھ ساتھ ہی پورا کر رہا ہے۔ اس کے ابا کو تو کوئی فکر ہی نہیں۔ صاف بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھائے ہوئے ہے۔۔۔۔۔“

انعم باہر نکل آئی۔ چکن کے دروازے میں کھڑے ہو کر عظمیٰ کو اطلاع دی۔

”افتخار کی بہن کی شادی ہے۔“

”تو میں کیا کروں۔۔۔۔۔؟“ وہ رکھائی سے بولی۔

”جانے کی تیاری کرو۔ مجھے بھی کارڈ آیا ہے۔ بہت ہی چالاک بندہ ہے۔“

”میرا دماغ خراب ہے جو جاؤں گی۔“ اس نے چینی کا ڈبہ پٹا۔

”اچھا مت جانا مگر چائے اچھی بنانا۔ یہ کیا۔۔۔۔۔“

ساتھ میں صرف سوکھے بسکٹ۔ کیا علاج کروں تمہارا عظمیٰ۔۔۔۔۔“ وہ سر پیٹ کر رہ گئی۔ عظمیٰ کچھ نہیں بولی۔

بسکٹ پلیٹ میں نکالنے لگی۔ انعم پلیٹ تو فوراً بول اٹھی۔

”جا کہاں رہی ہو“ چائے لے کر جاؤ“ میں نہیں جاؤں گی۔“

”مجھے تم سے کبھی بھی کوئی اچھی امید نہیں ہے“ ابھی آتی ہوں۔“ وہ سیڑھیوں سے دیوار اور دیوار سے دوسری طرف چارپائی پر کود گئی تھی۔

”اس لڑکی کا کوئی کام سیدھا نہیں۔“ عظمیٰ زیر لب برہنہ ہوئی ہوئی کپ دھونے لگی۔ انعم واپس آئی تو ساتھ میں بھری ہوئی ٹرے تھی۔ چکن رول، سموے، بیکری کے مزے دار بسکٹ۔

”یہ کیا ہے۔۔۔۔۔؟“ عظمیٰ نے اسے کڑے تیوروں سے گھورا۔

”بہت کچھ بیچ گیا تھا۔ یونہی ضائع ہی جاتا میں نے سوچا۔۔۔۔۔“ اس کا لہجہ صاف چڑانے والا تھا۔

”اسے اٹھاؤ اور دفع ہو جاؤ۔ مجھے تمہاری چیزوں کی ضرورت نہیں۔“ عظمیٰ دانت پیس کر بولی تھی۔

”لیکن مجھے ہے۔“ انعم نے اس کے ہاتھ سے کپ جھپٹ لیے۔ وہ کچھ لمحے اسے بری طرح گھورتی رہی جبکہ انعم اسے یکسر نظر انداز کرتی ٹرے میں برتن لگاتی رہی اور جب اپنی مسکراہٹ ضبط کرنے میں ناکام رہی تو سر اٹھا کر پوچھنے لگی۔

”کیا ہوا۔۔۔۔۔ بہت غصہ آ رہا ہے۔“

عظمیٰ نے ہاتھ میں پکڑی پلیٹ ٹرے میں پٹنی اور دھپ دھپ کرتی کمرے میں گھس گئی۔ انعم جانتی

تھی اب وہ باہر نہیں آئے گی اس نے اطمینان سے چائے ٹھہراس میں نکالی ٹرے میں باقی چیزیں رکھیں۔ ڈرائنگ روم میں آئی تو امی اور بے بے نجانے کہاں کہاں سے تجرو نسب کھنگال رہی تھیں۔ بے بے انتہائی جوش اور خوشی میں بتا رہی تھیں کہ جس گاؤں سے ہجرت کر کے وہ لوگ پاکستان آئے تھے وہاں ان کے چچا کی سسرال تھی۔

”میں تو اس وقت پانچ برس کی تھی پر میرے ابا کو سب پتا ہے۔ انہیں ضرور معلوم ہو گا لیکن وہ تو پچھلے سال اللہ کو پیارے ہو گئے۔“ عظمیٰ کی امی نے آخر میں بے حد افسردگی سے بتایا تھا۔ انعم نے دیکھا زین بیزار سا پرانا اخبار ہاتھ میں لیے بیٹھا تھا۔ ظاہر ہے اسے ان خواتین کی باتوں میں کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔

”اتنے تکلف کی کیا ضرورت تھی بہن! ہم کوئی غیر ہیں۔“

”تکلف کیسا! مجھے تو اتنی خوشی ہو رہی ہے آپ کے آنے کی۔“

انعم مسکراہٹ دیتی چائے سرو کرنے لگی۔

”عظمیٰ! کہاں رہ گئی۔۔۔۔۔؟“ عظمیٰ کی امی نے پوچھا تھا اور انعم جانتی تھی اب وہ ہاتھ پاؤں جوڑنے سے بھی نہیں آئے گی۔

”ابھی آتی ہے۔“ وہ انہیں ٹال کر زین کی طرف متوجہ ہوئی۔ ”تم پور ہو رہے ہو؟“

”نہیں تو۔۔۔۔۔“ وہ قصداً ”مسکرایا۔“

”افتخار کے ساتھ بہت دوستی ہو گئی ہے تمہاری۔“

چلو اچھا ہوا اس پورے عرصے میں کسی کو تو دوست بنا پائے تھے۔۔۔۔۔“ وہ اس کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گئی۔

زین نے بس مسکرا نے پر اکتفا کیا تھا۔ انعم اس سے ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہی۔ افتخار کی بے بے ان سے شادی پر آنے کا پکا وعدہ کر کے ہی اٹھی تھیں۔

جاتے ہوئے انہوں نے عظمیٰ کا پوچھا ”امی کی آواز پر اسے آنا ہی پڑا۔ بے بے نے اسے پیار کیا شادی پر آنے کی تاکید کرتی ہوئی چلی گئیں۔ ان کے جاتے ہی امی عظمیٰ کی طرف پلٹیں۔“

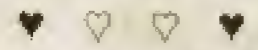


”یہ کیا طریقہ تھا۔ تمہیں کوئی تمیز بھی ہے یا نہیں۔ گول گپے جیسا منہ پتا کر سامنے آگئی تھیں۔“ انعم کے منہ سے ہنسی کا فوارہ نکل پڑا۔ ہاتھ میں پکڑا چائے کا کپ چھلک گیا۔ عظمیٰ کو مزید ناؤ اُلبا۔

”مجھے نہیں اچھے لگتے یہ لوگ۔“ وہ تن فٹن کرتی پھر سے کمرے میں جا گھسی۔ امی اس کی یونیورسٹی کو کوٹنے لگیں جہاں جا کر لڑکیوں کے منہ میں زبان آجاتی تھی۔ پھر مضحک کر پلٹیں، انعم ہنس ہنس کر بے حال ہو رہی تھی۔

”تمہیں کیا ہوا لڑکی۔۔۔؟“ ایسا بے شرموں کی طرح ہنستا انہیں ذرا نہیں بھاپا تھا۔

”گول گپا۔۔۔“ وہ بمشکل ہنسی ضبط کر کے بولی اور پھر سے شروع ہو گئی۔ امی نے بمشکل مسکراہٹ روکی پھر عظمیٰ کو آواز دے کر برتن اٹھانے کا کہنے لگیں۔



لائی بے قدر اس نال باری تے ٹٹ گئی تڑک کر کے

سنگ صاف کرتے ہوئے وہ زور شور سے گاربا تھا۔ زور سنگ بر اور شور گانے میں تھا۔ زن کے لبوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ شرٹ کے بٹن کھولتے ہوئے وہ لیجن تک چلا آیا۔ سلیم نے سر اٹھا کر اسے دیکھا اور بے نیازی سے پھر گانے لگا تھا۔

”شترادہ سلیم! کچھ کھانے کو ملے گا۔“ وہ دروازے کے درمیان کھڑا پوچھ رہا تھا، سلیم کی تان ایک پل کو اُٹنی۔

”نہیں۔“ خاصا کورا جواب تھا۔

”کیوں۔۔۔؟“ زن کو حیرت ہوئی۔

”میں نے کچھ بھی پکانا چھوڑ دیا ہے۔“ جواب دے کر وہ پھر سے رگڑنے لگا۔

”کیوں بھی۔۔۔ چلے تو میں تمہیں ہر مہینے دیتا ہوں۔“ وہ اندر چلا آیا۔

”جیسوں کی بات مت کریں صاحبہ۔“

”صاحبہ۔۔۔؟“ زن نے اس طرزِ مخالفت پر کھور کر دیکھا۔ سلیم نے برش چھوڑا اور ہاتھ نچاتے ہوئے

جارحانہ انداز میں بولا۔

”بھائی صاحبہ! کاکوں کس کے لیے ان درو دیوار یا ہر گے پیڑ پودوں کے لیے۔ آپ کہیں تو لنگر خانہ کھول لوں، کیونکہ دن کی روشنی میں آپ تو گھر میں نظر آتے نہیں۔“

زن مسکرا دیا۔

”اپنے لیے پکا لیا کرو یا را!“ وہ فریق کھول کر جائزہ لینے لگا۔ وہاں کچھ بھی نہ تھا۔

”میری فکر مت کریں۔ میرا گزارہ تو دو روپے کے تان میں بھی ہو سکتا ہے۔“ وہ جل کر بولا۔

”بہت قناعت پسند ہو۔۔۔“ زن نے فریق بند کرتے ہوئے سراہا۔

”قناعت پسند ہوں۔ تب ہی سب کچھ سلامت ہے ورنہ جس طرح آپ سارا گھر کھلا چھوڑ کر پورا پورا دن غائب رہتے ہیں کوئی اور ہو تو سب سمیٹ کر لے جائے۔“

”تمہارا کچھ ایسا ہی ارادہ تو نہیں بن رہا۔“ زن نے چھیڑا تو وہ تڑپ اٹھا۔

”بابا جان کی نوازشیں اور محبتیں ہیں جو اب تک روکے ہوئے ہیں ورنہ جا چکا ہوتا۔“

”اچھا بھئی! اب ان ہی محبتوں کے بدلے کچھ بنا دو۔ بہت بھوک لگ رہی ہے۔“ وہ صلح جو لہجے میں گویا ہوا۔

”جہاں سے آئے ہیں وہاں کچھ نہیں ملا۔“ سلیم بڑبڑایا تو زن نے اسے کھور کر دیکھا۔

”زیادہ اور ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں شاور لے کر آ رہا ہوں۔“

”گھر میں بس انڈے ہیں۔“ سلیم نے پیچھے سے آواز دی۔

”آلیٹ بنا دو، ڈبل روٹی کے ساتھ چلے گا۔“ زن نے شرٹ اتار کر بیڈ پر پھینکی۔ وارڈ روب سے شلوار قمیص نکال کر ہاتھ روم میں گھس گیا۔ نما کر آیا تو سلیم سب تیار کیے بیٹھا تھا۔

”تھینک یو سلیم میاں! تمہارا دم کسی غریب بزرگ

بیوی سے کم نہیں میرے لیے۔“ ڈرینگ ٹیبل کے سامنے اگر برش اٹھاتے ہوئے زن نے بے اختیار سراہا۔

”مجھے بھی اپنا آپ ایسی بیوی کا ہی لگتا ہے۔ جو دہر میں کھانا بنا کر سارا دن آوارہ اور تک چڑھے شوہر کا انتظار کرتی اور اس کی واپسی پر جھڑکیاں کھاتی ہے۔ اسی لیے میں نے کھانا بنا چھوڑ دیا ہے۔“

سلیم منہ بنا کر بولا تو زن ہنس دیا۔ اور کھانا کھانے بیٹھ گیا۔ سلیم کچھ لمحے اسے دیکھتا رہا۔ اس نے بابا جان کو اس کے ناز کسی ننھے بچے کی طرح اٹھاتے دیکھا تھا۔ ان کے حلق سے لقمہ نہیں اترتا تھا جب تک زن کھانا نہ کھا لیتا۔ تاسف سے سر ہلاتے ہوئے وہ بے اختیار کہنے لگا۔

”اپنا خیال رکھا کریں بھائی جان! کم از کم کھانا تو ڈھنک سے گھر پر کھایا کریں۔“

”بخشو بھی بابا! آئندہ گھر پر ہی کھاؤں گا۔“ زن اس کے احساسات سے بے خبر لا پرواہی سے بولا۔ ”یہ فون تو قریب کرو۔“

سلیم فون سیٹ اس کے قریب رکھ کر خود باہر نکل گیا۔ اس نے نمبر ملایا، دوسری طرف بار بار نکل جانے کے بہت دیر بعد کسی نے فون اٹھایا۔

”ہیلو جی!“ دوسری طرف کی آواز پر وہ ذرا سنبھل کر پوچھنے لگا۔

”زارا ہیں۔۔۔“

”نہیں جی۔ وہ تو گاؤں گئی ہیں۔“

”گاؤں! خیریت تو ہے۔“ اس نے ہاتھ میں پکڑا نوالہ واپس رکھا۔

”رازے صاحب کا ایک سیڈنٹ ہو گیا تھا۔ وہ اللہ کو پیارے ہو گئے ہیں۔“

”کیا۔۔۔؟“ وہ ایک دم سے کھڑا ہو گیا۔

”کب۔۔۔ کیسے۔۔۔؟“

”ملازمہ نے اسے ساری تفصیل بتائی۔“

”پچھو۔۔۔ میرا مطلب ہے ان کی بیگم۔۔۔“ وہ تھکے تھکے سے انداز میں بیٹھ گیا۔ پچھو اور زارا پر

اتنی بڑی قیامت ٹوٹ گئی اور وہ بے خبر تھا۔

”سب ہی رازے پور چلے گئے۔ صاحب کو وہیں دفن کرنا ہے۔“

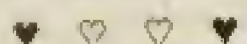
اس نے ریسیور کریڈل پر ڈال دیا۔ انگلیاں اپنے سر کے بالوں میں الجھا کر وہ کتنے ہی لمحے یونہی بیٹھا رہا۔ پچھو اور زارا کے دکھ کا احساس پوری شدت سے ہو رہا تھا۔ مگر کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے وہ حویلی میں ہوتا پچھو کے آنسو پو پچھتا۔ زارا کو تسلیاں دیتا۔ بالکل اسی طرح جس طرح ان دونوں نے اس کا غم بانٹ لیا تھا وہ بھی بانٹ لیتا مگر۔۔۔ وہ اضطراری انداز میں کمرے میں چکرانے لگا۔ سلیم کمرے میں داخل ہوا تو وہ فیصلہ کن انداز میں الماری کی طرف بڑھا۔ کچھ پیسے نکال کر اس نے والٹ میں رکھے سلیم برتن سمیٹ رہا تھا۔

”اور چائے بنا دوں بھائی جان۔۔۔“

”سلیم۔“ زن نے جوتے پہنے۔ ”فقار بھائی کا فون آئے تو بتا دیتا میں گاؤں گیا ہوں۔ شاید صبح تک لوٹ آؤں۔“

”گاؤں۔۔۔؟“ سلیم نے بے حد حیرت سے اسے دیکھا۔

”ہاں زارا کے والد کی ڈیوٹی ہو گئی ہے۔“ زن نے آہستگی سے بتایا۔ پھر اس کا کندھا تپتھا کر ”گھر کا خیال رکھنا“ کہتے ہوئے باہر نکل گیا۔



ویگن نے اسے سڑک پر اتارا تھا۔ دھوپ میں دو تین تانے کھڑے تھے وہ ایک کی طرف بڑھ گیا۔

”کہاں جانا ہے باؤ۔۔۔“ بوڑھے کو جوان نے چابک لہرایا۔

”حویلی۔“ وہ مختصراً کہہ کر تانے میں بیٹھ گیا۔ تانگا گاؤں کی کچی کچی سڑک پر دوڑنے لگا۔ گاؤں کی فضا اس کے درختوں، پھیتوں اور عقب سے بہتی نہریں سوگ کا رنگ نمایاں تھا۔ جب وہ حویلی پہنچا تو جنازہ قبرستان جانے کو بالکل تیار تھا۔ فضا وقفے وقفے سے ابھرتی کھڑی شادیت کی آوازوں سے لرز رہی تھی۔ وہ



خاموشی سے ساتھ ہولیا۔ مشہور سیاسی و سماجی شخصیات موجود تھیں۔ جنازے کو کندھا دیئے، میت کو لحد میں اتارنے اور آخر میں مٹی بھر مٹی قبر پر ڈالنے تک وہ خاموشی کے ساتھ رضوان اور سلیمان کے ساتھ تھا۔ پھر اسی خاموشی سے الگ ہو گیا۔

قبرستان خالی ہو گیا مگر وہ پھر بھی ایک درخت کے ساتھ ٹیک لگائے وہیں کھڑا رہا۔ اس کے سامنے تازہ قبر پھولوں کے ڈھیر سے بھری ہوئی تھی اور کانٹوں میں چھپو کے بین اور زار کی سسکیاں گونج رہی تھیں۔

یہ ان کا آبائی قبرستان تھا۔ بابا کی کتنی خواہش تھی کہ وہ اپنے آبائی قبرستان اپنی زمین اپنے لوگوں کے درمیان دفن ہوں مگر وہ کس قدر بے بسی اور خاموشی کے ساتھ وہیں دفن کر دیے گئے تھے۔

”اپنے لوگ.....“ وہ آہستگی سے چلتا ہوا مختلف قبروں کے کتبے پڑھنے لگا۔ پھر ایک بڑی قبر کے پاس جا رکا۔

”رائے اکبر علی۔“ اس کے دائیں اور بائیں دو قبریں تھیں۔ رائے اکبر علی کے دونوں بیٹوں کی۔

رائے حیات اکبر۔ رائے حیدر اکبر۔ ”پتا نہیں کیا بات ہے پر اس خاندان کے کسی فرد کو اپنے بچوں کی خوشیاں دیکھنا نصیب نہیں ہوئیں۔“ ایک بوڑھا سا شخص اس کے قریب کھڑا ہو کر بے حد تاسف سے ان قبروں کو دیکھنے لگا۔

”کیا مطلب۔“ درخت کے سائے میں سانس لیتے گورکن نے قدرے حیرت سے پوچھا۔

”پتا نہیں کس بددعا کا سایہ ہے اس خاندان پر۔“

رائے اکبر کے دونوں بیٹے بھی بڑی حادثاتی طور پر مارے گئے تھے۔ میں نے ان کی قبریں کھودی تھیں۔“ وہ لرزیدہ آواز میں کہہ کر خاموش کھڑے

زمین کی طرف متوجہ ہوا اور بے اختیار پوچھنے لگا۔

”تم کون ہو پتہ؟“

”میں.....“ زمین چونکا۔ اس کا ہاتھ بے اختیار

رائے حیات اکبر کی قبر کی طرف اٹھا۔ وہ کہنا چاہتا تھا۔ ”میں رائے حیات کا پوتا ہوں بالکل ویسے ہی جیسے رضوان اور سلیمان رائے حیدر کے پوتے ہیں۔“ مگر اس نے ہاتھ گرادیا اور لب بلب بھینچ کر رائے نواز حیدر کی قبر دیکھنے لگا۔

”رائے نواز..... رضوان اور سلیمان کے والد..... وہ شخص جس نے مرنے کے بعد اس کے باپ کو در بدر بھٹکنے پر مجبور کر دیا۔“

”رائے اکبر نے اپنے دونوں بیٹوں کی اولادوں کی پرورش کی۔ ان کے خاندان میں زمین بھی تقسیم نہیں ہوئی اس کے بڑے پوتے رائے نواز نے ساری جاگیر سنبھالی تھی۔ رائے اکبر کی وفات کے بعد جب زمین کی تقسیم کا معاملہ ہوا تو رائے حیات کے بیٹے جمشید نے اپنے تایا کے بیٹے کو قتل کروا دیا اور خود غائب ہو گیا۔“

”ضروری تو نہیں۔“ زین تڑپ کر ان کی طرف پلٹا۔ ”یہ ضروری تو نہیں بزرگوار کہ رائے جمشید نے واقعی رائے نواز کو قتل کیا ہو۔“

بوڑھے نے بے حد حیرت سے اس کا تڑپا دیکھا پھر آہستگی سے گویا ہوا۔

”غیب کا علم تو رب سونے کو ہے پر حقیقت تو یہی ہے پتا اس نے زمین کی خاطر اپنے بھائی کو مروا دیا۔ زر زن اور زمین کے جھگڑے ایسے ہی ہوتے ہیں۔“

”وہ پکڑا نہیں گیا اب.....؟“ اس کا بیٹا پھر سوال کر رہا تھا۔

”یہ بڑے لوگ اپنے معاملے دو سروں کے سپرد نہیں کرتے۔ سلیمان نے قسم کھائی تھی باپ کی موت کا بدلہ خود لے گا۔ سارا ملک کھنگال ڈالا پر پتا نہیں وہ کہاں غائب ہو گیا تھا۔“ بوڑھا سر جھٹک کر نئی قبر پر ڈالے پھولوں کو دیکھنے لگا۔ پھر تاسف سے گویا ہوا۔

”رائے حیدر کے تو پوتے ہیں اس کی نسل چلانے کو، رائے حیات کا تو کوئی نام لیوا نہ رہا۔ سارا خاندان ہی جھجھو ختم ہو گیا۔ بیٹیاں ہیں پر نسل تو بیٹوں سے

چلتی ہے۔“

”رائے جمشید کی شادی نہیں ہوئی تھی۔“

”ہوئی تھی رائے نواز کا بہنوئی تھا۔ وٹہ سٹہ تھا۔“

جمشید کی بہن رائے عمو کے گھر تھی اور ان کی بہن جمشید کے ساتھ بیابانی گئی پر وہ نہانی اپنے بچے کے ساتھ مر گئی۔ پتہ تھا پر کون جانے اب رہا یا نہیں۔“

”ہو سکتا ہے وہ زندہ ہو۔“ زین سے خاموش رہنا ممکن نہ رہا۔ ”ہو سکتا ہے وہ کبھی واپس آئے۔“ وہ بوڑھا ہلکی سی ہنسی ہنس دیا۔

”ہو سکتا ہے۔“ پر یہاں اگر وہ کیا کرے گا۔ اس گاؤں میں اب اس کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ کوئی اسے قبول نہیں کرے گا۔“

”اس کے باوجود وہ آئے گا۔ یہ بتائے کہ اس کا باپ بے قصور تھا۔“

بوڑھے نے بہت غور سے اس کا چہرہ دیکھنے کے بعد اس سے بے اختیار پوچھا تھا۔ ”تم کون ہو.....؟“

زین نے سر خنبدل لیا اور بے حد خاموشی سے شام کے اندھیرے میں درختوں کی اوٹ میں غائب ہو گیا۔



وہی گھر تھا وہی درو دیوار وہی لان اور وہی کرسی مگر وہ کرسی خالی تھی۔

”پاپا مجھے آخری بار یہیں ملے تھے۔“

رضوان نے گردن موڑ کر اس کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا پھر آہستگی سے اس کا کندھا تھپتھا کر بولا۔

”اندھ چلو.....“

مگر وہ سست روی سے چلتی وہاں تک آئی۔ سامنے والی کرسی پر بیٹھ کر یوں دیکھنے لگی جیسے پاپا وہاں موجود اس سے بات کر رہے ہوں۔

”مجھے صرف اس بات کا افسوس ہے کہ تم لوگوں نے مجھ پر اعتبار نہیں کیا۔“

اس نے پاپا کے لہجے میں اتنی افسردگی کبھی محسوس نہیں کی تھی۔

”تمہاری ماں نے مجھے کبھی سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔“

انہوں نے اس سے قبل کبھی شکوہ بھی نہیں کیا تھا۔ پاپا اور ماما کا پیل پر فیکٹ پیل سمجھا جاتا تھا۔

”پھر اتنی بدگمانیاں اپنے ساتھ کیوں لے گئے پاپا.....“ ایک سسکی ٹوٹ کر لبوں پر بکھری۔

”واپس آؤ گی تو ہم دونوں ڈھیر ساری باتیں کریں گے۔“ ان کے ہاتھ کا لمس اس نے پوری طرح محسوس کیا۔ وہ اس کا سر تھپتھا رہے تھے اور اس سے قبل انہوں نے کبھی ایسا نہیں کیا تھا۔

”کون سی باتیں تھیں پاپا، جو آپ مجھ سے کرنا چاہتے تھے۔“

وہ پھر سے رو پڑی۔ رضوان مضطرب سا ہو کر اس کے پاس آیا۔ ”نصیر کرو زارا.....“

”یقین کیوں نہیں آتا رضوان! پاپا اب ہم میں نہیں ہیں۔“

”یقین تو واقعی نہیں آتا زارا! مگر حادثے اچانک ہی ہوتے ہیں۔ اور ہم تقدیر سے لڑ نہیں سکتے۔“ وہ افسردگی سے کہہ رہا تھا پھر ایک طویل سانس لے کر بولا۔

”چلو اٹھو جو چیزیں لیتی ہیں لے لو۔ باقی سامان بعد میں آجائے گا۔“

زارا نے سر اٹھا کر گھر کے درو دیوار کو دیکھا۔ یہ گھر پاپا نے بہت چاہت سے بنوایا تھا اور اب اسے بند ہو جانا تھا کہ وہ اکیلی یہاں نہیں رہ سکتی تھی۔ ماما کو اپنی عدت گاؤں میں پوری کرنی تھی کہ وہیں ان کا سسرال بھی تھا اور میکہ، بھی۔ زارا کو رائے باؤس شغف ہوتا تھا۔ شیراز بھائی دودن کے بعد پاکستان آئے تھے کیونکہ وہ نیویارک سے باہر کسی کام کے سلسلے میں گئے تھے۔ زارا اور ماما چاہتی تھیں کہ اب وہ بیوی اور بچے کے ساتھ واپس آجائیں کہ یہ گھر اسی صورت میں آباد ہو سکا تھا مگر انہیں واپسی کی جلدی تھی۔ وہ تو شاید باقاعدہ



زارا کی رخصتی ہی کروا دیتے مگر ان حالات میں ممکن نہیں تھا۔ آئمہ اور زارا شیراز کی اس بے حسی پر بھی سی گئی تھیں۔ یوں لگتا تھا ان کا سب کچھ اب امریکہ میں ہے۔ ان لوگوں کے ساتھ وہ شخص رشتے داری نبھانے آئے ہیں۔ ان سے زیادہ اپنائیت تو رضوان اور سلیمان کے رویوں میں تھی۔ ان دس دنوں میں رضوان نے اپنا ہر کام چھوڑا ہوا تھا۔ اس کا پورا وقت آئمہ اور زارا کی دل جوئی میں گزر جاتا تھا۔

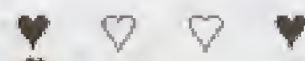
اس نے اپنی ضروری چیزیں اور کتابیں بیگ میں رکھیں۔ ملازمہ نے دوسرے سوٹ کیس میں اس کے کپڑے وغیرہ ڈال دیے۔ رضوان بھی اس کی مدد کرتا رہا۔

”سنو! پیلا اس دن کہاں گئے تھے۔“ اس نے پیلا کے بیڈروم کے بند دروازے کو دیکھا۔

”کچھ بھی نہیں بتایا تھا۔ آپ کے جانے کے بعد گاڑی لے کر نکل گئے تھے۔“ ملازمہ افسردگی سے بتانے لگی تو وہ بیڈروم کی طرف بڑھی۔ مگر رضوان نے آگے بڑھ کر راستہ روک لیا۔

”خالی کمرے کو دیکھ کر کیا کرو گی زارا! آؤ چلتے ہیں۔“

وہ بے بس سی ہو کر پلٹی۔ ملازمہ کو ضروری ہدایات دیں اور ڈیڈبانی آنکھوں سے گھر پر الوداعی نگاہ ڈال کر اس کے ساتھ چلی آئی۔



بتول کی ماں اور بہن کوثر آئی تھیں۔ ایک گھنٹے سے بند کمرے میں نجانے کیا صلاح مشورے ہو رہے تھے۔ نین تارہ چائے دینے گئی تو تینوں ایک دم چپ ہو گئی تھیں۔ بتول کی ماں نے بے حد ناگواری سے اسے دیکھا تھا۔ کوثر پلنگ پر بیٹھی پاؤں جھلا رہی تھی۔ لبوں پر چمکتی ہوئی مسکان تھی۔ نین تارہ چائے رکھ کر تیزی سے باہر نکل گئی۔

”ہائے! کیا یہ تو بتا دو۔ دیکھنے میں کیسا ہے؟“ کوثر اشتیاق سے بتول کے کندھے پر جھول گئی۔

”اچھا ہے بہت اچھا ہے، امی بھی ٹھیک ٹھاک

ہے۔ سیدھا سادا نوجوان، گھر میں صرف ماں باپ ہیں۔ وہ بھی چلے جائیں گے۔ عیش کرے گی کوثر۔“

”بس کسی طرح بات بن جائے۔“ اس کی ماں بھی راضی تھی۔

”بات بن جائے گی، میری تو مٹھی میں ہے۔ پہلے اس کو دیکھنے آتا تھا۔ اب مجھ سے ملنے آتا ہے، باجی کہتا ہے۔ میں بھی اکثر کچھ نہ کچھ پکا کر اس کے کلینک بھجوا دیتی ہوں۔“ بتول نے اپنی کارگزاری سنائی۔

”آئے گا کب؟ ایک نظر میں بھی دیکھ لیتی۔“

بتول کی ماں نے پوچھا۔

”دوسرے تیسرے دن چکر لگا لیتا ہے۔ آئے گا دو تین دن تو تم یہیں ہو۔“ بتول نے کہا تو اس کی ماں اچھا کہہ کر نجانے کیا سوچنے لگی۔ کوثر بتول کی طرف جھکی۔

”یہ تارہ کے عشق کا کیا بنا؟“

اماں کے دو ہنر اس کے کندھے پر پڑے۔ ”تجھے بہت چسکا ہے ایسی باتوں کا۔“

”لو اماں! میں نے تو یونہی پوچھ لیا تھا۔“ وہ کندھا سہلاتے ہوئے بڑبڑاتی پھر اٹھ کر باہر نکل آئی۔

نین تارہ چارپائی پر بیٹھی چاول چن رہی تھی۔ چولہے پر گوشت پہلے ہی چڑھا آئی تھی۔ ایڑی کا زخم مندمل ہو گیا تھا، بخار بھی اتر گیا۔ وہ سارا دن گونگی بہری بنی گھر کے کاموں میں خود کو الجھائے رکھتی۔ کون آتا ہے کون جاتا ہے، لوگ کیا کہتے ہیں اسے کن نظروں سے دیکھتے ہیں۔ اسے گویا کسی سے کوئی سروکار نہ رہا تھا۔ بس ایک رپوٹ کی طرح یہاں سے وہاں کام کرتی رہتی۔ اجمل آتا تھا۔ اس کی نگاہوں میں خلوص اور لہجے میں نرمی و ہمدردی ہوتی۔ اس کا حال پوچھتا۔ وہ نظریں جھکا کر وہاں سے بھاگنے کی کوشش کرتی۔ جواب نہ دیتی۔ اسے اجمل کے ہمدردانہ رویے سے خوف آتا تھا۔ وہ ظہور کے سامنے حال پوچھتا اس کا پورا وجود کانپ اٹھتا۔

”کیا پکا رہی ہو؟“ کوثر دھپ سے اس کے قریب بیٹھی۔



”چاول اور مرغی کا سالن۔“ نین تارہ نے آہستگی سے جواب دیا۔ ساتھ ہی سر اٹھا کر چولہے کی طرف دیکھا کہ کہیں آگ تو نہیں بجھ گئی۔ کوثر کچھ لمحے ادھر ادھر دیکھتی رہی پھر اسے کہنی مار کر پوچھنے لگی۔

”سن وہ کیسا تھا؟“ نین تارہ نے سر اٹھا کر تھیرے اسے دیکھا۔ کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں پوچھنے لگی۔ ”کون؟“

”اب بھولی مت بنو۔ وہی جس سے ملنے جاتی تھیں۔“ اس کی آنکھوں میں مجھد خیر کی اوٹ سے دکھ کی لہر سی ابھری اور وہ سر جھکا کر خاموشی سے چاول چننے لگی۔

”اچھا! یہ تو بتا۔ وہ سچ سچ تجھ سے پیار کرتا تھا؟“ کوثر کے لہجے میں اشتیاق ہی اشتیاق تھا۔ نین تارہ کو لگا وہ کنکر زمین پر پھینکنے کے بجائے آنکھ میں ڈال بیٹھی ہے۔ اس نے دونوں آنکھیں بے دردی سے مسل ڈالیں۔

”بھی کوئی تحفہ دیا اس نے تمہیں۔ سنا ہے پیسے والا ہے۔“

نین تارہ نے کان بند کر لیے۔ ”اچھا ٹھیک ہے مت بتا پر اس نے کوئی سندسہ تو ضرور بھجوایا ہو گا۔ کوئی کیوٹر دیوار پر اترا کر نہیں۔“ وہ اسے کندھا مار کر خود ہی ہنس دی پھر جلدی سے بولی۔ ”اللہ کی قسم باجی سے نہیں کہوں گی۔ وہ کیا جانے پیار کیا ہوتا ہے؟ تو نے چوڑیاں فلم دیکھی ہے اس میں۔۔۔۔۔“

کوثر کی محبت کے بارے میں ساری معلومات پنجابی فلموں تک محدود تھیں۔ نین تارہ نے سر اٹھا کر سنجیدہ نظروں سے کوثر کو دیکھا۔

”کوثر! اگر میں کہوں یہ سب جھوٹ ہے۔“ ”کو! جب پیار کیا تو ڈرتا کیا۔“ وہ منہ بنا کر بولی جیسے نین تارہ کا کرنا اچھا نہیں لگا۔ نین تارہ خاموشی سے چاولوں کا برتن اٹھا کر ٹکے کے پاس چلی آئی۔ اس کے پاس نہ وہ زبان تھی نہ لفظ جس پر لوگ اعتبار کرتے وہ کچھ بھی کہتی کوثر اسے جھوٹ ہی سمجھتی۔

”توبہ ہے کتنے خڑے ہیں اس کے۔“ کوثر زیر لب بڑبڑاتی چولہے کے پاس آگئی۔ ڈھکن اٹھا کر پیچ بھلانے ہوئے اس نے کھینچی نکال لی۔ نین تارہ چاول بھگو کر آئی تو وہ پھوٹکیں مار مار کر کھینچی ٹھنڈی کرتے ہوئے کھا رہی تھی۔ اس سے فارغ ہوتے ہی اسے پھر سے کچھ خیال آیا۔

”سن تارہ! وہ ڈاکٹر جو تیرا علاج کرنے آتا ہے کیا ہے وہ۔۔۔؟“

”پتا نہیں۔۔۔۔۔“ نین تارہ نے لکڑیاں کھینچ کر آگ بجھائی۔

”تو تم نے کبھی دیکھا نہیں۔۔۔“ وہ چمک کر پوچھنے لگی۔

”نہیں۔۔۔۔۔“ کوثر نے بے یقینی سے اسے دیکھا پھر متفر انداز میں بڑبڑاتے ہوئے اٹھ گئی۔

”توبہ ہے لوگ بھی کتنے پارسا بنے ہیں۔“ نین تارہ کا رنگ زرد ہو گیا۔ سارا دھواں گویا آنکھوں میں گھس آیا تھا۔

تب ہی دروازے پر دستک ہوئی۔

”بھائی منظور ہو گا۔“ کوثر درمیان سے پلٹی اور بنا بوجھ دروازہ کھول دیا مگر سامنے کھڑے نوجوان کو دیکھ کر جھجک کر دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔ اجمل خود بھی اجنبی صورت دیکھ کر ڈر کر سا گیا۔

”باجی بتول ہیں۔“

”جی نہیں۔“

”ان سے کہیں ڈاکٹر اجمل آیا ہے۔“ اس نے تعارف کروایا تو کوثر بوکھلا کر ایک طرف ہوئی۔

”اندر آجائیں جی! میں ان کی بہن ہوں۔“ ساتھ ہی اپنا تعارف کروایا۔

”اچھا! خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔“ اندر آکر رسمی جملہ رسمی انداز میں کہتے ہوئے اجمل کی نگاہوں نے چولہے تک سفر کیا اور مسکرا دیں۔ کوثر شرما سی گئی۔

”میں باجی کو بتاتی ہوں۔۔۔“ وہ اندر گھس گئی۔

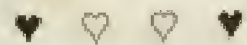
سارے خوبصورت جذبے لہجے میں تھلکنے لگتے تھے۔ نین تارہ نے چولہے میں جلتی دوسری لکڑی بھی باہر کھینچی اور پانی کا چھینٹا مار دیا۔ دھواں کھینچ کر غولہ نیچے سے اوپر گیا اور اس کے چرے کے تاثرات دھندلے ہو گئے۔

”میری بات کا جواب کیوں نہیں دیتی ہو؟۔ مجھ سے کس بات کی خفگی؟۔“ اس کے لہجے میں شکوہ سا اتر آیا، نین تارہ کی اتنی بے اعتنائی اور بے رخی اسے دکھ دیتی تھی۔

”بڑی لمبی عمر ہے اجمل تمہاری، ابھی میں اماں سے تمہارا ہی ذکر کر رہی تھی۔“ بتول تیز تیز بولتی ہوئی باہر نکلی۔

”آپ کی امی آئی ہیں۔۔۔؟“ وہ قصداً مسکرایا۔

”ہاں اور بہن بھی،“ تو اندران سے ملواتی ہوں۔“ اجمل نے ایک شکوہ بھری نگاہ خاموشی سے نیاز سی نین تارہ پر ڈالی اور سر جھٹک کر اندر کی طرف بڑھ گیا۔



رائے باؤس میں اس کا کمرہ بہت خوبصورتی سے سیٹ کیا گیا تھا مگر اسے اجنبیت کا احساس ہوتا۔ رات بھر وہ بے چین سی رہتی۔ غلطی اور انعم آئی تھیں، تعزیت کے لیے۔ پونیورسٹی آنے کی تاکید کر گئی تھیں۔ مگر اس کا دل نہیں چاہتا تھا۔ ہر روز رات کو ماما کو فون کرتی اور ان کی باتیں بس رائے عمیر کے گرد گھومتی تھیں۔ بھابھی کی باتیں، رضوان کی محبت اور سعد کی شرارتیں، کچھ بھی اچھی نہیں لگتیں۔ شیراز بھائی کی نجانے کون سی مصروفیات تھیں جو ختم ہونے میں نہ آتیں۔ اسے لگتا ایک پیپا کے جانے سے سب کچھ بدل گیا۔

اس دن ناشتے پر جب سلیمان اور شیراز بھائی بھی گاؤں سے آئے تھے تو انہوں نے اچانک بتایا۔

”سنڈے کو میری فلائٹ ہے۔“ سب ٹھٹک کر انہیں دیکھنے لگے جبکہ سلیمان بھائی نے بے حد اطمینان سے سر ہلادیا تھا۔

”اچھی بات ہے۔۔۔۔۔“

مگر زارا کے لیے یہ اچھی بات نہیں تھی۔ تب ہی گویا تصدیق کے لیے پوچھنے لگی۔

”آپ واپس جا رہے ہیں بھائی۔۔۔۔۔؟“

”ہاں! واپس تو جانا ہی تھا۔“

”لیکن یہاں۔۔۔“ وہ کچھ حیرت سے رضوان اور بھابھی کو دیکھنے لگی۔ رضوان اس کی مشکل سمجھ گیا تھا۔

”ہمارا خیال تھا شیراز! تم اب واپس آنے کی بات کر دو گے۔ یہاں تمہارا گھر ہے اور انکل کا اتنا بڑا بزنس، فیکٹری کون دیکھے گا۔ پھر زارا اور آئی کو اس وقت تمہاری ضرورت ہے۔“

وہ زارا کی زبان بن گیا تھا۔ شیراز نے اطمینان سے نیپکن سے ہاتھ صاف کیے اور بولا۔

”میرا فی الحال یہاں اتنا ممکن نہیں ہے رضوان! میرا کمپنی کے ساتھ تین سال کا کنٹریکٹ ہے پھر ابجد کی بھی وہاں جاب ہے۔ پھر تم لوگ یہاں ہونا ماما اور زارا کے پاس۔ جہاں تک فیکٹری کی بات ہے تو تم اور زارا دیکھ لیتا۔“

”میں نے ابھی اپنا بزنس اسٹارٹ کیا ہے۔ میرے پاس بالکل وقت نہیں۔ اور زارا۔۔۔۔۔“ رضوان نے ایک نظر زارا پر ڈالی جو تھیرے شیراز کو دیکھ رہی تھی۔ ”بزنس زارا کی فیلڈ نہیں ہے۔“

”تم خواہ مخواہ بحث کر رہے ہو۔“ سلیمان نے رضوان کو ٹوکا پھر شیراز کی طرف متوجہ ہوئے۔ ”تم بے فکر ہو کر جاؤ۔ یہاں سب معاملات ٹھیک ٹھاک چلتے رہیں گے۔“

زارا احتجاجاً اٹھ کر باہر آگئی۔ شیراز نے سلیمان کی طرف دیکھا۔

”شاک میں ہے، ٹھیک ہو جائے گی۔“ سلیمان بھائی اطمینان سے بولے پھر مسکرا کر رضوان کو دیکھا۔

”رضوان ہے نا! سنبھال لے گا۔۔۔۔۔“

رضوان نے سنجیدہ نظروں سے ان دونوں کو دیکھا۔ ”زارا کو اس وقت میری نہیں شیراز کی ضرورت ہے۔“



”آئمہ آنٹی کی عدت ختم ہو جائے ہم باقاعدہ رخصتی کر لیں گے۔ چند ماہ کی بات ہے۔ زارا کے ایگزامز کا چکر بھی ختم ہو جائے گا۔“ سلیمان نے گویا رضوان کی بات کو کوئی اہمیت نہیں دی۔

”تم اور چائے لو گے۔“ بھابھی دانستہ ان کی باتوں میں دخل نہیں دیتی تھیں۔ اب بھی خاموشی سے ان کی گفتگو سنتی رہی تھیں۔ جب شیراز اور سلیمان اپنی باتوں میں ملن ہو گئے تو انہوں نے رضوان کی توجہ بٹانے کو پوچھا تھا۔

”نہیں، میں ناشتہ کر چکا ہوں۔“ وہ کرسی کھسکا کر کھڑا ہوا تو سلیمان نے چونک کر اسے دیکھا اور رمان سے کہنے لگا۔

”زارا کا خیال رکھو رضوان! وہ بالکل مر چھائی ہے۔ ہو سکے تو شام میں آؤنگ کے لیے لے جانا۔“ رضوان نے ٹیبل سے چائی اور اپنا بریف کیس اٹھایا اور قدرے سنجیدگی سے گویا ہوا۔

”میں اپنی ذمہ داری اچھی طرح سمجھتا ہوں۔“ سلیمان ہنس آئے دیکھ کر رہ گئے۔ رضوان باہر آیا تو وہ لان میں ادھر سے ادھر چکرار رہی تھی۔ رضوان رک گیا۔ اپنے خیالوں میں گم وہ پلٹی مگر فوراً ”رکنا رہا تھا۔“ رضوان ہنس دیا جبکہ وہ مسکرا بھی نہ سکی۔ کچھ لمحے اس کی شرٹ کے بٹن کو گھورتی رہی پھر نظروں کا زاویہ بدل کر بولی۔

”تم نے دیکھا رضوان! شیراز بھائی کتنے بدل گئے ہیں۔ بالکل کوئی فکر نہیں ہے انہیں۔ پیانے اتنی محنت کی تھی مگر انہیں اپنی بیوی کی جاب اور اپنے کنٹرول کی فکر ہے۔ کس قدر عجیب رویہ ہے انہیں تو یہ بھی فکر نہیں کہ ماما کو ان کی کتنی ضرورت ہے۔ وہ کچھ دن اور نہیں رک سکتے تھے۔“

”زارا! ہمیں شیراز کو بھی تو اندازہ لینا پڑے گا۔ وہ تم لوگوں سے بے حد محبت کرتا ہے مگر حقیقت پسند بن کر سوچو۔ اس کے بھی کچھ راز ہیں جو ہم سب لوگ نہیں جانتے۔“

”پاپا کی ساری محنت برباد ہو جائے گی۔“ وہ سر جھکا کر بولی۔

کر زیر لب ہنسنے لگی۔

”زارا!۔۔۔“ رضوان نے اس کا چہرہ اوپر کیا۔ ”مجھ پر اعتبار ہے نا۔۔۔“ وہ کچھ لمحے اسے دیکھتی رہی۔ پھر بے اختیار بولی۔

”خود سے بھی زیادہ۔“

”بس پھر کوئی ٹینشن مت پو، سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں ہوں نا۔“ اس کے تسلی آمیز محبت بھرے لہجے پر وہ پرسکون سی ہو گئی۔

”میں آفس جا رہا ہوں۔ تھوڑی دیر میں آجاؤں گا۔ کچھ منگوانا ہو تو بتاؤ۔“

”رضوان! اتنا وقت ضائع مت کریں۔“

”میں ہر کسی کے لیے ایسا نہیں کرتا۔“ وہ اس کی طرف ذرا سا جھک کر گویا ہوا پھر خدا حافظ کہہ کر چلا گیا۔

”کب سے کھڑی ہوں کہ ہیرو صاحب کے ڈائلاگ ختم ہوں۔“ بھابھی مسکراتی ہوئی سامنے آئیں زارا جھینپ سی گئی۔

”سلیمان اور شیراز گاؤں جا رہے ہیں آنٹی کے لیے کچھ بھجوانا تو نہیں؟“

”ہاں میں نے بیگ تیار کر دیا تھا۔ میرے کمرے میں ہے۔۔۔۔۔“ پھر کچھ سوچتے ہوئے کہنے لگی۔

”بھابھی! میں بھی ساتھ نہ چلی جاؤں۔۔۔۔۔“



”تم گاؤں گئے اور زارا سے نہیں ملے۔ تعزیت بھی نہیں کی۔۔۔۔۔“ افتخار نے بے حد حیرت سے اسے دیکھا۔

”بہت دیر تک حویلی کے سامنے کھڑا رہا مگر اندر نہیں جاسکا۔“ زین ناخن سے میز پر لکیریں کھینچ رہا تھا۔

”ڈر گئے تھے۔“ افتخار نے گہری نظروں سے اس کے چہرے کا جائزہ لیا۔ اس نے انگلیاں اپنے بالوں میں الجھا کر نفی میں سر ہلا دیا۔ افتخار منتظر رہا مگر اس نے کوئی اور وجہ بھی نہیں بتائی۔ وہ اس کے جھکے ہوئے چہرے کے تاثرات سمجھنے میں ناکام رہا تو بات بدل دی۔

”تم نے اپنا گاؤں دیکھا۔“

”اپنا گاؤں۔۔۔۔۔“ زین نے زیر لب دہرایا پھر سراور کرتے ہوئے طویل سانس بھری۔ ”وہ گاؤں میرا تھا مگر میں اس کے لیے اور وہ میرے لیے بالکل اجنبی تھا اور اس گاؤں کی فضا، اس کے لوگ، اس کے کھیت کھلیاں سب مجھے اجنبی نظروں سے گھور رہے تھے۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ میں ان ہی کا ایک گمشدہ حصہ ہوں۔ سب مجھ سے پوچھتے تھے میں کون ہوں۔؟“

اس نے سر کرسی کی پشت سے نکایا۔ نگاہوں کی زد میں چھت پر بنا مکڑی کا جالا تھا اور لہجے میں دل گرفتگی۔

”میں جواب کیا دیتا۔ میری شناخت تو وہیں کسی دیوار کے سائے درخت کی کھو، کھیت کے کنارے یا نر کے پانیوں میں گم ہوئی تھی۔ مگر لوگ۔۔۔۔۔ یہ لوگ صرف سنی سنائی پر یقین کیوں کرتے ہیں۔؟“

افتخار خاموش ہی رہا۔ اس کے سوال کا جواب نہیں دیا۔ ”بدگمانی تھی ان کے لبوں میں اور تشویش ان کے چہروں پر۔ میں جانتا ہوں۔ بابا ہمیشہ گاؤں اور زمینوں سے دور رہے۔ انہیں نئی دنیا دریافت کرنے کا شوق تھا مگر کوئی تو کہتا۔۔۔۔۔“

وہ سیدھا ہو بیٹھا۔ ”میں اتنے بہت سے لوگوں سے

ملا مگر کسی ایک نے بھی نہیں کہا کہ ضروری نہیں قتل جمید حیات نے کیا ہو۔ حقیقت کچھ اور بھی ہو سکتی ہے۔“

”ایک بات کہوں تم سے زین۔۔۔۔۔“ افتخار کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ زین نے سوالیہ انداز سے اسے دیکھا۔

”ضروری تو نہیں کہ تمہارے بابا نے تم سے سچ ہی بولا ہو۔“

”کیا مطلب۔۔۔۔۔؟“

”ہو سکتا ہے وہ تمہارے سامنے اس بات کا اعتراف نہ کر سکتے ہوں مگر اشتعال میں آگیا۔“ زین کے چہرے کے تاثرات دیکھتے ہوئے اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

”میں نے ایک دفعہ ایسی ہی بات بابا سے کہی تھی۔“ بہت دیر خاموش رہنے کے بعد زین آہستگی سے گویا ہوا۔

”تو۔۔۔۔۔“

”وہ ایک دم خاموش ہو گئے تھے اور افتخار بھائی! سچ رفتی طور پر خاموش ہو سکتا ہے مگر جھوٹ کبھی خاموش نہیں رہتا۔ وہ ہمیشہ چیختا ہے شور کرتا ہے اور خود کو سچ ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔“

”ہوں۔۔۔۔۔“ افتخار کچھ سوچنے لگا۔ ”تمہارے بابا نے تمہیں کبھی اس بارے میں کچھ تو بتایا ہو گا۔“

”وہ تو یہ چیخ رہے ہیں کہ لے کلوز کر چکے تھے۔ میں لاہور آنے کی ضد نہ کرتا، یونیورسٹی میں مجھے زارا نہ ملتی تو شاید ہم ایک مختلف زندگی گزار رہے ہوتے۔ بہر حال میں پھر وہاں جاؤں گا۔ کبھی نہ کبھی کچھ تو سرا ہاتھ آئے گا ہی۔“

”ہاں ایگزام دے لو۔ تب تک زارا بھی وہاں چلی جائے گی۔“

”زارا کیا کرے گی۔“ زین نے حیرت سے پوچھا

افتخار مسکرا دیا۔

”یہ جاگیرداروں کی حویلیاں بہت اونچی ہوتی ہیں۔ اندر کے راز اندر ہی دفن ہو جاتے ہیں۔ زارا تمہاری



اتنی سی مدد تو کرے گی۔  
 ”ہاں یقیناً۔۔۔“ وہ مسکرا دیا۔ ”نہ صرف وہ بلکہ۔۔۔“  
 ”اب تم لوگ باتیں ہی کرتے رہو گے۔ کھنڈ بھر پہلے بارط کو بھجوا دیا تھا کہ دسترخوان بچھ گیا ہے۔“ فاطمہ نے کہا۔  
 ”آپا جمنجلائی ہوئی اندر آئی تھیں۔“  
 ”نکا کیا ہے۔۔۔؟“ افتخار نے پوچھا۔  
 ”شعلہ۔۔۔“

”شعلہ۔۔۔ یہ کیا بلا ہے۔۔۔؟“ زین نے بے حد حیرت سے پوچھا۔  
 ”آج شعلہ کھلا رہی ہیں، کل کو انگارے چبوائیں گی۔“ افتخار ہنس دیا۔ فاطمہ آپا نے اسے گھور کر دیکھا۔

”تمہیں تو اچھی طرح پتا چلے گا جب۔۔۔۔۔“  
 ”جب۔۔۔“ افتخار کا لہجہ متبسم و شریر ہوا تو وہ جینپ کر زین کی طرف متوجہ ہوئیں۔  
 ”بہت مزے کی بڑبڑ ہے۔ جلدی آجاؤ۔ ٹھنڈی ہو گئی تو مڑا نہیں دے گی۔“ وہ کہہ کر ہر نکل گئیں۔  
 ”چل یار! ان کا شعلہ بھی چکھ لیں۔“ افتخار نے اس کے کندھے پر دھپ لگائی۔

”میرا خیال ہے فریچر والے کو ایک کندھے کا بھی آرڈر دے دیں۔“ زین نے کندھا سلاتے ہوئے کہا۔

”یار! کچھ کھایا کرو تھوڑی جان شان بناؤ۔ تم تو ایک گلاس لسی بھی نہیں پی سکتے پیراڈال کر۔“  
 ”لسی سے مجھے یاد آیا۔ آپ تو کہتے تھے عظمیٰ لوگ آپ کے رشتے دار ہیں۔“ زین نے ایک دم پوچھا۔  
 ”لسی اور عظمیٰ میں کیا مماثلت ہے۔“ افتخار کے لمبے میں لطیف سی حیرت تھی۔

”میرا سوال حیرت نہیں ہے۔“ افتخار نے یار اور پرے کی رشتہ داری ہے۔“  
 ”پھر پتا چلا۔۔۔“  
 ”مجھے باقاعدہ ان کا تعارف کروانا پڑا۔“  
 ”زیادہ آنا جانا نہیں ہے۔“ وہ اب بھی گریزاں

تھا۔  
 ”آپ نہیں بتانا چاہتے تو مت بتائیں ورنہ وہاں ہونے والی گفتگو سے بہت کچھ سمجھ میں آلیا تھا۔ میں تو حیران ہوں آپ نے کبھی ذکر ہی نہیں کیا۔۔۔“ حالانکہ اسے یہ سوال افتخار جیسے بندے سے نہیں کرنا چاہیے تھا۔

”تم بھی مت کرنا۔ میں عظمیٰ کی عزت پہلے کرتا ہوں۔“ افتخار کے لہجے میں سنجیدگی در آئی۔  
 ”میں تو نہیں کروں گا مگر بے بس طرح عظمیٰ پر فدا ہو رہی تھیں۔ مجھے یقین ہے وہ جلد ہی یہ ذکر ضرور کریں گی۔“  
 ”ان کی بات اور ہے او چلیں۔ ورنہ پتا چھا ہوں گی۔“

♥ ♥ ♥ ♥  
 ”تمہیں سب اب کہہ رہے ہو زین۔۔۔۔۔“  
 زارا نے ناسف دکھ سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔  
 ”وہ رخ بدل کر درخت کی ٹنٹی توڑنے لگا۔“  
 ”اور میں نے سوچا تھا کہ تم۔۔۔۔۔“  
 ”میں آیا تھا۔۔۔۔۔“ اس نے آہستگی سے بات قطع کی۔

”کہاں۔۔۔؟“  
 ”گاؤں۔۔۔۔۔“

”تم گاؤں آئے تھے۔“ زارا نے حیرت سے پوچھا۔  
 ”پھر اس کے سامنے آئی۔“ کب۔۔۔؟“  
 ”میں انکل کے جنازے میں شریک ہوا تھا۔“  
 ”تم آئے اور مماتے نہیں ملے۔۔۔۔۔“  
 ”کس حیثیت سے ملتا۔“ اس نے انسا سوال کیا پھر ہاتھ میں پکڑی ٹنٹی چھوڑ دی۔ وہ ایک دم اوپر کی طرف لرزے لگی تو وہ اسے دیکھتے ہوئے آہستگی سے گویا ہوا۔

”میں تو بل بل آپ کے اور پچھو کے ساتھ تھا۔ میں نے آپ کی آواز سنی تھی، پچھو کے آنسو پونچے تھے، آپ لوگوں کے ساتھ مل کر رویا تھا مگر ان بہت سے لوگوں میں بیٹھ کر اجنبی اور رسمی انداز میں یہ کہنا کہ

مجھے واقعی بہت افسوس اور دکھ ہے۔ خدا مرحوم کو جنت میں جگہ دے میرے لیے ممکن نہیں تھا۔ میرا بھی تو آپ سے وہی رشتہ ہے جو ان لوگوں کا۔“  
 ”ہاں۔!“ زارا اس کی کیفیت سمجھ گئی تھی تب ہی خاموش ہو گئی۔

”پچھو کیسی ہیں۔۔۔۔۔؟“ زین نے آہستگی سے پوچھا۔

”بس ٹھیک ہیں۔۔۔۔۔“  
 ”واپس کب آئیں گی۔۔۔۔۔؟“  
 ”عدت گزار کر۔۔۔۔۔“ زارا نے بتایا تو وہ بے اختیار بولا۔

”اتنے دن۔ اتنے دن میں ان سے مل نہیں سکوں گا۔۔۔۔۔“ اسے ایک دم خالی پن کا احساس ہوا۔ پچھو سے مل کر ان کی محبتیں پاکر وہ سرشار ہو جاتا تھا اور کہتا تھا۔

”جب سے میں پچھو سے ملا ہوں مجھے کبھی لگا ہی نہیں کہ میں نے اپنی ماں کو نہیں دیکھا۔“  
 ”پتا ہے زین! اس سے قبل میں نے کبھی تمہارے اس دکھ کو محسوس نہیں کیا جو تم نے پایا کو کھو کر اٹھایا۔ ہاں۔ اس کی شدت میں اب محسوس کر سکتی ہوں۔ اتنا خالی پن۔ جیسے سب ختم ہو گیا ہو۔ جیسے کچھ بھی اپنے ٹھکانے پر نہیں۔ پھر پایا نے تو بہت جلدی کی۔“ اس کی آنکھیں ڈبڈبائیں گئیں۔

”صبر آجاتا ہے زارا! دکھ بھولتے نہیں مگر ان کے ساتھ جینا آجاتا ہے۔“ زین کو خود اپنے الفاظ پر حیرت سی ہوئی جبکہ زارا خاموشی سے آنسو صاف کرنے لگی۔ وہ بہت دنوں کے بعد یونیورسٹی آئی تھی۔ پروفیسرز، کلاس فیلوز سب نے تعزیت کی تھی پھر زین آگیا۔ اس کے جانے کے بعد وہ دوبارہ انعم اور عظمیٰ کے پاس آگئی۔

”کیا ڈسکس ہو رہا ہے۔“ وہ قصداً مسکراتے ہوئے پوچھنے لگی۔ اپنا دکھ اینا ہی ہوتا ہے۔ لوگ زیادہ دیر آپ کے ساتھ اداس شکلیں بنا کر نہیں بیٹھ سکتے۔“  
 ”یار! فیئر ویل پارٹی ہے، ایول ڈنر بھی آ رہا ہے

اور کوئی ڈھنگ کا سوٹ نہیں ہے۔“ انعم منہ بنا کر بولی۔  
 ”خیر، تم تو ایسا مت کہو۔ ابھی تو اتنے سوٹ آئے ہیں۔“ عظمیٰ نے ٹوکا۔  
 ”لنگا پن کر آجاؤں۔“

”پن سکتی ہو کیونکہ تم پر لوگوں کو کوئی حیرت نہیں ہوگی۔“ عظمیٰ نے عینک ٹھیک کرتے ہوئے کہا پھر زارا سے پوچھنے لگی۔  
 ”تم آؤ گی نا؟۔۔۔۔۔“  
 ”دیکھوں گی۔“

”ہائے نہیں زارا۔۔۔۔۔!“ انعم فوراً چیخا اٹھی۔ ”تم ضرور آؤ گی۔ آخری فنکشن ہے۔ پھر کہاں ہم اس طرح روز مل سکیں گے اور کون جانے ہم میں سے کون کہاں ہو گا آؤ گی نا۔“ وہ اصرار بھرے لہجے میں کہنے لگی۔

”اچھا بھی آجاؤں گی۔“ زارا کو کہنا ہی پڑا۔ ”تم یہ بتاؤ۔ وانیال کا کبھی فون آیا۔۔۔۔۔“

”کہاں یار! انتہائی بور بندہ ہے۔ اللہ خالہ ہر اتوار کو فون کرتی ہیں۔“ وہ منہ بنا کر بولی تو عظمیٰ ہنس دی۔  
 ”اچھا ہے نا! ساس کے ساتھ انڈر اسٹینڈنگ ہو جائے گی اور میرے خیال میں وانیال بور نہیں شریف انسان ہیں۔“

”شریف انسان۔۔۔۔۔“ زارا زبردست مسکرائی۔  
 ”کیا ہوا۔۔۔۔۔؟“ عظمیٰ نے پوچھا۔  
 ”تمہاری امی بھی مجھ سے افتخار کے بارے میں یہی پوچھ رہی تھیں کہ وہ شریف تو ہے۔“  
 ”کب۔۔۔۔۔؟“ عظمیٰ بری طرح چوگی۔  
 ”انعم کی منگنی کے دن۔۔۔۔۔“

”یہی سب کچھ انہوں نے مجھ سے بھی پوچھا ہے۔ لگتا تھا انہیں مجھ پر اعتبار نہیں آیا۔ دیسے یہ افتخار بہت چالاک اور زیرک ہے پتا ہے زارا۔۔۔۔۔“  
 ”عظمیٰ کو پتا تھا انعم اب زارا کو کیا قصہ سنانے والی ہے۔ وہ انھیں لگی تو انعم نے تھنج کر بٹھالیا۔  
 ”مت اتنا بھاگو۔ تمہیں ہارنا ہی ہے عظمیٰ بی بی! وہ



شخص تمہیں جیت لے گا۔ اسی طرح تمہیں حاصل کرے گا جیسے تم چاہتی ہو۔ مجھے آثار نظر آرہے ہیں۔“

وہ اس کا بازو قابو کیے زاراً کو بے بے کی آمد کا قصہ سنانے لگی۔ اس کا انداز بیباں اتنا شوخ و شیر تھا کہ عظمیٰ کے لبوں پر بھی مدھم سی مسکان جاگ اٹھی۔ ”تم جاؤ گی شادی میں۔۔۔۔۔؟“ زارا نے اعم کے خاموش ہونے پر عظمیٰ سے پوچھا۔ ”نہیں یار! وہ گھبرا کر بولی۔“

”میں تو جاؤں گی اور اس کی امی کو بھی لے کر جاؤں گی۔ آخر ہم نے بھی ان کا گھریا اور رہن سہن دیکھنا ہے۔ یونہی تو عظمیٰ کو دھکا نہیں دے سکتے۔“ ”تم نہیں مگر میں تو دے سکتی ہوں۔“ عظمیٰ نے اسے دھکیل کر اپنا بازو چھڑایا تھا۔ وہ ایک طرف کو لڑھک گئی۔ پھر منہ بنا کر بولی۔

”نیک کا تو زمانہ ہی نہیں ہے۔۔۔۔۔“ ”تم ساری نیکیاں میرے ساتھ مت کیا کرو۔۔۔۔۔“ عظمیٰ دونوں ہاتھ جوڑ کر بولی تھی۔

بھی دن نہیں، کبھی شب نہیں  
بھی لفظ صدم، کبھی لب نہیں  
بھی بات کرنے کا ڈھب نہیں  
بھی تب نہیں، کبھی اب نہیں  
بھی چل رہے ہیں قطار میں  
بھی بے زبانی کی مار میں  
بھی بد نصیبی کی جیت میں  
بھی خوش نصیبی کی ہار میں

آج یونہی اس کی انگلیاں اپنی کتابوں کو چھوتے چھوتے اس ڈانڑی پر رک گئی تھیں۔ اس ڈانڑی کے اور اقباس کی اشعار سالہ زندگی بھر کی تھیں۔ جس کا ہر دن سلکتا ہوا اور ہر رات انگارہ تھی۔ اس کے آخری صفحات خالی تھے اور اس میں اپنی موت نہیں تھی کہ ان پر اپنے آنسوؤں سے بد نصیبی کی داستان

اس کی انگلیوں نے بڑی حسرت سے کتابوں کے وجود کو محسوس کیا۔ ان پر جمی گرد انگلیوں سے لپٹ گئی۔ تارہ نے اپنے دوپٹے سے ساری کتابوں کو ایک ایک کر کے صاف کیا۔ کتابوں کے ٹائٹل جگمگانے لگے اور اس کے دل میں انہیں کھولنے کی خواہش نے پھر سے قدم رکھا۔ مگر اس نے آہستگی سے الماری بند کر دی۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی۔ انہیں کھولنے کی اجازت اسے کبھی نہیں ملے گی۔

”تارہ! او تارہ!“ باہر بتول اسے متواتر آوازیں دے رہی تھی۔ وہ آنکھوں میں اترے غبار کو دل میں اتار کر باہر نکل آئی۔ ”ایک گھنٹے سے آوازیں دے رہی ہوں۔ سری ہو گئی ہے کیا؟“

تارہ نے ان کے سامنے کبھی بولنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

”ہم لوگ جارہے ہیں، ظہور گھر پر ہی ہے۔ ابھی جائے گا تو دروازہ بند کر لیتا اور دودھ والا آئے گا۔ ایک کلو زیادہ دودھ لے لیتا۔ آج اماں کے لیے کھیر بنانی ہے۔“

اس کی ماں اور بہن کئی دنوں سے یونہی ڈیرے، ڈالے بیٹھی تھیں۔ اجمل کو گھیرنے کے منصوبے بنائی رہتیں۔ وہ تینوں چلی گئیں۔ تو وہ صحن کے کونے میں آ بیٹھی۔

”زندگی نے کیا کیا میرے ساتھ۔۔۔؟“ بہت بار سوچی گئی بات کو اس نے پھر بے حد حیرت و بے یقینی سے سوچا تھا۔ زندگی کبھی بھی اس کے لیے سہل نہیں رہی تھی مگر وہ پھر بھی خوش گماں تھی۔ وہ بہت سا پڑھے گی اور یہ تعلیم اسے کسی نہ کسی منزل تک ضرور پہنچا دے گی۔

درخت پر چڑھنے نے شور مچا رکھا تھا۔ ظہور باہر نکلا اسے پوچھنے دیکھ کر رک گیا۔

”تمہیں کچھ چاہیے تارہ؟“ وہ کبھی کبھی یونہی پوچھ لیتا تھا۔ تارہ نے سر اٹھا کر اسے دیکھا پھر گردن جھکا کر نفی میں سر ہلا دیا۔

وہ اب ان لوگوں سے کیا چاہ سکتی تھی۔ ظہور باہر نکل گیا۔ چیزیاں کچھ اور شور کر رہی تھیں۔ تارہ نے اٹھ کر چنگیر سے روٹی کا ٹکڑا اٹھایا پھر دیں آکر بیٹھ گئی۔

”اور اب۔۔۔ اب کیا ہو گا۔۔۔ کیا زندگی اسی طرح گزرے گی؟“ روٹی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کرتے ہوئے وہ سوچ رہی تھی۔ ”یا کوئی میچا آئے گا ان سارے زخموں کا مداوا کرنے۔۔۔“

اس نے ٹکڑے ڈالے، پھر سے دو چیزیاں درخت سے اتریں۔ پھر تیسری۔۔۔ جو تھی۔ پوری گیارہ چیزیاں تھیں۔ آٹکین میں ادھر سے ادھر پھدکتی روٹی چلنے لگیں۔ پھر دیوار سے ایک ٹکڑا کو اتر کر ساری چیزیاں پھر سے اڑیں اور شاخوں میں جا چھپیں۔ کو اسیاہ چونچ اٹھائے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ تارہ نے ایک بڑا ٹکڑا اچھالا۔ کوے نے ذرا سا اچھل کر اسے فضا میں ہی چونچ میں دھپایا اور دیوار پر جا بیٹھا۔ بہت عرصے کے بعد تارہ کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ اتری۔ بہت دیر تک وہ وہیں بیٹھی کوے اور چیزوں کو روٹی ڈالتی رہی۔

تب ہی دروازے پر دستک ہوئی۔ ”دودھ والا آگیا۔“ تارہ نے روٹی کا آخری ٹکڑا کوے کو ڈالا اور دھلی ہوئی پتی اٹھا کر دروازے تک آگئی۔ دروازے کو ذرا سا کھول کر جھانکا پھر اجمل کو دیکھ کر تیزی سے پیچھے ہٹی۔

”بھابھی گھر پر نہیں ہیں۔۔۔۔۔؟“ ”ظہور بھائی۔۔۔۔۔؟“

”نہیں ہیں۔۔۔۔۔“ وہ کہہ کر واپس آگئی۔ اجمل نے کچھ لمحے سوچا پھر دروازہ کھول کر اندر آگیا۔ پتیلی رکھتے ہوئے وہ پتیلی پھر خوف سے دیں جم گئی۔

”کیا ہوا؟“ تم مجھ سے اتنا ڈرتی کیوں ہو۔۔۔۔۔“ وہ نرم لہجے میں پوچھ رہا تھا۔

”تم۔۔۔ تم اندر کیوں آئے؟ بھابھی گھر پر نہیں ہیں۔ اس کا لہجہ کپکپا رہا تھا۔

”مجھے تم سے بات کرنی ہے تارہ۔۔۔۔۔“ ”مجھے نہیں کرنی، جاؤ یہاں سے۔۔۔۔۔“ وہ دبے

دبے لہجے میں چینی۔

”تارہ۔۔۔ میں۔۔۔۔۔“ وہ دو قدم آگے بڑھا۔ تارہ اٹنے قدموں پیچھے ہٹی۔ پھر بھاگ کر کمرے میں گھس کر دروازہ بند کر لیا۔ اجمل ششدر رہ گیا پھر کھلی کھڑکی کی طرف آگیا۔

”نہیں تارہ! ایک بار میری بات تو سنو۔۔۔۔۔“ ”نہیں تارہ نے کھڑکی بھی بند کرنا چاہی۔ مگر اس نے اس کی کلائی دیوچ لی۔

”کیوں کر رہی ہو تم اس طرح۔۔۔؟“ وہ سخت جھنجھلا گیا تھا۔ ”کیا ہوں میں، کوئی غنڈہ، بد معاش، کیا ہر لڑکی کے پیچھے میں یونہی خوار ہوتا ہوں۔ کیوں ڈرتی ہو تم اتنا؟“

”چھوڑو۔۔۔۔۔“ ”نہیں تارہ کو لگا اس کی گرفت کلائی پر نہیں گلے رہے۔ اس کا دم گھٹنے لگا، سانس کہیں سینے میں اٹکنے لگی تھی۔

”مجھے سمجھنے کی کوشش تو کرو۔ کیوں آتا ہوں میں بار بار یہاں، صرف تمہارے لیے۔“ اس کا لہجہ نرم ہو گیا۔ ”میں جانتا ہوں تم ایک جہنم میں زندگی گزار رہی ہو۔ میں تمہیں نکال لے جاؤں گا۔ شادی کروں گا تم سے۔۔۔۔۔“

نہیں تارہ ششدر سی رہ گئی۔ اجمل نے اس کی دم توڑتی مزاحمت کو دیکھا تو آہستگی سے کلائی چھوڑ کر دم قدم پیچھے ہوا۔

”ہاں نہیں تارہ۔ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے امی، ابو سے بھی بات کر لی ہے۔ وہ بہت جلد آئیں گے۔“

نہیں تارہ بے یقینی سے اسے دیکھتی رہی۔ پھر اس نے کھڑکی بند کرنا چاہی۔ اجمل نے کھڑکی پر ہاتھ رکھ دیا۔

”اپنی ذات کی ساری کھڑیاں بھی بند کر دو گی، میں تب بھی تم تک پہنچ جاؤں گا۔“

اس نے آہستگی سے کہا۔ اس کے بے یقین چہرے پر ایک نگاہ ڈالی۔ پلٹا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا چلا گیا جبکہ ”نہیں تارہ جہاں کھڑی تھی۔ وہیں ساکت ہو گئی تھی۔



ا جمل! کسی دن اپنا گھر تو دکھاؤ۔“ بتوں نے اشتیاق سے فرمائش کی۔  
 ”باجی! آپ کا اپنا گھر ہے جس دن مرضی آجائیں۔“  
 ”اس طرح نہیں آؤں گی۔۔۔۔۔“  
 ”تو؟؟؟“

نہی۔ ”کوثر نے جھنجھلاتے ہوئے دیوار سے جھانکا۔  
تب ہی اجمل پر نگاہ گئی۔ تو چہرے کا رنگ اور آنکھوں  
کے انداز بدل گئے۔ تیزی سے میڑھیاں اترتی نیچے  
آئی۔  
”السلام علیکم۔“

مگر منہ سے یہی بولا تھا۔  
 ”اب آپ جیسی عقل مند خاتون اور کہاں ہو سکتی  
 ہیں۔ تھوڑی عقل اس کو بھی دے دیں۔“ اس نے  
 پاس بلکہ سر پر کھڑی کوثر کی طرف اشارہ کیا۔  
 ”لو میں کوئی بے عقل ہوں۔۔۔“ وہ لڑنے لگی۔  
 بتول نے درمیان میں دخل نہیں دیا اور مسکرا کر نین  
 تارہ کو آوازیں دینے لگی۔ وہ آنا نہیں چاہتی تھی مگر  
 اس کی متواتر آوازوں پر آنا پڑا۔ بنا ان پر نگاہ ڈالے  
 سیدھا چوہے کی طرف اُٹھی۔ اجمل مسکرا دیا۔ آنے کا  
 مقصد ہی اب پورا ہوا تھا۔ تب ہی سر پر کھڑی کوثر کو

”کیوں۔۔۔؟“ ظہور چونکا۔  
 ”اپنی کوثر کے لیے۔“ بتول بہت خوش تھی۔  
 ”اچھا۔“ ظہور نچانے کیوں چپ سا ہو گیا۔ سر  
 اٹھا کر رتن دھوتی نین تارہ کو دیکھنے لگا۔  
 ”تم کس سوچ میں ڈوب گئے؟“  
 ”کچھ نہیں۔“ اب کچھ بھی کہنے کا کوئی فائدہ نہیں  
 تھا خاموشی سے روٹی کھانے لگا۔  
 ”تمہیں پسند نہیں اچھل!“ بتول اس کی خاموشی  
 سے خائف سی ہو گئی۔  
 ”نہیں۔ بہت اچھا لڑکا ہے۔ کوثر سکھی رہے  
 گی۔“



کا بیٹا ہے جن پر اس کے قتل کا الزام تھا۔ زارا کی ماں کو اپنے بھائی کی موت کا علم ہوتا ہے تو وہ غم سے بڑھال ہو جاتی ہیں کیونکہ وہ اپنے بھائی کو بے قصور سمجھتی ہیں۔ زارا اور اس کی مہارت سے ملنے لگتی ہیں۔ مگر وہ ساتھ ہی رائے سلیمان سے خوف زدہ ہیں۔ سلیمان ہی نے رائے جویش حیات پر اپنے باپ کے قتل کا الزام لگایا تھا اور ہر حالت میں اس سے بدلہ لینے کا عہد کیا تھا۔ اس کے برعکس رضوان تلخ بھی ہوئی بلکہ ت کا مالک انسان ہے اور ان تمام معاملات سے دور بیرون ملک تعلیم کے سلسلے میں مصروف تھا۔ اس کے لوٹ آنے پر ان کی رخصتی کی تیاریاں شروع ہو جاتی ہیں۔

نہیں تارا ایک مظلوم لڑکی ہے۔ جس کا گارشت صرف ایک ماما مقبول ہے۔ ایک روز زمین تارا کے پیروں کا گچ سے زخم آجاتا ہے تو زمین اس کے پیروں کی مرہم بنی کر دیتا ہے۔ جس پر اس کے سوتیلے بھائی بھابھی اس پر الزام لگا کر اسے زبرد کو ب کرتے ہیں اور زمین کو بھی ڈراتے دھمکاتے ہیں اور بالآخر زمین تارا پر ظلم و ستم کر کے اپنا مقصد یعنی مکان کی منتقلی کے کاغذات بردست خط کروا لیتے ہیں۔ ایک خدا ترس ڈاکٹر اجمل اس کا مفت علاج کر رہا ہے۔

زارا، عظمیٰ اور انعم کلاس فیلو ہیں، انعم کی اپنے خالہ زاد سے نسبت طے پا گئی ہے۔ جب کہ عظمیٰ کو افتخار بے حد پسند کرتا ہے لیکن عظمیٰ اپنی خاندانی پابندیوں کی وجہ سے اس کے التفات کا جواب امتحانی رکھائی سے دیتی ہے۔

## ساتویں قسط

”ماں! ظہور سے کہہ دیا تھا آتے ہوئے لیتا آئے گا۔ او تارہ! یہ کھڑے کو ذرا اچھی طرح رگڑنا۔“ اس نے صحن دھوئی تارہ کو آواز لگائی پھر ماں سے مخاطب ہوئی۔ ”کون جانے اس کی ماں کتنی صفائی پسند ہو۔“

”کوئی وقت ہی بتا دیتے۔ کیا پتا اب وہ پھر کو آئیں یا شام کو۔“ اس کی ماں زیر لب بڑبڑاتی پھر نظر کوثر پر پڑی۔

”تو کیوں بھوت بنی بیٹھی ہے اٹھ کر منہ دھو کر کپڑے بدل۔ کیا پتا وہ ابھی آجائیں۔“

”اچھا اماں۔“ وہ اٹھ کر باہر نکل گئی تو اماں نے پیچھے سے آواز لگائی۔ ”وہ مونگیا سوٹ پہننا تیرا رنگ گورا لگتا ہے اس میں۔“

کوثر مونگیا سوٹ اٹھا کر غسل خانے میں گھس گئی۔ زمین تارہ صحن دھو کر باورچی خانے میں آئی تب ہی ظہور آگیا۔ اس کے ہاتھ میں بہت سے لفافے تھے۔ باورچی خانے میں آکر اس نے زمین تارہ کو تھما دیے اور خود اندر چلا گیا۔ پھل، مٹھائی، سموسے اور بسکٹ۔

مگر وہ نہیں جانتی تھی۔ انسان اس زمین پر خدا بننے کی کوشش تو کرتا ہے۔ مگر ضمیر کی چیخیں زیادہ دن اسے سکون سے سونے نہیں دیتی۔



سارے گھر کی صفائیاں بہت تفصیل سے ہو رہی تھیں۔ کمروں سے دریاں نکال کر جھاڑی گئی تھیں۔ تکیے، غلاف، چادریں سب دھو دھا استری کر کے دوبارہ چڑھائے گئے تھے۔ کمرے صحن سب دھو ڈالے تھے۔ فرنیچر رگڑ رگڑ کر چمکایا گیا تھا۔ مقام حیرت کہ بتول اور کوثر بھی اس کی مدد کر رہی تھیں اور ان کی ماں پلنگ پر بیٹھی ہدایات جاری کر رہی تھی اور سب سے زیادہ زمین تارہ پر ہی برس رہی تھی پھر کوثر تو سب چھوڑ چھاڑ منہ پر ہنس لگا کر بیٹھ گئی۔

”اے بتول! ظہور سے تو کہا تھا جلدی گھر آنے کو۔“ اس کی ماں نے پکار کر کہا۔

”اماں! کہہ دیا تھا۔ آتے ہی ہوں گے۔“ وہ بیٹھ گئی۔

پردھے ہوئے کورڈال رہی تھی۔

”چائے کے ساتھ کیا رکھنا ہے۔“

وقفے وقفے سے ”وہ لوگ آتے ہی ہوں گے۔“ کی آوازیں ابھر رہی تھیں۔ مگر ”کون لوگ؟ نہ تو اس کو کسی سے پوچھنا تھا اور نہ کوئی اسے بتاتا۔ سو وہ خاموشی سے اپنا کام کر رہی تھی۔

دروازے پر دستک ہوئی۔ ظہور دیکھنے گیا تھا۔

”شاید وہ آگئے۔“ اماں اٹھ کھڑی ہوئی۔ بتول نے جھانک کر دیکھا۔ پھر ظہور کے ساتھ قاسم کو آنا دیکھ کر منہ مابین گیا۔

”قاسم آیا ہے۔۔۔؟“

”قاسم کون؟۔۔۔“ اماں نے پوچھا۔

”مائے مقبول کا بیٹا۔ اسے بھی اسی وقت آنا تھا۔ پہلے باپ یہاں مہینہ بھر نکا رہا۔ اب یہ پتا نہیں کیوں آگیا ہے۔“ وہ منہ بناتی بڑبڑاتی رہی۔ ظہور کے ساتھ قاسم اندر داخل ہوا تو چہرے کے تاثرات ٹھیک کیے۔

”و علیکم السلام، کیسے ہو بیٹا ٹھیک ٹھاک۔“ اماں نے قدرے خوش دلی سے پذیرائی کی۔

”ٹھیک ہوں۔ اللہ کا شکر ہے۔۔۔“ وہ اماں کی چارپائی پر بیٹھ گیا۔

”گاؤں میں سب ٹھیک ہے؟“ ظہور اس کے سامنے بیٹھ کر پوچھنے لگا۔ وہ مختصراً ”اسے گاؤں کا احوال بتانے لگا۔“

”خیر سے تو آئے نا۔۔۔۔۔“ بتول سے رہانہ گیا۔

”ہاں۔ ہاں۔ مجھے یہاں کسی کام سے آنا تھا۔ ابا نے لگا زمین تارہ کی خیریت پوچھتے آنا۔“

”بھابی چننی ہے زمین تارہ۔ لو آگئی پوچھ لو اس سے۔“

”سلام قاسم بھائی۔۔۔“

قاسم نے سرسری سا اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر نیت پوچھی۔

”ٹھیک ہوں میں۔ ماما نہیں آیا؟“

”ابا ذرا بیمار ہے۔“

”کیا ہوا۔“ وہ بے تابی سے پوچھنے لگی۔

”نہیں۔ فکر والی بات نہیں ہے۔ بس موسمی بخار ہے۔ کھانسی دانسی ہے۔ ٹھیک ہو جائے گا۔“ اس نے لاپرواہی سے کہا۔

”چائے بناؤ تارہ۔“ ظہور نے کہا تو وہ باہر نکل آئی۔

”بس بسکٹ اور سموسے رکھ دو۔ پانی چیرس رہے دو۔“ بتول نے پیچھے آکر تاکید کی۔

چائے پینے کے بعد قاسم اپنے کام سے چلا گیا۔ اسے اب رات کو ہی آنا تھا۔ بتول نے شکر ادا کیا۔

کوثر نہادھو کر مونگیا سوٹ پہنے باہر نکلی۔ لمبے بالوں کو سکھا کر چوٹی بنائی، پاؤڈر کریم کا جمل۔

”باباجی! تھوڑی سی لپ اسٹک بھی لگا لوں۔“

”نہ۔ نہ مجھے تو سیدھے سادے لوگ لگتے ہیں۔“

بتول نے روک دیا۔

وہ لوگ جب آئے تو زمین تارہ نکا چلاتے ہوئے پانی بھر رہی تھی۔ کندے گھسے ہوئے کپڑے، بالوں کی الجھی ہوئی چوٹی۔ وہ کوئی حور پری نہیں تھی۔ اگر اجمل اپنے والدین کو اس کی مظلومیت کے بارے میں نہ بتاتا تو شاید اس کی امی بھی زمین تارہ کو پسند نہیں کرتی۔

”یہ زمین تارہ ہے۔“ اجمل نے اشارہ کیا تھا۔ اس کے ابو نے بے حد ہمدردی اور محبت سے اسے دیکھا۔ لڑکی کا حلیہ بتا رہا تھا کہ وہ اس گھر میں کن حالوں میں رہ رہی ہے۔

”تم نہ بھی بتاتے تب بھی پتا چل جاتا۔ بے چاری بچی۔“ اس کی امی بڑبڑائیں۔ زمین تارہ کا بکا کھڑی دیکھ رہی تھی۔

”اندرا آئیں خالہ۔“ بتول نے انہیں وہیں بلکے دیکھا تو کہنا پڑا۔

”ہاں۔۔۔ ہاں ہمارا اپنا گھر ہے۔“ انہوں نے آگے بڑھ کر زمین تارہ کے سر پر ہاتھ رکھ کر حال پوچھا۔ وہ سٹیٹاسی گئی جبکہ اجمل ان کے عقب میں کھڑا مسکرا رہا تھا۔

”یہ میری نند ہے۔“ بتول نے تعارف کروایا۔

زمین تارہ گھبرائی کھڑی تھی پھر بھاگ کر بچن میں گھس گیا۔



گئی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ یہ وہی مہمان تھے جن کے لیے صبح سے تیاریاں ہو رہی تھیں اگر وہ ہی تھے تو پھر کوثر اگر کوثر تو پھر اجمل۔۔۔ وہ سر پکڑ کر رہ گئی۔ تب ہی کوثر گنگنائی ہوئی آگئی۔

”اس کے والدین کیسے ہیں؟“ آتے ہی پوچھنے لگی۔

”پتا نہیں۔۔۔“

”آئے ہائے۔۔۔“ وہ سر پر ہاتھ مار کر رہ گئی۔ پھر منہ بنا کر بولی۔ ”چائے رکھ دو۔ میرے ہاتھ کی چائے تو بیٹے کو پسند نہیں ماں کو کہاں آئے گی۔“

وہ انجھی انجھی سی چائے کا پانی چڑھانے لگی۔ کوثر نے سارے لوازمات پلیٹوں میں ڈالے۔ جب چائے تیار ہو گئی تو بتول آگئی۔ کوثر کو ہدایات دینے لگی۔

”دوپہ ٹھیک سے اوڑھو، گورنر زیادہ بولنا نہیں۔“

کوثر چائے لے گئی۔ وہ ساکت سی بیٹھی سوچ رہی تھی۔

”یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ تو کیا اس دن اجمل نے مجھ سے مذاق کیا تھا۔ یہ کوثر۔۔۔ اور میں سوچنے لگی کہ شاید یہی وہ مسیحا ہے جو۔۔۔“ اس کے آگے ساری سوچیں ختم اور زہریلی تھیں۔

”یہ میری بیٹی ہے۔“ اماں نے تعارف کروایا۔

”ماشاء اللہ بڑی پیاری بچی ہے۔“

بتول نے خوش ہو کر ہاں کا ہاتھ دیا، وہ مسکرا دیں۔ کوثر چائے دے کر باہر نکلی اور دروازے سے کان لگا کر کھڑی ہو گئی۔ وہ لوگ چائے پیتے اور اپنے خاندان کے بارے میں تفصیلات بتاتے رہے۔

”تو پھر ظہور بیٹے ہمیں مایوس مت لوٹانا۔ ہم بہت آس لے کر آئے ہیں۔“ اجمل کا رشتہ دیتے ہوئے اس کے ابو نے آخر میں کہا تھا۔

”اجمل تو ہمارا دکھا بھالا لڑکا ہے۔ ماشاء اللہ سارا محل تقریبیں کرتا ہے۔“

”بس تو پھر ہم بھی سمجھیں کہ نین مارہ ہماری ہوئی۔“ اجمل کی امی خوش ہو کر بولی۔

”نین مارے۔“ ظہور نے جیسے سے سر اٹھایا۔

”نین مارے۔“ بتول اور اس کی ماں نے سچا کر ایک دوسرے کو دیکھا۔

”نین مارے۔“ کوثر نے بے اختیار دروازہ کھول کر اندر جھانکا۔ اجمل مسکرا رہا تھا۔ اس کا دل دھک سے رہ گیا۔

”ہاں۔۔۔ ہاں کیوں نہیں۔“ ظہور کے لیے اس غیر متوقع خوشی کو سنبھالنا مشکل ہو گیا تھا۔ ”وہ آپ ہی کی بیٹی ہے۔“

کمرے میں موجود باقی نفوس ساکت و صامت تھیں۔

”بس تو پھر منہ بیٹھا کیسے۔“ اجمل کی امی نے مٹھائی کی پلیٹ اٹھائی۔ اجمل خاموشی سے اٹھ کر باہر نکل آیا۔ وہاں ساکت کھڑی کوثر کو دیکھ کر ٹھٹھک گیا پھر اس کے چہرے کے سامنے چٹکی بجاتے ہوئے پوچھنے لگا۔

”تمہیں کیا سانپ سونگھ گیا ہے۔“

کوثر نے بے حد شامی نظروں سے اسے دیکھا۔ تذلیل کے احساس سے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ وہ پٹی اور بھاگ کر کمرے میں گھس گئی۔ اجمل کندھے اچکا کر کچن کی طرف آگیا۔ حسب توقع وہ وہیں موجود تھی۔ گھٹنوں کے گرد بازو لپیٹے ان پر پیشانی لگائے ہوئے ہوئے ٹپ رہی تھی۔

”تمہارے سارے حقوق اپنے نام لکھوانے کی تیاری کر آیا ہوں۔ تم اب بھی خوش نہیں ہو۔“ نین مارہ نے گھبرا کر گھٹنوں سے چہرہ اٹھایا۔

”اب بھی بے یقین ہو۔“ وہ اندر آکر اس کے قریب بیٹھا۔ قریب پڑا مٹھائی کا ڈبہ کھول کر گلاب جاسن نکالی۔

”لو منہ بیٹھا کرو۔ میری اور تمہاری بات کی ہو گئی ہے۔“

”یہ۔۔۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔“

”ایسے کہ۔۔۔“ پھر ایک دم بات ادھوری چھوڑ کر اس کا ہاتھ پکڑا۔ اس پر گلاب جاسن رکھی اور باہر نکلی۔

”شاید اس نے اندر اٹھتی آوازیں سن لی تھیں۔“

سب باہر آ رہے تھے۔

”لو ہماری بیٹی یہاں بیٹھی ہے۔“

نین مارہ گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔ اجمل کی امی نے اسے ساتھ لگا کر باہر کیا پھر بڑے سے پانچ سو نکال کر دیئے لگیں۔ وہ سچا کر ظہور کو دیکھنے لگی۔

”رکھ لو۔۔۔“ وہ مسکرا رہا تھا۔

”سمجھیں۔“ منگنی ہو گئی۔ میں اب شادی کی تاریخ لینے ہی آؤں گی۔“ اجمل کی امی کہہ رہی تھیں پھر ان کی آوازیں صحن سے ہو کر بیرونی دروازے پر معدوم ہو گئیں۔ نین مارہ نے بے حد حیرت و بے یقینی سے ہاتھ میں پکڑے پانچ سو کے نوٹ کو دیکھا۔

”کیا زندگی کو تجھ پر رحم آگیا۔“



ہاں کے راستے میں پریولیس کے لڑکے لڑکیاں قطار بنائے کھڑے تھے۔ فاسٹل کے اسٹوڈنٹ اندر آتے لڑکیاں لڑکیوں کو موتیے کے گجرے پہناتیں اور you We will miss کے خوبصورت کارڈ دیتی تھیں جو انہوں نے خود بنائے تھے۔ لڑکوں کے ہاتھ میں ادھ کھلے گلاب تھے۔ لڑکوں کو پیش کرتے ہوئے ان کے منہ سے ہائے ہائے کی آوازیں نکلتی تھیں۔ وہ دل پر ہاتھ رکھتے، کن اکھیوں سے لڑکیوں کو دیکھتے اور بڑے ادب سے انہیں تھما دیتے جو فاسٹل کے لڑکے ان سے زیادہ منہ بنا کر قبول کرتے تھے۔

”یار الٹ ہونا چاہیے تھا۔“ آصف زیر لب بڑبڑایا۔

”یعنی لڑکے لڑکیوں کو پھول پیش کرتے اور لڑکیاں ہمیں گجرے پہناتیں لا حول و لا قوت۔“ حیدر بھنا کر بولا تھا۔ سلیم نے تو شائستہ کے ہاتھ میں گجرہ دیکھ کر کھائی بھی سامنے کر دی تھی کہ پیچھے سے افتخار کی دھچپ نے اس کی مروا لگی کو جگا دیا۔

”تو ایسے پریولیس نے ہماری اتنی عزت پہلے کبھی نہیں کی۔“

”مرج کے کروالو۔ پہلی اور آخری بار ہے۔“ زین نے دیکھا تھا اور پھول افتخار کی طرف بڑھا دیا جو اس نے

بڑے آرام سے اپنے کوٹ میں لگا لیا۔

سب ہی لوگ ہال میں اپنی نشستیں سنبھال چکے تھے۔ زارا کچھ لیٹ آئی تھی۔ مگر انعام اور عظمیٰ اس کی سیٹ رکھے ہوئے تھیں۔

”ٹھیکاب گاؤ۔ ہم سمجھے تم نہیں آؤ گی۔“

”میں تو نہیں آ رہی تھی۔ رضوان زبردستی چھوڑ گئے۔“

”بہت اچھا کیا، ہماری طرف سے شکریہ کہنا کہ۔۔۔“ تب ہی لائٹ چلی گئی ایسے کی آواز کے ساتھ سارا ہال گونج اٹھا۔ اس سے قبل کہ وہ مزید شور کرتے، اسٹیج کے عقب سے ایک کے بعد ایک کئی دیسے گویا ہوا میں تیرتے ہوئے اور اسٹیج پر اکٹھے ہو کر، ویکلم لکھنے لگے۔ ہال میں دیوں کی روشنی مدھم سی چاندنی بن کر بکھر رہی تھی۔ انہوں نے تالیاں پیٹ پیٹ کر اس ویکلم کو قبول کیا۔ مگر ان کی تالیاں گلابوں کی خوشبو پا کر خاموش ہو گئیں۔ ان پر برسے والی گلابوں کی نرم پنکھڑیاں گویا چھت سے برس رہی تھیں۔

”لو میرے خدا۔ یہ سب کتنا خوبصورت ہے۔“ وہ گویا مدہوش ہو رہے تھے۔ ان پنکھڑیوں کو اپنے دامن میں ہاتھوں میں اور ان کی خوشبو نو سانسوں میں بسا رہے تھے۔ وہ وقت ان کی نگاہوں میں جا گئے لگا تھا۔ جب وہ لوگ پہلی بار اس یونیورسٹی میں آئے تھے۔ اپنی حماقتیں فاسٹل والوں کی شرارتیں یاد آ رہی تھیں۔ مریم نے کچھ پتیاں ٹشو پیپر میں لپیٹ کر بیگ میں رکھ لیں۔

”یہ میری ڈائری کی زینت بنیں گی، اچھی یادوں کی طرح۔“

پھول برسے بند ہو گئے تو ساتھ ہی لائٹس آن ہو گئیں۔

”یہ آکھاں سے رہے تھے؟“ انعام نے سراٹھا کر دیکھا۔ وہ بھی رفتار میں چلتے چلتے رک گئے تھے۔ ”میں بھی چھت میں سوراخ ہو گئے ہیں۔“

”تم اور تمہاری سمجھ۔“ زارا اپنے گلی سائیکل اب



پریویس کے عباس کے ہاتھ میں تھا۔ فنکشن بہت اچھا تھا۔ بھنگڑا، خاکے، خوبصورت الوداعی نظمیں، فائنل کے اسٹوڈنٹس کو ٹائٹل دیے جارہے تھے۔ پھر فائنل کے اسٹوڈنٹس کو اسٹیج پر آنے کی دعوت دی۔ آصف کی خوبصورت آواز نے پورے ماحول پر جادو سا کر دیا تھا وہ گاربا تھا۔

کاش ہم تم بھی اجنبی ہوتے جس طرح اور لوگ ہوتے ہیں بے تعلق سے، بے تعارف سے کاش ہم تم بھی اجنبی ہوتے بے قراری نہ بے کلی ہوتی انا مکمل نہ زندگی ہوتی

یوں نہ ہوتیں اذیتیں دل میں زندگی بھی نہ ہوتی مشکل میں آنسوؤں سے نہ دوستی کرتے اپنے دل سے نہ دشمنی کرتے یوں نہ لمحے ستاتے جدائی کے دوسروں کی طرح ہم بھی خوش رہتے کاش ہم تم بھی اجنبی ہوتے

”واؤ آصف! تمہاری آواز تو بہت خوبصورت ہے۔“

”زبردست بھئی۔۔۔ یہ تو سنگین سکتا ہے۔“ سب لوگ اپنے اپنے انداز میں اسے سراہ رہے تھے۔ ”لیکن اس نے تو ہمیں اداس کر دیا ہے۔“ انعم منہ بسور کر بولی تھی۔

”بہت نازک دل ہے تمہارا۔“ فنکشن کے آخر میں عباس الوداعی فقرے کہہ رہا تھا۔

آؤ مل کر بیٹھیں کہیں کہ میرے پیارے دوست چند لمحوں کی یہ رفاقت ہے بڑے کام کی چیز پھر تو شیرازہ بکھر جائے گا اپنے خوابوں کو ہمیں گے پھرنے والے کون جانے کہ پھر اس شام دل افروز کے لیے کون کدھر جائے گا

یادیں رہ جائیں گی

”سب کچھ یہی ہو گا۔۔۔ یہ درودیوار، یہ پیار ٹمنٹ، وہی پروفیسرز، وہی دوڑ دھوپ بس ہم نہیں ہوں گے۔“ ہشملہ اگری افسردگی کے ساتھ کہہ رہی تھی۔ افتخار بہت خوش تھا۔ اس نے بہت انتظار کیا تھا۔ یہ وقتی طور پر انہیں جدا کرتا وقت اسے اور عظمتی کو ہمیشہ کے لیے اکٹھا کرے گا۔ اسے پورا یقین تھا۔ وہ جانتا تھا عظمتی نہیں چاہتی ان کے رومانس کے قصے جامعہ کی درودیوار پر لکھے جائیں۔ اپنی محبت کو مقدس راز کی طرح چھپا کر رکھا تھا اس نے۔

ڈنر کا انتظام بہت اچھا تھا مگر وہ ان دو سالوں کو دہرا رہے تھے۔ جھگڑے، دوستی، دشمنی، لیکچر، بحثیں، محبتیں، حماقتیں، شرارتیں۔ وہ مسکراتے لبوں اور نرم آنکھوں کے ساتھ، ایک دوسرے کو خدا حافظ کہہ رہے تھے۔ کون جانے انہیں پھر ملنا تھا یا نہیں۔ آنکھوں میں کچھ خواب تھے۔ نہیں معلوم ان میں سے کن کے خوابوں کو تعبیر ملنی تھی اور کن کے خوابوں کو راکھ ہونا تھا۔



کوثر اندر آئی اور بے حد خاموشی سے ان کے قریب آ بیٹھی۔ اس کا چہرہ اس کے اندرونی اضطراب کا عکاس تھا۔ لبوں کے گوشوں میں ہلکی سی لرزش جیسے کوئی شکوہ کنار لب چل رہا ہو۔ آنکھ میں پھیلتا کاجل جیسے ایک نوخیز خواب بکھر گیا ہو۔ قصور کوثر کا بھی نہیں تھا۔ بتول نے اس کو کچھ اس طرح یقین دہانی کرائی تھی کہ اس کا دل بے حد خاموشی سے اجمل کے نام پر دھڑکنے لگا تھا۔ پھر اجمل کی چھیڑ خانیاں۔ مذاق اسے کیا معلوم تھا وہ نین تارہ کے لیے رستہ ہموار کر رہا ہے۔

ایک آہ اس کے لبوں سے نکلی اور خاموشی کی چادر پر سلوٹیں ڈال گئی۔ بتول نے چونک کر کوثر کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر لکھی تحریر وہ حرف حرف پڑھ سکتی تھی۔ ”یہ کیا ہو گیا بتول۔۔۔! تم تو کہتی تھیں۔“ اس کی

اماں اب تک عالم حیرت میں تھی۔

”بڑا ہی گھنا نکلا۔“ بتول زیر لب برید لائی۔ اس کی سمجھ میں یہ نہیں آ رہا تھا کہ اس صورتحال میں اس کا فوری رد عمل کیا ہو۔

”تمہاری ناک کے نیچے یہ کھیل ہوتا رہا اور تم سمجھتی رہیں۔۔۔ واس۔۔۔ بتول واس۔ تیرا بھی جواب نہیں۔ لوگ اڑتی چڑیا کے پر کن لیتے ہیں اور وہ کل کی چھو کری تھے ہاتھ دکھا گئی اور میں بھی بھٹکی کس کے کہنے میں آ گئی۔ ایک ہفتے سے یہاں ڈیرے ڈالے بیٹھی ہوں۔“ اس کی اماں کے حواس ٹھکانے آئے تو بتول پر ہی برس پڑتی۔

”اماں! بس کرو۔۔۔ تم تو مجھے ہی قصور وار سمجھ رہی ہو۔ اب مجھے کیا پتا تھا کہ ڈاکٹر پر اس منحوس کا جادو چل گیا ہے۔“

”چل اٹھ کوثر! سامان سمیٹ۔ بہت ہو گیا تماشا۔“ وہ خاصی دلبرداشتہ ہو گئی تھیں۔

”اماں! میرا نام بھی بتول ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے میں یہ سب ہو جانے دوں گی۔“ وہ سانب کی طرح پھینکاری۔ حیرت و بے یقینی کی جگہ طیش و غصے نے لے لی تھی۔

”تو کیا کرے گی۔ وہ تمہارا کچھ لگتا ہاں کہہ بیٹھا ہے۔“ اماں چڑ کر بولی۔

”ایک ہاں سے کیا ہوتا ہے۔ خیر۔۔۔ تم واویلا مت کرو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اس گھر میں اجمل اگر کسی رشتے سے آئے گا تو وہ رشتہ کوثر کا ہو گا۔“ وہ مصمم ارادے سے بولی۔

”اس تارہ میں سے کیا۔ سوکھی چرخ سی ہے اور ہر کسی کو اسے بس میں کر سکتی ہے جادو گر نی نہ ہو تو۔۔۔“ اماں جھنجھلا گئی۔

”مظلوم بن بیٹھی ہو گی اس کے سامنے۔ اپنی مجبوریوں کی داستان سنائی ہو گی اور یہ مرد تو بس۔۔۔ جمال عورت کے آنسو دیکھے۔ وہیں پھسل گئے۔ لیکن اجمل کو یہ نہیں پتا کہ اس کا واسطہ بڑا کس سے ہے۔ قدموں تلے سے زمین نہ کھینچ لی تو۔۔۔“ اپنی



شکست اس کے لیے قابل قبول نہ تھی۔ ذہن بڑی تیزی سے اک نئی کہانی کا تانا بانا بن رہا تھا۔ تب ہی ظہور اندر آیا، خوشی اس کے چہرے سے چھلک رہی تھی۔

”کمال ہو گیا ہے۔ میں تو سمجھ رہا تھا۔ خیر اللہ نے بڑا کرم کیا۔“ اس نے اپنی دھن میں کہتے ہوئے حد تک کا ڈھکن اٹھایا، پھر بتول کی طرف دیکھتے ہوئے تنے لگا۔

”چائے ٹھنڈی ہو گئی ہے۔“  
”ہاں!“ بتول چونکی پھر کوثر کہنے لگی۔ ”جاؤ چائے گرم کر لاؤ۔“

بتول کا لہجہ نارمل ہی تھا۔ جیسے کوئی بات غیر متوقع نہیں ہوئی۔ کوثر فوراً ہی اٹھ گئی کہ آنسو چھلک جانے کو بے تاب تھے۔ وہ چیدک اٹھا کر ہر نکل گئی۔ ظہور سوسہ کھانے لگا۔

”مر بتول! تم تو کہہ رہی تھیں۔“ ظہور نے اچانک سر اٹھا کر بتول سے کچھ پوچھنا چاہا۔

بتول نے تیزی سے اس کی بات کٹ دی۔  
”یہ بھی برا تو نہیں ہوا۔“

”برا۔۔۔ بہت اچھا ہو گیا۔ مجھے تو یقین نہیں آتا۔ ورنہ سچ پوچھو تو بہت پہلے سے دل میں ایک خیال ساتھ کہ اجمل سے تارہ کی بات طے ہو جائے۔“

بتول اور اماں نے بے اختیار ایک دوسرے کو دیکھا۔

”تارہ بھی میری بہن ہی ہے۔“ دل پر پتھر رکھ کر یہ جملہ بولا تھا۔

”ہاں۔۔۔ ہاں سب کچھ تمہیں ہی تو کرنا ہے۔“ ظہور خوش دل سے بولا۔

”مگر تمہیں اتنی جلدی ہاں نہیں لگنا چاہیے تھی۔“ بتول کے کہنے پر ظہور چونک گیا۔

”کیوں؟“  
”رسم دنیا بھی کوئی چیز ہے۔ سوچنے کے لیے تھوڑا وقت مانگ لیتے تو اچھا تھا۔ انسان تھوڑی بہت معلومات ہی کرواتا ہے۔“

”دیکھا بھالا لڑکا ہے اور معلومات تو تم ساری کی ساری کروا ہی چکی تھیں۔“  
ظہور نے تو بونہی ایک بات کی تھی۔ بتول کو لگا وہ دنگ رہا ہے۔ تلملا کر رہ گئی۔

”میں ہاں کہہ دینے سے سسرال میں بیٹیوں کی قدر نہیں ہوئی۔ وہ سمجھتے ہیں ایک بوجھ کی طرح اتار پھینکا۔“ اس کی اماں ترخ کر بولیں۔ ظہور خاموش سا ہو گیا پھر آہستگی سے گویا ہوا۔

”بوجھ ہی تو ہے میرے دل پر۔ بڑا بھاری بوجھ۔ اتر جائے تو مجھے بھی کچھ سکون ہو۔“ پھر سر جھٹک کر بولا۔  
”وہ شادی کی تاریخ لینے آئیں گے۔ زیادہ لمبی تاریخ نہیں دینی۔ جو بھی بن پڑا بس ایک دو ماہ میں رخصت کر دیں گے۔“

”نیاز سے مشورہ تو کرنا ہے۔“  
”نیاز سے مشورہ بھی کر لوں گا۔ اس نے کون سا انکار کرنا ہے۔ وہ بھی یہی چاہے گا کہ اسے جلد رخصت کر دیں۔“

”تم اسے کل کے بجائے آج رخصت کر دو مگر اجمل کے ساتھ۔۔۔؟ کبھی نہیں۔ یہ بات تم لکھ رکھو منظور۔“ بتول کا مکار ذہن ایک خاص فیصلے پر پہنچ کر مطمئن ہو گیا۔



قاسم رات کو بہت دیر سے آیا تھا۔  
”کھانا میں کھا آیا ہوں۔ بس سوؤں گا۔“ وہ خاصا تھکا ہوا تھا۔ نین تارہ نے بستر وغیرہ بچھا دیے اور کمرے میں آگئی۔ بتول اس کی اماں اور کوثر کمرے میں بند نجانے کیا کھسر پھسر کر رہی تھیں۔ نین تارہ نے توجہ نہیں دی۔ وہ اس وقت خوش ہونا چاہتی تھی۔

پانچ سو کے نوٹ کو ہاتھ میں لے کر وہ بہت دیر تک دیکھتی رہی۔

”کیوں آتا ہوں میں یہاں بار بار؟ صرف تمہارے لیے۔“  
ایک نرم مدھم سی مسکان نے اس کے لبوں کا احاطہ کیا۔

”اپنی ذات کے ساتھ اتنی دشمنی۔۔۔ میں کرنے نہیں دوں گا۔“

اس نے تھوڑی گھٹنوں پر ٹکالی اور آنگن میں کھلتی چاندنی کو دیکھنے لگی، آج چاندنی بہت آجلی اور نکھری ہوئی تھی۔

”میں جانتا ہوں تم ایک جہنم میں زندگی گزار رہی ہو۔ میں تمہیں نکال لے جاؤں گا۔“

”تم تو اپنی زبان کے بڑے بکے نکلتے۔“  
اس کی نرم آواز اور خوبصورت لہجہ تارہ کے گرد حصار کھینچنے لگا۔

”کیا واقعی زندگی اب بدل جائے گی؟“ اس نے ایک یقین کے ساتھ خود سے سوال کیا۔ اس سے قبل کہ جواب ہاں میں آتا۔ اس کے اور چاندنی کے بیچ ایک وجود حاکم ہو گیا۔ اس نے سر اٹھا کر کوثر کو دیکھا۔ پھر اس کی آنکھوں سے بہتے قطار در قطار آنسوؤں کو۔

”بہت خوش ہو؟“ وہ عجیب سے لہجے میں پوچھ رہی تھی۔

”کیا مجھے خوش ہونے کا حق نہیں۔“ تارہ کا لہجہ اس سے زیادہ عجیب تھا۔ ابھی تو وہ اپنے دل کو یقین کی دُور سے باندھ رہی تھی کہ یہ نیا سلسلہ شروع ہو گیا۔

”میں اجمل کو اتنی آسانی سے تمہارا نہیں ہونے دوں گی۔“ وہ پھٹکاری۔

”میں نے اسے کسی سے چھینا تو نہیں کوثر!“ وہ بے بس سی ہو کر بولی۔ اس نے کب چاہا تھا کہ اس کی خوشی کسی کی آنکھ کا آنسو بن جائے۔

”ایک وہ بنگلے والا کافی نہیں تھا۔۔۔“  
”کوثر!“ وہ بے دے لہجے میں چیخی۔

”مگر جنہیں جگہ جگہ مارنے کا شوق ہو۔ وہ کسی ایک پر اتنا کس طرح کریں۔“ وہ زہر زہر ہو رہی تھی۔

”بس کرو کوثر خدا کے لیے۔ ترس کھاؤ مجھ پر۔“  
وہ ہاتھ جوڑ کر چیخی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

”یہی۔۔۔ یہی ڈرامے کیے تھے نا اجمل کے سامنے بھی۔“ بتول دودھاری تلواریں کر سامنے آئی۔ ”اسی مظلومیت کا رونا رویا تھا ڈاکٹر کے سامنے۔ یہی ڈھکوسلے کیے تھے۔“

”بھابھی! وہ تمہارے سامنے آتا تھا۔“  
”مگر بھابھی کو کیا معلوم تھا؟ ڈاکٹر مریضہ عشق و عاشقی کے سبق پڑھا رہے ہیں ایک دوسرے کو۔“ کوثر کی زبان نے ڈنگ مارا۔

”میں مریکوں نہیں جاتی۔“ وہ بے بسی سے دونوں ہاتھوں میں بال فوج کر رونے لگی۔

”مجھ میں حیا ہی نہیں ہے نین تارہ! ورنہ تو واقعی مر جاتی۔“ بتول استہزائیہ ہنسی ہنس دی۔ ”بس ایک بات یاد رکھ جو خواب تو دیکھ رہی ہے وہ پورے ہونے والے نہیں۔ اجمل تجھے کبھی نہیں ملے گا۔ کبھی بھی نہیں اور میں کیا کر سکتی ہوں اس کا اندازہ تجھے اچھی طرح ہے۔“

نین تارہ کے آنسو جم سے گئے۔ وہ ساکت سی انہیں دیکھے گئی۔ بتول کوثر کا ہاتھ پکڑ کر پلٹ گئی۔ آنگن میں چاندنی زرد پڑ گئی تھی۔

”اور حقیقت یہ ہے نین تارہ! کہ تیری قسمت میں کوئی خوشی لکھی نہیں۔ تجھے صرف ذلیل ہونے کے لیے پیدا کیا گیا ہے اور اب ایک نیا کھیل شروع ہو گا۔“

بہت دیر ہونے کے بعد اس نے بے دردی سے آنسو پونچھے۔ وہ جانتی تھی۔ چند جملوں کی ایک چھوٹی سی کہانی۔۔۔ اس کے ناکرہ گناہ۔ اور اس کے بعد کون مڑے جو پھر بھی یہی کہے۔ ”میں شادی کروں گا تم سے۔“

”اور جس کی آنکھوں میں میں نے اپنے لیے محبت اور احترام دیکھا ہے۔ ان آنکھوں میں اتنی بدگمانی اور حقارت دیکھ سکوں گی۔“

اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ اپنے دوپٹے میں اپنے چند جوڑے اور کتابیں باندھ لیں۔

”اگر تم کمزور ہو تو اپنا معاملہ خدا پر چھوڑ دو کہ وہ بہتر



انصاف کرنے والا ہے۔" نین تارہ نے اپنا معاملہ واقعی خدا کے سپرد کر دیا تھا۔ تب ہی جب قاسم گاؤں جانے کو تیار ہوا تو وہ گھڑی اٹھا کر ہر نگل آئی۔

"میں قاسم بھائی کے ساتھ چلی جاؤں۔ ماما بیمار ہے۔" اس نے ظہور کو بھائی کہنا چھوڑ دیا تھا۔ ظہور نے بے حد حیرت سے اس کے ہاتھ میں موجود گھڑی کو دیکھا۔ مگر خوش دلی سے بولا تھا۔

"ہاں۔ ہاں۔ کیوں نہیں۔ ماما نے بڑا خیال رکھا تھا تمہارا۔ ٹھوڑی خدمت تمہارا بھی فرض بنتا ہے۔ چلی جاؤ۔" وہ کہہ کر قاسم کی طرف متوجہ ہوا۔

"ماما مقبول سے کہنا۔ ہم نے نین تارہ کی بات مکی کر دی ہے۔"

"کس کے ساتھ؟" قاسم چونک گیا۔

"ڈاکٹر اجمل کے ساتھ، ماما جانتا ہے اسے۔ میں آؤں گا کسی دن گاؤں۔ پھر تفصیل سے بات ہوگی۔ کچھ صلاح مشورے بھی کرنے ہیں۔" ظہور قاسم کو تفصیلات بتا رہا تھا۔ نین تارہ زمین پر نظریں گاڑے کھڑی تھی۔ پشت پر چبھتی ہوئی نظریں تھیں۔ دہلی دہلی ہنسنے لگی۔

"جلدی آجانا۔" ظہور نے کہا تھا۔

"یہ گھر یہ لوگ، یہ گلیاں، یہ راستے میرے لیے سب اجنبی ہیں۔ خدا نہ کرے مجھے کبھی لوٹ کر یہاں آنا پڑے، جہاں میری عزت، نفس، میرا مان، میرا وقار، مستقبل سب مٹی میں مل گئے۔"

شام ڈھلے وہ گاؤں پہنچے۔ ماما مقبول بکریوں کو چھوڑ کے نیچے باندھ رہا تھا۔ اسماء بھابھی نے ہنڈیا چڑھالی تھی۔ اسے دیکھ کر حیران کا حیران رہ گیا۔

"تارہ پتہ تو ہے۔"

"اما! تمہیں تو بخار تھا۔" وہ ہنسنے لگی۔

مسکرائی۔ کیسی روتی، سسکیاں لیتی مسکراہٹ تھی۔

"خوبی ہوئی، بڑا دل تو ہے، پڑھتی مسکراہٹ تھی۔"

"بخار تو صبح ہی اتر گیا۔ پر تم کو۔ تم کو ظہور نے کیسے آنے دیا؟" وہ اسے ساتھ لگا کر پوچھنے لگا۔

"آٹھ حیران کیوں ہو اما! میں نے نہیں تو آنا تھا اور

ٹھکا رہی کیا ہے میرا۔۔۔" دل تو دھڑکیں مار مار کر رونے کو کرتا تھا مگر وہ چپ تھی۔

"میں تو خوش ہوا ہوں پتہ۔ بہت خوش۔ اب آئی ہو تو جانے نہیں دوں گا۔" ماما واقعی بہت خوش تھا۔

"مجھے اب کہاں جانا ہے۔" وہ زیر لب پوچھتی اسماء بھابھی کی طرف متوجہ ہو گئی۔ انہوں نے بھی اس کی آمد پر خوشی کا اظہار کیا۔ ان کا سال بھر کا بیٹا چارپائی کے ساتھ بندھے کپڑے کے جھولے میں محو خواب تھا۔ کھلے آنگن میں چارپائیاں پچھی تھیں۔ کونے میں ناکا اور صحن میں ایک طرف چولہا، لپا لپایا کچا آنگن، تین کھلے کھلے کمرے، گاؤں کا روایتی سامان، بھابھی اسماء مسوری وال پکا رہی تھی۔ ساتھ میں زرد پکالیا۔ کھانے کے بعد جب اسماء برتن دھو رہی تھی۔ قاسم نے ماما مقبول کو اس کے رشتے کے بارے میں بتایا۔ وہ بے یقین سا اٹھ کر اندر آیا۔ نین تارہ گھڑی کھول رہی تھی۔

"قاسم کتنا ہے تیری بات مکی ہو گئی ہے ڈاکٹر کے ساتھ۔" نین تارہ کے ہاتھ رگ گئے۔

"پانچ سو کا نوٹ ہاتھ میں دے دینے کو منگنی ہونا کہتے ہیں تب تو ہو گئی۔"

ماما مقبول نے ابجھن بھرے انداز میں اسے دیکھا پھر رسانیہ سے بولا۔

"عزت دار لوگوں میں زبان دینا ہی سب کچھ ہوتا ہے۔"

"اور جسے زبان دی جا رہی ہے۔ اگر وہی عزت دار نہ ہو لوگوں کی نظر میں تو۔۔۔"

"کیسی باتیں کر رہی ہے تارہ۔"

"انتظار کرو اما! میں بھی انتظار کر رہی ہوں۔ آنے والا وقت دودھ کا دودھ پانی کا پانی کر دے گا۔" وہ گھر کھولنے لگی۔ مگر سخت تھی کھلنے میں نہ آ رہی تھی۔ اس نے کہا تھا۔

"اپنی ذات کی ساری کھڑکیاں بھی بند کر دو گی میں تب بھی تم تک پہنچ جاؤں گا۔"

نین تارہ کے لبوں پر استہزائی سی مسکراہٹ ابھری۔

"اور اب میں سارے دروازے کھول بھی دوں۔ شاید تم تب بھی اتنا پسند نہیں کرو گے۔" مگر اندر نہیں امید کا تھا سا جلتو من کے اندھیروں کو ہلکی ہلکی روشنی بخش رہا تھا۔

♥ ♥ ♥ ♥

عجیب اکتائے ہوئے بیزار دنوں کا سلسلہ تھا۔ آپا فاطمہ کی شادی کے بعد اب افتخار بھی وقت بے وقت اس کے ہاں نہیں آتا تھا۔ شاید اس کا خیال تھا کہ زین کو اب انگلی پکڑ کر چلانے کی ضرورت نہیں رہی۔ زین گھر میں کتابیں کھولتا تو سوچوں کے سلسلے دراز ہونے لگتے۔ وہ کتابیں اٹھا کر لاہوری آجاتا تو لاہوری کے پرسکون ماحول میں اونگھ آنے لگتی، جمالی پر جمالی کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔ افتخار کی طرف جاتا تو پنجابی شاعری کی تارن سنانے لگتا تھا۔ زین چڑ جاتا۔

"آپ کو ماسٹر پنجابی ادب میں کرنا چاہیے تھا۔"

ایک دن یونیورسٹی میں انعام مل گئی۔

"اچھا ہوا زین تم مل گئے۔ یہ زارا کہاں غائب ہے، نہ ہمارے گھر آئی ہے نہ فون کرتی ہے۔ خود کرو تو پتا چلتا ہے محترمہ گاؤں گئی ہیں۔"

وہ کیا کہتا کہ وہ رائے ہاؤس میں مقید ہو کر رہ گئی ہے اس سے بھی ملنے نہیں آتی۔ بس مختصراً فون پر ہی بات ہوتی تھی۔

"میرے پاس اس کے کچھ نوٹس ہیں۔ اتفاق سے اس وقت بھی فائل میرے پاس ہی ہے۔ تمہیں ملے تو اسے دے دینا۔ ہم لڑکیوں کا گھر سے نکلنا بھی بس پڑا لیم ہی ہے اور بھائی لوگ کوئی بات نہیں مانتے۔"

زین نے فائل پکڑ لی تھی۔

"اس تک میری شکایت بھی پہنچا دینا۔ گاؤں سے اگر فون ہی کر لیا کرے۔"

فائل دو دن تک اسی کے پاس رکھی رہی۔ اس نے فون کیا تھا۔ زارا گاؤں گئی تھی۔ ہفتے کو اسے واپس آنا تھا۔ ہفتے کو اس کا موبائل آف ہی ملا اور زین کچھ یوں

آگیا کہ فائل اٹھا کر رائے ہاؤس پہنچ گیا۔ خوشگوار سی شام پھولوں کی خوشبو میں نہا رہی تھی اور لان چیمبر سلیمان شام کا اخبار پڑھ رہے تھے۔

"مجھے مس زارا سے ملنا ہے۔" ساہو وپراعتقاد لہجہ، اسے سلیمان سے کوئی خوف محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ سلیمان نے اخبار سے نظریں اٹھا کر بلیک پیٹ اور لیمن کلر کی شرٹ میں ملبوس نوجوان کو دیکھا۔ دوسرے مل ان کی آنکھوں میں ناگواری کا تاثر ابھر آیا۔ اس لڑکے کو انہوں نے زارا کے ساتھ بہت سی جگہوں پر دیکھا تھا، پھر وہ بائیک پر زارا کو گھر بھی چھوڑنے آیا تھا اور وہ جسے ایک بار دیکھ لیتے تھے اسے بھولتے نہیں تھے اور یہ لڑکا انہیں بالکل اچھا نہیں لگا تھا۔ انہوں نے نظریں دوبارہ سے اخبار پر لٹکا دیں۔ انہوں نے زین سے بیٹھنے کو بھی نہیں کہا تھا۔ زین کے اندر غصے کی لہری ابھری۔

"مجھے مس زارا سے ملنا ہے۔" اس نے قدرے بلند آواز میں اپنی بات دہرائی۔

"کیوں؟" سلیمان کے انداز ہی غصہ و اشتعال دلانے والے تھے۔

"کام ہے ان سے۔" لہجہ زین کا بھی نارمل نہ تھا۔ شاید دونوں کے احساسات ہی نارمل نہ تھے۔ ایک طرف شدید غصہ اور نفرت تھی۔ تو دوسری طرف ناپسندیدگی۔

"کیا کام؟" نظریں اب بھی اخبار کی سرخی پر پھسل رہی تھیں۔ چہرہ سپاٹ اور ہر تاثر سے عاری تھا۔ زین سلگ اٹھا۔

"ان ہی کو بتاؤں گا۔"

سلیمان نے نظریں اٹھا کر زین کو دیکھا۔ اس کے لبوں پر استہزائی سی مسکراہٹ ابھری۔

"زارا رائے فیل سے تعلق رکھتی ہے۔ ہر ایرا غیر امنہ اٹھا کر اس سے نہیں مل سکتا۔"

بے حد نارمل لہجہ، مگر زین کا وجود غصے کی آگ میں جھلس گیا۔ اس نے فائل سلیمان کے سامنے میز پر پھینک دی۔



”زارا سے کہیے گا۔ یہ فائل انعم نے بھجوائی ہے۔“

سلیمان نے ایک نگاہ فائل پر ڈالی اور زین کے چہرے پر نظریں گاڑ دی۔ اس نگاہوں میں عجیب سی لپک اور چمک تھی۔ اپنی تمام تر بے خونی کے باوجود زین کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ سی ہوئی۔

”تم جانتے نہیں ہو کہ کہاں کھڑے ہو ورنہ یہ گستاخی۔۔۔“ اس کا یوں فائل چٹخنا سلیمان کو ناگوار گزرا تھا۔ ”لیکن تمہارا بھی تصور نہیں ہے۔ تم جیسے چھوٹے گھروں کے لوگ کیا جانیں کہ تمیز و تہذیب بھی کسی چیز کا نام ہے۔ کیا کریں، دور ہی ایسا آگیا ہے چوٹی کے بھی پر نکل آئیں تو اڑنے کی کوشش وہ بھی کرتی ہے۔“ اخبار لپیٹتے ہوئے پر سکون لہجے میں زین کی تذلیل کی تھی اس نے۔

”تو اب آپ مجھے تمیز و تہذیب سکھائیں گے۔ مسٹر سلیمان۔“ دونوں ہاتھ کرسی کی پشت پر ٹکاتے ہوئے زین نے خود پر قابو پانے کی کوشش کی۔

”رازے سلیمان۔۔۔ رازے سلیمان حیدر ہے میرا نام۔۔۔ اور تمیز تو تمہیں ایسی سکھائیں گے کہ تم ساری عمر نہ بھول سکو۔ مگر مجبوری ہے رازے سلیمان دشمنی بھی اپنے برابر کے لوگوں سے رکھتا ہے۔“ کس قدر حقارت بھرا لہجہ تھا سلیمان کا۔ ”جاسکتے ہو تم۔ زارا کو بتا دوں گا اگر تمہارا نام یاد رہا تو۔“

وہ اخبار اٹھاتے اٹھاتے رک گئے۔ ایک محفوظ سی مسکراہٹ لبوں کی تراش میں منجمد ہوئی۔ گویا زین کی حالت سے لطف اٹھا رہے ہوں۔

”شاید تم نے اپنا نام نہیں بتایا ابھی تک۔۔۔“ (میں اسی جگہ تم سے اپنا تعارف کرواؤں گا رازے سلیمان۔۔۔ تھوڑا انتظار کروں گا) وہ ایک جھٹکے سے پلٹا اور میٹ کر اس کر گیا۔

سلیمان اطمینان سے اپنے جوتے دیکھتے دیکھتے پھر ملّا۔ ”کو آواز دے کر بلایا۔“

”یہ فائل زارا کو دے آؤ۔“ زارا کو انعم سے ہی پتا چلا تھا کہ اس نے فائل زین

کو دی تھی۔

”مائی گاڈ!“ اس نے گھبرا کر زین کو فون کیا۔ خلاف توقع وہ گھر پر ہی موجود تھا اور خاصے خوشگوار موڈ میں اس سے بات کر رہا تھا۔

”تم رازے ہاؤس آئے تھے؟“ زارا نے چھوٹے ہی پوچھا۔

”بال۔۔۔“

”کیوں کرتے ہو تم ایسی حرکتیں۔۔۔“

”بے عزتی کروانے کے لیے۔۔۔“

”شٹ اپ۔۔۔“ وہ جھنجھلا گئی۔

”نہیں بھئی۔۔۔ ذرا ابو گرم رہتا ہے۔ مجھے یاد رہتا ہے کہ مجھے کرنا کیا ہے۔ ورنہ بابا کی طرح میں بھی شخص ہو کر بیٹھ جاؤں گا۔“

”عجیب نظریے ہیں تمہارے بھی۔۔۔“

”میرے اپنے ہیں اس لیے۔۔۔ ویسے۔۔۔ یہ سلیمان صاحب تو خاصے بے مروت انسان نکلے، چائے پانی پوچھنا تو ایک طرف مجھے بیٹھنے کو بھی نہیں کہا۔“ وہ یوں بات کر رہا تھا جیسے کوئی بات ہی نہیں ہوئی۔

”سوری زین۔۔۔“

”کس کس بات پر معذرت کریں گی۔ ان کے حساب ان ہی کی طرف رہنے دیں۔ وقت آئے گا تو خود ہی چکا دیں گے۔ آپ اپنی بات کریں۔“ وہ آرام سے بات بدل گیا۔

”اپنی کیا بات کروں۔ عجیب ڈل سی لائف ہو گئی ہے۔“ زارا کا لہجہ اکتایا ہوا تھا۔

”کیوں؟“ رضوان صاحب بہت مصروف ہو گئے ہیں آج کل۔“ اس نے چھیڑا تو زارا مسکرا دی۔

”شکر ہے، تم نے رضوان کے ساتھ میرے رشتے کو تسلیم تو کیا۔“

”حقیقت تو حقیقت ہوتی ہے زارا بی بی! اپنا آپ منوا ہی لیتی ہے، انسان کب تک سربابوں کے پیچھے بھاگے گا۔“ وہ ایک طویل سانس لے کر بولا تھا۔

”ہوں۔۔۔“ زارا نے انجانے کس سوچ میں ڈوب گئی تھی۔

”پچھو کے پاس جائیں گی؟“ زین نے پوچھا۔

”سنڈے کو جاؤں گی اور کچھ دن وہیں رکوں گی۔“

”اچھی بات ہے۔ پچھو سے کہنے گا۔ زین انہیں بہت یاد کرتا ہے۔“

”یہ کہنے کی بات نہیں۔ وہ جانتی ہیں۔ ویسے زین مجھے اچھا لگا میں تو سمجھی تھی تم اب بھی پہلے کی طرح۔۔۔“

”کب تک بھاگوں گا۔“ زین نے اس کی بات قطع کی۔ پھر بات بدلتے ہوئے پوچھنے لگا۔

”اسٹڈیز کیسی جا رہی ہیں۔۔۔“

زین کے ساتھ اپنی اسٹڈیز ڈسکس کرتی زارا کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ کیا سوچے بیٹھا ہے۔

♥ ♥ ♥ ♥

ویگن نے پہلے کی طرح اب بھی اسے سڑک پر اتارا اور بارن بجائی، سڑک کے بل کو کراس کرتی دائیں طرف مڑ گئی۔ اس کے ساتھ اترنے والے شخص نے حیرت و تجسس کے طے جلے تاثرات کے ساتھ اسے دیکھا تھا۔ جسے نظر انداز کرتے ہوئے اس نے اپنا چھوٹا سا بیگ سنبھالا اور اگلوتے کھڑے تانکے پر بیٹھ گیا۔ اس کے بوجھ سے تانگا پیچھے کو جھولا تو یہاں گھوڑا ہنسنایا، وہیں اگلی سیٹ پر صاف منہ پر ڈالے اوگھتا ہوا کو جوان بھی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔

”کہدھر جانا ہے باؤ؟“

”گاؤں۔۔۔“

”جو ملی۔۔۔؟“ کو جوان نے شاید اس کے سطلے اور وضع قطع سے اندازہ لگایا تھا۔ زین ہنس دیا۔

”خوبی بھی جائیں گے لیکن۔۔۔ ابھی تو صرف گاؤں جانا ہے۔“

”گاؤں میں کس کے گھر جانا ہے باؤ۔ بتا دو، سیدھا دروازے تک لے جاؤں گا۔“ اس نے غور سے زین کو دیکھا۔

”منزل سامنے مگر رستہ بے نشان ہے۔ تمہیں کہاں کا پتا بتاؤں۔“ وہ ذرا لب بڑھایا۔ تب ہی اس کے ساتھ اترا شخص بھی تانکے پر آبیٹھا۔

”نہیں۔۔۔“

”ویسے تو یہاں آنے والے مہمان حویلی میں ہی ٹھہرتے ہیں۔۔۔“

”نہیں حویلی نہیں۔۔۔“ زین نے ایک دم ہاتھ اٹھا

”سلام چاچا! سناؤ کیا حال چال ہے۔“

”اللہ کا کرم ہے۔ ہو آئے شہر سے۔“ کو جوان نے تانگا آگے بڑھایا۔

”ہاں چاچا۔۔۔“ وہ آپس کی باتوں میں لگ گئے۔

زین خاموشی سے کھیتوں میں پھولی سرسوں دیکھ رہا تھا۔ کچے بکے مکانوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اونچی نیچی گلیاں، دھول اڑاتے راستے، جگلی کرتی گاؤں، نیم وا آنکھوں سے آنے والوں کو بھٹتی، اپنی دم ہلا کر کھیاں اڑاتیں بھینسیں، گاؤں کا پراسری اسکول، چھوٹی چھوٹی دکانیں، گوبر تھوٹی، بیرونی دیوار کی لپائی کرتی عورتیں، گھروں کے سامنے چارپائیاں ان پر حقہ گڑگڑاتے بوڑھے، گاؤں کا واحد آڈیو سینٹر اور اس کے سامنے کھڑے بے فکرے نوجوان۔

پہلے پھولوں کی تازگی، باغوں اور کھیتوں کی خوبصورتی اور دلکشی، گاؤں کی ٹیڑھے میڑھے راستے میں دھول ہو جاتی تھی۔

تانگہ رک گیا۔ اس کے ساتھ والے شخص نے پانچ روپے نکال کر تانکے والے کو دیے اور رب رکھا چاچا کہہ کر نیچے اتر گیا۔ زین نے بھی کرایہ دیا اور بیگ سنبھال کر اتر گیا۔ تانکے والا اب بھی تجسس سا وہیں رکا اسے دیکھ رہا تھا۔

وہ شخص رک گیا۔

”کس کے گھر جانا ہے۔۔۔؟“ زین کو وہیں کھڑے دیکھ کر اس نے پوچھا۔ زین چونک کر اس کی طرف متوجہ ہوا۔ پھر ہنسوتے سمجھے بول اٹھا۔

”میں راکٹر ہوں۔ اخباروں میں لکھتا ہوں۔ گاؤں کے پس منظر میں ایک ناول لکھ رہا ہوں تو سوچا سب کچھ آنکھوں سے دیکھ لوں۔“

”اچھا۔۔۔ اچھا۔۔۔ تو گاؤں میں کوئی نہیں ہے آپ کا؟“

”نہیں۔“

”ویسے تو یہاں آنے والے مہمان حویلی میں ہی ٹھہرتے ہیں۔۔۔“

”نہیں حویلی نہیں۔۔۔“ زین نے ایک دم ہاتھ اٹھا

”نہیں۔۔۔“

”ویسے تو یہاں آنے والے مہمان حویلی میں ہی ٹھہرتے ہیں۔۔۔“

”نہیں حویلی نہیں۔۔۔“ زین نے ایک دم ہاتھ اٹھا



کر اس کی بات کافی۔ ”میں عام کسان کی کہانی لکھ رہا ہوں ان کے دکھ ان کی مشکلات۔“

”ہاں تو پھر میرا گھر حاضر ہے نا۔۔۔“ اس نے

مخلص انداز میں دعوت دی۔ ناگے والا جو آواہان کی طرف جھکا باتیں سن رہا تھا۔ اشتیاق سے پوچھنے لگا۔

”باوا! کہانی لکھ رہے ہو ہماری۔۔۔“

”ہاں۔۔۔“

”شعور بھی چھپے گی۔“

”نہیں۔۔۔“ زین ہنس دیا تو اس نے ہائوس ساہوکر تازگا آگے بڑھا دیا۔ زین دوبارہ اس شخص کی طرف متوجہ ہوا۔

”میں نے انگ گیسٹ کے طور پر رہوں گا۔“

وہ اپنا کان کھانے لگا۔

”شعور! بہت پڑھا لکھا تو میں ہوں مگر یہ کیا بلا ہے دوست۔“

”میرا مطلب ہے اپنے کھانے پینے کا خرچ۔۔۔“

”نہ بھائی میرے نہ۔۔۔ کبھی دیکھا ہے کسی گاؤں میں کوئی ہوٹل ہو جہاں پیسے لے کر مہمان کو روٹی دی جاتی ہو۔ یہ شہر والوں کے چونچلے ہیں۔ ہمیں مہمان کی دو وقت کی روٹی بھاری نہیں۔“ یہ پہلا شخص تھا جس نے اسے اپنائیت کا احساس دلایا تھا۔ ورنہ زین کو تو یہی محسوس ہو رہا تھا۔ وہ دشمن کے کسی علاقے میں قدم رکھ رہا ہے۔

”مجھے نجانے کتنے دن لگ جائیں۔“ وہ اب بھی متذبذب تھا۔

”بھلے ساری زندگی رہو۔ ہم اتنے بھی تھوڑے نہیں۔۔۔ چلو میرے ساتھ۔۔۔“ اس نے ہاتھ سے

”نہیں! یہ میں اٹھالوں گا۔۔۔“ زین نے سہولت سے منع کر دیا۔

(مجھے یقین تھا۔ میں پہلا قدم اٹھاؤں گا تو راستے

خود بخود کھل جائیں گے اور یہ ایک اچھا شگون ہے۔)

اس نے ساتھ چلتے شخص کو دیکھا۔ اس نے زین کو

بٹھک میں بٹھایا تھا۔ بڑے بڑے ہالوں والے پانگ پر کڑھائی والی میزوں چادریں پڑیں۔ انہیں۔۔۔ دہائی دیوار کے ساتھ چھ کرسیاں اور میز جس پر سفید کور پڑے تھے۔ دیوار پر اللہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے طغریٰ تھے۔ وہ ریلیکس ہو کر بیٹھ گیا۔ کپڑے، جوتے سب مٹی مٹی ہو رہے تھے۔

”میں نے غسل خانے میں پانی رکھ دیا ہے۔ پہلے نہالو۔“

غسل خانہ صحن میں تھا۔ زین نما کر آیا تو چائے آگئی تھی۔ ناریل والے بسکٹ، ایلے ہوئے اندھے اور مین کے لڈو۔

”میں تو سمجھ رہا تھا کہ گاؤں میں آج بھی۔۔۔“

”وستی سے تواضع ہوتی ہے۔“ اس نے تہقیر لگایا۔

”تم شہر والے آج بھی گاؤں کتابوں میں پڑھتے اور فلموں میں دیکھتے ہو۔ اچھا ہوا یہاں آگئے۔ اب آج کے گاؤں کو دیکھنا۔“

”لیکن یہ سب۔۔۔“ اس نے لوازمات کی طرف اشارہ کیا۔

”فکر نہ کرو۔ آئندہ ایسا اہتمام نہیں کریں گے۔ یہ تو پہلی بار ہے۔“ وہ تہقیر لگا کر ہنس دیا پھر سنجیدہ ہو کر پوچھنے لگا۔

”تمہارا نام کیا ہے۔؟“

”زین العابدین۔“ آپ مجھے زین کہہ لیں۔“

”اور آپ کا۔۔۔؟“

”قاسم۔“ وہ مسکرایا۔ پھر اس کے لیے کپ میں چائے نکالنے لگا۔

♥ ♥ ♥ ♥

”مجھے اس حویلی سے وحشت ہوتی ہے زارا۔“

مما کا اجد تھکا تھکا سا تھا۔ وہ خود بھی بہت کمزور ہو گئی تھیں۔ سرخ و سپید چہرہ زردی مائل ہو رہا تھا۔ زارا کو

خود بھی حویلی پسند نہیں تھی۔ اتنی بڑی حویلی میں تکی

اماں کے ساتھ ملا زماؤں کی فوج تھی۔ کتنے ہی کمرے

تھے جو بند پڑے تھے اور ان کے مکین اب یہاں نہیں

رہتے تھے۔

”کبھی یہاں بہت رونق ہوگی۔“ اس نے الجھ میں لگے گروپ فونو کو دیکھ کر کہا تھا۔ جس میں پوری رائے فیملی موجود تھی۔ حتیٰ کہ رائے اکبر علی بھی۔ مما نے کہاں کھو گئی تھیں خاموش ہی رہیں۔ زارا نے انہیں دیکھا۔

”کچھ لوگ، کچھ رشتے، کتنے اہم ہوتے ہیں چاہے

توڑ دیں یا جوڑ دیں۔ تنہا انسان کچھ بھی نہیں۔“

”ان ہی رشتوں میں جب دراڑیں پڑتی ہیں تو سب

بکھر جاتا ہے۔ کچھ بھی تو باقی نہیں رہتا۔ دلوں میں

کدورت و نفرت اور بڑی بڑی حویلیوں میں تنہائی اور

وحشت کے سوا۔“

وہ زیر لب بڑبڑاتی تھیں۔

”ایک غلط قدم، غلط فیصلہ آنے والے وقت اور

نسلوں کو الجھا کر رکھ دیتا ہے۔“

”نورین! آئی بہت خوبصورت تھیں۔“ زارا نے

بات بدلتی چائی۔ مما نے ہاتھ بڑھا کر نورین کی تصویر

نکال لی کچھ لمحے اسے دیکھتی رہیں۔

”جہاں عورت اپنی فطرت کے خلاف جاتی ہے

وہیں خود بھی تکلیف اٹھاتی ہے اور اپنے خاندان کو

بھی اس میں مبتلا کر دیتی ہے۔“

”عورت کی فطرت۔۔۔؟“

”سمجھو! اور صبر۔۔۔“

”گویا عورت احتجاج بھی نہ کرے۔“

”احتجاج کس سے؟ نقدیر کے خلاف کون جاسکا

ہے؟ قسمت کے لکھے کو کون مٹا سکا ہے، کون ہے جو

خدا کے فیصلوں سے منحرف ہو۔“

”ماموں اور نورین! آئی کی شادی دونوں کی مرضی

کے خلاف طے کر دی گئی۔ جبکہ وہ عمر میں ان سے بڑی

بھی تھیں۔“

”جہشید نے اسے پوری دیانت داری سے اپنایا

تھا۔“

”دیانت داری۔۔۔ اور مما محبت؟“ اس نے سوالیہ

نظروں سے ماں کو دیکھا۔

”زارا! یہاں کتنے لوگ، ہیں جو شادی سے قبل

محبت کرتے ہوئے گئے۔ میں نے اور عمیر نے بھی لو میرج نہیں کی تھی۔ نورین کی طرح مجھے بھی صرف فیصلہ سنایا گیا تھا۔“

”محبت۔۔۔ مما محبت۔۔۔ پاپا نے آپ کو محبت، اعتماد

اور وفا سب ہی کچھ دیا تھا۔“

”نورین کو بھی یہی سب ملتا وہ انتظار تو کرتی۔ جہشید

کو تھوڑا وقت تو دیتی۔ جو عورت اپنے اندر ایک نئے

وجود کی پرورش کر سکتی ہے، وہ ایک مرد کی محبت کا رخ

اپنی طرف نہیں موڑ سکتی۔“

”یہ کوئی دلیل نہیں ہے مما! ورنہ دنیا کی کوئی

عورت نا آسودہ زندگی نہیں گزارے۔ آپ کو ماننا ہو گا

کہ نورین! آئی کے ساتھ زیادتی ہوئی تھی۔“

”اس سے زیادہ اس نے خود پر ظلم کیا ہے۔ وہ

تھوڑی سی سمجھ داری سے کام لیتی تو آج وقت کوئی اور

ہی کہانی لکھ رہا ہوتا مگر نورین وہ چنگاری بن گئی جو گندم

کے سارے کھیت کو جلا کر رکھ کر دیتی ہے۔“

انہوں نے خاموشی سے ماضی کا ایک نیا ورق کھول

کر زارا کے سامنے رکھ دیا۔

♥ ♥ ♥ ♥

”ازایلا کون ہے۔۔۔؟“

نورین ابھی ابھی آئی تھی چھوٹے ہی پوچھنے لگی۔

اس کا تجسس۔۔۔ عمیر کو چائے دیتی آئمہ ایک پل کو

گزر رہی تھی۔ عمیر نے کپ تھام کر نورین کو دیکھا اور

مسکرا دیے۔

”آئی! صبح اور اتنا غصہ۔۔۔؟“

”میں اس سے پوچھنے آئی ہوں ازایلا کون

ہے۔۔۔؟“ اس نے انگلی اٹھا کر آئمہ کی طرف اشارہ

کیا۔ خاصا تو بہن آمیز انداز تھا اس کا۔ شادی سے قبل

خاصی دوستی تھی دونوں میں۔ مگر اب لگتا تھا وہ صرف

اس کی نند اور بھابی بن کر رہ گئی ہے۔ ازایلا ایک

یسودی لڑکی تھی جو مسلمان ہو گئی تھی۔ جہشید سے اس

کی ملاقات اسپین میں مسجد قرطبہ میں ہوئی تھی۔

سیاحت کا مشترکہ شوق ان دونوں کو قریب لے آیا۔

”دوست تھی جہشید کی۔۔۔ آئمہ نے آہستگی سے



بتایا۔ نورین ہر روز ایک نیا پرابلم کھڑا کر دیتی تھی اور آئمہ براہ راست اس کی زد میں آتی تھی۔  
”شادی کرنا چاہتا تھا اس سے؟“ وہ چھٹے ہوئے  
لہجے میں پوچھنے لگی۔

”نورین! شادی تو اس کی تم ہی سے ہوئی نا۔۔۔“  
عمیر نے رسائیت سے کہا۔  
”تو پھر یہ کیا ہے۔۔۔؟“ اس نے چند لفافے سامنے  
میز پر پھینکے۔ آئمہ سر تھام کر رہ گئی۔ عمیر نے  
لفافہ اٹھا کر دیکھا۔

”پرانے ہیں شادی سے پہلے کے۔ فرینڈز کے  
درمیان خط و کتابت تو ہوتی ہی ہے۔“ عمیر مطمئن  
سے لہجے میں بولے۔ جمشید ان کا بیسٹ فرینڈ تھا اور وہ  
اس کے ماضی کے ایک ایک لمحے سے واقف۔  
”تو پھر سنبھال کر کیوں رکھے ہیں اس نے۔۔۔“ وہ  
چلائی۔

”وہ اپنی ہر چیز بونہی سنبھال کر رکھتا ہے۔۔۔“  
نورین نے ایک نظر انہیں دیکھا پھر جھپٹ کر خط  
اٹھا لیے۔

”میں دادا جان سے بات کروں گی۔“  
آئمہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر روکا۔  
”نورین اس پر اعتبار تو کرو۔ وہ شوہر ہے تمہارا۔  
یوں ہر کسی کے سامنے اسے ڈی گریڈ مت کرو۔“  
”تم تو کموگی آئمہ۔ بھائی ہے نا تمہارا۔“ وہ زہر خند  
لہجے میں بولی۔

”اور تم میری بہنوں جیسی ہو۔ اسے اگر ازایلا سے  
شادی کرنا ہوتی تو کون روک سکتا تھا۔“  
”تم۔۔۔ تم تھیں نا اس کی سب سے بڑی  
مجبوری۔۔۔“ وہ ہاتھ چھڑا کر کئی قدم پیچھے ہٹی۔ ”ورنہ  
وہ مجھ سے شادی نہیں کرنا چاہتا تھا۔“  
”لیکن وجہ ازایلا نہیں تھی۔“

”میں کئی سال بڑی تھی اس سے۔۔۔“  
آئمہ بے بس سی ہو گئی۔

”اسے موقع تو دو نورین۔“  
”کس بات کا کہ وہ ازایلا سے شادی کر لے۔۔۔“

لیکن میں اسے کوئی موقعہ نہیں دوں گی۔“ وہ متفر سے  
لہجے میں کہہ کر باہر نکل گئی۔  
”عمیر! نورین کو کیا ہو گیا ہے۔“

”ٹھیک ہو جائے گی۔ ڈونٹ وری۔۔۔“ عمیر نے  
تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ لیکن نورین نے یہ خط لے  
جا کر دادا جان کو دے دیے تھے۔ اکبر علی نے وہ خط  
پڑھے بغیر کئی ٹکڑے کر دیے۔

”ماضی کو مت کریدو۔ تم جمشید کا حال بھی ہو اور  
مستقبل بھی۔“

انہوں نے بات ہی ختم کر دی۔ لیکن نورین کے  
لیے یہ بات ختم کرنا آسان نہ تھا۔ وہ ازایلا کا نام لے کر  
جمشید کو بہت دنوں تک تنگ کرتی رہی اور جمشید کے  
پاس واحد حل یہی ہوتا تھا کہ وہ کسی نئے علاقے کی  
سیاحت کو نکل جائے۔ وہ نورین پر سختی کر سکتا تھا مگر  
اس صورت میں آئمہ کے لیے پرابلم ہو سکتی تھی۔  
وٹے ٹٹے کی اس شادی نے اسے ایک بڑی مصیبت  
اور ٹینشن میں مبتلا کر دیا تھا۔ نورین کے اپنے  
کمپلیکسز نے اسے ایک شکی مزاج عورت کا روپ  
دے دیا تھا۔ اس پر رائے نواز اور ان کی بیوی بھی  
نورین پر ہی اعتبار کرتیں۔ وہ جھوٹے سچے الزامات  
لگاتی تو ان لوگوں کے رویے آئمہ کے ساتھ تبدیل ہو  
جاتے۔ رائے اکبر اپنے بیمار وجود کے ساتھ حویلی کے  
ایک کمرے تک محدود تھے۔ ساری جاگیر عملی طور پر  
رائے نواز اور ان کے بیٹے سلیمان کے ہاتھوں میں  
تھی۔ عمیر اپنا بزنس شروع کر رہے تھے اور جمشید کو  
زمینوں کے معاملات سے کوئی سروکار نہ تھا۔ رائے  
نواز اور سلیمان صحیح معنوں میں سیاہ سفید کے مالک  
تھے۔ سلیمان سولہ برس کا نوجوان تھا مگر اٹھان ایسی  
تھی کہ بیس سے کم نہ لگتا۔ پھر رائے نواز نے بہت  
شروع سے اسے اپنے ساتھ لگایا تھا۔ اسی لیے اس  
چھوٹی عمر میں وہ اپنے فیصلے خود کرنے کا عادی ہو گیا۔  
رائے عمیر اور رائے جمشید جن معاملات کے  
بارے میں ابھی اپنی رائے ہی دے رہے ہوتے وہ  
انہیں چٹکی بجاتے خل کر لیتا تھا۔ رائے عمیر اس کی



زیرک نگاہی اور خود اعتمادی کو ہمیشہ سراہتے ہوئے کہتے تھے۔  
”یہ ہمارے اجداد کا صحیح جانشین ثابت ہو گا۔“

”میں شرمناک ہوں۔“ جمشید نے رائے اکبر کو آگاہ کیا۔  
”کیوں؟“

”یہاں رہنا ممکن نہیں ہے دادا جان! نورین چھوٹی چھوٹی باتوں کو لے کر نت نئے پرابلمز پیدا کرتی ہے۔ آئمہ کے لیے ہر روز ایک نیا مسئلہ کھڑا ہو جاتا ہے۔ ہم لوگ دور ہوں گے تو۔“

”تو کیا مسئلے حل ہو جائیں گے۔“ آئمہ نے سب سے پہلے اختلاف کیا۔ ”یہاں تم سب کی نظروں کے سامنے رہتے ہو۔ نورین کا جھوٹ بچ فوراً سامنے آ جاتا ہے۔ وہاں سے تو نورین جو کچھ بھی کہے گی یہ لوگ اعتبار کر لیں گے۔ میرے لیے تو تب بھی مشکل ہی ہوگی۔“

”بس میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔ بھائی نواز نورین کو شہ دیے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر بلا کر باز پرس کرتے ہیں مجھ سے۔ انہیں کیا حق ہے ہم میاں بیوی کے جھگڑوں میں دخل دینے کا۔ یہ ٹھیک ہے کہ میں نورین سے شادی نہیں کرنا چاہتا تھا کیونکہ میں جانتا تھا صرف عمروں کا ہی نہیں سوچ کا بھی فرق ہے ہمارے درمیان۔ مگر دادا جان کی ضد۔“

”میں تو اس خاندان کو اور مضبوط کرنا چاہتا تھا۔“ وقت نے رائے اکبر جیسے انسان کو بے بس اور کمزور کر دیا تھا۔ جمشید نے ان کے ہاتھ تھام کر آنکھوں سے لگا لیے۔

”میرا گولو ہے میں نے بھی پوری ایمانداری سے آپ کے اس فیصلے کو اپنایا تھا۔ مگر وہ احساس کمتری میں مبتلا عورت۔ ہر حال میں خاندان ہی شریکے جانتے ہیں۔“

”اس مٹی سے اتنا دور مت جاؤ کہ یہ تمہیں قبول کرنے سے انکار کر دے۔ تم اس جاگیر کے وارثوں

میں سے ہو۔ یہ گاؤں یہاں کے لوگ تمہارے اپنے ہیں۔ ان کے قریب رہو۔ ان کے مسائل حل کرو کہ گل کو یہی لوگ تمہارے کام آئیں گے۔“  
”میں مجبور ہوں۔“

رائے نواز بھڑک اٹھے۔ نورین نے بھی ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ کسی کو ان کا فیصلہ پسند نہیں آیا تھا۔ عمیر خاموش رہے تھے۔ آئمہ نے پوچھا تو بس اتنا کہا۔

”میرے خیال میں یہی ٹھیک ہے۔“  
نورین رو رو کر یہی کہتی رہی کہ جمشید اسے شرلے جا کر مار ڈالے گا۔ عمیر نے سنا تو اسے ڈانٹ دیا۔ وہ مزید آئمہ کے خلاف ہو گئی۔ اس کے خیال میں یہ سب آئمہ کی شر پر ہو رہا ہے۔

”اگر میں سکون سے نہ رہی تو تمہیں بھی چین نہیں لینے دوں گی۔“  
”عورت کا سکون شوہر کی محبت میں نہیں ہے نورین! اسے سمجھنے اور اپنانے کی کوشش کرو۔ وہ تم سے مخلص ہے۔ تمہاری یہ حرکتیں اسے تم سے دور کر دیں گی۔“

آئمہ نے اسے گلے لگا کر رومانیت سے سمجھایا مگر نورین نے اسے پیچھے ہٹا دیا۔  
”جو پاس ہی نہیں۔ اس کے دور جانے کا کیا خوف۔“

آئمہ طویل سانس لے کر رہ گئی۔ نورین کو سمجھانا بہت مشکل تھا۔ کچھ عرصہ سکون سے گزر رہی مگر نورین کے دل میں جو بات بیٹھ گئی تھی اسے نکالنا ممکن نہ ہو سکا۔ جمشید کی بھرپور توجہ بھی اس کے دل میں لگی گرہ نہ کھول سکی کہ جمشید نے اس سے شادی سے انکار کیا تھا اور وہ محض آئمہ کی وجہ سے مجبور ہوا تھا۔ یہ

حقیقت سہی مگر بعد کے حالات بگڑنے میں جمشید سے زیادہ نورین کا ہاتھ تھا یا شاید جمشید ہی اسے یہ یقین دلانے میں ناکام رہا تھا کہ وہ اس سے شادی کے بعد خوش ہے۔

نورین پھر روٹھ رہی تھی۔

نورین پھر روٹھ رہی تھی۔

”گئی ہے وہ چیل واپس۔“  
”کون؟“ آئمہ زارا کو پالنے میں لگا کر اس کی طرف لپکی۔  
”میری سو کن از ایلا۔“ وہ دادا کی پٹی سے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

”میں جمشید کو فون کرتی ہوں۔“ آئمہ گھبرا کر فون کی طرف لپکی۔  
جمشید ہنس دیا۔

”ہاں۔ آئی ہے از ایلا پاکستان۔ لیکن میری محبت میں نہیں۔ کے نوکی محبت میں۔“  
”مطلب۔۔۔؟“

”وہ ایک کوہ پیما ٹیم کے ساتھ آئی ہے اور اس کی منزل کے۔ نوکی چوٹی ہے۔ میرا دل نہیں۔“  
”جمشید! مذاق کا وقت نہیں ہے۔ نورین نے یہاں آ کر نجانے کیا کیا کہا ہے۔ بھائی نواز بہت غصے میں ہیں۔“

”اور عمیر۔۔۔“  
”تمہیں تو پتا ہے وہ کتنے ٹھنڈے دماغ کے انسان ہیں۔ جب تک ہر معاملہ صاف ہو کر سامنے نہیں آجائے گا۔ وہ کچھ نہیں کہیں گے۔“  
”تو پھر فکر کس بات کی۔“

”جمشید! تم جانتے ہو نورین کس حالت میں ہے۔“  
”جانتا ہوں۔“ وہ ایک طویل سانس لے کر رہ گئے۔ ”لیکن لگتا ہے نورین کو اس کا احساس نہیں اسے اپنے ہونے والے بچے کی کوئی پروا نہیں ہے۔“

”جمشید! تم تھوڑی احتیاط۔“  
”احتیاط۔ آئمہ! جنم بنا دی ہے اس نے میری زندگی۔ وہ ایک ضدی اور غصیلی مزاج عورت ہے۔ اب اتنی دور سے از ایلا ایک رات نے دوست سے ملنے چلی آئی تو میں کیا ملنے سے انکار کر دوں۔ یہ میرے لیے ممکن نہیں۔“ اس نے ٹھوس لہجے میں کہہ کر بات ہی ختم کر دی۔

”اچھا تم حویلی تو آؤ۔“

”اچھا تم حویلی تو آؤ۔“

”آنا تو پڑے گا۔“ وہ زریب پر ہنسیا تھا۔ آئمہ کے دل کو تاسف نے گھیر لیا۔ اس کی وجہ سے جمشید کو کیا کچھ برداشت کرنا پڑ رہا تھا۔

”اس سے پوچھیں یہ ہماری بہن کو بسانا چاہتا ہے یا نہیں۔۔۔؟“ رائے نواز کا لہجہ سخت تھا۔ جیسے کوئی فیصلہ کر لینا چاہتے ہوں۔

”پہلے یہ سوال اپنی بہن سے کریں۔ وہ بسنا چاہتی ہے یا نہیں۔۔۔“ جمشید اس ساری صورتحال سے آگاہ چکا تھا۔ رائے اکبر نے بے بسی سے انہیں ایک دوسرے سے لڑتے جھگڑتے دیکھا۔

”میں نے یہ رشتے تم لوگوں کو جوڑنے کے لیے باندھے تھے۔“  
”میں چلتا ہوں۔ نورین کو چلنا ہے تو تیار ہو جائے۔“ وہ بات سمیٹ کر کھڑا ہو گیا۔

”انداز دیکھا ہے اس کا۔ ہماری بہن بھاری نہیں ہے۔ وہ نہیں جائے گی جب تک فیصلہ نہ ہو جائے۔“  
رائے نواز تلملا کر بولا۔

جمشید نے ایک نظر سب پر ڈالی۔  
”ٹھیک ہے، کیسا فیصلہ قبول ہو گا آپ لوگوں کو۔“  
طلاق چاہیے۔۔۔ میں طلاق دے دیتا ہوں۔

”رائے جمشید۔۔۔! بوڑھے شیر کی دھماڑ پر حویلی کے دروازے پر لرز گئے۔ رائے اکبر اپنے کپکپاتے وجود کے ساتھ اٹھ بیٹھے۔ ایک پل کو سب ہی خاموش ہو گئے۔

”یہ مت بھولو کہ تمہارے اس فیصلے کی زد میں تمہاری بہن بھی آسکتی ہے۔“ رائے نواز نے پھنکارتے ہوئے لہجے میں کہا۔ آئمہ نے دل کر عمیر کو دیکھا۔

”مجھے اس معاملے میں کھینچنے کی ضرورت نہیں۔ مجھے آئمہ سے کوئی شکایت نہیں۔“  
”فیصلہ ہو گا تو دونوں طرف سے ہو گا۔“ رائے نواز قطعی انداز میں بولے۔ رائے اکبر نے خشکیں لگا ہوں سے سب کو کھوڑا۔



”تم کون ہوتے ہو فیصلہ کرنے والے میں ابھی مرا نہیں ہوں اور تمہیں۔“ انہوں نے انگلی اٹھا کر جمشید کی طرف اشارہ کیا۔

”تم دفع ہو جاؤ یہاں سے اور جب تک تمہارا دل ٹھنڈا نہیں ہو جاتا۔ یہاں مت آنا۔“

وہ اب تک جمشید کا ساتھ دے رہے تھے۔ مگر اس کی طلاق والی بات نے انہیں جمشید کے خلاف کر دیا۔ جمشید پھر آیا ہی نہیں۔ عمیر نے بالائی بالائی اس سے رابطہ کر کے سمجھانے کی کوشش کی۔

”میں نورین کو تھوڑا وقت دینا چاہتا ہوں۔ اسے احساس تو ہو کہ اس کی ہٹ دھرمی اور ضد اس کا گھرتا ہ کر سکتی ہے۔“

نورین کو اس کا احساس تو تھا مگر وہ الزام اب بھی جمشید ہی کو دیتی تھی۔ ہمہ وقت روتی رہتی یا آئمہ سے جھگڑتی رہتی۔ ڈاکٹر کہتے۔ اس کی حالت ٹھیک نہیں اسے خوش رہنا چاہیے۔ جمشید مصر جلا گیا تھا۔

”اسے میرا پروا نہیں۔ اپنی آوارگی سے پیار ہے۔“

اور جب وہ لوٹا تو نورین کی شکوہ لیے منوں مٹی تلے جاسوئی تھی اور ایک ننھا سا وجود اس کی راہ تک رہا تھا۔ حویلی کے درو دیوار میں اس کے لیے نفرت کے سوا کچھ باقی نہ تھا۔

”یہ یہاں کیوں آتا ہے۔؟“ رائے نواز اس کی شکل دیکھتا بھی نہیں چاہتے تھے اور ان کا پر تو سلیمان اس سے بات بھی نہ کرنا۔

”اسے منع کریں۔ مت آیا کرے یہاں۔۔۔“ انہوں نے دادا سے مطالبہ کیا۔

”میں اسے کیسے روک سکتا ہوں۔ وہ اس حویلی کے وارثوں میں سے ہے۔ اس جاگیر میں تم دونوں کے برابر اس ایک آگے کا حصہ ہے۔“ انہوں نے جواب دیا تھا۔

جمشید خاموشی سے آئمہ زار سے کھیلنا زین العابدین کو پیار کرتا اور واپس چلا جاتا۔ اس حویلی کے لوگ اس سے ویسا ہی سلوک کرتے جیسا ایک اجنبی

کے ساتھ کیا جاتا۔ آئمہ کا دل اس کی حالت دیکھ کر کڑھتا۔

”جمشید کو سمجھاؤ۔ یہاں رہے اپنی جاگیر سنبھالے۔ یہ آوارگی اسے کچھ نہیں دے گی۔ صاحب اولاد ہے وہ۔ اپنی اولاد کے لیے سنبھال جائے ورنہ نقصان اٹھائے گا۔“

رائے اکبر آئمہ سے کہتے۔ وہ اپنے بستر پر پڑے پڑے آنے والے وقت کی آٹھیں سن رہے تھے۔ جو کوئی اچھی نوید نہیں سناتی تھیں۔

”وہ تمہاری بات نہیں سنتا تو اسے میرے پاس بھیجو۔“

لیکن تقدیر نے انہیں مہلت ہی نہیں دی کہ وہ اسے سمجھا سکیں۔ رائے اکبر کی وفات ایک مرکز کے ٹوٹ جانے کے مترادف تھی۔ رائے نواز اور سلیمان کے پاس مکمل اختیارات آگئے تھے۔ رائے عمیر یوں بھی جاگیر کے معاملوں میں دخل نہیں دیتے تھے۔

♥ ♥ ♥ ♥

رضوان بورڈنگ سے جب بھی گھر آتا، زارا کے لیے چاکلیٹ اور چھوٹے چھوٹے کھلونے لایا کرتا تھا۔ اس کی دونوں بڑی بہنیں مریم اور عائشہ کبھی کبھی خفا ہو کر پوچھتیں۔

”رضوان ہمارے لیے کیوں نہیں لاتے۔“ تو ہاتھ اٹھا کر ایک اسٹائل سے کہتا۔

”تم کوئی بچی ہو جو کھلونوں سے کھیلو گی۔“

”اور زارا۔۔۔“

”شی ازہائی بیسٹ فرینڈ۔“ بہت متانت سے جواب ملتا۔ شروع شروع میں اسے زارا سے بہت الجھن ہوتی تھی۔

”یہ کیسی گڑیا ہے۔ سارا دن یا سوتی رہتی ہے یا روتی رہتی ہے۔“

مگر جیسے ہی اس نے چلنا سیکھا اور چھوٹی چھوٹی باتیں کرنا سیکھیں۔ اسے گویا کھیلنے کے لیے ایک جیتا جاگتا کھلونا مل گیا تھا کسا سے گاؤں میں عام بچوں کے ساتھ کھیلنے کی اجازت نہیں تھی۔ سلیمان سے وہ ڈرتا

تھا۔ مریم اور عائشہ بھی اس سے خاصی بڑی تھیں۔ عائشہ کے ساتھ اکثر لڑائی ہی رہتی تھی۔ اب زارا کو وہ چاکلیٹ لا کر دیتا اور اپنی سائیکل پر بٹھا کر سیر بھی کرواتا تھا۔ زین پیدا ہوا تو اسے ایک ہی جلدی تھی کہ وہ زارا کی طرح باتیں کب کرے گا اور چلنا کب سیکھے گا۔ اسے یقین تھا کہ زین العابدین کے ساتھ اس کی دوستی زارا سے زیادہ ہوگی کیونکہ وہ لڑکا تھا۔ اس بار وہ گھرتا تو زارا کی چیزوں کے ساتھ ایک چھوٹا سا بھالو علیحدہ سے پیک تھا۔

”اسے مت کھولیں امی۔۔۔“ جیسے ہی اس کی امی نے اسے ہاتھ میں لیا۔ وہ فوراً ہی بول اٹھا۔

”یہ کس کے لیے ہے؟“

”زین کے لیے۔“ چاکلیٹ کا رپر کھول کر زارا کے ہاتھ میں دیتے ہوئے اس نے مصروف سے انداز میں بتایا۔ زین ہمک ہمک کر زارا کے ہاتھ سے چاکلیٹ چھیننے کی کوشش کر رہا تھا۔

”لیکن آپ کو تو زین بہت برا لگتا تھا۔“ اس کی امی نے مسکرا کر کہا۔

”اب یہ اچھا ہو گیا ہے۔“ اس نے زین کا گال کھینچا۔ پھر بھالو کی پینٹنگ کھولنے لگا۔

”رضوان تو بالکل اپنے چچا پر بڑا ہے۔ سنا ہے عمیر بھی ایسا ہی کیئرنگ ہوا کرتا تھا۔“ اس کی امی ہنس دی تھیں۔

”ہوا کرتا تھا۔۔۔“ عمیر نے مسکرا کر ان کا جملہ دہرایا۔ ”بھابھی! میں اب بھی ویسا ہی کیئرنگ ہوں۔“

کیوں جمشید۔۔۔؟“ انہوں نے خاموش اور گرم سم بیٹھے جمشید کو پکارا تو وہ چونک گیا۔

”بھول۔۔۔“

”کن سوچوں میں ہو یا۔۔۔؟“ ایک عمیر تھا جس کا رویہ نورین کے بعد بھی نارمل رہا تھا۔

”مجھے کچھ رقم کی ضرورت ہے۔“ جمشید نے آہستگی سے بتایا۔

”ہاں تو اپنا اکاؤنٹ چیک کرو۔ ابھی۔۔۔“

”اس میں ایک پیسہ بھی نہیں ہے۔“ جمشید

نے بات قطع کی۔ اس کے لہجے میں دبا دبا سا غصہ تھا۔ ”یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ نواز بھائی ہمیشہ زمینوں کی آمدنی میں سے میرا اور تمہارا حصہ ہمارے اکاؤنٹس میں جمع کروا دیتے ہیں۔“ عمیر نے قدرے حیرت سے اسے دیکھا۔ آئمہ بھی ان کی طرف متوجہ ہو گئی۔

”میرے اکاؤنٹ میں پچھلے ایک سال سے کوئی پیسہ نہیں ہے۔“ جمشید نے زور دے کر کہا۔

”میں نواز بھائی سے بات کروں گا۔“

”وہ کہتے ہیں جمشید ان کے ساتھ مل کر جاگیر سنبھالے۔“ رضوان کی امی نے آہستہ سے بتایا۔

”تو آپ کو معلوم تھا کہ۔۔۔“ آئمہ نے پلٹ کر انہیں دیکھا۔

”میں نے سلیمان اور اس کے ابو کی باتیں سنی تھیں۔“

”جو وہ سوچ رہے ہیں وہ غلط تو نہیں ہے جمشید! تم ان کے ساتھ مل کر کام کیوں نہیں کرتے جاگیر کے سو مسئلے اور جھگڑے ہوتے ہیں۔“ عمیر نے کہا تو آئمہ بول اٹھی۔

”عمیر! نواز بھائی یہ بات جمشید سے براہ راست کر سکتے تھے یہ تو کوئی طریقہ نہیں ہے۔“

”وہ صرف مجھے تنگ کرنا چاہتا ہے اور بس۔۔۔“ جمشید بڑبڑایا۔

”تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے جمشید۔“

”غلط فہمی تمہیں ہے عمیر! کیونکہ تم ہفتے میں چھ دن شرمیں گزارتے ہو۔ تم نے ان کی آنکھوں میں وہ نفرت و حقارت نہیں دیکھی جو صرف مجھے دیکھ کر ابھرتی ہے۔ پچھلے ایک سال سے جو سلوک میرے ساتھ اس گھر میں روا رکھا گیا ہے وہ صرف میں نے برداشت کیا ہے اور وہ میرا بھتیجا سلیمان جو مجھ سے زیادہ اختیارات رکھتا ہے اور جسے یہ گمان ہے کہ وہ مجھ سے بلکہ اپنے باپ سے بھی بہتر فیصلہ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ سیاہ و سفید کا مالک جتنا بیضا ہے۔“

”مجھ سے بات کرنے کا بھی روادار نہیں ہو۔“

”جمشید! آرام سے یا رہیں یا۔۔۔“

”جمشید! آرام سے یا رہیں یا۔۔۔“

”جمشید! آرام سے یا رہیں یا۔۔۔“



”برداشت کی ایک حد ہوتی ہے عمیر۔۔۔“ وہ ایک جھکے سے کھڑا ہو گیا۔ ”اور آج یہ حد ختم ہو گئی ہے۔“

”جہشیدہ یارا تم ہر فیصلہ جذباتی ہو کر کرتے ہو۔“ عمیر نے اسے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔ ”تم اسے جو بھی کہو لیکن مجھے۔۔۔ جائیداد میں اپنا حصہ چاہیے۔“

گزشتہ تین سالوں نے اسے کس مقام پر لا کھڑا کیا تھا کہ وہ خود کو ان سے الگ سمجھنے لگا تھا۔ ”اس سے کہنا دن میں خواب دیکھنا چھوڑ دے۔“ رائے نواز کا لہجہ استہزاء سے بھرا تھا۔

”نواز بھائی! آپ بھی اپنے روتے پر غور کریں۔ کیا ضرورت تھی جہشیدہ کے ساتھ یہ سب کرنے کی۔“ اس نے ہماری بہن کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ بھول گئے ہوتے۔

”نورین نے بھی کوئی اچھا سلوک نہیں کیا تھا اس کے ساتھ اور آپ۔ آپ نے ہر بار اسے شہ دی۔“ ”تمہارے منہ میں تمہاری بیوی کی زبان ہے۔“

”آئمہ کو درمیان میں مت لائیں۔ مجھے صرف اتنا کہنا ہے یا تو آپ جہشیدہ کے ساتھ اپنا روتہ تبدیل کر لیں یا پھر۔۔۔“

”جائیداد نہ تو پہلے تقسیم ہوئی تھی اور نہ اب ہو گی۔“ رائے نواز نے ہاتھ اٹھا کر قطعی لہجے میں کہا۔ حالات بگڑنے تھے بگڑتے چلے گئے۔ رائے نیلی کی محبت اور اتحاد جو لوگوں کے لیے مثال بن گیا تھا۔ نوٹ کر نکھر گیا۔ رائے نواز نہ تو اپنا رویہ تبدیل کر سکے اور نہ ہی جائیداد تقسیم۔ ان کی نظروں کے سامنے اپنی بہن کی نا آسودہ اور روتی بلکتی زندگی آجاتی۔ ہر کوئی

رائے عمیر نہیں ہو سکتا۔ خون کے رشتوں سے بالاتر ہو کر حالات و واقعات کا مجزیہ کر سکے۔ جہشیدہ زین کو لے گیا۔ رائے نواز بھڑک گیا۔ وہ اس حویلی میں قدم نہیں رکھے گا اور نہ یہاں کا کوئی فرد اس سے ملنے جائے گا۔

”بالکل ٹھیک ہے، بلکہ خاصا سمجھ دار بھی ہو گیا ہے۔ آپ اس کی باتیں سنیں گی تو حیران ہو جائیں گے۔“

بے بسی سے عمیر کو دیکھ کر رہ گئی۔ عمیر نے اس کا کندھا تھپتھپایا تھا۔ کبھی کبھی عمیر کو لگتا۔ رائے نواز اس معاملے کو جان بوجھ کر ابھار رہے ہیں۔

”امریکہ چلو گی۔“ آئمہ کو ہمہ وقت دیکھ کر انہوں نے پوچھا تھا۔ ”بہل جاؤ گی۔“ وہ بے زار تھی۔ مگر شیراز ہو سٹل سے آیا تو وہ بھی ضد کرنے لگا۔

”پاپا چلتے ہیں۔ بہت انجوائے کریں گے۔“ ”اور مجھے کیا معلوم تھا۔“ پیچھے یہ سب ہو جائے گا۔ سب کچھ ختم ہو گیا اور حویلی، جاگیر کا انتظام سلیمان کے ہاتھ میں تھا۔ وہ واقعی رائے نواز کا صحیح جانشین ثابت ہوا۔

آئمہ ایک جھرجھری لے کر ماضی کی دلدل سے باہر نکلیں۔ ”پاپا نے ہر موقع پر آپ کا ساتھ دیا تھا۔“ زارا ایک طویل سانس لے کر بولی۔

”ہاں۔ انہوں نے ہمیشہ میرا ہان رکھا تھا۔ بس میں ہی ان پر اعتماد نہ کر سکی۔“ ایک پچھتاوا تھا جو ہمیشہ ان کے ساتھ رہتا۔ ”میں نے ان سے کہا ”عمیر! مجھے کہیں دور لے چلو۔ میرا اس حویلی میں دم گھٹتا ہے۔“

”ہم نہیں رہ سکتی یہاں۔“ ”ہم شہر چلے جائیں۔“ ”رائے ہاؤس میں۔۔۔ نہیں۔۔۔ ان سب سے الگ۔ سب سے دور۔“ اور انہوں نے الگ سے گھر لے لیا۔ سب کی مخالفت کے باوجود۔ کبھی کبھی مجھے خیال آتا ہے، ہم زین کے معاملے میں انہیں اعتماد میں لے لیتے تو شاید۔۔۔ انہیں یہ احساس تو نہ ہوتا کہ ہم۔۔۔

”مما۔۔۔“ زارا نے انہیں دونوں بازوؤں کے گھیرے میں لے لیا۔ ”بہت رات ہو گئی ہے۔ اب سو جائیں۔ صبح آپ کی زین سے بات کرواؤں گی۔“

”وہ ٹھیک تو ہے نا۔“ ”بالکل ٹھیک ہے، بلکہ خاصا سمجھ دار بھی ہو گیا ہے۔ آپ اس کی باتیں سنیں گی تو حیران ہو جائیں گے۔“

”کچھ دن رکوں گی۔“ اس نے مختصراً بتایا۔ ”اب کیا ارادہ ہے تمہارا۔۔۔“ ”شاہدوں کی ناشتہ کروں گی۔“

گی۔ ”وہ دن کا دھیان بٹا گئی۔“ ”انڈا اسے اپنی حفاظت میں رکھے۔“

رضوان نے دروازہ دھیرے سے ناک کیا۔ ”کون ہے۔۔۔؟“ اس کی سوئی جاگی سی آواز پر وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ ”ابھی تک بستر میں ہو۔“

بلیک پینٹ لائٹ گرین لائٹنگ والی شرٹ میں تروتازہ چہرہ بالوں میں نمی ابھی تک موجود تھی۔ اس کی آند کے ساتھ ہی کمرہ آفٹر شیو لوشن اور کلون کی خوشبو سے سارا کمرہ مہک اٹھا تھا۔

”آپ۔۔۔“ وہ بیک سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ غالب گمان یہی تھا کہ کوئی ملازمہ ہو گی۔ کچھ جھجک کر اس نے ٹیکے پر پراڈ پونڈ اوڑھا تھا۔

”ہم آپ کی طرح دیر تک بستر پر رہنے کی عیاشی انورڈ نہیں کر سکتے۔“ اس نے کرسی کھینچ کر بیڈ کے نزدیک کی۔ کی چین اور موبائل سائڈ ٹیبل پر رکھ کر بیٹھ گیا۔

”میں اور مہماریات کو کافی دیر تک باتیں کرتے رہے۔ بہت دیر سے سوئے تھے۔“ لمبے بکھرے بالوں کو اس نے ہاتھوں سے سمیٹنے کی کوشش کی۔ ”کمال ہے مجھ سے تو کبھی اتنی باتیں نہیں ہوئیں۔“ لمبے میں ہلکی سی شرارت اور چھیڑ چھی۔

”جوہن کے سمجھ لے۔ اس سے کیا بات ہو۔“ ”گویا میں ساری عمر ہی نقصان میں رہوں گا۔“ وہ ہر شے بولا۔ زارا مدھم سا مسکرا کر اٹھنے لگی۔ رضوان نے روک دیا پھر گھڑی پر نگاہ دوڑاتے ہوئے بولا۔

”میرے پاس صرف دس منٹ ہیں۔“ ”شرعاً ہے ہیں۔“ ”ہاں اور ممہ۔“ رضوان نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”کچھ دن رکوں گی۔“ اس نے مختصراً بتایا۔ ”اب کیا ارادہ ہے تمہارا۔۔۔“ ”شاہدوں کی ناشتہ کروں گی۔“

وہ کچھ لمبے متبسم نگاہوں سے اسے دیکھتا رہا۔ ”میں۔۔۔ مستقبل کے پلان پوچھ رہا ہوں۔“ ”تو یوں کہیں۔“ وہ کچھ جھل سی ہوئی۔

”ایگزٹم کے بعد کوئی اخبار جوائن کر لینا۔ کوئی بڑا پروجیکٹ شروع کرنے سے پہلے، تجربہ تو ہونا چاہیے۔“ ”میرا بھی یہی ارادہ ہے۔“

”اپنے ارادوں میں اس خاکسار کو بھی شامل کر لیں۔ ایک عرصے سے سرپا انتظار بنے بیٹھے ہیں۔“

وہ اس کی پر شوق نگاہوں سے بچ کر کھڑی ہو گئی۔ پھر گھڑی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی تھی۔ ”آپ کے دس منٹ ختم ہو گئے ہیں۔“

وہ بے ساختہ ہنسا۔ پھر اپنی چیزیں اٹھا کر کھڑا ہو گیا۔ ”میں تمہیں شیراز کے فون کے متعلق بتانے آیا تھا۔۔۔“ اس کے لمبے میں ہلکی سی سنجیدگی در آئی۔ ”کیا کہہ رہے تھے۔“

”رابعہ کے کچھ رشتے دار۔ شاید اس کے تایا کی فیملی۔۔۔ پاکستان شفٹ کر رہے ہیں تو شیراز چاہتا ہے۔“ وہ ایک لمبے کو خاموش ہوا۔ زارا مختصر نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ ”تم لوگوں کی کوٹھی انہیں کرایے پر دینا چاہتا ہے۔“

وہ ایک طویل سانس لے کر رہ گئی۔ ”مما سے بات کی۔۔۔؟“ ”نہیں۔۔۔“

زارا کچھ لمبے سوچتی رہی پھر سر جھٹک کر بولی تھی۔ ”ٹھیک ہے رضوان! گھر انسانوں سے بنتے ہیں۔ ان خالی دروازوں میں رکھا ہی کیا ہے۔“

اس کے لمبے میں ہلکی سی اداسی در آئی تھی۔ ”تم آئی سے بات کر لینا۔“ زارا نے اثبات میں سر ہلادیا۔ پھر اچانک اسے خیال آیا۔

”پاپا کی فیکٹری کون دیکھ رہا ہے رضوان۔۔۔؟“ ”تومہ داری اٹھائی ہے تو بھانوں گا بھی۔ سب کام



ٹھیک ٹھاک چل رہا ہے۔ تم فکر مت کرو۔“  
اس نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ پھر خدا حافظ کہہ کر  
باہر نکل گیا۔

”تمہارے ہوتے ہوئے مجھے فکر کرنے کی  
ضرورت ہی کیا۔“ وہ ایک خوشگوار سے احساس کے  
ساتھ بوڑھائی تھی۔

♥ ♥ ♥ ♥  
قاسم نے اس سے کہا بھی تھا۔ وہ کچھ لمحے آرام  
کر لے۔ زین مسکرا دیا۔  
”میرے پاس وقت نہیں۔“ کچھ لمحے خاموش  
رہنے کے بعد دوبارہ گویا ہوا۔ ”مجھے جلد واپس جانا ہے  
بہت کام ادا ہو رہے ہیں۔“

وہ دونوں باہر نکل گئے۔ گاؤں کی گلیوں میں گہرا گہری  
سی شروع ہو گئی تھی۔ گھروں کو لوٹتے کسان اور تیل  
گاڑیاں چارے سے لدی ہوئیں۔ دودھ کی پالٹیاں اٹھا  
کر احاطے سے واپس آئیں گندمی رنگت اور  
چھریں بے بدنوں والی عورتیں۔ بٹنے، اخروٹ اور بیٹ  
لے کر شور مچاتے چھوٹے بڑے بچے، کھلے دروازے،  
چولہوں سے اٹھتا دھواں، جھریوں زدہ چرواہے والے  
بابے جن کے چرواہے جھریوں میں صدیوں کا تجربہ بہتا  
تھا اور ان کی تازہ گرم کی چلیں اور ان سب کے  
درمیان خاموشی سے اترتی شام، تنور خوب گرم اور  
روشن تھا۔ اپنی اپنی باری کا انتظار کرتی عورتیں پرست،  
کنالی سنبھالے اپنی باتیں بھول کر پلٹ کر اسے دیکھنے  
لگتیں۔

”تمام کسانوں اور حویلی والوں کی زندگی میں بہت  
فرق ہو گا قاسم بھائی۔“

”زمین، آسمان کا۔ بادشاہت کرتے ہیں حویلی

والے اس گاؤں میں۔“

”آپ بھی ان ہی کی زمینیں کاشت کرتے

ہیں۔“

”کوہنوں کی ہیں۔ جات ہیں جات اور ہم کسی کی

زمینیں کاشت نہیں کرتے۔ تھوڑی سی پر اپنی

جے۔“ اس نے بے حد فخر سے بتایا تھا۔ زین مسکرا

دیا۔ وہ بے حد خاموشی سے ان لوگوں میں گھل مل جانا  
چاہتا تھا مگر یہ ممکن نہ تھا۔ وہ لوگ قاسم سے اس کا  
تعارف پوچھتے۔ پھر اپنے درمیان نمایاں جگہ دیتے۔  
ایک سہولت اسے ہوئی تھی کہ رائے عمیر کی وفات  
اور اس حوالے سے حویلی والے ابھی تک ان کا  
موضوع گفتگو تھے۔ نوجوان اس سے فری ہونا چاہتے  
مگر زین کی توجہ بزرگ تھے کہ جو کچھ زین معلوم کرنا  
چاہتا تھا اس کے بارے میں یہی بوڑھے اسے بتا سکتے  
تھے۔ گفتگو کا رخ پھر سے رائے نواز کی طرف ہوا تو  
زین نے سب سے حد احتیاط سے سوال کیا تھا۔

”رائے جمشید کون تھا۔۔۔۔۔؟“

”تھا ایک گھٹیا شخص۔۔۔۔۔“ کوئی جلد باز تنفر سے

لہجے میں بولا۔ زین کی کپٹیاں سلگ اٹھیں۔ اس نے

کڑے تیوروں سے کہنے والے کو دیکھا تھا۔ پھر لب

بھینچ کر ضبط کرتا چاچا خوشیا کی طرف متوجہ ہوا۔ جس

نے حقے کا لمبا کش لیا۔ پھر ہولے ہولے کھانسنے لگا۔

”چاچا! اب بس بھی کرو۔ تم تو لیٹی ہو جتنا لمبا

وقفہ دیتے ہو۔“ تنگ آکر چارپائی پر آکڑوں بیٹھے عباس

نے کہا تھا چاچے خوشیا نے اسے گھور کر دیکھا۔ پھر

ترخ کر بولا۔

”تیری گڈی نکلی چلی جا رہی ہے۔ چل اٹھ حقے

میں پانی ڈال کر لا۔۔۔۔۔“

”چاچا! اب حقہ چھوڑ بھی دے۔ کش تو تجھ سے

لگتا نہیں۔“ آدھا دم تیرا نے میں اٹک کر رہ جاتا

ہے۔“ عباس اٹھتے ہوئے بولا۔ چاچے نے جھک کر

اپنا کھتہ اٹھالیا۔ عباس حقے سمیت عقب میں کھلے

دروازے میں غائب ہو گیا۔ چاچا اپنی پہلی بات بھول

گیا تھا۔ اس نے اپنی جوانی کا کوئی قصہ شروع کر دیا۔

جس میں لوگوں کو زیادہ دلچسپی تھی۔ بہ نسبت رائے

جمشید کے۔ زین بات کا رخ نہ بدل سکا تو آکٹا کر اٹھ

گیا۔

گلیوں میں اندھیرا کھیلنے لگا تھا۔ کسی کسی گھر کے

سامنے جلتے پیلے کی زردو لکڑی سی روشنی رستے کی نشان

دہی کر رہی تھی۔ زین نے پلٹ کر درو حویلی میں چلتی

روشنیوں کو دیکھا۔

وہاں پچھو تھیں۔۔۔ اور شاید زارا بھی۔

اتنے قریبی رشتے اور اتنے ہی دور۔

”اے کاش۔۔۔۔۔“ اس نے طویل سانس کھینچی۔

قاسم چونک سا گیا۔

”کیا ہوا۔۔۔۔۔؟“

”کچھ نہیں۔ گھر چلتے ہیں۔“

”ہاں۔۔۔۔۔“ تمہاری بھر جاتی تو مجھ پر برس پڑے گی۔

کھانا رکھے کب سے انتظار کر رہی ہو گی۔“

”آپ کے بچے بھی ہیں۔“

”ایک ہی بچہ ہے محمد علی۔۔۔۔۔“

چھوٹی چھوٹی باتوں میں رستہ کٹ گیا۔ زین بیٹھک

میں ہی رک گیا۔ قاسم اندر چلا گیا۔ ابا چارپائی پر بیٹھا

پلاؤ کھا رہا تھا۔

”مسلم ابابا۔۔۔۔۔!“

”و علیکم السلام! کب آئے شہر۔۔۔۔۔“

”شام کو ہی آ گیا ابابا۔۔۔۔۔“

”سننا ہے کوئی مہمان ہے تیرے ساتھ۔۔۔۔۔“

”ہاں ابا مہمان تو ہے دوست سمجھ لے میرا۔ اسماء

کھانا تیار ہے۔“ اس نے چولہے کے پاس بیٹھی بیوی

سے پوچھا۔

”ٹھنڈا بھی ہو گیا۔ میں کب سے انتظار کر رہی

ہوں۔“ اسماء نے کہا اور سلگتی ہوئی لکڑیوں کو پھونکیں

مار مار کر آگ جلانے لگی۔

”مہمان کو ادھر ہی بلا لو۔ ہاتھ دھو لے۔“

”اچھا ابابا۔۔۔۔۔!“ قاسم اٹھ کر بیٹھک کے دروازے

تک آیا۔ ”آجاؤ یا ر۔ ادھر گاؤں میں کوئی پردہ نہیں

آتا۔ ادھر صحن میں بیٹھ کر کھانا کھاتے ہیں۔“

زین نے کتاب واپس بیگ میں رکھی اور اٹھ آیا۔

”ادھر نکلے رہا تھو دھولو۔“ قاسم خاصی بے تکلفی

کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ زین نے صحن میں قدم رکھا۔ نین

تارہ گلاس نے کر کمرے سے نکلی تھی۔ نگاہ سیدھی

بیٹھک کے دروازے تک گئی۔ گلاس ہاتھ سے چھوٹا

تھا۔ اس شخص کو اس نے غور سے نہیں دیکھا مگر وہ

اسے لاکھوں میں پہچان سکتی تھی۔ سب ہی نے پلٹ  
کر اسے دیکھا۔ خوف کے منہب سائے اس کی  
آنکھوں میں لہرائے۔ دوسرے پل وہ بھاگتی ہوئی اندر  
چلی گئی۔ مائے مقبول کے ہاتھ سے بھی نوالہ چھوٹ  
گیا۔

”تم۔۔۔۔۔“ ساکت کھڑے زین کے وجود میں جنبش  
ہوئی۔

”بھی۔۔۔۔۔“ ابھی جو لڑکی بھاگ کر اندر گئی۔ اسے

شک سا ہوا تھا۔ پھر اس نے ملگبی روشنی میں اس

بوڑھے کو بھی پہچان لیا تھا۔

اسے بھولی نہیں تھی اماوس کی رات جیسی گہری

اور سہمی آنکھیں۔ مگر اس کے گمان میں بھی نہ تھا

وقت انہیں پھر ایک دوسرے کے مقابل لے آئے

گا۔

(باقی سہندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

خواتین ڈائجسٹ کے شائع کردہ

چارتے اور خوبصورت

ناول

دل، دیبا، دہلیز، رفعت سران 600 روپے

وہ خبیثی سی دیوانی سی آریہ سیم قریشی 400 روپے

جو چلے تو جاں سے گزر گئے، ماہک 150 روپے

ساگر، دریا، بادل، بلوند، رضیہ میں 250 روپے

قیمت، جنگی سی آرڈر یا بیک ڈرافٹ سے بھرتی

ڈاک خرچ اور پکنگ فری

منگوانے کا پتہ

• مکتبہ عمران ڈائجسٹ 37 اردو بازار کراچی

• لاہور اکڈمی 205 سرگرم روڈ لاہور

•

•

•



”تم یہاں کیوں آئے ہو؟“ وہ پلیٹ ہاتھ سے رکھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی آنکھوں اور چہرے کے ہر ہر انداز سے غصہ، ناگواری اور سختی مترشح تھی۔ زین نے کچھ خفیف سا ہو کر قاسم کو دیکھا۔ جبکہ مائے مقبول نے اپنی بات کو دوبارہ قدرے بلند آواز میں دہرایا تھا۔ اس کی آواز غصے سے لرز رہی تھی۔ متحیر سا قاسم ذرا آگے ہوا۔ اسماء کے مصروف ہاتھ بھی رک گئے تھے۔

”ابا! مہمان ہے میرا۔“

”مہمان نہیں ہے یہ۔ یہ تو۔“ کچھ کہنے کی کوشش میں وہ لب بلبھٹ کر رہ گیا۔ کچھ لمحے زین کو بونسی گھورتا رہا۔ پھر ایک جھٹکے سے صافہ کندھے پر ڈال کر باہر نکل گیا۔ قاسم الجھ کر زین کی طرف پلٹا۔

”اے کو کیا ہوا؟“

زین اسے دیکھ کر رہ گیا۔ وہ کیا جواب دیتا۔

”تم دونوں جانتے ہو ایک دوسرے کو؟“ قاسم نے اگلا سوال کیا۔

”ہاں۔ ایک بار ملاقات تو ہوئی تھی۔“ زین اب آگے کے متعلق سوچ رہا تھا۔ شاید اب وہ اس گھر میں نہ ٹھہر سکے۔

”کہاں؟“ قاسم نے پوچھا اور ساتھ ہی بیوی کو کھانا لگانے کا اشارہ کیا۔ وہ قریب آئی اور مائے مقبول کی چھوڑی ہوئی پلیٹ اٹھا کر چلی گئی۔ مگر پلٹنے سے قبل بظاہر سرسری مگر غور زین کو دیکھا تھا۔

”بس یونسی سر راہ۔۔۔ تھوڑا سا جھگڑا ہو گیا تھا۔“

زین نے بتانا مناسب نہیں سمجھا ماما مقبول چاہتا تو بتا دیتا۔

”اچھا۔۔۔ اچھا تم جتنی توجہ اسماء جلدی کرو۔“ قاسم کے لئے پروہ بیٹھ کر گیا مگر زین ابھی سا گیا تھا۔

”تارہ۔۔۔ تارہ۔“ اسماء نے پکارا۔ زین نے مضطرب سا ہو کر پہلو بدلا۔ مگر وہ باہر نہیں آئی تھی۔ اسماء نے میزور میان میں رکھ کر کھانا لگا دیا۔

”شروع کرو یا رکب۔“ پلاؤ کی خوشبو بے قاسم کی

نے ایک نظر نین تارہ کے چہرے پر ڈالی پھر نظر چرا گیا۔

”وہ مجھے گایہ تیرے پیچھے آیا ہے۔ میں اس سے کہوں گا وہ خود ہی یہاں سے چلا جائے۔“

”تمہیں مجھ پر اتنا اعتبار کیوں ہے ماما۔“ نین تارہ نے سر اٹھا کر عجیب سے لہجے میں پوچھا۔

”گنگنا روں کے چہرے بھلا ایسے ہوتے ہیں۔“

وہ تلخ سی ہنسی ہنس دی۔

”گنگنا چروں پر نظر آنے لگیں تو یہاں ہر کوئی چرو بچا تا پھر ہے۔۔۔ پر ماما۔! اگر تم اور تمہارا اعتبار نہ ہوتا زین مرجائی۔“

”نہ پتر ایسے نہیں بولتے۔ بس میرا دل کہتا ہے۔۔۔“

لہ نے تیرے لیے کچھ بہت اچھا لکھ رکھا ہے، کچھ بہت ہی انوکھا۔“

نین تارہ اس کی خوش گمانی پر مسکرا دی۔

”بس پتر! تو دعا کیا کر رہ۔“ باہر کسی نے مائے مقبول کو پکارا تھا۔ وہ بات ادھوری چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔

”منشی بشیر علی آیا ہے۔ میں اس کے ساتھ جا رہا ہوں۔ قاسم آئے تو بتا دینا۔“

تب ہی اسماء اندر آئی۔

”ابا! چاچا بشیر بلا رہا ہے۔“

”ہاں بس میں جا رہا ہوں۔“ ماما چلا گیا۔ تو اسماء اس کے قریب بیٹھ کر کرنا دیکھنے لگی۔ وہ سلائی کڑھائی میں باہر تھی۔ نین تارہ کو ہمہ وقت کم صم بیٹھا دیکھ کر سلائی کھانے لگی تھی۔ مگر نین تارہ کا گویا من ہی مر گیا تھا۔

متحیر خیالی، ناممیدی عدم اعتماد اور خوف اسے کچھ بھی نہ کر نہیں کرنے دیتا۔

”کرتے کی پٹی ٹھیک نہیں بن رہی۔“ نین تارہ نے ہنسی سے بتایا۔

”نیزھی میڑھی سلائی۔“ اسماء نے کرنا پلیٹ کر ایک طرف رکھ دیا اور پوچھنے لگی۔

”شام کو خویلی چلیں۔“

”کون کام ہے؟“ تارہ نے پوچھا۔

”یونہی زارا آئی ہے۔۔۔ اس سے مل کر آئیں۔“

”وہ اسے باہر نکالنا چاہتی تھی۔ گاؤں کی عورتیں آئیں۔ وہ کمرے میں گھس جاتی۔ وہ باتیں بناتی تھیں۔“

کہ مغرور اور نلک چڑھی ہے۔ اسماء بلا بھی لیتی تو اتنی گم صم سی رہتی کہ مجبوراً اسے کسی نہ کسی بہانے اٹھانا پڑتا۔

”دیکھا کرنا ہے باجی! چھوڑیں۔“ نین تارہ بے زار سی ہو کر بولی تھی۔

”بس بس رہنے دو، شام کو چلیں گے۔“ اسماء اس کی بات نظر انداز کر گئی۔

♥ ♥ ♥ ♥

تھڑے پر چار پائیاں بچھی تھیں۔ حقہ گرم تھا۔ قاسم اور مائے مقبول کے ساتھ منشی بشیر علی بھی موجود تھا۔ قاسم کو قدرے غصے میں دیکھ کر زین اندر جانے کے بجائے وہیں بیٹھ گیا۔ مائے مقبول نے اضطرابی انداز میں پہلو بدلا۔ منشی بشیر نے سوالیہ نظروں سے قاسم کو دیکھا۔

”دوست ہے میرا، شہر سے آیا ہے۔“

”اچھا اچھا۔“ منشی نے زور زور سے سر ہلایا۔

”گاؤں دیکھنے آئے ہو۔ کیسا لگا ہمارا گاؤں؟“

”ہمارا گاؤں۔“ زین زیر لب مسکرایا پھر مختصراً

بول۔ ”اچھا ہے۔“

”کب تک رہو گے۔“

”پتا نہیں۔“ وہ کچھ ہزار سا ہو گیا۔

”اچھا۔ اچھا۔“ منشی بشیر علی نے پھر سے سر ہلایا

اور قاسم کی طرف متوجہ ہوا۔ ”تو کیا سوچا ہے تم نے؟“

”پہلے مجھے یہ بتاؤ چاچا! میرے یوب ویل لگانے سے حوصلے کو کیا تکلیف ہے۔“ قاسم کا لہجہ تلخ تھا۔

”اس کو سمجھا مقبول!“ منشی بشیر علی نے ہاتھ اٹھا کر

مائے مقبول سے کہا۔ ”مت لے رائے سلیمان سے

مگر نہ کوشش کر اس کی برابری کی۔“

”میں اپنی ہاتھ بھر زمین کے ساتھ کیا مقابلہ کروں

گا اس کا۔ اپنے چوہدری سے کتنا دل بڑا کرے۔“

میرے یوب ویل لگانے سے اس کے سو مریحوں کو کیا نقصان ہو گا۔“

منشی چپ کر کے حقہ گڑ گڑانے لگے۔

”تمہارے بندوں کا تو جب دل چاہتا ہے پانی کھول

منشی چپ کر کے حقہ گڑ گڑانے لگے۔



دیتے ہیں، جب دل چاہتا ہے بند کر دیتے ہیں ہماری تو روزی بندھی ہے اس تھوڑی سی زمین سے۔" قاسم کھول رہا تھا۔

"اچھی بھلی قیمت دے رہا تھا رائے سلیمان۔ بیچ دیتے تو۔"

"میں بھی زمین بیچ دیتا اور پھر حویلی میں نشی گیری کرتا تمہاری طرح۔" قاسم نے خاصا گہرا طنز کیا تھا۔

مائے مقبول کو تو کنارہ۔

"آرام سے قاسم! آرام سے۔"

زین نے بے حد غور سے حقہ گڑگڑاتے نشی بشر علی کو دیکھا۔

"آپ حویلی میں نشی ہیں۔؟"

"ہاں بیٹا جی۔ میرے باپ نے زمین بیچی اور حویلی میں نشی ہو گیا۔ مرنے سے پہلے یہی عمدہ مجھے دے گیا۔ میں تو پیدا نشی نشی ہوں۔" وہ ہنسنے لگا۔

"گویا رائے قبیلے کے ساتھ قریبی تعلق رہا ہے آپ کا۔"

"ایسا ویسا۔ اس حویلی میں ایسا کیا ہوا ہے جو مجھے نہیں معلوم۔" وہ اک ٹھٹھ سے بولا۔

"ٹھیک کہا آپ نے، آپ تو چوہدریوں کی رگ رگ سے واقف ہوں گے۔" زین نے تو صیغی نگاہوں سے اس مضبوط جسم والے بوڑھے شخص کو دیکھا۔ وقت صرف اس کے چہرے کو جھریوں اور بالوں کو سفیدی عطا کر گیا تھا ورنہ وہ آج بھی کمر سیدھی کر کے چلتا تھا۔

"رائے جمشید کے بارے میں کیا خیال ہے۔ وہ قتل کر سکتا ہے؟"

زین نے اچانک مگر سرسری انداز میں پوچھا تھا۔ حقہ کا دھواں نشی بشر علی کے حلق میں پھنس گیا۔ وہ بری طرح کھانسنے لگا اور اس کی کھانسی نے خاصا طویل وقفہ لیا تھا۔ زین کی منتظر نگاہیں اس کے چہرے پر جمی تھیں۔ ذرا سانس بچال ہوا تو اس نے گردن گھما کر بہت غور سے زین کو دیکھا۔

"تم کیوں پوچھ رہے ہو؟"

تلاش ہے جو کہ قتل رائے جمشید نے نہیں کیا۔" نشی بشر علی نے کہا۔

"میں تو نہیں جانتا۔" قاسم نے کہا۔

"تم شہر والوں کو عجیب لگتی ہوگی۔ پر یہ گاؤں ہے، یہاں حکومت، بھی چوہدریوں کی اور قانون بھی چوہدریوں کا۔" نشی بشر علی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر روایت سے کہا۔

"مگر۔" زین نے کچھ کہنا چاہا۔ مگر نشی بشر علی کے ہاتھ کے بڑھتے ہوئے دباؤ نے اسے خاموش کر دیا۔

وہ سپاٹ سے لہجے میں کہہ رہا تھا۔

"جو بات تمہاری سمجھ میں نہیں آتی۔ اسے چھوڑ دو۔ تم مسمان ہو۔ چند دن رہو گے، چلے جاؤ گے۔ گڑے مودے کیوں اکھاڑتے ہو، کیوں مقبول؟" اس نے تائید طلب نظروں سے مقبول کو دیکھا۔ وہ نجانے کس سوچ میں ڈوبا تھا۔ چونک کر اسے دیکھنے لگا۔ پھر یوں ہی اثبات میں سر ہلادیا تھا۔

"اچھا تو پتر قاسم! تو سوچ لے اچھی طرح میں چتا ہوں۔" نشی بشر علی کھڑا ہو گیا۔

"ہاں۔ پر چاچا! ایک بات سن میری۔" قاسم بھی اس کے ساتھ کھڑا ہوا تھا۔ زین نے لب بچھتے ہوئے بہت غور سے قاسم کے ساتھ جاتے شخص کو دیکھا۔

"یہ یقیناً بہت کچھ جانتا ہے۔"

اس کا دل گواہی دے رہا تھا۔ پاس بیٹھے مائے مقبول نے اضطرابی انداز میں پہلو بدلا۔ کچھ لمبے جوتے پر لگی نادیدہ مٹی جھاڑا رہا۔ پھر ایک دم سراٹھا کر پیچھے ہوئے کچے میں پوچھنے لگا۔

"تم تو کہتے تھے تمہارا اس کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔"

خود سے الجھتے زین نے چونک کر اسے دیکھا۔ اس سے قبل کہ وہ کوئی وضاحت کرتا۔ ماما مقبول زہرہ لہجے میں بولا۔

"پھر کیوں پیچھے پڑ گئے ہو اس معصوم کے پوئلہجے؟"

ی تمہاری ڈی ہوئی ہے۔ تم پھر چلے آئے۔"

"یابا! یہ محض اتفاق ہے۔" اسے وضاحت کے لیے مناسب الفاظ نہیں ملے تھے۔

"سارے اتفاق تمہارے ساتھ ہی کیوں ہوتے ہیں۔" اس کا لہجہ بچھتا ہوا اور تلخ تھا۔ زین ایک لمبی سانس لے کر رہ گیا۔ دونوں ہاتھ مسلتے ہوئے محض اتنا ہی کہہ سکا۔

"میں یہاں آنے سے قبل بالکل بے خبر تھا۔"

"ہاں! سارا کھیل اس بے خبری کا ہی تو ہے۔ بے خبری میں اس کے پاؤں میں کانچ لگ گیا۔ بے خبری میں تم نے مرہم پیٹی کی بے خبری میں اس پر الزام لگا اور بے خبری میں تم پھر یہاں تک چلے آئے۔ یہ بے خبری نجانے اور کیا کچھ دکھائے گی۔"

"میں کچھ بھی کہوں، آپ اعتبار نہیں کریں گے۔"

"اب بھی تم پر اعتبار کروں۔" غصے سے اس کا وجود لرز لرز گیا۔ "وہ گھر سے بے گھر ہو گئی جو کچھ اس پر ہتی ہے، کہتے ہوئے میری زبان کانپ جاتی ہے اور تم کہتے ہو، تم پر اعتبار کروں۔ تم سہارا دے نہیں سکتے تو سہارے چھین کیوں رہے ہو۔ میں نے تو ہاتھ باندھ کر تم سے کہا تھا۔ بے غیرت بن کر کہا تھا کہ اسے اپنے نام کا آسرا دے دو تم صاف مکر گئے۔ کیا لگاڑا ہے اس معصوم نے تمہارا کیوں کر رہے ہوا تھی دشمنی۔"

"میں کیوں کروں گا اس کے ساتھ دشمنی۔" وہ جھنجھلا گیا۔

"مگر رہے ہو۔" ماما مقبول ایک جھٹکے سے کھڑا ہو گیا۔

"آپ نے کبھی میری بات سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔" زین بولا تو کچے میں ہلکی سی تلخی اور خفگی تھی۔

"کوئی سبب بنیاد الزامات عائد کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ میں کیوں اس کے پیچھے یہاں خوار ہوں گا۔ جبکہ میرا اس لڑکی کے ساتھ کوئی تعلق، کوئی واسطہ ہے ہی نہیں۔ آپ نے بھی بس ان جاہل لوگوں کی باتوں پر

اعتبار کر لیا۔ میرا اس کے ساتھ اگر کوئی تعلق ہے تو ثابت کریں میں انکار نہیں کروں گا۔ اتنا حوصلہ ہے مجھ میں کہ کسی سے وعدہ کروں تو اسے آخری سانس تک نبھاؤں۔ میں۔"

نادانستگی میں وہ اپنے خاندان کا حوالہ دیتے دیتے لب بچھتا گیا۔

"بہر حال۔ میں اگر یہاں آیا ہوں تو مقصد کچھ اور ہے اور اس سے کہیں زیادہ اہم ہے، یہاں آنا، قاسم کا ملنا اور آپ کے گھر ٹھہرنا، یہ صرف وقت کا مذاق ہے، محض ایک اتفاق، آپ یقین کریں نہ کریں، لیکن بیچ ہی ہے۔"

مائے مقبول نے بے حد خاموشی سے اس کی بات سنی تھی۔ بولا تو لہجے میں پہلے جیسی تندی نہ تھی۔ بلکہ ہلکی سی بے بسی جھلکنے لگی تھی۔

"میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتا کہ یہ اس بد نصیب کا آخری ٹھکانا ہے۔ یہاں کسی ایک فرد کی آنکھ میں اس نے اپنے لیے نفرت دیکھی تو وہ مرجائے گی۔ خود نشی کر لے گی اور تم، تم یقیناً یہ نہیں چاہو گے۔"

"معلوم نہیں تقدیر نے ہم دونوں کے ساتھ یہ کیسا کھیل کھیا ہے۔" وہ اپنے بالوں میں انگلیاں پھنسا کر الجھے الجھے لہجے میں بولا تھا۔ ماما مقبول لب بچھتا کر رہ گیا۔

"یہ نوجوان! اس نے بغور زین کو دیکھا۔" اسے دیکھ کر عجیب سا احساس دل میں پیدا ہوتا ہے۔ ایسا احساس جسے کوئی بھی نام نہیں دیا جاسکتا تھا۔

"تم یہاں کیوں آئے ہو؟" مائے مقبول نے بے اختیار پوچھا تھا۔ وہ مسکرا دیا۔

"میرے جواب پر یقین کریں گے یا وہ کہوں جو آپ سننا چاہتے ہیں۔"

ماما مقبول چپ سا ہو گیا۔

"ایک کام ہے، میری زندگی سے بھی زیادہ اہم ہو گیا تو جلد ہی چلا جاؤں گا۔ ابھی تو میرا کوئی اور ٹھکانا بھی نہیں ہے۔"

"کیسا کام؟" وہ اس لڑکے سے زیادہ بات نہیں کرنا



چاہتا تھا پھر بھی کر رہا تھا۔

”مجبوری ہے“ ابھی بتا نہیں سکتا۔ ”وہ آہستگی سے گویا ہوا پھر سر اٹھا کر مائے مقبول کو دیکھا۔ جس کی آنکھوں میں دھند سی پھیل رہی تھی۔

”لیکن آپ فکر نہیں کریں۔ میں چلا جاؤں گا۔“ ماما مقبول کچھ کہنا چاہتا تھا مگر قاسم کو آتے دیکھ کر خاموش ہو گیا۔ پھر اسی خاموشی میں پلٹ کر گھر کے اندر چلا گیا۔

”یہ منشی بڑا کایاں بندہ ہے۔ ابے کا دوست ہے اس لیے تھوڑا لحاظ میں بھی کر جاتا ہوں۔ پر دیکھو نا یہ کوئی انصاف تو نہیں ہے کہ ہم اپنی مرضی سے اپنی ہی زمینوں پر ٹیوب ویل نہیں لگا سکتے۔“

وہ اکھڑے لہجے میں کہتا ہوا اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ ”پچھلی بار بھی ساری فصل کاٹا ہوا تھا۔ سال بھر کی گندم بھی پوری نہ ہوئی۔ اب ہماری کوئی ملیں فیکٹریاں تو چل نہیں رہیں کہ ادھر سے نقصان ہو تو ادھر سے پورا کریں۔ پر یہ جتنے بڑے لوگ ہوتے ہیں اتنے ہی تھوڑے ہوتے ہیں۔“ خود ہی بولتے بولتے وہ ایک دم چپ ہوا پھر پوچھنے لگا۔

”کیا ہوا یا ر؟“

”ہوں۔“ ”زمین چونکا۔ اس نے قاسم کا کوئی ایک لفظ بھی نہیں سنا تھا۔“

”کس سوچ میں ڈوبے ہو؟“

”نہیں۔ تمہاری بات سن رہا تھا۔“ وہ سنبھل گیا۔

”کوئی تکلیف کوئی پریشانی تو نہیں یہاں۔؟“

”کیسی باتیں کر رہے ہو قاسم بھائی۔ مجھے تو لگتا ہے میں اپنے گھر آگیا ہوں اپنے لوگوں کے درمیان۔“

(کاش! میں واقعی ایسا محسوس کر سکوں۔ یہ اپنی ہی زمین پر! اپنے ہی لوگوں کے درمیان اجنبیت کا احساس۔)

”کسی بھی چیز کی ضرورت ہو تو بلا جھجک کہنا۔“ قاسم کہہ رہا تھا۔

”آپ ہی سے کہوں گا۔“ وہ قصداً مسکرایا تھا۔

دروازہ کھول کر تائی اماں اندر آئی تھیں۔

”اب تم پڑھتی ہی رہو گی۔“ زارا کے ہاتھ میں نوٹس دیکھے تو بے حد غظبی سے بولی تھیں۔ ان کے عقب میں ملازمہ دودھ کا گلاس لیے کھڑی تھی۔

”رکھ دو اب کیا سر پر سوار رہو گی۔“ ملازموں سے بات کرتے ہوئے ان کا لہجہ یونہی نخوت زدہ ہو جاتا تھا۔ پچائیاں گلاس نیبل پر رکھ کر پلٹ گئی۔

”اب بس کرو زارا! وہاں میں تھوڑا آرام کر لیا کرو۔“

”بس تھوڑے دنوں کی تو بات ہے تائی جان! اس کے بعد آرام ہی آرام ہو گا۔“ زارا نے مسکرا کر کہا۔

”ایک تو یہ پڑھائیوں کے شوق نجانے کہاں سے لگ گئے ہیں تمہیں۔ اچھی بھلی گلابی رنگت جلا کر رکھ دی ہے۔ ہم نے کون سا تم سے منسٹری کروانی ہے۔“

”ہو سکتا ہے مجھے منسٹری ہی کرنا پڑ جائے۔“ وہ متعجب لہجے میں گویا ہوئی۔

”بس۔۔۔ بس۔“ تائی اماں نے ہاتھ اٹھا کر غظبی سے ٹوکا۔

”یہ منسٹری کا شوق گھر کے مردوں کے لیے ہی رہے دو۔ ذرا فارغ ہو جاؤ پرچوں سے۔ پھر ہم تم دونوں کی ایک نہیں سنیں گے۔ بہنوں کو تو بے وقوف ہی سمجھتے ہو تم لوگ۔“

”یہ کس کا غصہ مجھ پر نکالا جا رہا ہے تائی جان۔“ وہ مسکراہٹ دبا کر بولی۔

”غصہ کس بات کا نکالوں گی۔ سیدھی سادی بات کی ہے میں نے۔“

”مما سو گئیں کیا؟“ زارا نے فوراً موضوع بدلنے کی ضرورت محسوس کی۔

”پتا نہیں ناشتے کے بعد سے اپنے کمرے میں بند ہے۔“ زارا بیٹی اماں کا خیال رکھا کرو۔ وہ تو بالکل ہی خاموش ہو گئی ہے۔ نہ کسی سے ملتی ہے نہ ڈھنگ سے بات کرتی ہے اور نہ ہی کسی اور معاملے میں دلچسپی لیتی ہے۔“

”کو شش تو کرتی ہوں۔ مگر ابھی زیادہ وقت بھی تو نہیں گزرا۔“ وہ رنجیدہ سی ہو گئی۔

”بس بیٹی! بعض دکھ ایسے ہی ہوتے ہیں۔ وقت تھوڑا گزرے یا زیادہ ہمیشہ تازہ ہی رہتے ہیں۔“

زارا خاموش سی ہو گئی۔

”اچھا! یہ باداموں والا دودھ ہے۔ تم نے صبح ناشتہ بھی ڈھنگ سے نہیں کیا تھا۔ ضرور پی لینا۔“ تائی جان نے کہا۔ تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔ تائی جان کے جانے کے بعد وہ کچھ لمحے یونہی بیٹھی رہی۔ پھر اٹھ کر ماما کے کمرے میں آگئی۔ نیم تاریک کمرے میں مہابیز پر دراز تھیں۔

”مما! سو رہی ہیں۔؟“

”مما نے گردن تھما کر اسے دیکھا۔

”نہیں یونہی لیٹی تھی ذرا۔“ وہ مضطرب انداز میں انھیں اور بیڈ سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئیں۔

زارا نے آگے بڑھ کر کھڑکی سے پردہ کھینچ دیا۔

سورج کی روشنی نے کمرے میں گھس کر نیم تاریکی کا گلا گھونٹ دیا۔ زارا نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ کیا سے کیا ہو گئی تھیں۔ اک طویل رفاقت کا خاتمہ انہیں اندر تک توڑ گیا تھا۔ وہ معمول سے کچھ زیادہ مضطرب اور افسردہ نظر آ رہی تھیں۔

”مما! آریو آل رائٹ؟“

”زارا! تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں؟“ وہ آہستگی سے گویا ہوئیں۔

”کیا؟“

”میں نے گھر فون کیا تھا۔“

”اور۔“ زارا کو خیال آیا۔ اس نے ابھی تک ماما سے بات نہیں کی تھی۔ حالانکہ رضوان نے اس سے کہا بھی تھا۔

”ہاں کوئی پرانا ملازم موجود نہیں اور کون لوگ ہیں وہاں آگئے ہیں اور کس سے پوچھ کے شیراز نے کسی سے پوچھا بھی گوارا نہیں کیا۔“ وہ بہت دلگرفتہ لگ رہی تھیں۔

”سو رہی ممما۔“ زارا ان کے قریب بیٹھ گئی۔

”رضوان سے بات ہوئی تھی میری۔ شیراز نے ہی ان کو فون کیا تھا۔ مجھے خیال ہی نہیں رہا کہ آپ سے

بات کر لوں۔“ آئی ایم ویری ساری۔“

”زارا! وہ گھر۔“

”کیا فائدہ ممما! ان خالی در و دیوار میں رکھا ہی کیا تھا۔ جب پایا ہی نہیں رہے۔“

”کتنی یادیں وابستہ تھیں اس گھر سے۔“

”یادیں تو دل میں بستی ہیں دیواروں میں نہیں اور اب تو سب ہی کچھ بدل گیا ہے اور بہت کچھ بدل جائے گا۔“

”کیر وائز تو کرنا پڑے گا۔“

”مما خاموش ہی رہیں تو وہ لہجہ بدل کر بولی تھی۔

”چھوڑیں اس سب کو چلیں زمین سے بات کرتے ہیں۔“ وہ جانتی تھی۔ ایک ہی چیز ان کا موڈ بدل سکتی ہے۔ اس نے موبائل اٹھا کر نمبر ملا یا۔ بہت دیر کے بعد سلیم نے فون اٹھایا تھا۔

”ہاں جی کے بچے کہاں تھے؟ کب سے نیل جا رہی ہے۔“

”اوہ بابی! میں ذرا لان کی کاٹ چھانٹ کر رہا تھا۔“

”اپنے بھائی جان کو بلاؤ۔ ذرا اس کی بھی کاٹ چھانٹ کریں۔“ وہ ماما کو دیکھ کر مسکرائی۔

”وہ تو نہیں ہیں۔“

”اچھا۔۔۔ وہ آئے تو اسے۔“

”پتا نہیں بھائی جان نے کب آتا ہے۔ مجھے تو لگتا ہے اب پرچے دینے ہی آئیں گے۔ سارا گھر چھوڑ چھاڑ کر چلے گئے۔ اب میں گھر بھی اکیلا نہیں چھوڑ سکتا۔ اپنی اماں کو لے آیا ہوں یہاں۔“

”زمین کہاں گیا ہے؟“ زارا متفکر سی ہو گئی۔

”وہ تو ساہیوال گئے ہیں۔“

”مساہیوال۔ کیا مطلب؟“ وہ بری طرح چوکی۔

”مما بھی سر اٹھا کر اسے دیکھنے لگی تھیں۔“

”مساہیوال کا مطلب تو مجھے بھی نہیں پتا۔“ سلیم گڑبڑا سا گیا۔

”وہ کب گیا ہے اور کیا کہہ کر گیا تھا؟“ زارا کے لہجے میں سنجیدگی در آئی۔

”کہتے تھے ادھر پڑھائی نہیں ہوتی۔ وہاں جا کر پڑھوں گا۔“



”کوئی فون نمبر یا ایڈریس وغیرہ چھوڑا ہے اس نے۔“

”نہیں۔ باجی جب سے گئے ہیں۔ خود بھی فون نہیں کیا۔“

”اچھا۔ افتخار آیا تھا اس کے جانے کے بعد؟“

زارا نے کچھ سوچ کر پوچھا۔

”نہیں اتنے دنوں سے تو وہ بھی نہیں آئے۔“

”کمال ہے۔ اچھا دیکھو یہ فون کے پاس ایک ڈائری پڑھی ہوگی۔ اس میں سے افتخار کا نمبر دیکھ کر بتاؤ۔“

”میں دیکھتا ہوں باجی۔“ وہ ڈائری ڈھونڈنے لگا۔

”شاید اسی سے کچھ کہہ کر گیا ہو۔“ زارا نے یہ جملہ ماما سے کہا تھا۔ تھوڑی دیر میں سلیم کی آواز دوبارہ آئی۔

”باجی! ادھر تو کوئی ڈائری نہیں۔ شاید ساتھ ہی لے گئے ہیں۔“

”کیا اختلاف حرکت ہے یہ۔“ زارا جھنجھلا گئی۔

”اچھا سلیم! اس کا جب بھی فون آئے یا وہ خود آئے اسے کہنا مجھے کال کرے۔“

”وہ وہاں کیا لینے گیا ہے۔“ ماما نے بے اختیار پوچھا۔

”ہو سکتا ہے یکسوئی سے پڑھنے کے لیے وہاں چلا گیا ہو۔ لیکن وہاں اس کا رہا کون ہے۔“ خود زارا بھی سمجھنے سے قاصر تھی۔

”تم نے دیکھا زارا! وہ بھی بدل گیا ہے۔ کیا جانے ہے پہلے وہ مجھے بتا بھی نہیں سکتا تھا۔“ ماما بہت زور دینے لگی تھی۔

زارا کچھ نہ کہہ سکی تو تسلی آمیز انداز میں ان کا ہاتھ تھپتھپانے لگی۔

”شام کو کمرے سے باہر نکلی تو تائی اماں آرام کر رہی تھیں۔ ماما کے پاس اسامہ بیٹھی تھیں۔“

”کیسی ہو زارا! آج تو میں صرف تم سے ملنے آئی ہوں۔“ اسامہ اسے دیکھتے ہی بولی تھیں۔

”میں بھی ماما سے پوچھ ہی رہی تھی کہ اسماء آئی نہیں ہے۔“ وہ ماما کے قریب بیٹھ گئی۔

”بس گھر سے نکلتا ہی کہاں ہوتا ہے۔ پھر محمد علی اتنا تنگ کرتا ہے ابھی بھی ابا اسے لے کر نکلتا تھا تو میں نے سوچا مل لوں۔“

”یہ کون ہے؟“ زارا نے اسماء کے قریب بیٹھی بچھے ہوئے چہرے والی لڑکی کی طرف دیکھا۔ جو بس نظریں جھکائے قالین کو گھور رہی تھی۔

”ابے کی بھانجی ہے۔ شہر سے آئی ہے۔“

”پڑھتی ہو۔“ زارا نے پوچھا تو اسماء نے گم صحنہ میں تارہ کو ٹھوکا دیا اس نے چونک کر سر اٹھایا پھر آہستگی سے بولی۔

”ایف اے کیا ہے۔“

”آگے کیوں نہیں پڑھا؟“

اس نے بڑی اذیت سے نچلا لب دانتوں تلے دبایا تھا۔ زارا نے بے حد غور سے اس کے چہرے کے چمکتے تاثرات کو دیکھا۔

”پڑھتی کیسے؟“ اسماء جو بولنے پر آئی تو کچھ بھی نہ چھپایا۔ وہ اسے روکنا چاہتی تھی مگر یونہی ساکت و صامت نظریں قالین پر گاڑے بیٹھی رہی۔ گود میں دھرے ہاتھوں میں لرزش اتر آئی۔ زارا اور ماما نے بے حد ہمدردی سے اسے دیکھا۔

”اب پڑھو گی؟“ زارا نے پوچھا تو وہ زیر لب برپڑائی۔

”اب کیا کروں گی پڑھ کر۔“

”لوں ہوں۔“ زارا نے مسکرا کر نفی میں سر ہلایا۔

”نہیں تارہ! یہ زندگی اتنی ارزاں نہیں ہے کہ اسے دوسروں کے لیے ضائع کر دیا جائے۔ زندگی خدا کی امانت ہے اور ہر انسان کو اسے سنوارنے کا حق حاصل ہے۔ اپنے لیے اور ان لوگوں کے لیے جنہیں تمہاری ضرورت ہے۔“

”زارا ٹھیک کہہ رہی ہے۔ یہ مصیبتیں یہ تکلیفیں تو انسان کو کندن بنانے آتی ہیں۔ آزمائش ہے تمہاری صلاحیتوں کی اور ان لوگوں کی جن کے ہاتھ میں خدا نے

نہارا معاملہ دیا تھا۔ ان کی آزمائش تو ہو گئی۔ اب تمہیں اپنی صلاحیتیں آزمانا ہیں۔ ثابت کرو کہ تم معمولی لڑکی نہیں ہو۔ کمزور ہو تو خود کو مضبوط کرو۔ تعلیم پہلی سیڑھی ہوگی اور مجھے یقین ہے ان بہت سی آزمائشوں کے بعد خدا تمہیں کسی بڑے انعام سے نوازے گا۔“

نہیں تارہ کی آنکھیں لبالب بھر آئیں۔ دل اک ابلہ تھا، کوئی ہمدردی کا بھانا بھی رکھتا تو پھوٹ جاتا۔ وہ اس مہمان خاتون کے گلے لگ کر بہت سارونا چاہتی تھی مگر سارے آنسو آنکھوں کے اندر منجمد ہو گئے تھے۔ بہت رو چکی تھی وہ۔

”میں تمہیں کتابیں منگوا دوں گی۔“ زارا نے کہا تھا ماما تیزی سے بول اٹھی۔

”اس کی ضرورت نہیں۔ قاسم شہر آتا جاتا رہتا ہے۔ وہ لادے گا۔“ وہ اک خود دار شخص کی پیروی تھی۔ زارا نے اصرار نہیں کیا مگر تاکید ضرور کی تھی۔ اسماء اجازت لے کر کھڑی ہو گئی۔

”تم نے دیکھا، کیسی شاندار حویلی ہے۔“

بڑے بڑے کمروں، رہنما ریلوں، دالان عبور کر کے باہر نکلیں تو اسماء نے پوچھا۔ پاؤں کے انگوٹھے پر نظریں جما کر چلتی نہیں تارہ نے چونک کر سر اٹھایا تو ابل جنتو کے تندو کے پاس زین کو کھڑا دیکھ کر ساکت رہ گئی۔ لاشعوری طور پر وہ اسماء کے عقب میں ہو گئی تھی۔ اسماء بھی سوال بھول کر دوپٹے کی اوٹ سے زین کو دیکھنے لگی جو رخ بدل کر تندو پر رکھی گرائی کی طرف متوجہ تھا۔

”رج کے سونہا ہے۔“

”دوسروں کے نصیبوں میں سیاہی گھول دیتا ہے۔“

اس کے قریب سے گزرتا چند سیکنڈ کا فاصلہ سیدلوں پر محیط ہو گیا، ہاتھ پاؤں بے جان سے ہو کر لٹکا لٹکا بیٹھ چھوڑ رہے تھے۔ وہ گویا اک لقمہ حق حیرا کی کھڑی چیخ کر اس سے التجا کر رہی تھی۔

”چلے جاؤ یہاں سے تم تو مرہم بھی لگاؤ گے تو لوگ

زخم ہنادیں گے۔“

”تارہ! تارہ! کیا ہو گیا تمہیں۔“ اس کا پیلا پڑتا چہرہ پسینہ پسینہ تھا، گھٹیتے قدم۔ اسماء بچ رستے میں بوکھلا گئی تھی۔

”کچھ نہیں۔ کچھ نہیں۔“ وہ اسماء کا ہاتھ دوہرچ کر بمشکل مسکرائی۔ ”یونہی چکر آگیا تھا۔“

اس رات اس نے سجدے میں گر کر اپنے رب سے بہت دعائیں کی تھیں۔ اس ایک شخص کے لوٹ آنے کی جس نے کہا تھا۔ ”اپنی ذات کی ساری کھڑکیاں بھی بند کر دو گی، میں شب بھی تم تک پہنچ جاؤں گا۔“

”تم بات مت کرو مجھ سے۔“ زارا کی آواز سننے ہی انعم جی اٹھی تھی۔

”کیا ہوا اتنا غصہ۔“ زارا مسکرا دی۔ کتنے دنوں کے بعد وہ اسے کال کر رہی تھی۔ سواس کی خفگی بجا تھی۔

”میرا دل چاہتا ہے تم سے بات نہ کروں۔“ وہ دانت پس کر کہہ رہی تھی۔

”تم ہمیشہ سے اتنی ہی بے مروت ہو۔ کوئی خفا ہو تو اسے منالیا کرتے ہیں۔“ اس نے بے حد چڑ کر کہا تو زارا ہنس دی۔

”سوری انعم ڈیر! میں واقعی کچھ مصروف تھی اس لیے۔“

”رائے رضوان نے کھیتوں میں مل تم سے چلوانا شروع کر دیا ہے یا۔“

”نشٹ اپ۔“

”اوکے۔ یہ بتاؤ تم کیسی ہو؟“

”ٹھیک ہوں۔ ابھی میں نے عظمیٰ کو کال کی تھی۔ وہ مارکیٹ گئی ہے اور حیرت ہے کہ تمہارے بغیر گئی ہے۔“

”ہاں، اسے اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کی چیزیں خریدنی تھیں اور میں اس لیے نہیں گئی کہ میرے پاؤں میں موبچ آگئی ہے۔ میں ہاتھ روم میں پھسل گئی

ہے۔“

”ہاں، اسے اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کی چیزیں خریدنی تھیں اور میں اس لیے نہیں گئی کہ میرے پاؤں میں موبچ آگئی ہے۔ میں ہاتھ روم میں پھسل گئی

ہے۔“

”ہاں، اسے اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کی چیزیں خریدنی تھیں اور میں اس لیے نہیں گئی کہ میرے پاؤں میں موبچ آگئی ہے۔ میں ہاتھ روم میں پھسل گئی

ہے۔“

”ہاں، اسے اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کی چیزیں خریدنی تھیں اور میں اس لیے نہیں گئی کہ میرے پاؤں میں موبچ آگئی ہے۔ میں ہاتھ روم میں پھسل گئی

ہے۔“

”ہاں، اسے اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کی چیزیں خریدنی تھیں اور میں اس لیے نہیں گئی کہ میرے پاؤں میں موبچ آگئی ہے۔ میں ہاتھ روم میں پھسل گئی

ہے۔“

”ہاں، اسے اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کی چیزیں خریدنی تھیں اور میں اس لیے نہیں گئی کہ میرے پاؤں میں موبچ آگئی ہے۔ میں ہاتھ روم میں پھسل گئی



تھی۔ اس نے افسردگی سے بتایا۔ تبھی ریسپور اس کے ہاتھ سے جھپٹ لیا گیا تھا۔  
”ہاتھ روم میں نہیں پھنسی۔ اماں نے ییلن پاؤں پر دے مارا تھا۔“

”ہو گئی شاپنگ۔“ زارا نے پوچھا۔  
”ہاں ابھی۔ ابھی لوٹی ہوں۔ تم سناؤ کیسی ہو گاؤں میں ایسا کیا ہے جو تمہیں واپس ہی نہیں آئے دیتا۔“  
”مما کی وجہ سے رک جاتی ہوں۔ ورنہ یہاں ایسا کچھ نہیں جو مجھے روک سکے۔“ زارا نے کہا۔ کچھ دیر وہ دونوں سنجیدگی سے اسٹڈیز کے بارے میں گفتگو کرتی رہیں۔ تب ہی زارا دوبارہ موضوع بدل کر ییلن کی طرف آئی تو عظمیٰ بتانے لگی۔

”یہ مختصر شادی کی شاپنگ کر رہی ہیں۔ جو چیز بھی پسند کرتی ہیں اس کی قیمت اتنی ہوتی ہے کہ اس کے ابو کا بلڈ پریشر لو اور امی کا ہائی ہو جاتا ہے۔ ٹنگ آکر انہوں نے یہ حربہ استعمال کیا۔ اب یہ گھر میں ہوتی ہیں اور وہ لوگ شاپنگ کرتے ہیں۔“

”ایگز امز میں شادی کہاں سے آگئی۔“ زارا نے تحیر سے پوچھا۔

”یہ ہماری مائیں اور اگر بیٹی انعم جیسی ہو تو یہی ہوتا ہے۔ اسے تو لگتا ہے صرف شادی ہی زندگی کا سب سے اہم اور بڑا مقصد ہے۔“

”بالکل۔ بالکل۔“ انعم نے فوراً تائید کی تھی۔  
”اس کو دفع کرو۔ تم واپس کب آرہی ہو؟ ہم کہاں اسٹڈی کریں گے۔“ عظمیٰ نے پوچھا۔  
”میں سنڈے کو واپس آرہی ہوں۔ عظمیٰ! تمہارے پاس افتخار کا نمبر ہے۔“ زارا کو اچانک خیال آیا تو یونہی پوچھ لیا۔

”ہاں ہے۔“ اس نے سادگی سے نمبر دہرایا۔  
ایک دم خیال آیا تو وضاحت کرتے ہوئے لوٹی۔  
”میں نے شاید ابا کو بتایا تھا اور وہ سارے نمبر مجھے ہی لکھواتے ہیں۔“  
”زبانی یاد بھی کروا دیتے ہیں۔“ انعم کی سرگوشی ابھری۔ جو اب عظمیٰ نے زور سے جھکی کافی تھی۔

”دل میں چور نہیں ہے تو وضاحت کیوں کر رہی تھیں۔ اور زارا سنو یہ مختصر آج کل بشری اعجاز کی ”یہاں پار“ پڑھ رہی ہیں۔ کچھ سمجھ میں آیا؟“ انعم نے ہنس مہو شریر لہجے میں پوچھ رہی تھی۔  
”ہاں وال میں کچھ کالا ہے۔“

”کچھ کیا پوری کی پوری دال کالی ہے۔ بس یہ گھنٹی ہے۔“

”کیا فضول بکواس ہے۔ کیا پنجابی شاعری صرف افتخار پڑھ سکتا ہے۔“ عظمیٰ چڑ گئی۔

”لو ہم نے کچھ کہا۔ یا افتخار کا نام ہمارے لبوں پر آیا۔ اس کے باوجود تم کہتی ہو دل میں چور نہیں۔“

”زارا! اللہ حافظ سنڈے کو واپس آؤ گی تو ملیں گے۔“ عظمیٰ کی آواز کے ساتھ ہی لائن ڈسکنکٹ گئی۔

زارا جانتی تھی اب انعم کی دھناتی ہونا تھی۔ اس نے افتخار کا نمبر ڈائل کیا مگر دوسری طرف بڑی ٹون سنائی دے رہی تھی۔

”زارا بی بی! آپ کو بڑی بی بی بلا رہی ہیں۔“ پھانٹاں نے آکر کہا۔

”آتی ہوں۔“ اس نے کہا تو وہ واپس چلی گئی۔ زارا نے بھی فون کا ارادہ فی الحال ترک کیا اور مائی اماں کے کمرے میں چلی گئی۔

♥ ♥ ♥ ♥

میں اوہ موتی جیڑا رلیا پیراں تھلے  
میں اوہ پھل آں جیڑا سبھا قبراں آئے

میں اوہ ہونی جسے دے اگے چپ نے سارے  
میں اوہ نعمت جس دا بھار نہ کوئی جھلے

مٹھائی کا ڈبہ چار پائی پر پڑا تھا۔ محمد علی ہاتھ مار مار کر اسے کھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔ نین تارہ کی ساکت نظرس ڈبے پر جمی تھیں۔ کون لایا تھا۔ اسے خبر نہ تھی۔ مگر یہ ڈبہ کیوں بھیجا گیا تھا۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی۔ یہ ان کی فتح مندی اور اس کی شکست کا اعلان تھا۔

”قاسم تو کہتا تھا کہ۔“ مائے مقبول کی آواز سب دور کسی خلا سے ابھر رہی تھی اور گونج گونج کر واپس جا

رہی تھی۔  
”اس ڈبے میں کیا ہے؟“  
بتوں کی استہزائیہ مسکراہٹ۔  
”میں کیا کر سکتی ہوں۔ اس کا اندازہ تجھے اچھی طرح ہے۔“

کوثر کی آنکھوں کی چمک، فخر کا نشان۔  
”میں اجمل کو اتنی آسانی سے تمہارا نہیں ہونے دوں گی۔“

اور وہ سارے دعوے، محبت، اعتبار، وفا اور یقین کے دعوے سب کے سب اس ڈبے میں بند کر کے اسے روانہ کر دیے گئے تھے۔

”میں نے اپنا معاملہ خدا کے سپرد کیا تھا اور یہ خدا کا انصاف ہے؟“

اس نے آہستگی سے اپنی بند مٹھی کھولی۔ پانچ سو کا نوٹ مڑا تھا۔  
”اس آگ امید کی طرح سنبھلا تھا اسے۔“

”خدا میری ساری دعا میں کہاں سنبھال کر رکھ رہا ہے۔“

اس کی سانس کا پچھی تھک کر سینے کی دیواروں میں پھنس کر پھڑپھڑا رہا تھا۔ وہ بہت زور سے اندر کہیں انگ جانے والی سانس کو کھینچنے کی کوشش کرنے لگی۔

محمد علی ڈبے کی طرف سے مایوس ہو کر پلٹا۔ اس کی مٹھی سے پانچ سو کا نوٹ جھپٹ کر منہ میں لے کر ہنسنے لگا۔

لانا مقبول تھک کر اس کے قریب آ بیٹھا۔ یہ دنیا اس کے ساتھ کچھ بھی کرتی، وہ شاید پہلا اور آخری شخص تھا۔ جس کے کندھے پر سر رکھ کر وہ رو سکتی تھی۔

”تارہ!“

وہ اک جھرجھری لے کر جاگی۔ دوسرے بل اسے اسٹاس ہوا کہ وہ کہاں سے اور اس کے ساتھ کیا ہو گیا

سب اس نے گردن گھما کر مائے مقبول کو دیکھا اور اس کے آنسوؤں کو۔

”تو کیوں رہے ہو ماما؟“ وہ خشک آنکھوں سے پوچھ

رہی تھی۔ مائے کے آنسوؤں میں روانی آگئی۔ اس نے سر اٹھا کر بے حد سنجیدہ کھڑے قاسم اور رنجیدہ سی اسماء کو دیکھا۔

”کیا یہ متوقع نہیں تھا۔“ وہ پھر مائے مقبول سے مخاطب تھی۔ مائے مقبول کا بازو پھر پھیلا، وہ چاہتا تھا۔ نین تارہ رو لے۔ نین تارہ نے اس کا ہاتھ تھام لیا پھر ایک جھٹکے سے چھوڑ کر کھڑی ہو گئی۔

”تم کیوں چاہتے ہو کہ نین تارہ روئے۔ کیا یہی نین تارہ کی قسمت ہے کہ وہ ہر بار زخم کھائے اور تمہارے کندھے پر سر رکھ کر روئے۔ کیا سمجھتے ہو تم لوگ مجھے جس کا دل چاہا عزت دی۔ جس کا دل چاہا بے عزت کر کے گھر سے نکال دیا۔ جس کا دل چاہا ہاتھوں میں وعدہ تھما دیا اور جس کا دل چاہا۔ زندہ در گور کر دیا۔“

میں جانتی ہوں میرا باپ نہیں ہے جو سر کی چھاؤں بن سکے۔ بھائی نہیں ہے جو میری طرف اٹھنے والی انگلی توڑ دے۔“ اس کے لہجے میں شعلوں کی لپک تھی۔ ”اور تم لوگ۔“ اس نے انگلی اٹھا کر مائے مقبول اور قاسم کی طرف اشارہ کیا۔ جو ہکا بکا اس نین تارہ کو دیکھ رہے تھے۔ جس کی کبھی اونچی آواز نہ سنی تھی۔

”تمہارا خون سفید ہو گیا ہے۔“ اس نے مٹھائی کا ڈبہ ہاتھ میں لیا۔ ”بے غیرت ہو گئے ہو تم دونوں ورنہ یہ ڈبہ لانے والے کے منہ پر دے مارتے۔ یوں میرے سامنے رکھ کر میرا تماشا نہ دیکھتے۔“ اس نے ڈبہ صحن میں دے مارا۔ مٹھائی زین کے قدموں میں بکھری تھی۔ جو تولیہ ہاتھ میں لیے ششدر سا اس بکھری ہوئی لڑکی کو دیکھ رہا تھا جس کی آنکھوں میں اس نے صرف سہم اور اداسی دیکھی تھی۔ لیکن وہ نہیں جانتا تھا زندگی میں ایک مقام وہ بھی آتا ہے جب بے بسی دم توڑ دیتی ہے اور بغاوت جنم لیتی ہے اور یہی وہ مقام ہے جو زین کو گاؤں آنے پر اور نین تارہ کو چھننے پر مجبور کر دیتا ہے۔ اس کے اندر بھی سر جھکا کر ہر ظلم سہ جانے والی نین تارہ مر گئی تھی اور اب وہ ایک ایک کا گریبان پکڑ کر حساب مانگ رہی تھی۔!

(201)



”بولو قاسم! تمہاری بہن پر کوئی یوں الزام دھرتا تو تم یونہی تماشائی بنے دیکھتے رہتے کہ روتی ہے، چیختی ہے یا مرجاتی ہے۔ اور ماما! تمہاری بیٹی کے ساتھ یہ سب ہوتا تو تم یونہی اس شخص سے جا کر بھیک مانگتے کہ نین تارہ سے شادی کر لو۔ بے غیرت وہ نہیں جنہوں نے ظلم کیا۔ بے حس تم تھے۔ جنہوں نے ظلم کرنے دیا۔ ایک بار تو ان کا ہاتھ روکا ہوتا۔ ایک بار تو ان کی زبان پکڑی ہوتی تو ان کی جرات نہ ہوتی کہ وہ ہر بار میرے ساتھ یہی سب کرتے۔ اور اب۔۔۔ اب ماما تم اس شخص کی ہاتھ جوڑ کر منتیں کرتے ہو کہ یہ یہاں سے چلا جائے۔ یہ چلا جائے گا تو کوئی اور آجائے گا۔ تم کس کس کے سامنے ہاتھ جوڑو گے۔ تم لوگوں کے پاس مجھے دینے کے لیے بس ایک کندھا ہے جس پر سر رکھ کر میں رو سکوں۔“

”تارہ! چپ ہو جاؤ۔“ اس کی بلند آواز سے خائف ہو کر قاسم نے کہا تھا۔ نین تارہ نے تڑپ کر اسے دیکھا۔ اس کی نگاہوں میں چیخیں تھیں اور شدید غصے کی لپک۔

”میں تو اس وقت بھی چپ تھی جب پانچ سال کی بچی کے چہرے پر پہلا تھپڑ پڑا تھا۔ میں تو اس وقت بھی خاموش تھی جب میرے پاکیزہ کردار پر جھوٹے الزام لگا کر مجھے زندہ درگور کیا گیا۔ میں تو تب بھی کچھ نہیں بولی جب مجھے میرے حق سے محروم کر دیا گیا۔ میں تو اٹھارہ سال سے چپ تھی اس انتظار میں کہ کوئی تو میرا بھی ہو گا جو میرے لیے بولے گا۔ لیکن کوئی نہیں ہے۔“ اس کے حلق میں کچھ اٹک سا گیا۔ ”مجھ سے اپنے رشتے پر اعتبار نہ تھا تو یتیم سمجھ کر ہی ترس کھایا ہوتا۔“

اس نے اپنی کپکپا جانے والی آواز کو بمشکل سنبھالا اور ایک نظر ان سب پر ڈالی۔ اس پر بھی جو عقب میں دم بخود کھڑا تھا۔

”لیکن اب نین تارہ نہیں روئے گی۔ کسی سے نہیں ڈرے گی۔ جب میں نے کچھ کیا ہی نہیں تو میں کیوں ڈروں۔ کیوں سب سے منہ چھپا چھپا کر پھروں

۔۔۔ یہ زندگی میری ہے اور مجھے ہی گزارنی ہے۔ میں اسے تم لوگوں کو جینے نہیں دوں گی۔ مجھے اب تم لوگوں سے اپنی پاکیزگی کی گواہی بھی نہیں چاہیے۔ کیونکہ یہ گواہی میرا دل خود دے رہا ہے۔“

وہ پلٹی اور کمرے میں چلی گئی۔ اک ظلم تھا جو ٹوٹ گیا تھا۔ زین ایک بے نام سی کیفیت کا بوجھ دل پر لیے خاموشی سے بیٹھک میں چلا گیا۔ ماما مقبول، قاسم اور اسماء ساکت سے کھڑے تھے۔ بس محمد علی تھا جو پاؤں پاؤں چلتا مٹھائی اکٹھی کر رہا تھا۔ اس کے گرد پانچ سوکانوٹ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بکھر گیا تھا۔



”ہوا میں تیر چلانے کا فائدہ ہی کیا؟ محض مفروضہ قائم کرنے سے کوئی قاتل ثابت نہیں ہو جاتا۔ آخر کون شخص ہے جس نے رائے جمشید کو قتل کرتے دیکھا۔“

ایک دم ضبط کا دامن ہاتھ سے چھوڑ بیٹھا تھا۔ اس کے گرد بیٹھا ہر شخص ایک دم خاموش ہو گیا۔ چاہے خوشی کی چارپائی پر اندھیرے کونے میں بیٹھے شخص نے بے حد غور سے زین کے تپے ہوئے چہرے کو دیکھا۔ ایک معنی خیزی کیفیت اس کی آنکھوں میں ابھری تھی مگر زین اس کی طرف متوجہ نہ تھا۔

”چھوڑو یار! ہمیں کیا، جن کا معاملہ وہ نہیں۔“ عباس بیزار سا ہو گیا اور زین اس سے زیادہ بیزار ہو کر اٹھا تھا۔ چلتے چلتے وہ چھوٹی نہر کی طرف نکل گیا تھا۔ جس کے دونوں اطراف میں شہتوت اور ٹالی کے درخت لگے تھے۔ نہر کے عقب میں وہ شاندار حویلی تھی۔ اس کی اپنی حویلی۔ اس کے بابا کا گھر، زین کے لیے اس حویلی اور جائیداد پر اپنی ملکیت ثابت کرنا ناممکن نہ تھا مگر وہ اپنے بابا کا نام صاف کرنا چاہتا تھا۔ ان کی اور اپنی زندگی پر لگا بد نما داغ دھونا چاہتا تھا۔ مگر ہر سو تاریکی تھی۔

آخر وہ کون شخص تھا جس نے بابا کو قتل کرتے دیکھا۔

نہر کے پانیوں میں جھانکتے ہوئے اس نے ایک بار



پھر سوچا تھا۔ اسے یہاں آئے کتنے دن ہو گئے تھے مگر وہ آج بھی خالی ہاتھ تھا۔ اپنی ہی زمین پر بے یار و مددگار اور بے نشان اپنی ہی حویلی کے سامنے کھڑے ہو کر گھنٹوں سوچنا کہ وہ اندر جائے یا نہ جائے۔ جائے تو کس حیثیت سے۔ کس قدر اذیت ناک تھا یہ بیس بائیس سال پہلے کے واقعات آپس میں اس طرح گڈنڈ ہو گئے تھے کہ وہ جس سے بات کرتا ایک نیا نام سامنے آتا تھا۔

”مجھے واپس چلے جانا چاہیے۔“

وہ ہر رات یہی مایوس سوچ کیلئے کے نیچے رکھ کر سوتا تھا اور ہر صبح وہیں بھول جاتا تھا۔

نجانے اسے کس نے باندھ دیا تھا؟

اپنی مٹی کی خوشبو نے۔

حویلی کی روشنیوں نے۔

یا پھر ان سیاہ آنکھوں نے جنہیں وہ ایک بار سوچتا تو گھنٹوں بے چین رہتا تھا۔

”وقت ہمیں ایک بار پھر ایک دوسرے کے مقابل کیوں لے آیا ہے؟“

وہ اپنے قدموں میں پڑی ناویدہ زنجیروں کی جھنکار سنتا تو جھنجھلا جاتا۔ وہ خود اپنی کیفیت سمجھنے سے قاصر تھا۔

”تمہیں رائے نواز کے قتل اور رائے جمشید کے فرار میں اتنی دلچسپی کیوں ہے؟“

وہ بری طرح چونک کر پلٹا اس کے سامنے منشی بشیر علی کھڑا تھا۔ وہ گڑبڑا سا گیا۔ تو کیا لوگ اس کے بارے میں مشکوک ہونے لگے ہیں؟

”ایسی تو کوئی بات نہیں۔ میں تو بونہی۔“

”نہیں اگر کوئی دلچسپی ہے اور تم واقعی کچھ جانتا بھی جانتے ہو تو رائے سلیمان تمہاری مدد کر سکتا ہے۔“

وہ کل شہر سے واپس آ رہا ہے۔ منشی بشیر علی کا لہجہ عجیب سا تھا اور وہ بغور اس کے چہرے کے تاثرات جانچ رہا تھا۔ زین کے لیے اپنے تاثرات پھیلانا ممکن نہ رہے تو رخ بدل کر نہر کے پانیوں میں ٹپ ٹپ کرتے

کاٹے گھاتوں کو دیکھنے لگا۔ پھر دیر تک بیٹھ رہا۔

”وہ میری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔“

منشی بشیر علی کچھ لمحے اس کی پشت کو گھورتا رہا۔ پھر سرسری انداز میں پوچھنے لگا۔

”تمہارا کام مکمل ہو گیا۔“

”کون سا کام؟“ وہ ایک بار پھر گڑبڑا گیا تھا۔ منشی بشیر علی کے لبوں کی مسکراہٹ گہری ہوئی۔

”تم کون سے کام کے لیے آئے ہو؟“

زین کچھ لمحے بشیر علی کو دیکھتا رہا۔ اسے اس شخص کی بوڑھی نگاہوں کی چمک، معنی خیز لہجے نے خائف سا کر دیا تھا۔

”نہیں۔“ وہ مختصر سا جواب دے کر پلٹ گیا۔

”ابھی مکمل نہیں ہوا۔“

♥ ♥ ♥ ♥

جیب کے بریک عین اس کے قریب آ کر لگے تھے۔ وہ اچھل کر ایک سمت نہ ہو جاتا تو شاید پکلا جاتا یا

آنے والے کا مقصد ہی اسے ڈراتا تھا۔ وہ غصے سے جھنجھلا کر پلٹا اور ایک لمحے کو ساکت سا رہ گیا۔ رائے

سلیمان نے سرتاپا اس کا جائزہ لیا۔ زین کی یہاں آمد انتہائی غیر متوقع تھی۔ اس کی تیوری پر پل پر گئے۔

”تم یہاں کیا کر رہے ہو؟“

زین مبہم سا مسکرایا۔

”یہاں آنے کے لیے آپ سے اجازت لینا پڑتی ہے؟“

”یہ۔۔۔ میرا علاقہ ہے۔ یہاں پر نہ وہ بھی میری مرضی کے خلاف پر نہیں مار سکتا۔“ رائے سلیمان کو اس کا

لہجہ خاصا ناگوار گزرا تھا۔

زین نے دو قدم آگے ہو کر جیب کے دروازے پر دونوں ہاتھ ٹکائے۔

”پرندوں پر لاگو ہوتا ہو گا یہ اصول خوش قسمتی سے میں اک جیتا جاگتا انسان ہوں۔“

”آؤ گئے ہو۔ دعا کرنا۔ جا بھی سکو۔“ رائے سلیمان نے استہزاء سے مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ساتھ

یہ ڈرائیور کو جیب پر بھانے کے لیے کہا۔ زین دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ جیب تیزی سے آگے بڑھ گئی۔ سلیمان

نے حویلی جاتے ہی منشی بشیر علی کو طلب کیا۔

”گاؤں میں شہر سے کون آیا ہے؟“

منشی بشیر علی ان کے سوال کا مقصد نہیں سمجھ سکا تھا۔ پھر کان کھجاتے ہوئے بتانے لگا۔

”ایک تو ماسٹر عنایت کا بھائی آیا ہے۔“

”میں اس کی بات نہیں کر رہا۔“ سلیمان نے تیزی سے بات قطع کی۔ ”گاؤں میں ایک بندہ دندناتا پھر رہا ہے کون ہے وہ؟“

”اچھا وہ۔ قاسم کا دوست ہے شہر سے آیا ہے۔“

”کتنے دن ہوئے؟“

”ہفتہ بھر تو ہو گیا ہے۔“

”ہفتہ۔“ دونوں ہاتھ پشت پر باندھتے ہوئے وہ رائے اکبر کی تصویر کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ پھر اس

نے لب بچھڑچھڑ لیے۔ ہفتہ بھر پہلے ہی زارا گاؤں آئی تھی۔

”حویلی آیا تھا؟“

”نہ بیٹا جی! حویلی کے تو قریب بھی نہیں پھٹکا بس۔“ اس نے متذبذب سا ہو کر بات ادھوری چھوڑ دی۔

”بس کیا؟“

”بس ادھر ادھر معلومات اکٹھی کرتا رہتا ہے۔“

”کیسی معلومات؟“

”بڑے رائے صاحب اور رائے جمشید کے بارے میں۔“

”کیا مطلب؟“ وہ ایریوں کے بل اس کی طرف گھومے۔

”پتا نہیں کوئی اخبار و اخبار میں کہانیاں لکھتا ہے۔ شاید اس لیے۔“ ٹھیک طرح سے تو منشی بشیر علی بھی کچھ نہیں بتا سکتا تھا۔

”تمہیں یقین ہے کہ وہ حویلی بھی نہیں آیا۔“

”حویلی آتا تو جھلا مجھے خبر نہ ہوتی۔“

”ہوں!“ وہ کچھ لمحے سوچتا رہا۔ ”ٹھیک ہے نظر رکھو اس پر کہاں کہاں جاتا ہے اور کیا کیا کرتا ہے۔“

♥ ♥ ♥ ♥

مغرب کی اذان کے بعد نیم تاریکی گاؤں کی گلیوں میں چھانے لگی تھی۔ وہ مسجد سے نکلا تو پاؤں اک اور سمت چل دیے اک موزوم سی امتیہ تھی جو کشاں کشاں اسے گاؤں سے باہر کی سمت لے جا رہی تھی۔ نہر کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے وہ دائیں طرف پلٹ گیا۔ دھول اس کے قدموں سے لپٹ رہی تھی۔ پراٹھی اسکول کی عمارت پیچھے رہ گئی۔ تھوڑی دیر میں اسے قبرستان کی ٹوٹی پھوٹی چار دیواری اور گور کن کا کچا کوٹھا نظر آنے لگا۔

بے تحاشا درختوں کی گھنی چھایا میں تاریکی کا احساس کچھ اور بڑھ گیا تھا۔ اس نے سب سے پہلے

دادا اور پردادا کی قبروں پر فاتحہ پڑھی پھر گردن گھما کر اس درخت کی سمت دیکھا۔ جہاں وہ بوڑھا گور کن ملا

تھا۔ کچے گھر کی چوکھٹ پر لٹکتی لائین روشن ہو گئی تھی۔ اندر سے بائیں کرنے اور برتنوں کے کھٹکنے

کی آوازیں ابھر رہی تھیں۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ قبروں کے گرد خود رو گھاس اکی تھی۔ کہیں کہیں گھاس اتنی لمبی تھی کہ قبریں اس میں چھپ گئی تھیں جس

میں آوارہ بلیاں اور کتے اپنا مسکن بنائے ہوئے تھے۔ زین کے عقب میں ایک دم کچھ سرسراہٹیں ابھری

تھیں۔

زین تیزی سے پلٹا۔ وہاں کچھ نہیں تھا۔ شاید کوئی جانور جو ساتھ کی جھاڑیوں میں گھس گیا تھا۔ اس نے

ذرا آگے ہو کر آواز دی تھی۔ کچی کوٹھڑی سے ابھرتی آوازیں ایک دم خاموش ہوئیں۔

”آیا بھائی آیا۔“

ذرا سی دیر میں ایک نوجوان دھوٹی بنیان میں ملبوس چوکھٹ میں آگیا۔ لائین کی روشنی ان دونوں کے بیچ

حائل تھی۔ زین نے پہچان لیا۔ وہ بوڑھے گور کن کا بیٹا تھا۔

”کیا ہوا بابو؟ خیر سے تو آئے۔“ شاید وہ بھی اسے پہچان گیا تھا۔

”ہاں مجھے تمہارے ابا سے ملنا ہے؟“

”ابا سے۔“ لکھی نے حیرانی سے دہرایا۔ ”ابا سے“



کیا کام ہے؟

”یونہی کچھ پوچھنا تھا۔ وہ اس دن مجھے یہاں ملے تھے۔“

”ہاں۔ ہاں مجھے یاد ہے۔ پر اب اسے کیا پوچھنا ہے؟“

وہ بہت زیادہ سوال کرنے کا عادی معلوم ہوتا تھا، یا شاید اس کے اباسے کبھی کوئی ملنے ہی نہیں آیا تھا۔

زین کے چہرے پر چھائی سنجیدگی گہری ہو گئی۔

”یہ تو میں ان ہی گویاؤں گا۔“

لڑکے نے بے حد الجھ کر زین کو دیکھا۔ اس کی خاموشی سے تنگ آکر زین نے دوبارہ پوچھا۔

”وہ کہاں ہوں گے؟“

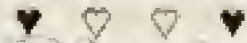
”اُدھر۔“ لڑکے نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ زین نے پلٹ کر دیکھا۔ وہاں جا بجا قبروں کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ زین کی استفہامیہ نگاہیں دوبارہ سے اس کے چہرے پر جم گئیں۔

”دس دن ہو گئے اب اسے انتقال کو۔“

”کیا؟“ وہ شدید سارہ گیا۔ تقدیر ہر راستہ کھول کر دوبارہ بند کر دیتی تھی۔ امید کا آخری سہارا تھا۔ جو ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ وہ کچھ لمحے بے یقینی سے اسے دیکھتا رہا۔

”باؤ جی! مجھے بتاؤ کیا پوچھنا ہے۔“

”تم میری کیا مدد کر سکو گے؟“ وہ مایوس سا ہو کر پلٹ گیا۔ اس نے عقب سے پکار کر کچھ کہا بھی تھا۔ جسے زین کی سماعت سننے سے قاصر ہی رہی۔ اسے تو یہ بھی خبر نہ تھی کہ ان گھنے درختوں کی اوٹ میں کوئی تھا جو مسلسل اس کے تعاقب میں تھا۔



ماما مقبول دونوں بازوؤں کا تکیہ بنا کر لیٹا تھا۔ محمد علی اس کے سینے پر سر رکھے اونٹھ رہا تھا۔ تارہ آہستہ سے چلتی ہوئی اس کے قریب آئی۔ مامے نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا مگر بولا کچھ نہیں۔

”ماما! تم مجھ سے ناراض ہو گے؟“

محمد علی سر اٹھا کر نین تارہ کو دیکھنے لگا۔ مامے کا ہاتھ

دھیرے دھیرے اسے تھپکنے لگا۔

”ماما!۔“

”میں کیوں ناراض ہوں گا۔“

”میں نے اس دن۔“

”غلط نہیں کہا تھا۔ کچھ بھی غلط نہیں کہا تھا تم نے۔ بزدل لوگوں کا جینا بھی کوئی جینا ہے۔ لوگوں کی باتوں سے ڈر کر تمہیں جہنم میں دھکیل دیا۔“ مامے مقبول کی آواز بے حد مدھم تھی۔

”لوگوں کی باتیں؟“ نین تارہ نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

”وہ کہتے تھے مامے کو مکان کا لالچ ہے۔“ ماما مقبول اتنا ہی کہہ کر خاموش ہو گیا اور آنکھیں موندے محمد علی کو ہچکاتا رہا۔

”کتنی عجیب سی زندگی ہو گئی ہے؟“

صحن کے پتوں بچ کھڑی نین تارہ نے خود کو بے حد تنہا محسوس کیا۔ جب سے اس کی زبان کھلی تھی۔

سب اس سے کترائے کترائے سے پھرتے تھے۔ اسماء بھی پہلے کی طرح باتیں نہیں کرتی تھی۔ وہ کیا کرے کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا۔ اس نے آنکھیں بند کر کے لیٹے مامے مقبول کو دیکھا اور بیزار سی ہو کر خاموشی سے باہر نکل آئی۔

منزل کوئی نہ تھی۔ بس اک خالی الذہنی کی کیفیت کے ساتھ چلتی رہی۔

”اور یہ کہنا کتنا آسان ہے کہ یہ زندگی میری ہے۔ اسے میں خود جیوں گی۔ مگر یہ زندگی اس کے خرے ہزار۔ اسے جینے کی کوشش میں ہزار بار مرنا پڑتا ہے۔

ہائے انسان! دعوا بھی کرے تو کس بل بوتے پر۔“

اس کے قدم تھک ہار کر سوکھے کھوہ (کنوئیں) کے کنارے جار کے اس نے ذرا سا جھک کر اس کے اندر جھانکا۔ اس کی اتھاہ گہرائی کی وہشت نے تیزی سے پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا۔ ”اعتبار کے بنا زندگی جینا کس قدر دشوار ہے۔“

دونوں ہاتھ منڈیر پر رکھا کر اس نے پھر اندر جھانکا۔

”میں نے بار بار سوچا میرا جانا زیادہ آسان ہے مگر یہ

کون ہے جو مجھے مرنے بھی نہیں دیتا۔ مگر یہ جھوٹی اور فرہی دنیا جینے کے قابل ہی کہاں ہے۔ یہاں کوئی ایک بھی ایسا نہیں جسے میری ضرورت ہو اور جب کسی کو میری زندگی کی ضرورت ہی نہیں تو پھر اس کا ہونا کیا معنی رکھتا ہے۔“ وہ پھر سے اپنا اعتماد کھو بیٹھی تھی۔

کچھ دے گھر کچھ دیاں خوشیاں کچھ دے جتن بکلی کچھ دے کارے بنے ساڈے کچھ دی ہوئی کھینڈی کچھ دے گھر وچ برسہ کے سوچاں مان کرال میں کس تے جنہاں ہتھیں پتھر دیکھے اوہ سی اپنے دوس دے

وہ استہزائیہ سی ہنسی ہنس دی۔

”کون اپنا ہوتا ہے کوئی بھی نہیں۔ سارے رشتے جھوٹے سارے وعدے فریب ڈھکوسلے۔“ ذرا سا آگے جھکتے ہوئے اس نے پھر سے تصور کیا۔ وہ مر جائے تو کون ایسا ہے جو اس کے لیے روئے گا۔ ”ماما! ہاں ماما۔ بھلا آدمی ہے۔ اور کچھ کرے نہ کرے میرے لیے روئے گا ضرور۔ کیا کروں؟ یہاں سے اپنی زندگی۔ اک نئی زندگی کا آغاز کیا۔“

”پاگل ہو گئی ہو۔“ کسی نے اسے ایک دم کندھوں سے پکڑ کر کھینچا تھا۔ وہ پشت کے بل نیچے گری۔

”کیوں اپنی زندگی داؤ پر لگا رہی ہو! حق لڑکی! یہ جاہل لوگ تمہاری موت کو بھی الزام بنالیں گے۔“

وہ ڈر گیا تھا۔ اپنے سامنے کسی کو مرتے دیکھنا آسان نہیں تو نہیں۔ نین تارہ نے اپنے سامنے کھڑے شخص کو دیکھا۔ جس کی معمولی سی ہمدردی اس کی پوری زندگی کے لیے الزام بن گئی تھی۔

”اور تم نے خود ہی تو کہا تھا کہ تم کسی سے نہیں ڈرو گی۔ یہ زندگی تمہاری ہے اسے تم خود جیو گی۔ تم نے تو کہا تھا کہ تمہیں کسی گواہی کی ضرورت نہیں اور یہ حرکت۔ یوں ڈرو گی تو سب تمہیں ڈرائیں گے کیونکہ یہ خود ڈرے ہوئے لوگ ہیں۔ ایک بار ان کی آنکھوں

میں آنکھیں ڈال کر تو دیکھو ان کے قدم اکھڑ جائیں گے۔ اور وہ ہمت جس نے کل ان بزدل لوگوں کے منہ پر طمانچہ دے مارا، آج کہاں گئی۔ مت کرو اپنی زندگی کو ضائع۔ یہ زندگی خدا کی امانت ہے۔ تمہاری زندگی۔“

”زندگی۔“ نین تارہ کے لبوں پر گہرا طعنا بھرا آیا۔ وہ جو کسی سے آنکھ ملا کر بات نہیں کر سکتی اب اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے پوچھ رہی تھی۔ ”یہ زندگی ہے۔ یہ جو میں جی رہی ہوں اسے زندگی کہتے ہیں۔ کیا اس سے زیادہ خوب صورت لمحے موت کے نہیں۔“

زین ششدر سا رہ گیا۔

یہی الفاظ۔ کم و بیش یہی الفاظ کچھ عرصہ پہلے اس نے زار اسے کہے تھے اور اب وہ کہہ رہی تھی۔

”میں نے کچھ بھی نہیں کیا اور معنوب ٹھہری۔“

اک عمر خود کو بچا بچا کر رکھنے کی سزا یہ ملی کہ سب کے لیے قابل نفرت ہوئی۔ میرے اپنے مجھ سے منہ موڑ گئے۔ میں اپنے ہی گھر میں اجنبی ہو گئی۔ لوگوں نے۔ میرے اپنے لوگوں نے مجھ پر وہ الزام لگائے کہ میں نے ہر بل مرنے کی دعا کی۔ وہ اس شخص کے سامنے رونا نہیں چاہتی تھی۔ وہ کسی کے سامنے رونا نہیں چاہتی تھی۔ مگر آنسو ساون کی جھڑی ہو گئے تھے۔ وہ پھر سے کمزور پڑ گئی تھی۔

وہ اسے یہ سب بتانا نہیں چاہتی۔ وہ اب کسی کو بھی کچھ بتانا نہیں چاہتی تھی۔ مگر بتا رہی تھی۔ حالانکہ وہ اس کا تھا ہی کون۔ اسے اپنی اس کمزوری اور بزدلی سے نفرت ہونے لگی تھی۔ زین جھکے جھکے انداز میں پگڈنڈی پر بیٹھ کر گھاس کی پتیاں نوچنے لگا۔ وہ روتے روتے خود ہی خاموش ہو گئی تب وہ آہستگی سے گویا ہوا۔

”کاش میں جب تمہاری مدد نہ کرتا۔“

”تم نہ کرتے تو کوئی اور کرتا۔ یہ سب تو ایسے ہی ہوتا تھا۔“ وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ ایک نظر اس کی پشت پر ڈالی۔ وہ زرد نارنجی سورج کی شعاعوں میں نہایا ڈوبتے سورج پر نظریں جمائے بیٹھا تھا۔



”کبھی کبھی مجھے لگتا ہے نین تارہ! میں اور تم بالکل ایک سی زندگی جی رہے ہیں۔“  
اس کا بے حد غم توجہ نین تارہ کے اٹھتے قدموں کو زنجیر کر گیا۔ ہاتھ کی پشت سے آنسو صاف کرتے ہوئے اس نے قدرے حیرت سے اسے دیکھا جو کہہ رہا تھا۔

”واقعات و حادثات مختلف ہو سکتے ہیں مگر کیفیات ایک ہیں۔۔۔ دکھ و تکالیف مختلف ہو سکتی ہیں۔ مگر درد ایک ہے۔ شاید جس پل تم نے خود کو اکیلا محسوس کیا اسی پل تمہاری کا عذاب مجھ پر بھی اترا تھا۔ جب تمہارے اندر مرنے کی خواہش نے جنم لیا، زندگی مجھے بھی بوجھ لگی تھی۔ بے عزتی کے احساس نے تمہیں گھر سے نکلنے پر مجبور کیا اسی پل میں بھی توہین کے احساس سے دوچار ہو کر نکل کھڑا ہوا تھا۔ جو زندگی تمہارے لیے طعنہ بنی، اسی زندگی کو میں نے بھی بے جرم سزا کی طرح کاٹا ہے۔ کیا یہ درد مشترک نہیں؟“  
وہ کھڑا ہو کر پلٹا تو عین اس کے مقابل تھا۔ نارنجی شعاعیں اس کے اطراف سے نکل کر نین تارہ کی آنکھوں میں ڈوبنے لگیں۔ وہ اس کے وجود کے سائے میں شہد رسی کھڑی تھی۔ نارنجی روشنی میں بھیگایہ انمول لمحہ ان دونوں کو ایک نئے سفر کا اذن دے رہا تھا۔  
”کچھ تو ایسا ہے جو ہمیں دوبارہ ایک دوسرے کے مقابل لے آیا۔ تم جانتی ہو، وقت یہ سازش کیوں کر رہا ہے؟“

وہ یک دم دو قدم پیچھے ہٹی۔  
اسے وقت اور تقدیر سے کسی مہربانی کی امید نہ تھی۔  
اس کے بے اعتبار قدم پگھڑی پر مڑ گئے۔  
”سی۔“ وہ ایک دم رکی۔ اڑی میں کہا کاٹا ہے  
درونی کے بچے کو زور کب بڑھائی۔  
”میں نے خدا سے جب بھی کچھ مانگا۔ بدلے میں  
میری زندگی میں تو بس اولاد کی دوری ہی کبھی  
زین پلٹ کر اس کے لڑکھڑاتے قدموں کو دیکھنے لگا  
اور ہر آنکھ میں اس کے فیصلے کو محسوس کر رہا تھا۔ وہ جانتا

ہو اس کے برابر آگیا۔ نین تارہ پگھڑی سے اتر گئی۔  
زین نے بھی اس کی تقلید کی۔ نین تارہ نے ناگواری سے اسے دیکھا اور قدموں کی رفتار تیز کر دی۔ زین کے قدم بھی نہیں رکے۔

گاؤں کی حد شروع ہوئی۔ وہ اس کے ساتھ تھا، کھیتوں سے واپس آتے لوگوں نے انہیں دیکھا۔  
اونچی نیچی گلیوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ وہ تب بھی ساتھ تھا نہ ایک قدم آگے نہ ایک قدم پیچھے۔ کچھ آشنا چروں پر حیرت سی ابھری۔ وہ اس کے ہم قدم تھا، دونوں ہاتھ جینز کی جیبوں میں ڈالے، پُرسکون اور با اعتماد نگاہ صرف راستے پر تھی۔

وہ بھاگ کر کھلے دروازے سے اندر داخل ہوئی۔  
مائے مقبول نے کچھ کہنے کو لب کھولے، عقب میں آتے زین کو دیکھ کر خاموش ہو گیا۔ نین تارہ بھاگ کر کمرے میں گھس گئی۔ زین مائے مقبول کے قریب آ کر رک گیا۔ مائے مقبول نے کچھ الجھ کر اپنے سامنے کھڑے متذبذب سے نوجوان کو دیکھا۔ وہ کچھ لمحے انگلیاں چٹختا رہا پھر بولا تو لوجہ سا، ٹھوس اور مضبوط تھا۔

”ایک دن آپ میرے پاس آئے تھے۔ آج میں اپنے دل و دماغ کی پوری آمادگی کے ساتھ آپ سے درخواست کر رہا ہوں۔ میں نین تارہ سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔“  
ماما مقبول پلکیں جھپکنا بھول گیا۔

”کہاں رہ گئیں یہ محترمہ؟“ رضوان نے دوسری بار گھڑی پر نگاہ دوڑائی۔  
”اپنا پرس لینے گئی ہے۔“ ماما نے آہستگی سے بتایا۔ رضوان رات ہی آیا تھا اور صبح جانے کے لیے تیار۔ تائی اماں اسی بات پر خفا سی تھیں۔  
”میری زندگی میں تو بس اولاد کی دوری ہی کبھی  
پلے بورڈنگ، پھر پریس اور اب شہر نے جکڑ لیا ہے۔ پورا پورا ہفتہ گزر جاتا ہے تمہاری شکل دیکھنے  
تھوڑا ترس ہی کھالیا کرو ماں پر۔“

”امی!۔“ رضوان بازوان کے کندھے پر پھپھلا کر ہنس دیا۔ ”مصروفیت تھوڑی زیادہ ہو گئی ہے۔ لیکن جب بھی موقع ملتا ہے سیدھا گاؤں بھاگتا ہوں۔“  
”ہاں، رات بھر رکتے ہو صبح پھر جانے کو تیار۔ ماں تو بات کرنے کو ترس جاتی ہے۔“

”رضوان! ایک فیکٹری بیچ کیوں نہیں دیتے۔“  
آئمہ جانتی تھیں اس پر دہرا بوجھ ہے۔  
”کم آن آنٹی لوگ تو چار چار فیکٹریاں سنبھال لیتے ہیں۔ میں دو نہیں سنبھال سکوں گا۔ انکل کی فیکٹری تو یوں بھی اسٹیبلش ہے۔ سارا کام جوں کا توں ہو رہا ہے۔ بس ذرا نگرانی کرنا پڑتی ہے اور وہ کوئی ایسا بڑا مسئلہ نہیں۔“

وہ سرسری سے لہجے میں بولا۔ آئمہ نے ممنونیت سے اسے دیکھا۔ وہ واقعی عصمو ہی کی طرح تھا۔ کسی بھی بات کو جتنا اس کی عادت نہ تھی۔ تب ہی زارا شولڈر بیک سنبھالے آئی۔

”ایک اس کے آنے سے ذرا رونق ہو جاتی ہے مگر یہ بھی ہمیشہ بھاگنے کو تیار رہتی ہے۔“ تائی اماں نے شکوہ کیا۔

”میں کئی بار کہہ چکا ہوں۔ چھوڑیں حویلی، شہر چلتے ہیں۔“ جواب رضوان نے دیا تھا۔  
تائی اماں نے خفگی سے اسے دیکھا۔  
”تم نئی نسل کا بس چلے تو اپنے آباؤ اجداد کی ہر چیز سے جان چھڑالو۔“

”میں مذاق کر رہا تھا۔“ رضوان نے ہنستے ہوئے کہا۔ تائی اماں نے اس کی پیشانی پر بوسہ دیا۔ زارا کو پیار کیا۔ ماما نے جلد آنے کی تاکید کی۔  
”اپنا خیال رکھیے گا۔“ زارا کو زیادہ فکر ماما کی ہی ہوتی تھی۔  
”آپ واقعی بہت مصروف ہو گئے ہیں رضوان۔“  
گاڑی حویلی سے نکلی تو زارا نے کہا۔ ڈرائیونگ ہمیشہ کی طرح رضوان خود ہی کر رہا تھا۔  
”ہاں، اب تو تمہیں فون کرنے کا بھی وقت نہیں ملتا۔“ وہ مسکرا دیا۔

”میں اس لیے نہیں کہہ رہی۔ تائی اماں کو بہت فکر رہتی ہے آپ کی۔“  
”اور تمہیں۔“ اس کی نگاہیں متبسم و شریر ہوئیں۔

”ظاہر ہے مجھے بھی ہوگی۔“ اپنی مسکراہٹ دیا کر اس نے سرسری سا لوجہ اختیار کیا۔ ”لیکن مصروفیت کیسی بھی ہو، اپنے لیے وقت تو نکالنا چاہیے۔“  
”ٹھیک کہہ رہی ہو۔ لیکن کیا کریں زارا ڈیر! یہ مقابلے کا دور ہے۔“ وہ بے بسی سے کندھے اچکا کر بولا۔ ”لیکن آج ایسا کرتے ہیں تھوڑا وقت نکالتے ہیں اپنے اور تمہارے لیے۔ تمہیں گھر چھوڑ کر میں آؤں گا لیکن لہجہ نام تک تیار رہنا۔ لہجہ باہر کریں گے اور پھر آؤنگ کے لیے کہیں بھی نکل چلیں گے۔“

اس نے فوراً ہی پروگرام بنالیا۔  
”اوکے۔ لیکن۔“ اس کے باقی الفاظ لبوں میں ہی دم توڑ گئے۔ گاڑی تیزی سے اس شخص کے پاس سے گزر گئی تھی۔ جسے وہ ہزاروں لاکھوں میں بھی پہچان سکتی تھی۔ اس نے بے اختیار پلٹ کر پھر گردن گھما کر بیک مرر سے اسے دیکھا۔  
”مائی گاڈ!۔۔۔ زین یہاں۔۔۔“

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

عمران ڈائجسٹ کا ایک حیرت انگیز سلسلہ

# ایر ہوسٹس

آب و حوضوں میں شائع ہو گئی ہے

ملکتِ عمران ڈائجسٹ، ۲۷، اردو بازار، کراچی



زارا سوچ بھی نہ سکتی تھی کہ زین جیسا بزدل شخص یہ انتہائی قدم اٹھالے گا۔ وہ بھی بنا کسی سے پوچھے اور مشورہ کیے بغیر۔ جس بل زارا نے آخری بار زین سے بات کی تھی۔ اس کے کسی جملے، کسی انداز سے اس کا اندازہ نہیں ہو رہا تھا اور اسے زین سے اس بے وقوفی کی توقع بھی نہ تھی کہ وہ منہ اٹھا کر گاؤں پہنچ جائے گا۔ موٹر کاٹ کر سڑک پر آتے ہوئے رضوان نے اس کی سمت دیکھا۔ وہ بات کرتے کرتے ایک دم خاموش ہوئی تھی۔

”ہاں۔۔۔!“ وہ چونک گئی۔ نظریں بیک مرر کی طرف اٹھیں مگر موٹر کاٹنے کی وجہ سے وہ اب غائب ہو چکا تھا۔ وہ ایک طویل سانس لے کر رہ گئی۔

”کہاں کھو گئیں محترم۔۔۔؟“ رضوان نے پوچھا تو وہ قصداً ”ذرا سا مسکرائی۔ پھر نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔

”کیس نہیں۔۔۔؟“

(یہ یقیناً) افتخار کا مشورہ ہو گا۔ زندگی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جینے کے سبق وہی دیا کرتا ہے)

”ہم کیا بات کر رہے تھے؟“

”پتا نہیں۔۔۔“ ساری باتیں گڈنڈ ہو گئی تھیں۔

”سوچا۔“ اور شاید یہ اچھا ہی ہوا۔ تم کب تک ڈبل ہانڈ ہو کر سوئے رہتے۔“

سڑک پر بھینٹوں بکریوں کا ریوڑ گزر رہا تھا۔ رضوان نے گاڑی آہستہ کر لی۔ چرواہا ادھر ادھر بھاگ جانے والی بکریوں کو ہانک رہا تھا۔ گاڑی میں بالکل خاموشی چھا گئی تھی۔ شاید رضوان نے اس کی بے توجہی محسوس کر لی تھی۔ زارا نے نظروں کا زاویہ بدل کر رضوان کو دیکھا۔ وہ دونوں ہاتھ اسٹیرنگ پر جمائے باہر دیکھ رہا تھا۔ یہ وہ شخص تھا جس نے ہمیشہ اپنی محبت و وفا اور اعتماد کا یقین دلایا تھا۔ صرف لفظوں سے نہیں اپنے عمل اور رویے سے۔ وہ دعوے ہی نہیں کرتا تھا۔ وقت آنے پر ثابت بھی کر دیتا کہ دنیا میں وہی ایک شخص ہے جو وقت آنے پر ڈھال بن کر اس کے سامنے کھڑا ہو سکتا ہے۔

رضوان کے لبوں پر مبہم سی مسکراہٹ بکھر گئی۔ ”تو کیا یہ شخص قابل اعتبار نہیں؟“ زارا کا دل چاہا۔ وہ اسے اس راز میں شریک کر لے۔ اسے زین العابدین کے بارے میں سب کچھ بتا دے۔ وہ یقیناً اس کی مدد کرے گا۔

”رضوان!“ اس نے بے اختیار پکارا تھا۔

”میں ہمہ تن گوش ہوں۔۔۔“ اس کا لہجہ و انداز متبسم و شیریں تھا۔ زارا ریک سی گئی۔ پھر کچھ سوچ کر قدرے بیزاری سے بولی تھی۔

”کچھ نہیں۔“

رضوان کی آنکھوں میں ہلکی سی حیرت در آئی۔ زارا کا ہر ہر انداز وہ پہچانتا تھا۔ وہ ٹوک لہجے میں بغیر کسی لٹی رکھے بات کرنے والی لڑکی تھی۔ ٹھوس، مستحکم مگر رشتوں کا احساس کرتا لہجہ ہوتا۔ مگر کبھی بھی وہ بونہی اسے پکار لیتی۔ جیسے کچھ کہنا چاہتی ہو۔ مگر ہمیشہ ہنا کے بات بدل دیتی۔ اس لہجے جو ابھمن اس کے چہرے پر نظر آئی وہ رضوان کو بھی الجھا دیتی تھی۔ سڑک خالی ہو چکی تھی۔ اس نے اسپید بڑھا دی۔

”نہیں معلوم ہے زارا! میرے اور تمہارے رشتے کا سب سے خوبصورت پہلو کیا ہے؟“

رضوان نے پوچھا تو زارا کی سوالیہ نظریں اس کی طرف اٹھیں۔ وہ اس رشتے کے کئی خوبصورت پہلو گنوا سکتی تھی، مگر وہ جاننا چاہتی تھی۔ رضوان کے نزدیک سب سے خوبصورت پہلو کون سا ہے۔ رضوان کچھ لمحے منتظر رہا مگر خود ہی بول اٹھا۔

”میں جانتی ہوں۔۔۔“ وہ آہستگی سے گویا ہوئی۔

”پھر بھی لگتا ہے، کہیں کوئی کمی ہے۔ کوئی کسر رہ گئی ہے میری طرف سے۔۔۔“

”ایسی کوئی بات نہیں رضوان! میں ہمیشہ کہتی ہوں، مجھے آپ پر خود سے زیادہ اعتبار ہے۔“

رضوان کے لہجے میں دیر آنے والی ہلکی سی مایوسی اس سے برداشت نہ ہوئی تھی۔ رضوان نے رخ بدل کر راہ راست اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

”تو کچھ تم مجھ سے وہ کیوں نہیں کہہ دیتیں جو کہنا چاہتی ہو۔“

زارا چاہتے ہوئے بھی نظروں کا زاویہ نہیں بدل سکی۔ البتہ رضوان نے اپنی توجہ سامنے مرکوز کر لی تھی۔

”رضوان! اگر میں آپ کو کچھ نہیں بتا پا رہی تو اس میں کچھ بھی مصلحت ہو سکتی ہے۔ مگر وہ نہیں جو آپ کو کچھ رہے ہیں۔“ زارا کے لہجے میں سنجیدگی در آئی تھی۔

”کبھی کبھی ہم مصلحت کے ہاتھوں مناسب وقت بھی کھودیتے ہیں زارا!“

زارا نے چونک کر رضوان دیکھا۔ نجانے کیوں اسے بابا کی آخری بات یاد آگئی تھی۔ انہوں نے جب کہا تھا۔

”مجھے صرف اس بات کا افسوس ہے کہ تم لوگوں نے مجھ پر اعتبار نہیں کیا۔۔۔“ کس قدر افسردگی و مایوسی تھی ان کے اس ایک جملے میں۔

زارا کے اندر اضطراب سا اتر گیا۔

”کیا واقعی ہم اپنی بے جواز مصلحتوں کے ہاتھوں

مناسب وقت کھودیتے ہیں۔۔۔“

ایک فیصلہ سا اس کے اندر اتر آ۔ وہ کب تک یہ سب چھپا سکتی تھی۔ آج یا کل سب کچھ عیاں ہونا ہی تھا۔ تب رضوان یہ شکوہ کرنے میں حق بجانب ہی ہو گا کہ زارا نے اس پر اعتبار نہیں کیا۔

”اور اب یہ کھیل ختم ہو ہی جانا چاہیے۔“

”رضوان۔۔۔!“ اس کے لہجے میں مخصوص الجھن غائب ہو چکی تھی۔ رضوان اس کی طرف متوجہ ہوا۔

”تمہیں زین العابدین یاد ہے۔۔۔؟“ اس نے محتاط سے لہجے میں آغاز کیا۔

”کون زین العابدین۔۔۔؟“ وہ ڈیڑھ برس کا بچہ جس کے لیے وہ ہاسٹل سے کھلونے لایا کرتا تھا کہیں لاشعور میں ہو تو ہو۔ فوری طور پر شعور نے نفی کا سنگل ہی دیا تھا۔

”نورین آنٹی کا بیٹا۔۔۔؟“ زارا نے دانستہ یہ حوالہ استعمال کیا تھا۔

”اوس۔۔۔“ وہ چونکا پھر پوچھنے لگا۔ ”اس کا یہاں کیا ذکر۔۔۔؟“

”اسی کا ذکر تو کرنے جا رہی ہوں۔۔۔“ زارا نے آہستگی سے کہا۔ رضوان نے ابھ کر اسے دیکھا ”میں اور مہما زین العابدین سے ملتے ہیں۔۔۔“

رضوان کے ذہن کو جھٹکا سا لگا۔ دوسرے بل اس کا پاؤں بریک پر دباؤ ڈال گیا۔ جیب کے پیسے چرچرائے اور وہ عین سڑک کے درمیان رکی تھی۔ بچی پٹی سڑک پر دھول کا بادل اٹھا اور بند شیشوں سے سرنگھرانے لگا۔

رضوان پورے کا پورا اس کی طرف پلٹ گیا۔

”تم اور آنٹی زین العابدین سے ملتے ہو گویا زین۔۔۔؟“

زارا خاموش بیٹھی شیشوں پر جمی گرد دیکھتی رہی۔

یہی گرد ہے جو ہمارے ذہنوں پر چھا کر سارے منظر دھندلا دیتی ہے۔ واقعات کا اصل رخ ہی چھپا دیتی ہے۔

”کب سے زارا۔۔۔؟“

”ایک سال سے۔۔۔“ اس نے آہستگی سے بتایا۔

رضوان کی آنکھوں میں بے یقینی ہی بے یقینی تھی۔ وہ



جو سمجھتا تھا زار اس سے بھی کوئی بات نہیں چھپا سکتی اور وہ گزشتہ ایک سال سے اس بات کو چھپائے ہوئے تھی۔

”وہ میرا بیویورٹی فیلو ہے۔“ زار نے مزید بتایا۔  
رضوان کا دماغ ماؤف سا ہو گیا تھا۔ حیرت تھی غصہ اور دکھ بھی۔

”سلیمان بھائی جانتے ہیں۔“  
”نہیں۔“ زار نے مختصراً جواب دیا۔

”تم جانتی ہو۔ سلیمان بھائی کو جب یہ اطلاع ملے گی۔ تو ان کا رد عمل کیا ہو گا۔“

زار نے ایک نظر اسے دیکھا، پھر سامنے دیکھتے ہوئے سپاٹ سے لہجے میں بولی تھی۔ ”جانتی ہوں۔“

”تم ایک ایسے شخص سے ملتی رہی ہو۔ جو میرے باپ کے قاتل کا بیٹا ہے۔“ رضوان کے لہجے سے دیا دیا غصہ اور شدید نفرت متاثر تھی۔

”وہ نورین آئی کا بھی بیٹا ہے اور ویسے بھی باپ کے جرم کی سزا کیا بیٹے کو ملے گی؟“

اس نے رسائی سے سوال کیا۔ رضوان بنا جواب دیے اسے دیکھتا رہا۔ پھر لب بلب کرنا گیشن میں چابی گھمائی۔ شاید اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ کس

رد عمل کا اظہار کرے۔ زار اسے یہ نہیں بتا سکی کہ اس نے زین کو گاؤں میں دیکھا ہے۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ یہ خبر رضوان کے ذریعے سلیمان تک پہنچے۔

بہر حال زین کی زندگی اور سلامتی اسے سب سے زیادہ عزیز تھی۔

گھر پہنچنے تک رضوان بالکل خاموش رہا تھا۔ عالیہ بھابھی لان ہی میں چمچل قندی کر رہی تھیں۔ اسے دیکھتے ہی خوش دلی سے بولیں۔

”شکر ہے زار! تم آگئی۔“ وہ نہ سمجھتی کہ زار کیا تھا کہ آج باجی نہیں آئیں تو میں خود گاؤں پہنچ جاؤں گا۔“

”اسکول کیا ہے؟“ زار نے ان سے گلے ملتے ہوئے پوچھا۔

”میں سب ٹھیک ہوں۔“

”مجھے انہیں سب کچھ بتانا چاہیے تھا۔“

”بالکل۔۔۔“

”ناشتہ لگاؤں تم لوگوں کے لیے۔۔۔؟“ انہوں نے رضوان سے پوچھا۔

”ناشتہ کر چکے ہیں۔ میں ابھی واپس جا رہا ہوں بس زار کو چھوڑنے آیا تھا۔“ رضوان نے بے حد سنجیدگی سے جواب دیا۔ پھر ملازم کو پکار کر بریف کیس گاڑی میں رکھنے کو کہا۔

”تمہارے بھیا کب واپس آئیں گے۔؟“

”کچھ بتایا نہیں انہوں نے۔۔۔“ وہ سابقہ انداز میں کہہ کر گاڑی کی طرف برہہ گیا۔

عالیہ بھابھی رازداری کے ساتھ اس کی طرف جھکیں۔

”میرے دوپور کے منہ پر بارہ کیوں بچ رہے ہیں۔ کیا راستے میں لڑائی ہو گئی تھی۔“

”ایسی کوئی بات نہیں۔ آپ بتائیں۔ اس وقت اتنی فاسرغ کیسے نظر آ رہی ہیں۔“

اس نے آرام سے بات بدلی۔ حالانکہ رضوان کے اس بے حد سنجیدہ انداز کو وہ پوری حسیات کے ساتھ محسوس کر رہی تھی۔ لیکن ایک بات کا یقین تھا اس کو۔ رضوان کسی اور خاص طور پر سلیمان سے یہ بات نہیں کرے گا۔

”وہ تمہارے سلیمان بھائی تو کہہ دیتے ہیں صاف صاف کہ اگر موٹی ہوئیں تو دو سری لے آؤں گا۔ کل ویٹ کیا تو پورے پانچ کے جی ویٹ بڑھ گیا تھا۔ صبح شام واک کرتی ہوں۔“

”یہ آپ کی صبح ہے۔؟“ زار نے رضوان کی گاڑی کو گیٹ سے نکلنے دیکھا تو اندر کی طرف قدم بڑھا دیے۔

♥ ♥ ♥ ♥

دونوں ہاتھ سر کے نیچے تکیہ کیے وہ پٹنگ پر نیم دراز تھا۔ اس کی آنکھیں روشن دہان سے چھن چھن کر آتی دھوپ کی کرنوں سے اُبھ رہی تھیں۔ مگر ذہن میں ایک چھڑی سی پک رہی تھی۔ ایک فیصلہ تھا۔ جو ہونے میں ہی نہ آتا تھا۔ وہ متذبذب تھا۔

”مجھے انہیں سب کچھ بتانا چاہیے تھا۔“

وہ کب سے ایک ہی بات سوچے جا رہا تھا۔ تب ہی بلکی آواز سے اندرونی دروازہ کھلا۔ اس کی اوھر اوھر بکھری سوچیں بھاگ کر ذہن کے کسی نیم تاریک کونے میں جا گھسیں۔ کمرے کی نیم تاریکی میں روشنی نے راستہ سا بنالیا تھا۔

مائے مقبول نے اسے دیکھا۔ پھر سوتا سمجھ کر الماری کی طرف پلٹ گیا۔ وہ اس کے خیال سے بہت آہستگی سے الماری کھول رہا تھا۔ شاید اسے کچھ لینا تھا۔ مگر اس کے پیچھے محمد علی کلاکریاں مارتا آیا تھا۔

”بابا۔۔۔ بابا۔۔۔“ وہ مائے مقبول کو نجانے کیا دکھانا چاہتا تھا۔

”اوئے گڈو! چل اپنی ماں کے پاس۔۔۔“ مائے مقبول نے دلی آواز میں اسے ڈانٹا۔ مگر وہ سنی آن سنی کر کے میز کے نیچے گھس گیا۔ کچھ لمحے وہاں پڑی چپل کو چھیڑتا رہا۔

”چھپانا دھوکا دینے کے مترادف ہو گا۔“ زین نے آخری بار سوچا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ پٹنگ چرچا رہا تھا۔ مائے مقبول نے پلٹ کر دیکھا پھر مسکرا دیا۔

”میں سمجھا۔ تم سو رہے ہو۔۔۔“

”نہیں۔ میں کچھ سوچ رہا تھا۔“ زین نے اپنے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

”گڈو۔ پترا! نکل پٹنگ کے نیچے۔ ورنہ چاچا مارے گا۔“

مائے مقبول نے محمد علی کو ڈرایا۔ وہ پٹنگ کے نیچے سے نکل زین کی طرف دیکھنے لگا۔ زین نے مسکرا کر اس کا گال تھپتھپایا۔ اسے گویا حوصلہ ہو گیا تھا۔ ایک ایک قدم اٹھا ماؤہ میز تک آیا۔ میز کا کونا دونوں ہاتھوں سے تھما کر منی منی اڑیاں اٹھائے اوپر رکھی کتابیں دیکھنے لگا۔

”بابا! مجھے آپ سے کچھ بات کرنا ہے۔“

مائے مقبول دہل مایا گیا۔

”کیس! اس کا ارادہ تو نہیں بدل گیا۔“ اس نے بغور زین کا چہرہ دیکھا۔ وہ مقبول کو کچھ الجھا ہوا لگا۔

”ایسی بات۔۔۔؟“

”بابا! مجھے آپ سے کچھ بات کرنا ہے۔“

مائے مقبول دہل مایا گیا۔

”کیس! اس کا ارادہ تو نہیں بدل گیا۔“ اس نے بغور زین کا چہرہ دیکھا۔ وہ مقبول کو کچھ الجھا ہوا لگا۔

”ایسی بات۔۔۔؟“

”آپ۔۔۔ بیٹھیں۔۔۔؟“ زین نے کہا تو وہ میز کے پاس بڑی کرسی پر بیٹھ گیا۔ محمد علی اچک اچک کر کسی چیز کو پھینکنے کی کوشش کر رہا تھا۔

”میری سمجھ میں نہیں آتا میں کیسے کہوں۔۔۔ اگر معاملہ شادی کا نہ ہوتا تو شاید میں فی الحال یہ بات کسی سے نہ کرتا۔“ وہ متذبذب سا انگلیاں پچھتا رہا تھا۔ مائے مقبول کی دل کی دھڑکن تیز ہو رہی تھی۔ ذہن قیاس کر رہا تھا۔ وہ کیا کہنے والا تھا۔

ابھی رات اس کی آنکھوں نے ایک طویل عرصے کے بعد سکھ کی نیند دیکھی تھی۔ وہ نہیں چاہتا تھا۔ زین کی کوئی بات پھر سے اس کی راتوں کی نیند اور دن کا چین چین لے۔

”تم کہو۔۔۔؟“ اس کی آواز بے حد ہم تھی۔

”میں نے نین تارہ سے شادی کا فیصلہ پوری ایمان داری اور سچائی سے کیا ہے اور اسی ایمان داری اور سچائی کا تقاضا ہے کہ میں آپ کو سب کچھ سچ سچ بتا دوں۔“

”یا اللہ۔۔۔ یا اللہ۔ اس بچی پر رحم کر۔۔۔“ اس کا دل دونوں ہاتھ باندھے وہاں دے رہا تھا۔

”آپ جانتے ہیں میں درحقیقت یہاں کس کام سے آیا ہوں۔۔۔؟“ زین نے آہستگی سے پوچھا تو مائے مقبول کی گردن میکا کی انداز میں نفی میں ہلی۔ تب ہی محمد علی نے کسی چیز کو ہاتھ مارا۔ زین کا والٹ میز سے پھسل کر مائے مقبول کے پیروں میں آگرا۔

”اوئے۔۔۔!“ ماما مقبول نے اسے اٹھانا چاہا۔ مگر وہیں ساکت ہو گیا۔ اسے لگا والٹ نہیں مکان کی چھت گر گئی ہے۔ کھلے والٹ میں۔۔۔ وہ ششدر سا اسے دیکھتا رہا۔ زین کی توجہ اس سمت نہیں تھی۔ وہ مناسب لفظ ڈھونڈ رہا تھا، مگر جو بات اس کے ہونٹوں پر رک رہی تھی۔ کھلی سچائی کی طرح سامنے آ رہی تھی۔

مائے مقبول نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ اس کی آنکھیں کھڑی ناک، کشادہ پیشانی، اس کے ہونٹ۔۔۔ پہلے آپ کو وعدہ کرنا ہو گا کہ فی الحال آپ اس حقیقت کو کچھ عرصہ چھپا کر رکھیں گے۔“



مائے مقبول نے پھر سے والٹ میں لگی تصویر کو دیکھا۔ پھر زین کو۔

”دراصل میں آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ۔۔۔۔۔“

”کہ تم رائے جمشید حیات کے بیٹے ہو۔ رائے حیات اکبر کے پوتے۔۔۔۔۔“

زین ششدر سا رہ گیا۔

مائے مقبول نے جھک کر والٹ اٹھایا اور اس میں لگی تصویر کو بغور دیکھنے لگا۔ زین ایک طویل سانس لے کر رہ گیا۔ حقیقت خود بخود سامنے آگئی تھی۔ مائے مقبول نے والٹ اس کی سمت بڑھا دیا۔

”جی! میں یہی بتانا چاہتا تھا۔۔۔۔۔“ اس نے والٹ تھام لیا۔

”تم یہاں کیوں آئے تھے۔۔۔؟“

”سچائی کی تلاش میں۔“ اس نے والٹ میں رکھی بیابا کی تصویر کو دیکھا۔

”واپس چلے جاؤ۔۔۔۔۔“ مائے مقبول نے بے اختیار کہا تھا۔ زین نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

”خالی ہاتھ۔۔۔۔۔؟“

”تم نے یہاں آکر اچھا نہیں کیا۔“

”کاش کوئی ایک تو یہ کہے۔ تم نے یہاں آکر بہت اچھا کیا زین العابدین۔۔۔۔۔“ وہ پھکی سی ہنسی ہنس دیا۔

”یہاں تمہیں کچھ نہیں ملے گا۔۔۔۔۔؟“

”ما یوسی‘ تاریکی‘ دھند‘ راستے‘ اجنبیت۔ تو کیا میں ساری زندگی منزل کی تلاش میں یونہی بھٹکتا ہوا واپس چلا جاؤں تو اس دل کو کیسے سمجھاؤں۔ جو کہتا ہے بیابا بے قصور ہیں‘ جو کہتا ہے یہ بزدلی کی زندگی مست جینا زین العابدین۔ میں کب تک لوگوں سے چھپتا رہوں گا بیابا‘ اپنی زمین‘ اپنی مٹی پر کھڑے ہو کر کب تک اپنی شناخت چھپاتا رہوں گا۔ کب تک حویلی کے در و دیوار کو دور سے تکتا رہوں گا۔“ اس کا چہرہ شکست خوردگی کی علامت تھا۔ پھر یک دم گویا اس کے اندر لے لے ابال اٹھا تھا۔ چہرہ ایک دم دہکنے لگا تھا۔

”نہیں۔۔۔۔۔ اب ایسی زندگی جینا۔ میں کچھ بھی نہ کھوج پایا تب بھی ان لوگوں کے سامنے جا کر اپنی

حوالی میں کھڑے ہو کر یہ ضرور کہوں گا کہ میں رائے جمشید حیات کا بیٹا ہوں اور مجھے اس شناخت پر کوئی شرمندگی نہیں۔ تاکہ کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ زین العابدین بھی اپنے باپ کی طرح بزدل تھا۔“

”تم ایسا کچھ نہیں کرو گے۔۔۔۔۔“ مائے مقبول نے تیزی سے کہا۔ اس کا لہجہ درشت تھا۔ درحقیقت وہ ڈر گیا تھا۔ زین کے لبوں پر در آنے والی مسکراہٹ بتاتی تھی۔ وہ ایسا ہی کچھ کرے گا۔

”تم رائے سلیمان کو نہیں جانتے ہو۔ وہ بھون کر رکھ دے گا تمہیں۔“

”مجھے موت سے ڈر نہیں لگتا۔“ اس کی آنکھوں میں عجیب سی بے خوفی تھی۔ مائے مقبول نے بہت غور سے اس کے تاثرات دیکھے۔ اس کے ہر انداز میں جرات تھی۔

”کیوں گڑے مردے اکھیڑتے ہو۔ بڑھے لکھے ہو‘ شہر میں اپنا گھر ہے کہیں نوکری کر کے سکون کی زندگی گزارو۔۔۔۔۔ پتر! تم ان لوگوں کو نہیں جانتے۔ طاقت کے نشے میں چور ہیں۔ پاگل تو نہیں ہیں کہ زمین کے ایک اور وارث کو اپنے مقابل کھڑا ہونے دیں۔ یہ تو چھوٹا سا بہانا بنا کر تمہیں راستے سے ہٹا دیں گے۔ سکون سے زندگی جی رہے ہو۔ مت پریشان بکھیرؤں میں۔“

”سکون سے ہی تو نہیں جی رہا۔۔۔۔۔“ وہ زیر لب برہنہ کیا۔

”ہو سکے تو فوراً“ واپس چلے جاؤ۔ یہ منشی بشیر علی جو سارے گاؤں میں دندناتا پھر رہا ہے اس کا خاص بندہ ہے اسے تو بھنک بھی پڑ گئی تو۔۔۔۔۔“

”آپ میری مدد نہیں کر سکتے تو پلیز مجھے روکیے بھی مت۔۔۔۔۔“ وہ بیزار سی سے گویا ہوا۔

محمد علی اس کے ہاتھ سے والٹ چھیننے کی کوشش کر رہا تھا۔ زین نے اسے میز کی دراز میں رکھ دیا۔ تو ما یوس ساہو کر دراز کھولنے لگا۔

ماما مقبول خاموش ساہو گیا تھا۔

”میں نے آپ سے کچھ نہیں چھپایا۔ فیصلہ آپ کو کرنا ہے۔ میں پہلے بھی اس سے شادی کرنا چاہتا تھا اور



اب بھی کرنا چاہتا ہوں۔ اگر آپ کے دل میں کوئی ڈر کوئی خوف ہے تو۔۔۔

زین نے ہلہ اوھو رہی تھی۔ ماما مقبول نے کہا کیا سوچتا رہا۔ بہت سے لمحے خاموشی کی گود میں سر رکھ کر اونگھنے لگے۔ تب ایک طویل سانس لے کر وہ کھڑا ہو گیا۔

”اس نمائی کی زندگی میں کوئی اور دکھ لکھا ہوا تو میں کیا کر سکوں گا۔ اس کی تقدیر میں تو دعا ہی کر سکتا ہوں۔ پہلے بھی کرتا تھا اب بھی کرتا رہوں گا۔“ اس کے بوڑھے ہاتھ زین کے سر پر ٹک گئے۔

”میری تو ساری امیدیں تم ہی سے وابستہ تھیں۔ کل بھی اور آج بھی۔“ زین نے سر اٹھا کر اسے دیکھا اور اس کا بوڑھا ہاتھ اپنے مضبوط ہاتھوں میں لے کر مسکرا دیا۔

”تھینک یو بابا۔ تھینک یو سوچ۔ میرے بس میں جہاں تک ہوا۔ میں اس کے لیے کروں گا۔ مجھے یقین ہے۔ آپ کی دعا میں ہماری خوشیوں کے گرد حصار باندھ دیں گی۔“

”اللہ تمہاری حفاظت کرے۔“ مامے مقبول نے جھک کر اس کا سر چوم لیا۔ آج اس پر ٹوٹ کر ہمارا آ رہا تھا۔ اپنی آنکھوں میں در آئی تھی کو چھپاتے ہوئے اس نے جھک کر مجھے علی کو اٹھالیا۔

”چل گڈو۔ تجھے ملنی لے دوں۔“ زین نے ایک سکون بھری سانس کھینچی۔ اس کے سر سے گویا ایک بوجھ اتر گیا تھا۔

منشی بشیر علی مامے مقبول کو دکان پر ہی مل گیا تھا۔ پہلی بار مامے مقبول کو اس کی شکل بے حد بری لگی تھی۔

”کوئی بدیہی مقبول کیا حال چاہتا ہے؟“ ”ٹھیک ہوں۔“ مامے مقبول کے بچے میں لا شعوری طور پر رکھائی در آئی تھی۔

”ملانی دلائے لیا تھا۔“ اس نے صوفی کو ٹیٹھی ”گولیاں دینے کا اشارہ کیا۔“

”اور سناؤ! تمہارا شہری مہمان چلا گیا یا نہیں ہے۔؟“

”اسے بہت زیادہ سوال کرنے کی عادت ہے۔“ مامے مقبول نے پہلی بار سوچا تھا۔

”ہمیں ہے۔“ اس نے کر تے کی جیب سے پیسے نکالے۔ محمد علی نے ٹافیاں دونوں مٹھیوں میں بھری تھیں۔ ”جاتا تو تمہیں خبر ہو ہی جاتی۔“

”ٹھیک ٹھاک تو ہے نا۔۔۔“ ”ٹھیک ٹھاک ہے اسے کیا ہونا ہے۔“ ماما مقبول چڑسا گیا۔

”یار یو نمی بوجھ رہا ہوں۔ اتنے دنوں سے تجھ پر بار بنا ہوا ہے۔“ منشی بشیر علی نے ہمدردی دکھائی۔ ”ہم پر مہمان بار نہیں ہوتے۔ اللہ کی رحمت سمجھتے ہیں۔“ ”تک کر بولا پھر زیر لب بڑبڑایا۔

”تیرے گھر سے روٹی کھاتا ہے۔“ ”لگتا ہے آج مقبول کا مزاج ٹھیک نہیں۔“ منشی بشیر علی نے فکرمند لگایا۔ مامے مقبول کا دل چاہا وہ منشی بشیر کو کھڑے کھڑے پھینکی لگا دے۔ پتا نہیں کیوں۔

بس آج اسے منشی بشیر علی زہر لگ رہا تھا۔ اس نے باقی پیسے لیے اور اس سے قبل کہ منشی کوئی اور سوال کرتا۔ وہ واپسی کے لیے مڑ گیا تھا۔

قاسم ششدر سا رہ گیا تھا۔ خود نہیں تارہ اپنی جگہ ساکت وصامت بیٹھی مگر مگر مامے مقبول کا چہرہ تک رہی تھی۔

”میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔“ مامے مقبول کے لہجے میں اطمینان ہی اطمینان تھا۔

”نرا بابا! ہم اسے جانتے تک نہیں میوں۔“ ”تم نہیں جانتے۔ میں جانتا ہوں۔“ اس نے آرام سے قاسم کی بات کاٹ کر ٹھنڈے لہجے میں کہا۔ ”مگر وہ نیاز اور ظہور۔ ان سے تو پوچھنا ہو گا آخر انہوں نے۔“

”مجھے کسی سے نہیں پوچھنا اور تم سے بھی میں مشورہ نہیں کر رہا۔ صرف بتا رہا ہوں۔ میں نے نہیں

تارہ کا رشتہ اس لڑکے سے طے کر دیا ہے۔ بہت جلد بے حد سادگی سے نکاح ہو گا۔“

مامے کا لہجہ ٹھوس اور اٹل تھا۔ قاسم جھنجھلا کر باہر نکل گیا۔ مامے مقبول نے ایک نظر ساکت بیٹھی زین تارہ پر ڈالی اور مسکرا دیا۔

”میں نے کہا تھا نا۔ تیری قسمت بہت اچھی ہوگی۔ اتنی کہ سب دیکھتے رہ جائیں گے۔“

زین تارہ کی نگاہوں میں شکوہ سا ابھرا۔ ”کچھ مت سوچو پتر! خوشیاں ہاتھ بھر کے فاصلے پر تمہاری منتظر ہیں۔“

”ماما! لوگوں کی باتوں پر تصدیق کی مہر لگا رہے ہو۔“ عجیب بھیگا بھیگا سا لہجہ تھا۔ ماما بے ساختہ ہنس دیا۔ پھر پیار سے اس کا سر اپنے کندھے سے لگاتے ہوئے بولا تھا۔

”پگلی! کوئی کچھ کہنے کے قابل ہی کہاں رہے گا۔“ ”ماما! ایسا مت کر۔۔۔“ زین تارہ نے سر اٹھا کر التجا کی۔

”یہ شخص تو میری دعا ہے تارہ پتر۔ وہ دعا جو میں نے رات رات بھر تیرے لیے کی تھی۔ وہ خوشی ہے جو تقدیر نے بہت سینچال سینچال کر تیرے لیے رکھی ہے اور تو ہی تو کہتی تھی۔ ماما تیرے لیے کچھ بھی نہیں کر سکا۔ ماما کیا کرنا۔ کرنا تو اوپر والے نے تھا اور رب مومن نے کر دیا۔“ وہ بڑا خوش بہت مگن سا لگ رہا تھا۔ زین تارہ جھنجھلا گئی۔

”ماما! تم میری بات نہیں سمجھ رہے یہ سب۔“ ”ہاں۔۔۔“ مامے مقبول نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ ”نا شکری نہیں کرتے۔ چل اٹھ نماز پڑھ اور اپنے رب کا شکر ادا کر۔“

مغرب کی اذان ہونے لگی تھی۔ ماما اسے نماز کی تائید کر کے اٹھ گیا۔ کندھے پر صاف رکھا اور باہر چلا گیا۔ وہ وہیں بیٹھی انگلیاں چٹختی رہی۔ کچھ بھی تو سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ نہ اس شخص کا فیصلہ نہ مامے کی خوشی اور نہ اپنی کیفیت۔ جو کچھ ہو چکا تھا۔ وہ اسے

خوش گمان بھی نہ ہونے دیتا تھا اور دل تو پہلے ہی ہے یقین تھا۔ وہ کیسے مان لیجی کہ ریت کا سفر اختتام پذیر ہے۔ سامنے ٹھنڈے ٹھنڈے پانی کا چشمہ ہے، سراب نہیں۔

وہ مرے مرے قدموں سے چلتی نکلے تک آئی۔ تب ہی زین بھی وضو کے ارادے سے اندر آیا۔ زین تارہ کو دیکھ کر ایک بے اختیار اور بے ساختہ سی مسکراہٹ لبوں پر ابھری تھی۔

ایک فیصلہ تھا۔ جو ہو گیا تو اندر تک پرسکون کرنا چاہا گیا تھا۔ یہ کیا تھا؟

ہمدردی، محبت یا محض تقدیر کا فیصلہ جو بھی تھا زین نے یہ فیصلہ اپنے دل و دماغ کی تمام تر گہرائیوں اور جذباتوں کی شدت سے کیا تھا۔

”کھڑے کھڑے کہاں کھو جاتی ہو۔“ زین نے اس کی نظروں کے سامنے چٹکی بجا لی۔ وہ بری طرح جوگی۔

”خود نشی کے نئے طریقوں پر غور کیا جا رہا ہے۔“ متبسم و شرر لہجہ وہ ترخ کر رہی۔

”تمہیں کوئی ضرورت نہیں مجھ پر ترس کھانے کی۔“ ”ضرورت تو ہم دونوں کو ہے ایک دوسرے پر ترس کھانے کی۔ میں نے کہا تھا نا حالات مختلف سی۔ مگر درد تو مشترک ہے۔“ زین نے ذرا سا جھک کر دونوں ہاتھ نکلے کے نیچے کیے۔ گویا وہ ناکا چلا ہی دے گی۔ وہ سیاہ بالوں پر نظریں جمائے لب کا تکی رہی۔ پھر زیر لب بڑبڑائی۔

”تم سب ایک جیسے ہو۔ ہند کھڑکیاں کھولتے ہو اور جب دروازے کھل جائیں تو وہاں بس دستک چھوڑ جاتے ہو۔ پہلے دل کو یقین کی ڈور سے باندھتے ہو۔ پھر۔۔۔ تمہیں میرے بارے میں کچھ نہیں پتا اور جب پتا چلے گا تو تم بھی لوٹ جاؤ گے۔“

زین نے ذرا سا سر اٹھا کر اس کے ہلتے لبوں کو دیکھا۔ ایک خود کلامی تھی جو اس کی سماعتوں سے دور ہی دم توڑ گئی تھی۔ مگر وہ ان کے لفظوں کا مفہوم بخوبی

155



سمجھتا تھا۔ تب ہی اس کے دل کو زنجیر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ یہ یقین تو خود اس کے اندر اترنا چاہیے تھا۔  
 ”کیا یونہی کھڑا رہوں۔۔۔؟“ اس نے سادہ سے لہجے میں پوچھا۔ وہ ہاتھ چھوڑ کر دو قدم پیچھے ہٹی۔ پھر اس کے لبوں پر طنز میں ہنسی مدھم سی مسکان اتری۔  
 ”کوئی کسی کے لیے کھڑا نہیں رہتا۔۔۔“  
 وہ کہہ کر رکی نہیں تھی۔ زین نے نکلے پر ہاتھ نکالتے ہوئے اسے اندر جاتے دیکھا۔ پھر مسکرا دیا۔  
 ”میں جانا چاہتا تو مجھے کون روک سکتا تھا۔ مگر شاہراہ حیات پر کوئی ایک شخص ایسا ضرور ملتا ہے جو پاؤں سے سفر چھین کر وہیں ایسا وہ ہونے کی خواہش باندھ دیتا ہے اور زین العابدین! تم زنجیر ہو چکے ہو۔“



منشی بشیر علی افغان و خیزاں لپکا آیا تھا۔ رائے سلیمان کے پاس کچھ لوگ بیٹھے دیکھ کر وہ مضطرب کر رک گیا۔  
 رائے سلیمان نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔  
 ”اؤ منشی چاچا! کوئی کام تھا کیا۔۔۔؟“ ظاہر ہے وہ بے وقت آیا تھا اور سلیمان کے پاس شہر سے کچھ مہمان آئے بیٹھے تھے۔  
 ”کچھ نہیں“ میں پھر آ جاؤں گا۔“ وہ کچھ بددل سا ہو کر واپس پلٹ گیا۔ مردان خانے کے سامنے آم کے بے شمار درختوں کی چھاؤں میں کرسیاں اور چارپائیاں بکھی تھیں۔ ایک کرسی پر فیروز بیٹھا ہندو صاف کر رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی پوچھنے لگا۔

”اؤ چاچا! چوہدری صاحب نے بلوایا ہے۔“  
 ”ہاں۔۔۔“ منشی بشیر علی اس سے زیادہ بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ سو مختصراً ”جواب دے کر ایک طرف ہو بیٹھا۔ دو گھنٹے کے طویل انتظار کے بعد رائے سلیمان مہمانوں سمیت باہر نکلے تھے۔ فیروز اٹھ کر ان کے قریب چلا گیا۔ منشی بشیر علی خاموشی مگر بے تکانی سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ رائے سلیمان نے فیروز کو مہمانوں کے ساتھ کہیں بھیجا تھا۔ پھر پلٹ کر وہیں آئے۔ منشی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

”کو چاچا! کیا خاص بات ہے۔۔۔؟“ ایک عرصے

سنبھال کر رائے سلیمان نے سنجیدہ سے لہجے میں پوچھا تھا۔ منشی بشیر علی کا بے وقت آنا کسی خاص بات کی نشاندہی کر رہا تھا۔  
 ”خاص نہیں۔ بہت خاص بات ہے۔“ اس کے لہجے میں وہاں ہوا جوش تھا۔ رائے سلیمان نے بغیر کچھ کے بس استفسار سے نگاہوں سے منشی بشیر علی کو دیکھا۔  
 ”یہ جو چھو کر اگاؤں میں آیا ہے۔۔۔“  
 ”کوئی گڑبڑ کی ہے اس نے۔۔۔؟“ سلیمان کی پیشانی پر سلون ابھری۔  
 ”کی تو نہیں۔ اور بے چارہ کرے گا بھی کیا؟ اسے تو قضا کھینچ لائی ہے اس گاؤں میں۔“ اس کا لہجہ غیر معمولی تھا۔

”کام کی بات کرو منشی۔“ رائے سلیمان نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔  
 ”آپ کو پتا ہے وہ کون ہے۔۔۔“ اس کا لہجہ پر اسراریت میں ڈھل گیا۔  
 ”کون ہے۔۔۔؟“

”وہ۔۔۔“ اس نے ایک لمحے کو رک کر خود کو اس انکشاف کے لیے تیار کیا۔ ”وہ رائے جمشید حیات کا بیٹا ہے۔“  
 اس نے گویا دھماکا کیا تھا۔ رائے سلیمان کے ماتھے پر شکن ابھری۔ مگر انہوں نے سابقہ لہجے میں پوچھا تھا۔  
 ”تمہیں کس نے بتایا۔۔۔؟“

منشی بشیر علی کے لیے رائے سلیمان کا رد عمل غیر متوقع تھا۔ اس کا خیال تھا وہ بھڑک اٹھے گا۔ اس نے تیزی سے جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک تصویر نکالی۔  
 ”یہ تصویر اس لڑکے کے ہوئے میں تھی۔ میں نے خود نکالی ہے۔“

رائے سلیمان نے تصویر کو دو انگلیوں میں تھام کر سرسری سی نگاہ دوڑائی۔ پھر نظریں منشی بشیر علی کے چہرے پر جمادیں اس کا اپنا چہرہ بالکل سپاٹ تھا۔  
 ”گویا یہ وہی زین العابدین ہے۔ رائے جمشید حیات کا بیٹا۔“

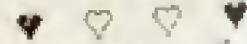
”ہاں۔۔۔ بالکل۔۔۔ اب تو شک کی گنجائش ہی نہیں رہی۔“ منشی تیزی سے بولا۔

”تو اب کیا کیا جائے۔۔۔؟“ رائے سلیمان سابقہ لہجے میں اس سے رائے مانگ رہے تھے۔ منشی بشیر علی چارپائی پر بیٹھ گیا۔

”سلیمان پترا! تمہاری قسم پوری ہونے کا وقت آیا ہے۔ مجھے تو اب بھی وہ وقت نہیں بھولتا، جب بڑے چوہدری صاحب کی لاش میرے سامنے خون میں لت پت پڑی تھی اور تم نے اسی خون کی قسم کھا کر کہا تھا کہ رائے جمشید کیا اس کی نسل مٹا کر رکھ دو گے۔“ وہ جذباتی سے لہجے میں کہہ رہا تھا اور رائے سلیمان کی نظریں تصویر پر جمی تھیں۔ وہ دیکھ سکتے تھے اس سولہ سال کے نوجوان کو دیکھ کر جو باپ کی لاش کو دیکھ کر پاگل ہو رہا تھا۔ وہ رونا چاہتا تھا مگر رونا اس کا منصب نہ تھا۔ وہ اب اس جاگیر کا وارث تھا۔ انتقام کے شعلوں نے اس کے آنسو بھاپ کی طرح اڑا دیے تھے۔  
 ”وہ آج کل میں شہر واپس جا رہا ہے۔“ منشی بشیر علی بتا رہا تھا۔ رائے سلیمان نے طویل سانس لے کر اسے دیکھا پھر تصویر سامنے چھوٹی تھیل پر اچھال دی تھی۔

”اسے جانے دو۔۔۔“  
 ”ہیں۔۔۔“ منشی بشیر علی نے مضطرب کر انہیں دیکھا۔ کچھ کہنا چاہا۔ مگر رائے سلیمان نے ہاتھ اٹھا کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا تھا۔  
 ”میں نے کہا۔ اسے شہر جانے دو۔۔۔“

رائے سلیمان کا غیر جذباتی اور سپاٹ انداز۔۔۔ منشی بشیر علی اگلا جملہ کہنا ہی بھول گیا۔ وہ حیران تھا بے حد حیران۔ رائے سلیمان نے اٹھتے ہوئے اچھتی سی غماز کے ہکا بکا چہرے پر ڈالی اور مزید کچھ بھی کہے یا نہ بغیر اندر چلے گئے۔ منشی بشیر ساکت سا بیٹھا تھا۔



”وہ حقیقتاً“ ان لوگوں کا ممنون تھا۔ جنہوں نے ایک جہنم کو اسے دنوں اپنے گھر میں ٹھہرائے رکھا۔ قاسم نے اسے اس نے ننھے محمد علی کو ہلکے سے گدگدایا۔

”اگلی بار آؤں گا۔ تو تمہارے لیے کھلونے لاؤں گا ماسٹر۔“

وہ بتا کچھ سمجھے کھلکھلا یا تھا۔ زین نے اسماء کے کندھے کے اوپر سے چوہے کی لپائی کرتی نین تارہ کو دیکھا۔ جو بے ارادہ ہی ہاتھ روک کر اسے دیکھنے لگی تھی۔

”میں جلد ہی افتخار اور بے بے کو لے کر آؤں گا۔“ یہ جملہ بطور خاص اس کے لیے تھا۔ نین تارہ کے لبوں پر ہنسنے والی مسکراہٹ طنز سے بھری تھی۔ پھر وہ سر ہنٹک کر کام میں مصروف ہو گئی۔

”اؤ! میں تمہیں بڑی سڑک تک چھوڑاؤں۔“  
 ”نہیں بابا! تکلیف مت کریں۔ میں چلا جاؤں گا۔“

”میں چھوڑ آتا ہوں بابا۔“ قاسم جلدی سے بولا۔ مگر اسے مقبول نے نفی میں سر ہلا کر اس کا بیگ اٹھالیا۔ زین شرمندہ سا ہو گیا۔  
 ”بابا! میں اٹھالیتا ہوں۔“ اس نے تیزی سے بیگ ہاتھ میں لیا۔

”چلو۔ ویگن نکل جائے گی۔“ ماسے مقبول کو نجانے کس بات کی جلدی تھی۔ وہ سب کو خداحافظ کہہ کر پلٹا۔ مگر دروازے میں ہی رک گیا۔  
 ”میرا انتظار کیجئے گا۔“

قاسم نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ جبکہ اسماء دوپٹے میں منہ چھپا کر ہنسی روکنے کی کوشش کرنے لگی۔ وہ جانتی تھی یہ جملہ کس کے لیے بولا گیا تھا۔ نین تارہ کا وجود سلگ اٹھا۔ قاسم اور وہ لوگ باہر نکلے تو وہ ہستے ہوئے نین تارہ کی طرف پلٹی۔

”سنا! تم سے کیا کہہ گیا ہے وہ۔۔۔؟“  
 ”میں نے اعتبار اور انتظار دونوں ہی کرنا چھوڑ دیے ہیں۔“ وہ زہر خند لہجے میں گویا ہوئی۔  
 ”تو تو پاگل ہے وہ کوئی اجمل تھوڑا ہی ہے۔“ اسماء نے کہا تھا۔ مگر اس کے اندر امید کی کوئی کرن چھوٹی ہی نہ تھی۔ گھٹا توپ اندھیرا تھا اور وہ۔۔۔



ہوا کی شرارت سمجھ کر بھول جانا چاہتی تھی۔ اسے یقین تھا جو چلا گیا وہ کبھی لوٹ کر نہیں آئے گا۔ زندگی کے لبوں پر ایک مہربان سی مسکراہٹ ابھر آئی۔ وقت نے شرارت سے زندگی کو آنکھ ماری کچھ اور مہربان لہجوں کو اپنی زنجیل میں ڈالا اور بے حد خاموشی سے کھسک گیا۔

ماما مقبول چلتے چلتے اس کچی سڑک کے کنارے رک گیا جس کے گرد آسموں کے باغات کا سلسلہ بہت دور تک جاتا تھا۔ جس کے عقب میں دو حویلی کے خدو خال نمایاں ہونے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔ فضا میں خاموشی، سبز کھیتوں اور پھولی سرسوں کے پیلے پھولوں کی خوشبو پھیلی تھی۔ نسر کے پانیوں کو چھو کر آئی ہو امیں خوشگوار سی ٹھنڈک تھی۔

ماما مقبول کے قدم وہیں ٹھم گئے تھے۔ وہ بے حد خاموشی سے سامنے سڑک پر نظرس گاڑے کھڑا تھا۔ زمین نے متجھب انداز میں اسے دیکھا۔  
”چلیں بابا۔ لیکن نکل جائے گی۔“  
ماما مقبول زیر لب نجائے کیا بڑبڑایا تھا۔  
”بابا۔۔۔“ زمین نے دوبارہ پکارا۔ تو وہ نظروں کا زاویہ بدل کر اسے دیکھنے لگا۔

”چلیں۔۔۔“ زمین نے پوچھا تھا۔  
”خالی ہاتھ۔۔۔؟“ مامے مقبول نے پوچھا۔ زمین ٹھٹھک کر اور پھر الجھ کر اسے دیکھنے لگا۔  
”میں نے سوچا تھا۔ میں یہ سب تمہیں کبھی نہیں بتاؤں گا۔ مگر تم۔۔۔ تم باز نہیں آؤ گے۔“  
”آپ۔۔۔ کتنا کیا چاہتے ہیں۔۔۔؟“

”جانتے ہو تم کہاں کھڑے ہو۔۔۔“ مامے مقبول نے سوال کیا اور شہتوت کی ٹھنڈی چھاؤں میں کھڑے زمین العابدین کے اعصاب تن کی ایک خطرناک لہر اس کے چہرے پر بکھری۔ یہ وہ اچھی طرح جانتا تھا۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں رائے نواز قتل ہوا تھا۔  
”تم جانتے ہو۔۔۔ میں نے اسے اپنے سامنے قتل ہوتے دیکھا تھا۔“  
”مما مقبول کا لہجہ پلٹ گیا۔ زمین شہر سداہ

گیا۔ کہاں کہاں نہیں ڈھونڈا اس نے کسی ایسے شخص کو جس نے اپنی آنکھوں سے یہ سب دیکھا ہو۔ امید کا دامن تھام کر وہ یہاں تک آیا تھا اور کس ناامیدی سے لوٹ رہا تھا کہ شاید کوئی ایسا نہیں جو سچ پر پڑا نقاب کھینچ سکے۔ اور یہ شخص۔۔۔ یہ شخص کہہ رہا تھا اس نے۔۔۔

ماما مقبول دو قدم چل کر اس کے سامنے آیا۔ اس کی پشت زمین کی طرف تھی۔ زمین دم بخود تھا۔ ماما مقبول کچھ لمحے کے راستے پر اڑتی دھول دیکھتا رہا۔ پھر اس نے ہاتھ اٹھا کر اسی راستے کی طرف اشارہ کیا تھا۔  
”وہ دونوں وہاں سے آرہے تھے۔ گھوڑوں پر سوار۔۔۔“

مامے مقبول کی آواز خود کلامی سے زیادہ نہ تھی۔ وہ یوں گم صم سا بول رہا تھا۔ جیسے ایک بھولا بسرا منظر پھر سے اس کی آنکھوں میں جاگنے لگا ہو۔ زمین کا دل دھڑکنا بھول گیا۔

”کون۔۔۔ کون آرہے تھے۔“ اسے خود اپنی ہی آواز اجنبی سی لگی۔

”رائے جمشید اور رائے نواز۔ وہ دونوں ست روی سے گھوڑوں پر سوار آرہے تھے۔ میں وہاں تھا۔۔۔ اپنے کھیت کے کنارے۔۔۔ قاسم کی ماں ابھی تک روٹی لے کر نہیں آئی تھی۔ مجھے بھوک لگنے کے ساتھ ساتھ غصہ بھی آرہا تھا۔“

”آج اسے نہیں چھوڑنا۔ روز بروز ہند حرام ہوتی جا رہی ہے۔“ میں سخت غصے میں اٹھ کر کھڑا ہوا۔ تب ہی میری نگاہ ان پر پڑی۔ ”وہ ایک بل کو خاموش ہوا“ گویا پوری کائنات چپ کی گود میں جاگری تھی۔ زمین کے اعصاب تن سے گئے۔ اسے لگا ایک اہم انکشاف ہونے جا رہا ہے۔ اس کا پورا وجود سماعت بن گیا۔ ماما مقبول کی خود کلامی سرگوشی سے زیادہ نہ تھی۔ مگر اس گھنی خاموشی میں وہ ایک ایک لفظ سن رہا تھا۔

”کمال ہے۔ یہ دونوں آج اسٹھے کیسے نظر آرہے ہیں۔“ میں نے بے حد حیرت سے سوچا۔ سارا گھونسا سا ماما مقبول کا لہجہ پلٹ گیا۔ زمین شہر سداہ

ہے۔ وہ دونوں تو ایک دوسرے کی صورت دیکھنے کے ردِ ادار بھی نہیں۔ میں روٹی اور بیوی دونوں بھول کر انہیں دیکھنے لگا۔ ان کی آوازیں آرہی تھیں۔ مگر اتنی نہیں کہ کچھ سمجھ سکتا۔ مگر میں دیکھ سکتا تھا۔ رائے جمشید سخت غصے میں تھا اور رائے نواز بے حد پُرسکون۔

”تو تم فیصلہ چاہتے ہو۔۔۔؟“ وہ ذرا قریب ہوئے تو ان کی آوازیں بھی واضح ہو گئیں۔ رائے نواز رائے جمشید سے پوچھ رہا تھا۔ ”جواباً“ وہ ٹھک کر بولا۔  
”میں یہ بات کئی بار دہراچکا ہوں۔۔۔۔۔“  
”میں تو تم سے کئی بار کہہ چکا ہوں کہ۔۔۔۔۔“  
”مجھے کوئی بات نہیں سننا۔ بس فیصلہ کرو۔ آج ابھی اور اسی وقت۔۔۔۔۔“

”اگر فیصلہ تمہاری مرضی کے مطابق نہ ہوا تو۔۔۔“ رائے نواز کے لبوں کی مسکراہٹ معنی خیز اور استہزا سی تھی۔

”تو تم نے مجھے یہاں بلایا کیوں تھا۔؟“ رائے جمشید پھر کر بولا۔

”فیصلہ کرنے۔۔۔“ رائے نواز کا لہجہ پُرسکون تھا۔  
”اور فیصلہ یہ ہے کہ تمہارا اس زمین پر کوئی حق نہیں۔“

”میرا اس زمین پر کوئی حق نہیں۔۔۔؟“ رائے جمشید نے پچھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

”یہ زمین اسی کی ہے جس نے اسے کاشت کیا اور سنبھالا۔۔۔ یہ زمین نہ پہلے تقسیم ہوئی تھی اور نہ آج ہو گی۔“ رائے نواز کا لہجہ حتمی ہو گیا تھا۔  
”تمہیں یہ فیصلہ مزگڑے گا۔“

”تم کچھ بھی کہو فیصلہ تو ہو گا۔“ رائے نواز نے گھوڑے کو تھپکی ماری اور اسی بل۔۔۔ مامے مقبول کی آواز سم کر چپ ہو گئی۔ سانس زمین کے سینے میں اٹک کر رہ گئی۔

”اس بل۔۔۔ اسی بل کیا ہوا تھا بابا۔۔۔؟“ شدید بچکانہ کیفیت میں اس نے سوال کیا۔ مامے مقبول نے بھرپور تیزی سے گھوم کر اس کے سامنے

آیا۔  
”اسی بل کیا ہوا تھا بابا۔۔۔“ اس کے مضبوط ہاتھوں نے اس کے بوڑھے وجود کو ہلا کر رکھ دیا۔ مامے مقبول نے اس کی سرخ انگارہ آنکھوں کو دیکھا۔

”میں جب بھی تمہیں دیکھتا تھا۔ عجیب سا احساس ہوتا تھا۔“ اس کی نگاہیں زمین کے ہر ہر نقش میں ایک اور چہرہ کھونج رہی تھیں۔ ”اور یہ احساس ہر اس شخص کو ہو سکتا ہے جس نے رائے جمشید کو قریب سے دیکھا ہو۔“

”میں پوچھ رہا ہوں اس بل کیا ہوا تھا۔“ وہ ضبط کھو بیٹھا۔

”اس بل۔۔۔“ ماما مقبول ڈوب سا گیا۔ ”گولی چلی اور رائے جمشید کا گھوڑا بدک گیا۔ نہیں۔۔۔ گولی بعد میں چلی تھی۔ پہلے گھوڑا بدک کا تھا۔ یا سب کچھ ایک ساتھ ہی ہو گیا۔ گھوڑے نے شاید کوئی سانپ دیکھا تھا۔ وہ ہنسنایا اور پچھلی ٹانگوں پر کھڑا ہو گیا۔ گولی اس کی ٹانگوں سے نکل کر رائے نواز کو جا لگی اور اگر رائے جمشید کا گھوڑا نہ بدکنا تو گولی کا نشانہ اسے ہی بنتا تھا۔“

”کیا۔۔۔؟“ ایک چو نکا دینے والا انکشاف تھا۔  
”میں آگے بڑھنے کو تھا کہ عقب سے کسی نے میرا بازو پکڑ لیا۔“

”نہ بھرا نہ۔۔۔“ میں چونک کر پٹا۔ وہ زقون تھی میری۔ سن اور زمین تارہ کی ماں۔“

”مگر وہ۔۔۔“ میں پھر بھی آگے بڑھنے کو تھا۔ اس نے میرا بازو نہیں چھوڑا۔

”کیا آپ نے اسے دیکھا۔ جس نے گولی چلائی تھی۔“ زمین نے بے تابانہ پوچھا۔

”ہاں۔ وہ وہاں ان درختوں کے پیچھے۔“ مامے مقبول نے ایک سمت اشارہ کیا۔ ”لیکن میں اسے پہچان نہیں سکا۔ اس کا چہرہ صاف میں چھپا تھا اور وہ یہاں سے دور بھی تھا۔“

”اور بابا جان۔۔۔؟“  
”اس نے بمشکل گھوڑے کو سنبھالا اور گھوڑے سے کود کر بھاگتا ہوا رائے نواز تک آیا۔ مگر گولی اس



کے سر میں لگی تھی۔ وہ تو شاید بچکی بھی نہ لے سکا۔ پھر نجانے اس کے دل میں کیا آئی کہ وہ گھوڑے پر بیٹھ کر فرار ہو گیا یا شاید وہ جانتا تھا کہ نواز کے قتل کا الزام اسی پر آئے گا۔

زین کو پہلی بار بابا جان کی بزدلی پر شدید غصہ آیا۔ وہ فرار نہ ہوتے تو آج حالات مختلف ہوتے اور یہ۔۔۔ اس نے سراٹھا کر مامے مقبول کو دیکھا۔ پھر تندو بخ لہجے میں گویا ہوا۔

”اور آپ ہمیں چھپے رہے۔۔۔ آپ نے کسی سے کچھ بھی نہ کہا۔ آپ نے سوچا، حوبلی والوں کے لیے گولی اور خون کا کھیل نیا نہیں۔ آپ کو پرانے پھندے میں نانگ اڑانے کی کیا ضرورت ہے۔ کوئی اپنی جان سے جائے یا زندہ درگور ہو جائے۔۔۔ آپ آنکھیں بند کیے سچ کو چھپائے بیٹھے رہیں گے، کیونکہ اس معاملے سے آپ کا کیا تعلق تھا۔“

شدید غصے اور اشتعال میں وہ اس کے سامنے کھڑا کہہ رہا تھا۔ مامے مقبول نے کچھ کہنا چاہا مگر زین نے اس کا موقع ہی نہیں دیا۔

”نہیں۔ ٹھیک ہے آپ کو خاموش رہنا چاہیے تھا کہ یہ تو عمومی رویہ بن گیا ہے۔ ہمارے سامنے کوئی کسی کا گلا بھی گھونٹ رہا ہو تو ہم اس کا ہاتھ نہیں روک سکتے کہ اس معاملے سے ہمارا کیا تعلق۔۔۔ بزدل ہیں ہم۔۔۔ سب کے سب بزدل ہیں۔ خاموش ہو جاتے ہیں۔۔۔ کبھی اپنی جان کے خوف سے تو کبھی خود سے وابستہ رشتوں کی بنا پر۔۔۔ سچائی چھپانے کی عادت ہو چکی ہے ہمیں۔۔۔ کسی کی جان پر کیسے بھی عذاب تو نہیں۔ ہم سچ سے نظریں چراتے رہیں گے۔ یہ تو ساری کہانی ہی بزدلی کی ہے۔ بابا جان اور میں۔۔۔ بزدل۔۔۔ بکے بزدل۔۔۔“

شدید طیش میں وہ بار بار منہ پھینک رہا تھا۔ ”میں کہاں کہاں خوار نہیں ہوا اور آپ مجھے اب یہ بتا رہے ہیں۔۔۔“ اس نے پلٹ کر مامے مقبول سے پوچھا۔ ماما مقبول نے پلٹ کر اس کا چہرہ دیکھا۔ وہ اب بھی یہ سب نہ

جتا تا مگر زین کے اندر جو کھوج لگ گئی تھی۔ وہ بار بار اسے پیس بھٹکاتی۔

”لیکن سوری۔ مجھے آپ سے یہ سب نہیں کہنا چاہیے۔۔۔ جب وہ شخص خود اپنے دفاع کے قابل نہ تھا تو آپ کو کیا ضرورت تھی اس کے پیچھے اس کی بے گناہی ثابت کرنے کو بھاگے پھرتے۔۔۔ آپ نے بالکل ٹھیک کیا۔۔۔ آپ کو خاموش رہنا چاہیے تھا۔ لیکن آپ نے یہ سب مجھے اب کیوں بتایا ہے۔۔۔؟“

ماما مقبول خاموش ہی رہا۔ زین اضطرابی انداز میں ادھر سے ادھر چکراتا رہا۔

”تم اب کیا کرو گے۔۔۔؟“ مامے مقبول نے اچانک سوال کیا تو وہ رک گیا۔ کچھ لمحے خالی رستے پر نظریں جمائے سوچتا رہا اسے اب کیا کرنا ہے۔ پھر اس نے نظروں کا زاویہ بدل کر مامے مقبول کو دیکھا۔ وہ اسی کی سمت متوجہ تھا۔ زین نے پلٹ کر دونوں ہاتھ اس کے کندھوں پر ٹکا دیے۔ مامے مقبول نے الجھ کر اسے دیکھا۔

”اتنے برسوں تک آپ خاموش رہے۔ اب۔۔۔ اب اگر ضرورت پڑی تو آپ سچ بولیں گے میری خاطر۔۔۔“

مامے مقبول کا سر اثبات میں ہل گیا۔ دور سے ویگن آرہی تھی۔ وہ اس کے کندھے سے ہاتھ ہٹا کر پیچھے ہٹا۔

”تم اب کیا کرو گے زین پتر۔۔۔؟“ مامے مقبول نے پھر پوچھا۔

”اس شخص کو تلاش کروں گا جس نے گولی چلائی۔“ اس نے ویگن کو رکتے دیکھا تو جھک کر بیگ اٹھالیا۔ ”میں چلتا ہوں۔۔۔“

”زین پتر۔۔۔“ مامے مقبول نے پکارا تو وہ پلٹا پھر اسے دیکھ کر مسکرا دیا۔

”بے فکر رہیں بابا۔۔۔! میں وعدہ خلاف نہیں۔ میں جلد ہی آؤں گا۔“ اس کا لہجہ سنجیدہ اور ٹھوس تھا۔ مامے مقبول نے دھندلائی آنکھوں سے اسے دیکھا۔ اس نے سوار ہوتے دیکھا اور پلٹ گیا۔ زین نے سیٹ

سنبھال کر بیگ اپنے قریب خالی سیٹ پر رکھا اور کینٹی ملنے لگا۔

”تو یہ تھی سچائی۔“ جس سچائی کی تلاش میں وہ مسلسل بھاگ رہا تھا۔ وہ ایک دم سامنے آئی تھی۔

”باؤتی۔ پیسے۔۔۔“ کنڈیکٹر نے کہا تھا۔ اس نے ایک طویل سانس لے کر والٹ نکال کر کھولا اور ”مرے پل ٹھٹھک گیا۔ اس کے والٹ میں ہمیشہ موجود رہنے والی بابا جان کی تصویر غائب تھی۔“



سلیم اس سے یوں ملا تھا۔ جیسے مہینوں کے بعد گھر لوٹا ہو۔

”سچ بھائی جان! آپ کے بغیر تو گھر کاٹ کھانے کو روڑا ہے۔“

”یار! ہفتہ ہی تو ہوا ہے۔“ زین نے مسکراتے ہوئے بیگ اسے تھمایا۔

”مجھے تو مہینہ لگ رہا ہے بھائی جان۔۔۔“ سلیم نے ہنستے ہوئے کہا۔ زین سیدھا بیڈ روم میں آگیا۔ کمرہ ہمیشہ کی طرح صاف ستھرا تھا۔

”ناشتہ لاؤں۔۔۔“ سلیم نے بیگ کھول کر کپڑے نکالے۔

”نہیں ایک کپ چائے۔۔۔“ اس نے جوگر اترے۔

”لادو تو ختم ہے۔ میں ابھی لے آتا ہوں۔“

”لے آؤ لیکن پہلے یہ بتاؤ۔ کوئی آیا گیا۔۔۔“

”افتخار بھائی آئے تھے ایک دن۔ بہت خفا ہو کر گئے۔ زارا باجی اور پچھو کے بھی فون آئے تھے۔ کل شام بھی کیا تھا۔ کہہ رہی تھیں جیسے ہی آپ واپس آئیں ان سے فون پر بات کر لیں۔“

”یہم نے پیغام دیا۔“

”ٹھیک ہے۔ تم دو دو کا پیکٹ لے آؤ۔“

موبا کل کا نمبر ملایا تھا۔

”ہیلو۔۔۔“ دوسری طرف سے زارا کی آواز ابھری۔

”السلام علیکم۔۔۔!“ وہ مسکرا دیا۔

”زین العابدین۔ تھینک گاڈ تم واپس آگئے۔۔۔“ زارا بے ساختہ ہی بولی تھی۔ وہ اس کے لیے کتنی پریشان اور فکر مند تھی۔

”کیا بہت یاد آ رہا تھا میں۔۔۔؟“ اس نے شرارت سے پوچھا۔

”کیا نہیں آتا چاہیے تھا۔ یہ بتاؤ بغیر بتائے کیوں غائب ہو گئے تھے۔۔۔“ اس نے شکوہ کیا۔

”یونہی دل چاہ رہا تھا۔۔۔“ وہ لاپرواہی سے گویا ہوا۔

”تمہارے دل کا علاج بھی کرنا پڑے گا۔۔۔“ اسے غصہ سا آگیا۔

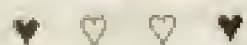
”وہ میں نے خود ہی کر لیا ہے۔“ زین زیر لب مسکرایا۔

”تم سنا ہوا لگے تھے۔؟“ زارا نے سرسری انداز میں سوال کیا۔ وہ چاہتی تھی زین اسے خود بتائے۔

”کہاں گیا تھا؟ کیوں گیا تھا؟ یہ سب آپ کو بتانا ہے۔ ابھی گھر آ سکتی ہیں۔۔۔“

”ابھی تو مشکل ہے۔۔۔ ہاں شام میں ضرور آؤں گی۔“

”میں انتظار کروں گا لیکن دیکھیں، آنا ضرور ہے۔۔۔“ اس نے دوبارہ تاکید کی تھی۔



”چھیما۔۔۔ چھیما۔۔۔“ تانی اماں کی آواز پر دالان میں پوچھا لگانی چھیما بھاگی آئی۔ وہ چند رو سولہ سال کی دہلی پٹی الھڑی لڑکی تھی۔

”جی لی لی!“ دوپٹے سے ہاتھ صاف کرتی وہ ان کے قریب آگئی۔ تسبیح پھیرتی تانی جان نے سراٹھا کر اسے دیکھا۔ تو آنکھوں میں ناگواری ہی اتر آئی۔

”چھیما! کتنی بار کہا ہے تجھے نماز کر پڑے بدل لیا کر۔۔۔“ ان کی نفاست پسند طبیعت ان کے گندے

کر۔۔۔“



سندے چلے دیکھ کر اوب جاتی تھی۔ چھہما کو انہوں نے اسی لیے صفائی کے کاموں پر لگا رکھا تھا۔ کچن کے تو قریب بھی پھٹکنے نہ دیتی تھیں۔

”لو بی بی! ابھی جمعہ کو تو نماز کربد لے تھے۔“ اس نے لاری والی سے کہا۔

”کل اگلا جمعہ آ رہا ہے۔“

”اچھا بی بی! بدل لوں گی۔“ وہ مرے مرے لہجے میں بولی۔ گویا گندار میں اس کا شوق تھا۔

”تیری ماں نہیں آئی۔ بلوایا تھا میں نے اسے۔“

”اماں کو تو سخت بخار ہے بڑی بی بی! وہ تو سارا دن کانپتی ہی رہتی ہے۔“

”اچھا۔ چل پھر اپنی چاچی کو بھیج دنا شام کو گندم صاف کرنا ہے۔“ دیکھ بھولنا مت۔“ انہوں نے انگلی اٹھا کر تنبیہ کی۔

”نہیں بھولنا کس لیے میں جاتے ہی بول دوں گی۔“

انہوں نے تخت کے کنارے بڑے اپنے بٹوے کو کھول کر کچھ روپے نکال کر اس کی طرف بڑھائے۔

”ماں سے کہنا ڈوالی لے لے۔“

”شکریہ بی بی! اس نے جھٹ سے روپے پکڑے۔“

”میں نے تمہیں بلوایا تھا۔ دعوے کہو۔ یا ہر دوپہر میں چارپائیاں دھوپ میں پڑی خراب ہوتی رہتی ہیں۔ دوپہر میں انہیں چھاؤں میں بھیج دیا کرے۔ مجال ہے جو ذرا سی بھی پروا کرتے ہوں۔“

”ابھی بول دیتی ہوں بی بی۔“ وہ پیسے مٹھی میں دبائے باہر بھاگ گئی۔ تالی جان نے تسبیح پوری کر کے جائے نماز تہ کی۔ تب ہی آئمہ آگئیں۔ ان کا سوٹ ملگایا ہوا ہاتھ ایک دم سلاہ واپس چھوڑ تالی جان اس وقت سے سر ہلا کر رہ گئیں۔

یہ وہ عورت تھی جو اپنے لباس پر ایک شکن بھی برداشت نہ کر سکتی تھی۔

”آؤ آئمہ! بیٹھو۔“ انہوں نے اپنے قریب جگہ بنائی۔ وہ خاموشی کے بیٹھ گئیں۔

”کل تمہاری عدت بھی ختم ہو جائے گی۔“

”ہاں۔۔۔“ ایک سروسی آہ ان کے لبوں پر ٹٹلی۔

”اتنے دن گزر گئے۔ پر دل کو صبر نہیں آتا۔ لگتا ہے کل کی بات ہے۔“

”دل چاہے تو شہر چلی جانا۔۔۔“ انہوں نے ہمدردی سے کہا۔

”کیا فرق پڑتا ہے آیا۔ یہاں رہوں یا وہاں۔۔۔“ ان کے ہر ہر انداز میں دل گرفتگی و بیزاری تھی۔ تالی جان نے بغور اسے دیکھا۔ پھر ایک ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گئیں۔

”یہ حادثہ صرف تمہارے ساتھ ہی تو نہیں ہوا آئمہ! مجھے دیکھو۔ میں نے بھی تو ایک عمر بونگی میں گزار دی۔ شروع میں یونہی لگتا تھا بس زندگی ہی ختم ہو گئی مگر زندگی کہاں ختم ہوتی ہے جینا ہی پڑتا ہے جتنی سانسیں جتنے دن رب سوئے نے لکھ دیے ہیں وہ تو پورے کرنے ہی ہیں۔ بھلے رو کر یا صبر کے ساتھ۔ تم بھی صبر کرو۔“

”آپ کے پاس تو شیر جیسا بیٹا تھا۔ آنسو پونچھنے والا، حوصلہ بڑھانے والا۔ میرے پاس کیا ہے ایک بیٹا۔ وہ بھی دور جا بیٹھا ہے۔ ماں کو دو حرف تسلی کے کہنے کا بھی وقت نہیں اس کے پاس کتنے دن ہو گئے اس نے فون نہیں کیا۔ اور زارا۔۔۔ اسے تو پہلے ہی آپ کو سونپ چکی ہوں۔ میں تو خالی ہاتھ ہوں آپا۔۔۔ گھر رہا۔۔۔ نہ گھر والا۔“

وہ رو دیں۔ آج دل بہت اداس تھا۔ کتنے بہت سے دن شیراز کے فون کا انتظار کرتے گزر گئے تھے۔ تالی جان انہیں ساتھ لگا کر دھیرے دھیرے پھٹکنے لگیں۔

”رضوان بھی تو تمہارا ہی بیٹا ہے۔“

آئمہ بتا نہیں سکتی تھیں۔ وہ خود کو کس قدر غما محسوس کر رہی تھیں۔ پکڑے ہوئے کھوئے ہوئے ساری ساری رات انہیں ترپاتے تھے۔ رات بھر نیند پلکوں سے رو بھی رہتی۔

”مجھے لگتا ہے۔ اس حویلی کو کسی کی بد دعا لگ گئی ہے۔“ انہوں نے سر اٹھا کر حویلی کے دروازے سے لپکے

سنائے کو دیکھا۔ اس پر چھائی خاموشی کو پوری شدت سے محسوس کیا۔ ”دیکھیں نا آپا! کتنی دیر آئی سی چھا گئی ہے۔ لوگ یہاں سے جاتے ہیں تو واپس آنے کا نام ہی نہیں لیتے۔ یہ۔۔۔ یہ کس کی بد دعا کا سایہ ہے جو حویلی کو اپنی لپیٹ میں لے رہا ہے۔“ ان کے لہجہ میں خوف سا سمٹ آیا۔ ”ہر بل کچھ اجنبی سی آہٹیں سنائی دیتی ہیں۔ کچھ عجیب سی سرگوشیاں۔ کہیں۔۔۔ کہیں کوئی اور حادثہ تو نہیں ہونے والا۔“

ان کے لہجے نے تالی جان کا دل دہلا دیا۔

”آئمہ۔۔۔“ انہوں نے ایک دم انہیں جھنجھوڑ ڈالا۔ ”انہو۔ اندر کمرے میں چلتے ہیں۔“

وہ ایک دم چپ ہو گئیں۔ کچھ لمحے خالی خالی نظروں سے انہیں دیکھتی رہیں۔ پھر آہستگی سے گویا ہوئیں۔

”آپ جا میں آپا! میں کچھ دیر اکیلے بیٹھنا چاہتی ہوں۔“

انہوں نے کچھ کہنا چاہا مگر چپ ہو کر تسبیح اٹھا کر کمرے میں چلی گئیں۔ آئمہ نے سر اٹھا کر ارد گرد دیکھا۔ بہت گہری خاموشی تھی جس کے منخوس پہنچے حویلی کے دروازے میں کھب گئے تھے۔

”ہاں۔۔۔ یہ آہٹیں۔۔۔ یہ سرگوشیاں کیا ہونے والا ہے؟ یہ دل کو دھڑکا سا کیوں لگا رہتا ہے؟ اور وہ۔۔۔ وہ کیوں آنے لگا ہے بار بار میرے خواب میں۔۔۔ چپ اور گم صم۔ کچھ بھی نہیں بولتا۔ پھر بھی محسوس ہوتا ہے کچھ کہنا چاہتا ہے۔ وہ کیا کہنا چاہتا ہے۔“ انہوں نے دونوں ہاتھوں میں اپنا سر تھام لیا۔ ”مجھے لگتا ہے مڑپاگل ہو جاؤں گی۔“

”پھولی بی بی۔! بڑی بی بی کدھر ہیں۔؟“

چھہما ہاتھ میں ایک تصویر پکڑے پوچھ رہی تھی۔ آئمہ نے چونک کر سر اٹھایا پھر درشتی سے بولیں۔

”کیا تکلیف ہے۔۔۔؟“

”بڑی بی بی۔!۔۔“

”اپنے کمرے میں ہوں گی۔“ انہوں نے غصے سے جواب دیا۔ تب ہی نظر اس کے ہاتھ پر گئی۔

”یہ کیا ہے۔۔۔؟“

”دھڑچاپائیاں اٹھانے لگی تو یہ تصویر وہاں گہری پڑی تھی۔۔۔“

”دکھاؤ۔۔۔“

چھہما تصویر انہیں تھا کر خود بھاگ لی۔ اسے ابھی بہت کام کرنے تھے۔ آئمہ نے تصویر سیدھی کی۔ دوسرے بل وہ ششدر سی رہ گئیں۔ گویا کائنات کی گردش رک گئی تھی۔ جس شخص کا نام اس گھر کے دروازے کے لیے اجنبی ہو چکا تھا۔ جس کی صورت یہاں کے مکین بھول چکے تھے۔ اس کی تصویر اور یہاں۔۔۔

”جمشید۔۔۔ میرے بھائی!۔“ ان کے لبوں نے اس تصویر کو بار بار چومنا۔ ”تم ہی تو ہو۔ کیوں آتے ہو میرے خواب میں۔ کیا کہنا چاہتے ہو۔۔۔ اتنے گم صم اتنے چپ کیوں ہوتے ہو۔ کیا تمہارے پاس مجھے دینے کے لیے دو حرف تسلی کے بھی نہیں۔۔۔“ وہ تصویر کو سینے سے لگائے زیر لب بوڑھا رہی تھیں۔ ”جمشید۔۔۔ دیکھو“ میں کتنی تنہا ہو گئی ہوں۔ کوئی ایسا نہیں جو میرے آنسو پونچھ کر سکے۔“

اندر آتے رائے سلیمان ایک دم کر رک گئے۔ ان کی آنکھوں میں ہلکی سی الجھن اور بے تحاشا سنجیدگی در آئی تھی۔ وہ آگے بڑھنے کو تھے کہ ان کی سماعتوں نے لرزتے لبوں کی سرگوشی سن لی۔ وہ کچھ لمحے لب بھیجے انہیں دیکھتے رہے۔ پھر جس خاموشی سے آئے اسی خاموشی سے دروازے کی اوٹ میں ہو گئے۔

”میں تمہیں کہاں ڈھونڈوں جمشید۔ کیوں اتنی دور چلے گئے کہ میں تمہیں آواز بھی نہیں دے سکتی۔“ مانوس ہاتھوں کا لمس ان کے چہرے پر جاگا۔ کسی نے نرمی سے ان کے آنسو صاف کر کے سر پر بوسہ دیا تھا۔

”اتنا کیوں رو رہی ہو بچی۔ میں کہیں بھی چلا جاؤں۔ تمہارا دھیان تمہارا خیال ہمیشہ میرے پاس رہتا ہے۔“

انہوں نے چونک کر آنکھیں کھولیں اور بے اختیار



ارد گرد دیکھا تھا۔ پھر بے اختیار چہرے پر ہاتھ پھیر کر دیکھا۔

یہی الفاظ تھے جب وہ ہر چیز سے بیزار ہو کر مصر جا رہا تھا۔ تو اس نے روتی ہوئی بہن کے آنسو سمیٹتے ہوئے کہے تھے۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیں۔ مگر اب کوئی آنسو پونچھنے والا نہ تھا۔ تصویر کو چومتے ہوئے وہ ایک دم ٹھٹھک گئیں۔

”یہ تصویر... یہ تصویر یہاں کیا کر رہی ہے؟“ انہوں نے دیکھا۔ یہ تصویر پیرس میں کھینچی گئی تھی۔ ”مگر اسے یہاں کون لایا۔“ وہ اضطرابی انداز میں اٹھ کر کھڑی ہو گئیں ”کہاں سے گری۔ یہ تصویر؟ کون آیا تھا؟“

”رائے سلیمان کے سامنے جا کر کہوں گا۔ میں رائے جمشید کا وارث ہوں۔“

بہت پتلے زین کا کہا ایک جملہ ان کی یادداشت میں گونجا۔ کسی نے ان کا دل گویا مٹھی میں لے کر مسلا تھا۔

”کہیں... کہیں... وہ یہاں تو نہیں آگیا۔ یا اللہ! اسے اپنی حفاظت میں رکھنا۔“ ان کا دل سجدے میں گرا دیا۔

”کس سے پوچھوں... کس سے پوچھوں وہ یہاں آیا تھا یا نہیں...؟“ وہ اضطرابی انداز میں کھڑی ہوئیں۔ ذرا سا آگے بڑھیں اور ایک دم آگے بڑھ کر دروازہ کھول کر باہر نکلتا چلا۔ سلیمان فوری طور پر پلٹ نہ سکے۔ وہ ٹھٹھک کر رک گئی تھیں۔ ان کی نگاہیں کچھ لمحے سلیمان پر گڑی رہیں اور زندگی میں پہلی بار رائے سلیمان کو اپنے تاثرات چھپانا مشکل لگا۔ تو انہوں نے سب خدائیں مان کر ان کا بازو آٹھ کی گرفت میں تھا۔ وہ ان کے سامنے آئیں۔

”وہ یہاں آیا تھا...؟“

”کون...؟“ وہ یہاں آیا تھا۔ سلیمان...؟“ ان کے لہجے میں خوف آمیز یقین تھا۔

”میں کی بات کر رہی ہیں آپ۔“

”زین العابدین... وہ یہاں تمہارے پاس آیا تھا... ہے نا سلیمان۔“

”وہ یہاں نہیں آیا تھا۔“ سلیمان نے آہستگی سے اور سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

”جھوٹ مت بولو سلیمان!۔ وہ نہیں آیا تو یہ تصویر کہاں سے آئی۔“ انہوں نے درشتی سے کہتے ہوئے تصویر ان کے سامنے کی۔ رائے سلیمان نے ایک نظر تصویر پر ڈالی اور لب بھینچ کر رہ گئے۔

”بولو! وہ یہاں آیا تھا۔ کیا کیا تم نے اس کے ساتھ...“ وہ پھر کر بولیں۔ دوسرے بل ان کا گریبان آٹھ کے ہاتھ میں تھا۔ ”بولو سلیمان! کیا کیا تم نے اس کے ساتھ... یہ تصویر وہاں کیوں اور کس سے گری تھی۔ کیا پلان کر رہے تھے تم لوگ...؟“

سلیمان ششدر سے رہ گئے۔ لیکن انہوں نے گریبان چھڑانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس کے برعکس خود پر قابو پاتے ہوئے دونوں ہاتھ ان کے بازو پر رکھ کر تحمل انداز میں بولے تھے۔

”آپ یقین کریں... وہ یہاں نہیں آیا۔“ اور آٹھ جانتی تھیں۔ سلیمان جھوٹ نہیں بول سکتا۔ ان کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ پھر وہ ان کے بازو پر سر ٹکا کر پھوٹ پھوٹ کر رو دیں۔

”وہ یہاں آئے گا سلیمان... وہ یہاں ضرور آئے گا۔ وہ آئے گا اور کہے گا کہ میں زین العابدین ہوں۔“ وہ سر اٹھا کر تم سب کو بتائے گا کہ وہ رائے جمشید حیات کا وارث ہے۔ اس حویلی کا ایک اور سپوت۔

انہوں نے چہرہ اونچا کر کے سلیمان کو دیکھا۔ آنسو بھل بھل ان کی آنکھوں سے بہہ رہے تھے۔ سلیمان لب بھینچے انہیں دیکھتے رہے۔

”میں جانتی ہوں سلیمان... وہ ایک دن یہاں تمہارے سامنے کھڑا ہو گا۔ مگر تم اسے کچھ نہیں کہو۔ تم سن رہے ہو سلیمان۔“ انہوں نے ساکت کھڑے سلیمان کو جھنجھوڑ ڈالا۔ ”وہ بے گناہ ہے... بے قصور ہے۔ اسے کچھ بھی نہیں چاہیے۔“

نہ جائیداد نہ وراثت... کچھ بھی نہیں۔ وہ بس اپنا نام اپنی شناخت چاہتا ہے۔ سر اٹھا کر جینا چاہتا ہے۔ اگر جرم اس کے باپ نے کیا ہے تو سزا اسے مت دینا۔ تم نہیں جانتے وہ میرے لیے کیا ہے۔ تم نے کبھی اسے غور سے نہیں دیکھا۔ کبھی اسے غور سے دیکھنا سلیمان... اس کی آنکھیں جمشید کی آنکھیں ہیں۔ اس کی آواز جمشید کی آواز ہے۔ وہ بولتا ہے تو اس کے لہجے میں مجھے جمشید سنائی دیتا ہے۔ اس کا وجود جمشید کی خوشبو سے ملتا ہے۔ اگر اسے کچھ ہوا سلیمان تو جمشید دوبارہ مرجائے گا۔ اسے نہیں مرنا چاہیے۔ کبھی نہیں... میں جمشید کو دوبارہ مرتے نہیں دیکھ سکتی۔

نہ معلوم کون کون سے خدشات ان کے دل میں چھپے بیٹھے تھے جو موقع ملتے ہی زبان کی نوک تک آگئے۔ ایک خود کلامی تھی۔

”لیکن میں یہ سب تم سے کیوں کہہ رہی ہوں۔ تمہیں تو جمشید سے نفرت ہے نا۔ لیکن وہ صرف جمشید کا ہی تو نہیں تمہاری پھپھو کا بھی بیٹا ہے۔ وعدہ کرو سلیمان... میرے ساتھ وعدہ کرو... وہ تمہارے سامنے آیا تو تم اسے کچھ نہیں کہو گے۔ وہ تم سے کچھ بھی کہے۔ میری خاطر وعدہ کرو۔“ وہ سسٹریانی انداز میں ان کا ہاتھ دوپچے کہہ رہی تھیں۔

”آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں آٹھ! آنٹی! آپ اندر چلیں۔“ ضبط کے کڑے مراحل سے گزرتے سلیمان بمشکل گویا ہوئے۔

”نہیں۔ تم پہلے مجھ سے وعدہ کرو۔“

”زہیب! چھو! رائے سلیمان کی گرج دار آواز پر جہاں وہ دونوں بھاگتی آئیں وہیں آٹھ ایک دم خاموش ہو کر انہیں دیکھنے لگیں۔

”بی بی کو اندر لے جاؤ۔“ انہوں نے آہستگی سے کہا اور خود رخ بدل لیا۔ دونوں ملازموں نے ذرا حیرت سے دیکھا۔ پھر آٹھ کی طرف بڑھیں۔

”چلیں بی بی۔“ ”تو تم وعدہ نہیں کرو گے۔“ انہوں نے بے حد

بے یقینی سے سلیمان کو دیکھا۔ ”آپ اندر جائیں۔“ ان کا لہجہ سپاٹ سا ہو گیا۔ آٹھ گھوم کر ان کے سامنے آئیں۔ ”سلیمان! ایک بات یاد رکھنا۔ اگر اسے کچھ ہو گیا تو میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی۔“ یہ کہتی وہ پلیٹیں اور تیز تیز قدم اٹھاتی اپنے کمرے میں گھس گئیں۔ رائے سلیمان لب بھینچے نجانے کیا سوچتے رہے۔ پہلی بار ایک ہلکا سا اضطراب ان کے چہرے پر نظر آیا تھا۔

♥ ♥ ♥ ♥

”باہی زار!۔“ سلیم اسے دیکھتے ہی چکا۔

”کہاں ہیں تمہارے بھائی جان۔؟“ زار نے اندر آتے ہوئے پوچھا۔

”آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ آپ کے لیے خود کیک بیک کیا ہے انہوں نے۔ ابھی ابھی میز پر رکھے ہیں۔“

”آٹھ!۔“

”گلتا ہے بھائی جان بہت خوش ہیں۔ صبح سے خواجواہ گنگنائے جا رہے ہیں۔ مجھے یونہی سو رہا ہے پکڑا دیا کہ جاؤ پیش کرو۔“

”آٹھ! پتا چل جائے گا کہ موصوف خوش کیوں ہیں۔“

زار ائیرس پر آئی تو وہ دونوں ہاتھ ریٹنگ برمائے دریا کی ساکت لہروں پر ہوا کے بھنور بننے دیکھ کر گنگنا رہا تھا۔ زار نے حیرت و دلچسپی کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ اس کے اس موڈ کو دیکھا۔ کم از کم زار اسے آج سے پہلے کبھی گنگناتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔

”اگر ساہیوال کا موسم تمہیں اتنا ہی خوش اور فریش کرتا ہے تو تم اکثر ایک چکر وہاں کا لگا آیا کرو۔“ زین چونک کر پلٹا۔ پھر ہنس دیا۔

”اے سلام علیکم!۔“

”وہ علیکم السلام! جیتے رہو۔“

”آپ سے کس نے کہہ دیا۔ میں خوش ہوں۔“ وہ دونوں ہاتھ عقب میں ریٹنگ پر نکاتے



ہوئے پوچھ رہا تھا۔ زار نے اس کا جھکا تا چہرہ اور روشن آنکھیں دیکھیں۔

"کہنے کی کیا ضرورت ہے۔ میں دیکھ رہی ہوں۔"

زین نے ہلکے سے سٹی بجائی۔ پھر زیر لب بڑبڑایا۔

"زین العابدین! تم کچھ نہیں چھپا سکتے۔"

"مجھ سے تو واقعی کچھ نہیں چھپا سکتے۔" زارا کا لہجہ ختا ہوا تھا۔

"اچھا چھوڑیں۔ آپ اتنی دیر سے کیوں آئی ہیں؟ میں نے آپ کے لیے ایسا زبردست کیک بنایا ہے کہ آپ نے ساری زندگی نہیں کھایا ہو گا۔" وہ

زین کے دروازے پر جا رکھا۔

"سلیم! اچی شہزادہ سلیم صاحب! میں نے کہا اگر زحمت نہ ہو تو وہ کیک نکال کر اوپر تشریف لے آئیں۔"

"ہم فارغ نہیں ہیں۔ آپ خود ہی زحمت فرمائیں۔" وہ نیچے سے پکارا۔

"آپ خاصے گستاخ واقع ہوئے ہیں شہزادہ سلیم۔ ہم نا نگیں توڑیں گے۔" وہ غصے سے گویا ہوا۔

"شہزادہ بھی کہتے ہیں اور بے عزتی بھی کرتے ہیں۔" کچھ کھوں میں خفا خفا سا سلیم سیڑھیوں پر

نمودار ہوا تھا۔ اس نے دونوں کے درمیان رکھی۔

"تم کیا سچ خود کو شہزادہ سمجھنے لگتے ہو۔؟" زین نے مذاق اڑایا۔ وہ منہ بنا کر نیچے اتر گیا۔ زین نے

چھری اٹھا کر اس کی طرف بڑھائی۔

"کافی ہے۔"

"کس خوشی میں۔؟"

"خوشی۔" زین نے لمحہ بھر کو سوچا پھر مسکرا دیا۔

خوبصورت رشتہ ہیں۔ سب سے خوبصورت حوالہ۔

"تم مجھے زارا کیوں کہتے ہو جبکہ میں تم سے بڑی ہوں۔"

"زارا نے پوچھا۔

"تو پھر کیا کہوں۔؟"

"کچھ بھی۔ آئی۔ باجی۔"

"آئی۔؟" وہ ہنسنے لگا۔ "شکل دیکھیں آئینے میں جا کر۔ آئی لگتی ہیں آپ میری؟" وہ ہنسنے اور مذاق اڑانے لگا۔

"میں چھری کھینچ ماروں گی۔" زارا نے دھمکی دی۔

"اچھا۔ اچھا کہہ دوں گا آپ کو آئی۔ باجی۔ خاص طور پر آپ کے رضوان صاحب کے سامنے تو ضرور کہہ دوں گا۔ خواہ غلط فہمی کا شکار ہی نہ ہو جائیں۔

آخر اتنی ڈیٹنگ پر سنبھلی ہے میری۔" وہ اتر کر بولا تھا۔

"اب آئینے میں منہ دیکھنے کی باری تمہاری ہے اور تم رضوان کے پیچھے مت پڑے رہا کرو۔ وہ ایسی ذہنیت کا مالک نہیں ہے۔"

"میری جرات کہ ان کو کچھ کہہ سکوں۔" اس نے فوراً پینتر ابدلا۔ "ویسے میں آپ کا چھوٹا بھائی بننے کو تیار ہوں۔ لیکن بڑے بڑے ہوتے ہیں چھوٹے بھائیوں کے۔ اٹھا سکیں گی آپ۔"

وہ ذرا جھک کر متبسم و شریعہ میں کہہ رہا تھا۔

"میں تمہارے سارے خیرے اٹھانے کو تیار ہوں زین العابدین۔"

زارا نے ذرا سنجیدگی سے کہا۔ زین کی آنکھوں میں جلتی روشنیاں تین گنا بڑھ گئی تھیں۔ جیسے الماس کی رات میں ہزاروں جگنو جگنو گاتھے ہوں۔

"تھینک یو زارا۔" پھر ذرا رک کر بولا تھا۔

"آئی۔"

"لیکن زین! تم نے مجھ سے جھوٹ کیوں بولا۔" زارا نے چھری واپس رکھ دی۔

زین ٹھٹھک گیا۔ پھر سر رہا تھا مار کر بڑبڑایا۔

"اور میں سمجھتا رہا کہ کسی کو خبر ہی نہیں ہوئی۔"

ایک دم گھامڑ ہو تم زین العابدین۔"

"زین! کچھ ملا۔؟" زارا مسکراتی پھر قدرے سنجیدگی سے پوچھنے لگی۔

"پہلے میں نے سوچا کہ تمہیں واپس آنے کو کہوں۔ پھر خیال آیا مجھے تمہارے راستے کی رکاوٹ نہیں بننا چاہیے۔ تمہیں وہی کرنا چاہیے جو تم چاہتے ہو۔"

"میں نے بھی کئی بار سوچا کہ آپ کو بتا کر جاؤں۔ پھر خیال آیا کہیں آپ مجھے روک نہ لیں۔ حویلی کے سامنے کھڑے ہو کر بار بار سوچا کسی بہانے جا کر پھپھو سے ملوں لیکن دل و دماغ کا فیصلہ ایک ہی تھا کہ اس حویلی میں قدم رکھوں گا تو اپنی اصل شناخت کے ساتھ۔"

"کچھ ملا زین۔؟"

"بہت کچھ۔" وہ ایک دم پر جوش ہو گیا۔ "میں نے کہا تھا نا کہیں نہ کہیں کچھ نہ کچھ ایسا ضرور مل جائے گا جو بابا کی بے گناہی کو ثابت کر سکے اور مجھے وہ مل گیا ہے زارا۔ مجھے یقین تھا۔ بابا نے قتل نہیں کیا۔ وہ کر ہی نہیں سکتے۔ وہ تو بس ایک سازش کا شکار ہو گئے تھے۔ کوئی بابا نے نہیں چلائی اور میں یہ بات ثابت کر سکتا ہوں۔"

اس کا لہجہ ٹھوس تھا۔ زارا چونک گئی۔

"کیسے۔؟"

"میں بہت مایوس ہو کر پلٹ رہا تھا زارا۔! مجھے لگا کہ کبھی سچ نہیں کھوج سکوں گا۔ لیکن وہ میرا اللہ۔"

ابھی مایوس نہیں ہونے دیتا اور اب مجھے خبر ہوئی اللہ اسے میرے راستے میں کیوں لے آیا تھا۔"

"کس کی بات کر رہے ہو۔؟"

"وہ جس نے سب اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔"

"یعنی گواہ۔ مگر کون۔؟" زارا بری طرح چونکی۔

زین مہم سا مسکرایا۔

"یہ نہیں بتا سکتا۔"

"لیکن زین! جو شخص اتنے برسوں تک نہیں بولا۔ وہ اب گواہی دے گا۔"

زین کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔

"دے گا۔ ہر صورت میں دے گا۔ بلکہ اب تو دینا پڑے گی۔" زین نے اسے سب ہی کچھ بتایا تھا۔

سوائے گواہ کے نام کے۔ شام آہستہ آہستہ دریا کے پانیوں میں گھلنے لگی اور رستوران کی روشنیاں جلنے لگیں اور وہ کہہ رہا تھا۔

"اب کچھ بھی چھپا ہوا نہیں۔ مجھے یقین ہے۔"

رائے سلیمان جان چکا ہے کہ میں کون ہوں میرے والد سے تصویر کا غائب ہونا۔ کسی کو اس تصویر سے کیا لینا دینا۔؟ کیا مقصد ہو سکتا ہے۔ باسوائے اس کے کہ رائے سلیمان کو بتایا جائے کہ میں کون ہوں۔

پھر رائے سلیمان کا رویہ۔ اسے مجھ سے کیا پر خاش ہے۔ وہ جب بھی مجھ سے بات کرتا ہے۔ اس کا لب و لہجہ بے حد ناگوار اور درشت ہوتا ہے۔ بالکل وہی لہجہ جو کسی دشمن کے ساتھ روار کھا جائے۔"

"تم سلیمان بھائی سے دوبارہ ملے تھے۔؟" زارا چونکی۔

"ان کے گاؤں گیا تھا۔ ایک آدھ دفعہ تو ٹکراؤ ہونا ہی تھا۔" اس نے لاپرواہی سے کندھے اچکائے۔

"لیکن یہ کیسے معلوم ہو کہ قاتل کا نشانہ کون تھا۔؟" زارا نے پرسوز انداز میں پوچھا۔

"غالب گمان تو یہی ہے کہ نشانہ بابا جان ہی تھے۔ گھوڑا بدک جانے کی وجہ سے نشانہ جو ک گیا۔"

"اور ہونے کو تو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ قاتل دونوں کا مشترکہ دشمن ہو۔" زارا اس معاملے کو نئے انداز میں دیکھنے لگی تھی۔ "ایک تیرے دو شکار۔ رائے نواز قتل اور رائے جمشید ہمیشہ کے لیے مفرور۔ اس پروجیکشن سے فائدہ کس کو حاصل ہوا؟"

زین بری طرح اچھلا۔

"رائے سلیمان۔؟"

"کم ان زین! ہاؤ ازاٹ پاسل؟" زارا ایسا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔



”کیوں نہیں ہو سکتا۔ سارے اختیارات اور جاگیر ان ہی کے ہاتھ تو آئی ہے۔ فائدہ صرف اور صرف اسی شخص کو حاصل ہوا۔“ وہ پرجوش ہو گیا۔ ذہن ایک نئی سمت چل دیا تھا۔

”تمہارا کہنے کا مطلب ہے، محض اختیارات اور جاگیر کے لیے رائے سلیمان اپنے باپ کو قتل کروا دیتا ہے۔“

”قتل اور کس لیے ہوا کرتے ہیں ایک وجہ یہ بھی ہوتی ہے زار اڑ گیا۔“

”نہیں زین۔ میرا دل نہیں مانتا۔“

”دل کی تمیں۔ حقائق کی بات کریں۔ چلیں ٹھیک ہے ایک کام کریں۔ رائے سلیمان سے اتنا تو معلوم کریں۔ وہ کون تھا جس نے رائے جمشید کو گولی چلائی دیکھا۔ کوئی تھا؟ یا محض ان دونوں کے درمیان جھگڑے کی بنا پر سمجھ لیا گیا کہ قاتل رائے جمشید ہے۔ حویلی تک یہ خبر کس نے پہنچائی اور کن الفاظ میں؟ جھوٹ کہاں سے شروع ہوا؟ پچھو اور انکل عمنو امریکہ میں تھے۔ رضوان کا تو سمجھیں اس معاملے سے کوئی تعلق ہی نہیں۔ انہوں نے اپنی آدمی زندگی بورڈنگ اور پھر امریکہ میں گزار دی۔ گاؤں میں یہ خبر بعد میں پہنچی وہاں تو ایک ہزار ایک باتیں ہیں۔ فقط رائے سلیمان ایسا شخص ہے جو اس بارے میں کوئی مستند بات جتا سکتا ہے۔“

زارا کچھ لمحے سوچتی رہی۔ پھر سر جھٹک کر تاسف سے کہنے لگی۔

”ماموں کے فرار نے ان پر لگے ہر الزام کو درست ثابت کر دیا۔“

”کاش بابا نے اس بزدلی کا مظاہرہ نہ کیا ہوتا۔ وہ گھبرا کر فرار ہوئے اور جب سنبھلے تو کہانی کچھ کی کچھ ہو چکی تھی۔ لیکن بڑی سب سے پہلے سوچنے بجھنے کی صلاحیت سب گرتی ہے۔ بس بھاگ جانے پر مجبور

کرتی ہے۔ کاش بابا ایک بار اوت گھر سامنے آجاتے تو ان پر یہ سب نہ ہوا ہوتا۔“ زین کے بچے میں تاسف سا جھلکنے لگا تھا۔

”زین! زارا نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔“ اب جو کچھ بھی کرنا ہے جلد کرنا ہے۔ ہمارے پاس خاموش رہنے کا وقت نہیں۔ اس سے قبل کہ سلیمان بھائی کوئی غلط قدم اٹھالیں۔ وہ کل واپس آئیں گے اور میں کل ہی ان سے بات کروں گی۔“

”دو ٹوک بات۔ کبھی گگ۔ مجھے اب کسی سے ڈر نہیں لگتا۔ بس بابا کا نام کلیئر ہونا چاہیے۔“ وہ سنجیدہ لہجے میں گویا ہوا۔ زارا مسکرا دی۔

”ڈونٹ وری۔ وہ اب مجھے ٹال نہیں سکیں گے۔ لیکن کیا یہ کیلک یونہی رکھا رہے گا۔“ اس نے بات بدلی۔

”بالکل نہیں۔ یہ آپ کا انتظار کر رہا ہے۔“

زارا کو اب خواہش نہیں رہی تھی۔ کچھ گہری ہوتی شام بھی اسے جلدی میں ڈال گئی تھی۔ اس نے یونہی ذرا سا ٹکڑا لے لیا۔ زین نے پیپسی کے ٹن پیک کھولے اور اپنا گلاس لے کر پھر سے ریٹنگ کی طرف آگیا۔ ہوا پتوں کو چھو کر گزرتی تو وہ تالیاں سی پیٹے لگتے۔ کوئی پتہ شاخ سے ہاتھ جھڑاتا تو پانی میں دوڑ تک دائرے بنتے چلے جاتے۔

”مجھے لگتا ہے۔ میں ایسی ہی کسی خوبصورت شام میں آپ سے ملنے رائے ہاؤس آؤں گا۔ اپنے اصل نام اور تعارف کے ساتھ۔“ وہ ذرا سا سر اٹھائے آسمان پر حیرتے بادل کے اس زرد ٹکڑے کو دیکھ رہا تھا۔ جو سورج کے آخری کنارے کو چھو کر آیا تھا۔

”انشاء اللہ۔“ زارا کے دل نے بے اختیار کہا۔

یہ شام اور تیرا نام دونوں کتنے ملتے جلتے ہیں

تیرا نام نہیں لوں گا بس تم کو شام کہوں گا

کیس لی سوی فل آواز میں چل رہا تھا۔ زین کو گندم کے سنہری کھیتوں پر چھائی شام جیسی لڑکی یاد آئی۔

”نہیں تارم۔“ وہ زیر لب مسکرایا۔ اس کا دل چاہا وہ زارا کو اس کے متعلق بتائے اور پوچھے ”کیا یہ جت

ہے۔“

وہ متذبذب ہی تھا جب زارا اٹھ گئی۔ وہ اسے گاڑی تک چھوڑنے آیا تھا اور آج سے پہلے وہ کبھی اسے گاڑی تک چھوڑنے نہیں آیا تھا۔ زارا نے دروازہ کھولا تو دونوں ہاتھ اس پر ٹکاتے ہوئے متبسم چھپتے ہوئے لہجے میں گویا ہوا۔

”آپ کو ایک اور بات بھی بتانا تھی۔“

”کون۔“

”پھر سوچتا ہوں رہنے دوں۔“ اس نے کان کھجاتے ہوئے کہا تو زارا مسکرا دی۔

”کیا یہ ممکن ہے زین العابدین۔“

”نجانے کیسا رشتہ ہے میرا آپ سے۔ میں اپنا ہر

نہ۔ ہر خوشی آپ سے شیئر کرنا چاہتا ہوں۔“

”اب کہہ بھی دو زین۔“ زارا کو جلدی تھی۔

”دیکھو شام کتنی گہری ہو گئی ہے۔“

”ہاں۔“ اس نے سر اٹھا کر آسمان کی سمت

دیکھا۔ ”چلیں ٹھیک ہے آپ جائیں۔ یہ بات پھر

کبھی تفصیل سے بتاؤں گا۔ جب آپ کے پاس بہت

سلاقت ہو گا۔“

زارا نے اصرار نہیں کیا۔ زین نے اس کے ہٹھنے پر

دروازہ بند کیا۔ پھر جھٹک کر کہنے لگا۔

”پچھو سے کہیے گا۔ زین انہیں بے حد یاد کرتا

ہے۔“

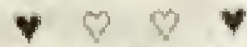
”اور کچھ۔“

”ان سے کہیے گا۔ میرے لیے دعا کریں۔“

”اوکے۔“ اس نے گاڑی اشارت کی۔ زین نے

اس کی گاڑی کو بہت دور تک جاتے دیکھا تھا۔ یہاں

تک کہ وہ دائیں طرف مڑ گئی۔



کئی رجسٹر تھے جنہیں فشی بشیر علی کھول کھول کر رائے سلیمان کے سامنے رکھ رہا تھا۔ رائے سلیمان کے انداز میں ہلکی سی بے توجہی تھی۔ جیسے ذہن کہیں اور بھٹک رہا ہو۔ تب ہی ایک جگہ غلط اندراج پر نشان لگتے ہوئے سلیمان نے سرسری سے انداز میں

پوچھا۔

”وہ چلا گیا ہے۔“

”کون۔“

”وہی لڑکا۔ کیا نام تھا اس کا۔“ ہاں زین

العابدین۔۔۔ چلا گیا یا نہیں ہے۔“ ان کا انداز اب بھی

سرسری ہی تھا۔

”وہ تو کل دوپہر ہی چلا گیا تھا۔“ فشی بشیر علی کے

لہجے میں مایوسی سی تھی۔

”ہوں۔“ رائے سلیمان دوبارہ رجسٹر پر جھک

گئے۔

”پھر وہ دوبارہ ضرور آئے گا۔“ کچھ دیر کے بعد فشی

بشیر علی بولا تھا۔ سلیمان نے چونک کر سر اٹھایا۔ ان کی

آنکھوں میں ناگواری کی ہلکی سی لکیرا بھری تھی۔

”تمہیں الہام ہونے لگا ہے چاچا۔“

”الہام کیسا پتر۔ حوصلہ بڑھ گیا ہے اس کا۔ ایک

بار صحیح سلامت لوٹ گیا ہے دوبارہ ضرور آئے گا۔

ایک بار حویلی اور زمینیں دیکھ گیا ہے اب وہ رے کے گا۔

آخر وارث ہے وہ بھی۔ حصہ ہے اس کا بھی اس ساری

جائیداد میں۔“

”اتنی جرات نہیں اس میں کہ وراثت کا دعویٰ

کرے۔“ رائے سلیمان نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

”جرات تو اپنے آپ ہی پیدا ہوگی۔ یہاں ہمدردی

پیدا ہو گئے ہیں اس کے۔“

وہ مقبول ہے نا۔ اپنی بھانجی کا نکاح کر رہا ہے اس

کے ساتھ۔“ اس نے اگلی اطلاع دی۔

رائے سلیمان کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ بکھر

گئی۔

”تو کرنے دو نکاح۔ تمہیں کیا اعتراض ہے۔“

فشی بشیر علی ششدر سا رہ گیا۔ پھر سنبھل کر بولا۔

”مجھے کیا اعتراض ہو گا جب کوئی اعتراض

نہیں۔۔۔ پر کیا کروں پتر۔ میری آنکھوں سے تو بڑے

رائے صاحب کا چہرہ او جھل نہیں ہوتا۔ کیا گزرتی

ہوگی ان کی روح پر۔ جب ان کے قاتل کی اولاد ان کی



قبر بردناتی پھر رہی ہوگی۔

”منشی بشیر علی۔“ رائے سلیمان کے لمبے میں عجیب سی گرج تھی۔ منشی بشیر ایک دم چپ ہو گیا۔ پھر آہستگی سے گویا ہوا۔

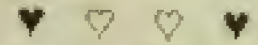
”آپ اسے پکڑ لیتے تو وہ خود بخود ہی بول دیتا کہ جمشید کہاں چھپا ہے۔“

رائے سلیمان کی آنکھوں میں الجھن سی تیر گئی۔ پھر ایک طویل سانس لے کر رہ گئے۔ گاؤں والے کب جانتے تھے کہ جمشید مر چکا ہے۔

”ٹھیک ہے چاچا! اٹھاؤ یہ سب کچھ۔“ منشی بشیر نے رجسٹر اکٹھے کر کے بغل میں دبا ہے۔ سلیمان نے اسے ہاتھ سے جانے کا اشارہ کیا۔ وہ دروازے تک جا کر رک گیا۔

”ویسے پتر سلیمان! اب تم اپنی قسم کا کفارہ ادا کر رہی دو۔“

رائے سلیمان نے جھٹکے سے سر اٹھایا۔ منشی بشیر علی تیزی سے باہر نکل گیا۔ رائے سلیمان کے اعصاب تن گئے اور وہ خود میں چند نگاریاں سی چٹختے لگی تھیں۔



”بھابھی! سلیمان بھائی کہاں ہیں۔؟“ زارائے لاؤنج میں میگزین کے صفحے پلٹتی عالیہ سے پوچھا۔ سلیمان بھائی کل ہی گاؤں سے آئے تھے۔

”کیا معلوم۔؟“ وہ قدرے چڑ کر بے نیازی سے گویا ہوئیں۔ ”وہ تو گھر میں بھی ہوں تو بھی ظلم نہیں ہوتا کہ کہاں ہیں۔“

”لڑائی ہو گئی کیا۔؟“ زارائے ہنستے ہوئے پوچھا۔ ”لوڑے تو انسان اس سے جو دو گھڑی دستیاب ہو۔“

یہاں تو ہفتہ ہفتہ بھران کی شکل نظر نہیں آتی۔ شہر میں بولی تو بھی خبر نہیں ہوتی کہ وہ کونسا گاؤں میں اور کیا کر رہے ہیں۔ بیوی تو گویا ایک فالتو روزہ ہے۔ جسے گھر

کے کسی کو نے میں ڈال کر بھول چکے ہیں تمہارے سلیمان بھائی۔“ وہ نجانے کس بات پر بھری بیٹھی تھی۔

”کیوں؟“ وہ اٹھتے اٹھتے پھر سے بیٹھ گئے۔ زارا

ہو گئی۔ ”سلیمان اندر داخل ہوئے۔“

”اور شوہروں کو تو طعنے دینے کا موقعہ چاہیے۔ ایسی کون سی ناشکری دکھا دی میں نے۔“ وہ تنک کر پوچھنے لگیں۔ انہوں نے زارا کو دیکھا اور متبسم لمبے میں کھنسے لگے۔

”تمہاری بھابھی کا آج لڑائی کا موڈ ہے۔“

”مجھے کیا لڑنا ہے۔ بس یاد دہانی کروا رہی تھی۔ اماں کا فون آیا تھا کہ ہم پنڈی کب آرہے ہیں۔ عاصم کی منگنی ہے اور سب کچھ میری وجہ سے رکا ہوا ہے۔“ انہوں نے اپنے چھوٹے بھائی کا نام لیا۔

”تو تم جاؤ نا۔ ہم نے کب روکا ہے۔ سعد کے اسکول سے دو چار چٹھیاں لے لو۔“ انہوں نے آرام سے پلان کیا۔ وہ سسرال کم کم ہی جاتے تھے۔ ”یہ تو تم عورتوں کے معاملات ہیں۔ میں فون پر عاصم کو مبارک باد دے دوں گا۔“

”گویا آپ نہیں چل رہے۔“ ”تھوڑا مشکل ہو جائے گا۔ ایک دو کام اٹکے ہیں۔ پھر فصل کی کٹائی بھی شروع ہونے والی ہے۔“ انہوں نے گویا صاف انکار کیا تھا۔

”ٹھیک ہے اماں! بابا سے کہوں گی۔ خود بات کر لیں اسے لاڈلے داماد سے۔ میری نہیں سنتے۔“ وہ گویا خفا ہو کر انھی تھیں۔ سلیمان مسکراتے ہوئے زارا کی طرف پلٹے پھر پوچھنے لگے۔

”تم کیا سوچ رہی ہو۔؟“

وہ جو اس پورے عرصے میں یہی سوچتی رہی تھی کہ سلیمان بھائی سے کس طرح بات کرے۔ سر جھٹک کر بولی۔

”کچھ بھی تو نہیں۔“

”اسٹڈیز کیسی جا رہی ہیں۔؟“

”ٹھیک ہیں۔“

”اچھا مجھے کیس جانا ہے۔“ انہوں نے کھڑکی

نکاہوڑا کر اٹھنے کا ارادہ کیا۔ تو وہ بول اٹھی۔

”مجھے آپ سے کچھ بات کرنی ہے۔؟“

”کیوں؟“ وہ اٹھتے اٹھتے پھر سے بیٹھ گئے۔ زارا

متذبذب سی ہو گئی۔ رائے سلیمان سے بات کرنا آسان کام نہ تھا۔

”کوئی ناپائیدار چیز کی ضرورت ہے۔؟“ ان کے لمبے میں مخصوص سی شفقت در آئی۔ ”نہیں۔۔۔“ وہ لب بچھینچ کر رہ گئی۔

”تو۔۔۔“ رائے سلیمان نے اس کے متذبذب چہرہ و انداز کو بغور دیکھا۔ تب ہی اس نے گویا دو ٹوک بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

”مجھے ماموں کے بارے میں بات کرنا ہے۔“ وہ ان کی سمت دیکھ رہی ہوتی تو ان کے چہرے پر در آنے والی سنگین سنجیدگی کو جانچ لیتی۔ پھر بھی انہوں نے پوچھا تھا۔

”رائے جمشید کے بارے میں۔۔۔؟“

”میرے ایک ہی ماموں تھے۔۔۔“ اسے اپنا اعتماد بھال کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگی تھی۔ رائے سلیمان نے اسے دیکھا۔ پھر بولے تو لہجہ پر سکون اور اطمینان بھرا تھا۔

”کوئی بات کرنی ہے۔؟“

زارائے سراٹھا کر براہ راست ان کی سمت دیکھا۔ ”کنے والے نے تو یہ کہا کہ قتل رائے جمشید نے کیا۔ میں جانا چاہتی ہوں کہ وہ کون شخص تھا جس کی بات پر آپ نے بنا تصدیق کیے اعتبار کر لیا۔ کسی نے انہیں گولی چلاتے دیکھا۔ آپ نے یا اس شخص نے۔ کوئی تو ایسا واضح ثبوت ہو گا جو ماموں کو قاتل ثابت کرے یا میں سمجھوں کہ آپ نے دانت یا دھنکی

بذباتیت سے واقعات کا سرخ بدل دیا۔“ زارائے اپنے آخری جملے کا رد عمل ان کے چہرے پر نمودار کرنے کی کوشش کی۔ مگر مقابل رائے سلیمان نے۔ وہی سنجیدہ نگاہیں اور سپاٹ چہرہ۔

”اپنی بات پوری کر۔؟“ انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔

”تفتیش اگر پر طریقہ سے ہوتی تو حقائق خود بخود سامنے آجاتے۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ ثابت کر دیتی کہ کوئی کتنی دور سے ماری گئی تھی اور رائے جمشید کتنے

فاصلے پر موجود تھے یہ بات آپ کے عینی گواہ نے ضرور بتائی ہوگی۔ اس کے علاوہ بہت سی دوسری باتیں دو سرے حقائق۔ جنہیں جاننا اس وقت آپ کے لیے بہت ضروری تھا۔ محض یہ کہنا کہ دونوں میں پیدا ہونے والی نفرت اور دشمنی کی بنا پر یہ قتل ہوا۔ واقعہ کا ایک رخ ہے۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے اس کی آڑ لے کر کسی اور نے اپنا مقصد پورا کیا ہو۔“

زارائے پہلی بار رائے سلیمان کی آنکھوں میں ہلکی سی الجھن تیرتی دیکھی۔

”تم کیسے سب کیوں پوچھ رہی ہو۔؟“

”کیونکہ مجھے کچھ ایسے شواہد ملے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ قاتل کوئی اور تھا۔“ زارائے آہستگی سے بتایا۔

”کیسے شواہد۔۔۔؟“ وہ ذرا سا چونکے۔

”سوری! یہ میں ابھی نہیں بتا سکتی۔“ وہ نظروں کا زاویہ بدل کر دیوار پر لگی پینٹنگ دیکھنے لگی۔ ”مجھے صرف اس شخص کا نام دیں سلیمان بھائی۔ جس نے سب سے پہلے آپ تک یہ خبر پہنچائی۔ مجھے یقین ہے اس نے آپ سے جھوٹ بولا تھا اور یوں بھی ہمیں لگتا ہے نشانہ آیا جان نہیں ماموں تھے۔“

”ہمیں۔۔۔؟“ رائے سلیمان نے زیر لب دہرایا۔ زارا ایک لمحوں کو گڑبڑائی۔ رائے سلیمان نے ایک طویل سانس لے کر ذرا سا آگے جھکے اور براہ راست اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا تھا۔

”زارا! تم اب یہ سب کیوں پوچھ رہی ہو جبکہ رائے جمشید زندہ بھی نہیں۔“

زارا اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

”آئی ٹھنک! آپ یہ بات جانتے ہیں کہ میں یہ

سب کچھ کیوں پوچھ رہی ہوں۔“

”میں تم سے سننا چاہتا ہوں۔۔۔“ ان کا لہجہ ٹھنڈا

تھا۔ فوری طور پر زارا فیصلہ نہیں کر پائی کہ زین

العابدین کے بارے میں بتائے یا نہیں۔

”یہ بھی تو ہو سکتا ہے سلیمان بھائی اب تک لاعلم

ہی ہوں۔“ ایک خیال سا بھرا تھا۔

”ایک خیال سا بھرا تھا۔“

”ایک خیال سا بھرا تھا۔“



”زارا! تمہیں اب یہ سب جاننے کا خیال کیوں آیا ہے۔۔۔۔۔“ سلیمان بھائی نے اپنا سوال دہرایا۔

”سلیمان بھائی! اہمیت اس بات کی نہیں ہے کہ یہ خیال اب کیوں آیا دس سال پہلے کیوں نہیں آیا۔ میں دس سال کے بعد پوچھتی۔ آپ تب بھی یہی سوال کرتے۔ میں صحافت پڑھ رہی ہوں اور شخص شوق نہیں ایک عزم کے ساتھ پڑھ رہی ہوں۔ کسی بھی غیر واضح سچائی کو واضح کرنا میری فطرت ثانیہ بن چکا ہے اور یہ تو ہمارے خاندان کا سب سے بڑا المیہ ہے۔“

سلیمان کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ دور آئی۔ ”اہمیت تو اس سوال کی ہے جو میں نے آپ سے کیا۔“ زارا ان کی مسکراہٹ یکسر نظر انداز کر گئی۔ ”اہمیت تو ان شواہد کی ہے جو بائیس برس کے بعد سامنے آئیں گے۔ اس سے پہلے کہ ہم پھر کسی بڑے نقصان سے دوچار ہو جائیں۔“

سلیمان بھائی نے ہاتھ بڑھا کر اس کا سر تھپتھپایا۔ ”تم واقعی بڑی ہو گئی ہو اور لگ رہا ہے کہ صحافت پڑھ رہی ہو۔“

زارا کو ان کا انداز انسٹنگ سا لگا۔ دوسرے معنوں میں وہ باور کروا رہے تھے کہ وہ کتنی بھی بڑی ہو جائے۔ ان کے مقابل نہیں آسکتی۔

”تو آپ میرے سوال کا جواب نہیں دیں گے۔“ زارا نے سر اٹھا کر بے حد سنجیدگی سے انہیں دیکھا۔ رائے سلیمان نے کلائی موڑ کر گھڑی پر نگاہ دوڑائی۔ ”تم نے مجھے خاصا لیٹ کروا دیا ہے۔“

”تو کیا میں سمجھوں کہ آپ دانستہ اس سچائی کو چھپانا چاہتے ہیں۔۔۔۔۔“ زارا ان کی طرف سے بدگمان ہو گئی تھی۔ اس کا لہجہ چبھتا ہوا اور تلخ تھا۔ رائے سلیمان نے دونوں ہاتھ پشت پر باندھتے ہوئے گہری نظروں سے اس کے تاثرات جانچے۔ زارا نے بھی نظروں کا زاویہ بدلنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔

”جس شخص نے تم تک بلے شولہ پونچائے ہیں۔ اس سے کہنا اس سوال کا جواب بھی ڈھونڈ دے۔“ ان کا لہجہ بالکل شپاٹ اور ٹھنڈا تھا۔ ”میں چلتا ہوں ڈنر پر

ملاقات ہوگی۔“

زارا نے لب بھینچ کر انہیں جاتے دیکھا۔ ”یہ کام تو اب میں کروں گی سلیمان بھائی۔“ وہ زیر لب بڑبڑاتی تھی۔



سائیں سائیں کوک نصیبا  
سائیں سائیں کوک  
دل میں عجب اندھیرا پھیلا  
بینائی بے چین

ایک جھلک دکھلا کے سانول  
اوڑھ گیورے رین  
جنگل جنگل، صحرا صحرا  
گو نجیں دل کے بین  
گھائل ہو گئے نین مسافر  
گھائل ہو گئے نین  
سائیں سائیں کوک نصیبا  
گھائل ہو گئے نین

اس نے پلٹ کر زین کے کندھے پر ہاتھ مارا۔ ”تو کیا جانے یہ عشق کیا بلا ہے۔ بچہ ہے یا۔۔۔۔۔“ ”میں نے کب عشق کا دعوا کیا ہے افتخار بھائی۔“ زین ہنسا۔ گلابی شام دھرتی پر دھیرے دھیرے اتر رہی تھی۔ ان کے ارد گرد لوگ ٹھے ٹریفک کا شور تھا۔ اشیاء کے انہار تھے، سچے سنورے چہرے اور وہ بازو میں بازو ڈالے اسی شام میں چلتے جا رہے تھے۔ ”سات سمندر تیر آتی ہے

ایک اکیلی جان۔۔۔۔۔“ افتخار نے پھر سے نعرہ لگایا۔ آج وہ بڑی موج میں تھا۔ بن پے بمک رہا تھا۔ زین نے اسے پہلے کبھی اس موڈ میں نہیں دیکھا تھا وہ دونوں چلتے جاتے تھے۔ کہیں رکتے۔ کبھی ملک شیک، کبھی جوس پیتے اور پھر سے چل دیتے۔ کبھی کبھی وہ دونوں ہاتھ باندھ کر جھونٹے لگتا۔

کبھی بادل وار برس سائیں  
میرا سینہ گیاتر سائیں

میں توبہ تائب دیوانہ

آباد کروں کیا ویرانہ

میری بس سائیں، میری بس سائیں

کبھی بادل وار برس سائیں

اس عشق نے عجب اسیر کیا

خود دل سینے میں تیر کیا

کیا چلے گی پیش و پس سائیں

کبھی بادل وار برس سائیں

وہ دھپ سے وہیں فٹ پاتھ کے کنارے بیٹھا۔ پھر سر اٹھا کر سنجیدہ نظروں سے زین کو دیکھا، اس کا سانس پھولا ہوا اور چہرہ سرخ تھا۔

”جب میں نے اسے پہلی بار دیکھا تو مجھے نہیں معلوم تھا اس کی آنکھوں کا رنگ کیسا ہے۔ مگر مجھے لگا میں ڈوب جاؤں گا۔ بس ایک بار ان آنکھوں میں جھانک لیا تو ہمیشہ کے لیے ڈوب جاؤں گا۔“

”میں نے اسے پہلی بار تب دیکھا تھا جب اس کے پاؤں میں کانچ لگ گیا تھا۔ لیکن مجھے تو ایسا کوئی احساس نہیں ہوا تھا۔“ زین افتخار کے قریب ہی بیٹھ گیا۔ ان کے پاس سے پھول بیچنے والے آوازیں لگاتے جا رہے تھے۔ تازہ پھولوں اور گلیوں کی مہک فضا میں گھل مل گئی تھی۔

”اس دن جب وہ۔۔۔۔۔“

زین نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

”آج آپ صرف میری بات سنیں گے۔“

افتخار نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور ہنسنے لگا۔

”تم بھی کہتے ہو گے، افتخار پاگل ہو گیا ہے۔ بس یار، بہت دنوں سے اسے دیکھا نہیں تھا۔ حالانکہ میں خود کو بہت مضبوط سمجھتا تھا مگر یہ کبھت عشق یونہی خوار کرتا ہے۔“

”تو آپ دیر کیوں کر رہے ہیں افتخار بھائی۔۔۔۔۔“ ”اب نہیں کروں گا۔۔۔۔۔“ اس نے گویا خود سے تہیہ کیا۔ پھر چونک کر پوچھنے لگا ”تم کیا کہہ رہے تھے؟“



”میں شادی کر رہا ہوں۔۔۔“ اس نے ایک دم کہا۔  
 ”کیا۔۔۔؟“ وہ اچھل پڑا۔ ”اس سارے قصے میں  
 شادی کہاں سے آگئی۔“  
 ”جانتے نہیں بس آگئی۔۔۔“ وہ ہنس دیا۔  
 ”کس سے کر رہے ہو۔۔۔؟“

”وہی لڑکی جس کے پاؤں میں کانچ لگ گیا تھا۔“  
 ”ہاں۔۔۔ ہاں۔۔۔ اور جس کے بھائی۔۔۔ بتایا تھا تم  
 نے مجھے ایک دفعہ۔۔۔ لیکن تم تو کہتے تھے تم اس لڑکی کو  
 بالکل نہیں جانتے۔“

”خیر۔۔۔ پہلے نہیں جانتا تھا اب تو اچھی طرح جانتا  
 ہوں۔ اتفاق سے میں گاؤں میں ان ہی کے گھر ٹھہرا  
 تھا۔“

”اتفاق سے۔۔۔؟“ افتخار کی آنکھیں شرارت سے  
 مسکرائیں۔

”بائے گاؤ افتخار بھائی میں سچ کہہ رہا ہوں۔“  
 ”اُوئے۔۔۔ تو افتخار کو اتنا بے وقوف سمجھتا ہے۔“

اس نے دھب لگائی۔  
 ”تو آپ یقین نہیں کریں گے۔۔۔ مت کریں۔۔۔  
 لیکن بے بے سے بات تو کریں۔ وہ میرے ساتھ  
 چلیں۔۔۔“ اس نے افتخار کو پوری بات بتا کر کہا تھا۔

”بے بے سے تم خود بات کر لو۔۔۔“ افتخار نے بے  
 نیازی دکھائی۔

”افتخار بھائی۔۔۔“ زین نے خفگی سے اسے دیکھا تو  
 اس نے ہنستے ہوئے بازو اس کے کندھے پر پھیلا دیا۔

”تجھے تو بھائی کہا ہے میں نے۔۔۔ تم دیکھنا ٹھیک  
 ٹھاک برات لے کر جائیں گے۔“

”ٹھیک ٹھاک برات کی ضرورت نہیں۔ بس میں  
 آپ اور بے بے چلیں۔ باقی انتظامات ماما مقبول خود کر  
 لیں گے۔“

”یار! تو تھوڑا انتظار کرے تو دیرم ہم خوی میں  
 کھاتے۔“

”مجھے خوی سے کیا لینا دینا۔ بس بابا کے نام پر گے  
 بے بنیاد اور گھٹیا الزام کو دھونا ہے۔ اور وہ انشا اللہ اب  
 ہو کر رہے گا۔ بس آپ میرا یہ کام کرویں کیونکہ اس

معاملے میں آپ کے سوا کوئی میرا ساتھ نہیں دے  
 سکتا۔“

”سمجھو ہو گیا اور بھلا بے کیوں نہیں مانیں گی۔  
 بہت پیار کرتی ہیں تم سے۔“ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

”چلو چلتے ہیں۔“  
 ”آپ چلیں افتخار بھائی۔ میں آپ کے ساتھ گیا تو  
 لبا چکر ہو جائے گا اور آج سلیم سے میں جلدی آنے کو  
 کہہ گیا تھا کیونکہ اسے چھٹی لے کر گھر جانا ہے۔“

”چلو ٹھیک ہے۔۔۔ میں جا کر بے سے بات  
 کرتا ہوں۔۔۔“ اس نے قریب سے گزرتی اپنے  
 روٹ کی ویلن کو ہاتھ دے کر روکا۔

”آج ہی بات کیجئے گا افتخار بھائی! کیونکہ وقت بہت  
 کم ہے اور ابھی بہت سے کام نمٹانے ہیں۔“ اس نے  
 پھر سے تاکید کی۔

”اتنی جلدی کس بات کی۔ کون سی گاڑی چڑھنا  
 ہے تم نے۔۔۔“ افتخار نے ویلن میں سوار ہوتے  
 ہوئے پوچھا۔

”وقت کا کیا پتا کہاں کا ٹکٹ تھما دے۔“ اس نے  
 ہنستے ہوئے جواب دیا تھا۔ جواباً افتخار نے ہاتھ ہایا۔

ویلن کا دروازہ بند ہوا اور وہ زن سے نکل گئی۔ زین  
 مسکرا کر پلٹا ایک مطمئن سی سانس بھر کر اس نے  
 پھولوں کی خوشبو کو اپنے اندر اتارا اور پاس سے گزرتے  
 لڑکے کے ہاتھ میں کلیوں کے گجرے دیکھ کر اس کے  
 لبوں پر بکھری مسکراہٹ کچھ اور گہری ہوئی۔

(تمہارے لبوں کی وہ طنزیہ مسکراہٹ۔ اسے  
 بہت بھری مسکان میں نہ بدلا تو میرا نام بھی زین  
 العابدین نہیں۔)

اس کا دل چاہا وہ گجرے خریدے۔ پھر ہنس دیا۔  
 ”کیا اپنی کالانی میں پننے کا حلق۔۔۔“

عجیب سرخوشی کا احساس تھا۔ جو اس کے دل کو گھر  
 رہا تھا۔ ایک سکون، ایک طمانیت کا احساس۔ اس کے  
 آگے ایک گول مٹول سا بچہ تقریباً ”لڑھکتا جا رہا تھا۔“

”یہ شام اور تیرا نام“ کی دھن سنٹی پر بجاتے ہوئے  
 وہ مگن سا چلا جا رہا تھا۔ اسے یقین تھا۔ اب زیادہ دن

نہیں لگیں گے جب وہ اپنے لوگوں کے درمیان ہو گا۔  
 اپنے اصل نام اور شناخت کے ساتھ۔

”مجھے لگتا ہے زندگی بالکل بدل جائے گی۔ پہلے  
 سے زیادہ خوبصورت اور زیادہ آزاد۔۔۔“

اس نے راستے میں آئے ننھے سے کنکر کو ٹھوکر  
 سے اڑاتے ہوئے مطمئن سے انداز میں سوچا تھا۔ اسی  
 بل فضا گولی کی آواز سے گونج اٹھی۔ ایک بل کے لیے  
 اسے لگا ایک گرم نوکیلی سلاخ ہے جو سینے میں دھنستی  
 چلی گئی۔ اس کے وجود کو جھٹکا لگا اور گویا ہفت آسمان  
 گھوم گئے اس کا ایک ہاتھ بے اختیار سینے کی طرف اٹھا

جہاں سے خون کا فوارہ چھوٹ گیا تھا۔ اس نے  
 سارے کے لیے دو سرا ہاتھ پر بٹھایا۔ مگر وہ غلا میں  
 معلق ہو کر رہ گیا تھا۔ زمین اس کے قدموں تلے ٹھسکتی  
 چلی گئی۔ اس نے خود کو پاتال میں گرتے ہوئے محسوس  
 کیا۔ اس کے ارد گرد شور تھا، چیخ و پکار، دوڑتے قدموں  
 کی آوازیں، بہت سے چہرے۔ اس کا سر بہت زور سے  
 زمین سے ٹکرایا۔ اس نے آنکھوں کے سامنے چھاتی  
 دھند کی اوٹ سے کسی بہت اپنے اور آشنا چہرے کو  
 دھندلے کی کوشش کی مگر ہر چہرہ اجنبی تھا۔ ہر آواز  
 نا آشنا۔

”وقت اپنی چال چل گیا۔ تو کیا میں بار گیا۔۔۔؟“  
 ایک زخمی سی سوچ اس کے شعور و احساس میں چکرا  
 رہی تھی۔

دھند گہری۔۔۔ کچھ اور گہری ہو گئی۔  
 اسی دھند کے درمیان کچھ چہرے ابھرے تھے۔  
 کچھ آشنا اور بہت ہی اپنے چہرے۔

وہ انہیں پہچان سکتا تھا اور پکارنا چاہتا تھا مگر وہ  
 سارے چہرے ایک نیلی دھند کی اوٹ میں غائب  
 ہوتے گئے۔ بس کچھ آوازیں تھیں جو اس کے زخمی  
 وجود کو اپنے حصار میں لے رہی تھیں۔ ہاں۔۔۔ وہ بابا کی  
 آواز تھی جو دونوں بائیں پھیلائے اسے اپنے پاس بلا  
 رہی تھی۔

”زین العابدین! میرے پاس آؤ۔۔۔“ وہ جانا چاہتا

نہیں لگیں گے جب وہ اپنے لوگوں کے درمیان ہو گا۔  
 اپنے اصل نام اور شناخت کے ساتھ۔

”مجھے لگتا ہے زندگی بالکل بدل جائے گی۔ پہلے  
 سے زیادہ خوبصورت اور زیادہ آزاد۔۔۔“

اس نے راستے میں آئے ننھے سے کنکر کو ٹھوکر  
 سے اڑاتے ہوئے مطمئن سے انداز میں سوچا تھا۔ اسی  
 بل فضا گولی کی آواز سے گونج اٹھی۔ ایک بل کے لیے  
 اسے لگا ایک گرم نوکیلی سلاخ ہے جو سینے میں دھنستی  
 چلی گئی۔ اس کے وجود کو جھٹکا لگا اور گویا ہفت آسمان  
 گھوم گئے اس کا ایک ہاتھ بے اختیار سینے کی طرف اٹھا

جہاں سے خون کا فوارہ چھوٹ گیا تھا۔ اس نے  
 سارے کے لیے دو سرا ہاتھ پر بٹھایا۔ مگر وہ غلا میں  
 معلق ہو کر رہ گیا تھا۔ زمین اس کے قدموں تلے ٹھسکتی  
 چلی گئی۔ اس نے خود کو پاتال میں گرتے ہوئے محسوس  
 کیا۔ اس کے ارد گرد شور تھا، چیخ و پکار، دوڑتے قدموں  
 کی آوازیں، بہت سے چہرے۔ اس کا سر بہت زور سے  
 زمین سے ٹکرایا۔ اس نے آنکھوں کے سامنے چھاتی  
 دھند کی اوٹ سے کسی بہت اپنے اور آشنا چہرے کو  
 دھندلے کی کوشش کی مگر ہر چہرہ اجنبی تھا۔ ہر آواز  
 نا آشنا۔

”وقت اپنی چال چل گیا۔ تو کیا میں بار گیا۔۔۔؟“  
 ایک زخمی سی سوچ اس کے شعور و احساس میں چکرا  
 رہی تھی۔

دھند گہری۔۔۔ کچھ اور گہری ہو گئی۔  
 اسی دھند کے درمیان کچھ چہرے ابھرے تھے۔  
 کچھ آشنا اور بہت ہی اپنے چہرے۔

وہ انہیں پہچان سکتا تھا اور پکارنا چاہتا تھا مگر وہ  
 سارے چہرے ایک نیلی دھند کی اوٹ میں غائب  
 ہوتے گئے۔ بس کچھ آوازیں تھیں جو اس کے زخمی  
 وجود کو اپنے حصار میں لے رہی تھیں۔ ہاں۔۔۔ وہ بابا کی  
 آواز تھی جو دونوں بائیں پھیلائے اسے اپنے پاس بلا  
 رہی تھی۔

”زین العابدین! میرے پاس آؤ۔۔۔“ وہ جانا چاہتا

تب ہی ایک سسکتی ہوئی آواز نے پہلی آواز کا گلا  
 گھونٹ دیا۔

”تمہیں نہیں بتا زین! تم میرے لیے کیا ہو۔ جہشید  
 کا دو سرا جنم، تمہیں اگر خراش بھی آئی تو میں مرجاؤں  
 گی۔“

ایک گراہ اس کے لبوں سے نئی۔ تو ایک اور آواز  
 نے اسے سنبھال لیا۔

”میں تمہارے سارے نخرے اٹھانے کو تیار ہوں  
 زین العابدین۔۔۔“

اس کی آنکھوں نے جلتے زخم سے بھل بھل نکلتے ہو  
 کو روکنے کی کوشش کی۔

”تجھے تو بھائی کہا ہے میں نے۔۔۔ تم دیکھنا ٹھیک  
 ٹھاک برات لے کر جائیں گے۔“

اس نے سر کو دائیں بائیں پھیر کر گہری ہوتی دھند کو  
 ہٹانے کی کوشش کی۔ مگر اس کے گرد اجنبی آوازوں کا  
 جھوم بڑھتا جا رہا تھا۔ پھر دور سے کسی اتھاہ گہرائی سے  
 ایک شکوہ کرتی آواز کو اس نے دھم سنا۔

”تم سب ایک جیسے ہو۔۔۔ بند کھڑکیاں کھولتے ہو  
 اور جب دروازے کھل جائیں تو وہاں بس دستک چھوڑ  
 جاتے ہو۔“

اس نے آخری بار چننا چاہا۔ مگر ایک سرد خاموشی  
 اس کے لبوں پر آگری۔ ایک عجیب سی بے بسی اور بند  
 ہوئی حیرت آنکھوں میں منجمد ہو گئی۔ جو سوال کرتی  
 تھی۔

”کیا یہ وقت کا انصاف ہے۔۔۔“

اندھیرے میں گم ہوتی شام۔ اس خوبرو نوجوان کو  
 اپنی دھن میں مگن لگتا تے اور پھر گولی کھا کر گرتے  
 دیکھ پاس سے گزرتے دوڑتے بھاگتے لوگوں کی بے  
 حسی پر گڑھی اس کی بند ہوئی آنکھوں کا سوال ہے حد  
 افسردگی اور بے چارگی سے پڑھا اور پھر ان ہی آنکھوں  
 میں بجھ گئی۔

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)



وہی شام نین تارہ کے آنگن میں بھی اتری تھی۔  
اس شام کارنگ بست مختلف اور عجیب تھا۔  
ہوا رکی رکی، فضا ساکت، ساری کائنات چپ گم  
صم صم....

کیا یہ اندسے واپسی کا راستہ بھول گئے ہیں۔  
شام کی گود پروں کی پھر پھر ہٹ سے خالی کیوں  
ہے؟

اور شام کارنگ۔ بے حد زرد۔ یہ زرد و شام گھر  
کے آنگن دیواروں، چھتوں، گولوں کے کھیتوں اور  
درختوں سے لپٹی ہے حد افسردہ اور خاموش لگ رہی  
تھی۔

نین تارہ کے آگ جلاتے ہاتھ رک سے گئے۔  
اس نے جلتی ہوئی تیلی کو چولہے میں جھونکا اور پلٹ کر  
اسماء کو دیکھنے لگی۔ وہ نکلے پر محمد علی کو نہلا رہی تھی۔  
گرمی بے حد تھی۔ وہ پانی کی دھار میں ہاتھ مار مار کر  
خوش ہو رہا تھا۔ نین تارہ نے ہنڈیا میں ڈوٹی کھائی۔ پھر  
ڈھکن سے ڈھانپ کر اسماء کے پاس آگئی۔

”آپا! حویلی چلیں۔“ بس اچانک ہی اس کا دل چاہا  
تھا۔ اسماء نے حیرت سے اسے دیکھا۔  
زارا تو وہاں نہیں ہے۔“

”مجھے تو ان کی امی سے ملنا ہے۔“ وہ آہستگی سے  
گویا ہوئی۔ اور مامے مقبول کو دیکھنے لگی۔ وہ کندھے پر  
چادر ڈالے اندر آیا تھا۔ اسے دیکھ کر مسکرایا۔ اب وہ  
بونہی خوش اور مگن سا دکھائی دیا کرتا تھا پھر چارہ بکریوں  
کو ڈالنے لگا۔

”ان سے کیوں ملنا ہے؟“ اسماء کو پھر حیرت ہوئی  
تھی۔

”میرا دل چاہ رہا ہے۔“ وہ سادگی سے بولی۔  
”مگر اس وقت تو شام ہو رہی ہے۔ ابھی تو ہانڈی  
روٹی بھی کرنی ہے۔ پھر کسی دن ملکہ صبح چلیں گے۔“

”اچھا۔“ نین تارہ خاموش ہو گئی۔  
”مگر ان کے ارادے ہیں؟“ ماما مقبول ہاتھ  
بھاڑتا نکلے کی طرف آیا۔ اسماء نے محمد علی کو پیچھے کیا  
اور نکلے کے پیچھے لگی۔

”تارہ کا دل حویلی جانے کو چاہ رہا تھا۔“  
مامے مقبول نے ہاتھ دھوتے ہوئے سر اٹھا کر نین  
تارہ کو دیکھا اور ہنس دیا۔

”ہاں ہاں۔“ تو علی جاؤ نا۔“  
”آپا! مجھے تو ابھی روٹی پکانی ہے۔“ اسماء نے عذر  
پیش کیا۔

”اچھا۔“ مامے مقبول نے کندھے پر رکھے  
صاف سے ہاتھ صاف کیے۔ ”چل پھر میں چھوڑ آتا  
ہوں۔“

”یہ ٹھیک ہے۔ تم ابے کے ساتھ چلی جاؤ۔“ اسماء  
نے کہا تو نین تارہ نے اثبات میں سر ہلا کر دپٹہ ٹھیک  
طرح سے اوڑھ لیا۔ اور مامے مقبول کے ساتھ باہر  
نکل آئی۔

”ماما! یہ شام کتنی عجیب سی ہے۔ ہر چیز زرد رنگ  
میں نہا گئی ہے جیسے آسمان سے بیلا زرد رنگ برس رہا  
ہو۔“ نگلی میں اپنے ہی قدموں کی چاپ سے گھبرا کر وہ  
بول رہی تھی۔

”گرمی میں ایسا ہو جاتا ہے۔“  
”خاموشی کتنی زیادہ ہے۔“ نین تارہ نے چاپے  
خوشی کی خالی چارپائی کو دیکھا۔

”ہاں۔ شاید اندھی آئے گی۔ اس سے پہلے ہوا  
رک جائے تو ایسی ہی خاموشی محسوس ہوتی ہے۔“  
مامے مقبول نے پچھم کی طرف گرد گرد آسمان کو دیکھا۔  
”ہاں شاید میں وہاں زیادہ دیر نہیں رکوں گی۔ وہ زارا  
سے ناں اس کی امی بہت اچھی خاتون ہیں۔ بہت اچھی  
باتیں کرتی ہیں بس ان ہی سے ملنے کو دل چاہ رہا تھا۔ ان  
کی عدت ختم ہو گئی ہے۔ اب تو وہ شرمیلی جائیں گی۔  
میں ان سے ملنا چاہتی تھی۔“

”ہاں۔“ ہاں کیوں نہیں۔ چلی آیا کر تو حویلی۔ ان  
سے اچھی اچھی باتیں کیا کر۔ ذرا ان کے طور طریقے  
اچھی طرح دیکھا اور سمجھا کر۔“ وہ منجائے کیوں ہنس رہا  
تھا۔ نین تارہ نے قدرے حیرت سے اسے دیکھا پھر  
سر جھٹک کر کہنے لگی۔

”میں نے کیا کرنا ہے ان کے طریقے سمجھ کے۔“  
”ہاں۔“ ہاں کیوں نہیں۔ چلی آیا کر تو حویلی۔ ان  
سے اچھی اچھی باتیں کیا کر۔ ذرا ان کے طور طریقے  
اچھی طرح دیکھا اور سمجھا کر۔“ وہ منجائے کیوں ہنس رہا  
تھا۔ نین تارہ نے قدرے حیرت سے اسے دیکھا پھر  
سر جھٹک کر کہنے لگی۔

”میں نے کیا کرنا ہے ان کے طریقے سمجھ کے۔“

”کیسے ہو تیا؟“ وہ لیٹا ہوا تھا اٹھ کر بیٹھ گیا۔  
”اللہ کا کرہ ہے۔ تو سن۔“  
”بس بھی ٹھیک ہوں۔“  
”یہ مٹی بشیر علی نہیں نظر آیا صبح سے۔ کہیں گیا  
ہے؟“ مامے مقبول نے پوچھا۔  
”ہاں۔ اس کی بیٹی ہے ناں جس کا بیاہ چک جھرو  
میں ہوا ہے۔“

”کیا پتا رب سوچنے نے تیری قسمت کسی حویلی  
والے سے جوڑ لی ہو۔“ مامے مقبول نے بے حد پیار  
سے اس کا سنجیدہ سا چہرہ دیکھا۔  
”بچوں جیسے خواب دیکھتے ہو ماما تم بھی۔“ وہ بھینکی  
کی ہنسی ہنس دی۔

”خواب کیوں؟“ مامے نے غصے سے اسے دیکھا۔  
”میری ماں تھے اپنی رانی بیٹی کہتی تھی۔“  
”ساری باتیں کتنی ہیں ماما پر اس کے کہنے سے میں  
الٹی باتیں بن گئی۔“

”تو تو سکتی ہے۔ اللہ چاہے تو تو بھی کسی حویلی میں  
الین کر راج کر سکتی ہے۔“  
”کچھ مامے مقبول کے دل و دماغ میں تھا، نین  
تارہ کے ہاں کتنی تھی تب ہی پڑی۔  
”ماما! وہ شہر والے کے آنے کی امید ٹوٹ گئی  
تھی۔ اب حویلی کے خواب دیکھنے لگے ہو۔“ اس کا  
پہلے ہی کہتی تھی۔ ست دیکھو ایسے خواب وہ  
اب نہیں آنے والا۔“

”اے کا نین تارہ! ضرور آئے گا۔“ ماما مقبول  
نے نین تارہ کے لیے میں بولا۔ ایک تلخ سی مسکراہٹ  
ان کے لبوں کا احاطہ کر لیا۔ وہ زیر لب منجائے  
بولی تھی۔ جب کہ مقبول خاموش ہو کر کچھ  
دیر سوچ رہی تھی۔

”تو تو کمرے سے ہی نہیں نکلتی حالانکہ ان کی  
عدت بھی ختم ہو گئی ہے، تم اندر چلی جاؤ۔ کیا پتا اسی  
طرح ان کا دل بدل جائے۔“  
”چھما اسے دروازے پر چھوڑ کر چلی گئی۔ نین  
تارہ نے دستک دی۔  
”اندرا آجائے۔“ بیزار سی آواز ابھری تھی۔ وہ  
آہستگی سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئی، بیروں  
سے دیوار قابض آگیا تھا۔ اس نے گھبرا کر نیچے دیکھا پھر  
جوتے اتار دیے باہر شام ہونے کی بنا پر کمرے میں  
تار کی ہو رہی تھی۔  
”کون ہے؟“

”میں۔“ میں نین تارہ۔“ وہ ایک بل کو گریز دیا  
حتیٰ۔ آئندہ نے کرو سنبھلی پھر اٹھ کر بیٹھ گئیں۔  
”تم۔“ آؤ نین تارہ۔“ وہ پھوٹے چھوٹے قدم

”میں۔“ میں نین تارہ۔“ وہ ایک بل کو گریز دیا  
حتیٰ۔ آئندہ نے کرو سنبھلی پھر اٹھ کر بیٹھ گئیں۔  
”تم۔“ آؤ نین تارہ۔“ وہ پھوٹے چھوٹے قدم

”میں۔“ میں نین تارہ۔“ وہ ایک بل کو گریز دیا  
حتیٰ۔ آئندہ نے کرو سنبھلی پھر اٹھ کر بیٹھ گئیں۔  
”تم۔“ آؤ نین تارہ۔“ وہ پھوٹے چھوٹے قدم

”میں۔“ میں نین تارہ۔“ وہ ایک بل کو گریز دیا  
حتیٰ۔ آئندہ نے کرو سنبھلی پھر اٹھ کر بیٹھ گئیں۔  
”تم۔“ آؤ نین تارہ۔“ وہ پھوٹے چھوٹے قدم



انٹھائی بیڑے کے قریب آگئی۔  
”السلام علیکم۔“

”خوش رہو۔“ انہوں نے سلام کا جواب دینے کے ساتھ دعا دی۔

”آپ اتنے اندھیرے میں کیوں بیٹھی ہیں۔“  
نمین مارہ کو پہلی بار میں ہی اس عورت سے اپنائیت کا احساس ہوا تھا۔

آئندہ خاموش ہی رہیں۔  
”کھڑکی کھول دوں گا اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔“  
”کھول دیجئے۔“ آئندہ نے آہستگی سے کہا تو اس نے آگے بڑھ کر کھڑکی کھول دی۔ روشنی کے ساتھ ساتھ تازہ ہوا بھی اندر آئی تھی۔ وہ پلیٹ کراٹھیں دیکھنے لگی۔  
”بیٹھو۔“ انہوں نے بیڑے کی تنی سمت اشارہ کیا۔ وہ کنارے پر ٹپک گئی۔

”تم اس دن کے بعد آئی ہی نہیں۔“  
”میں سوچتی تو تھی مگر۔“ وہ اپنا جملہ بھول کر لڑکائی کا متورم چہرہ اور سرخ آنکھیں دیکھنے لگی۔  
”آپ۔۔۔“ پھر وہ ایک دم خاموش ہوئی۔ بھلا وہ کون ہوتی تھی پوچھنے والی۔  
آئندہ محض سا مسکرا میں۔  
”آج کوئی یاد آ رہا ہے۔“

”کون؟“ اس نے بے ساختہ پوچھا۔ زار ایاو آدھی تھیں۔  
”نہیں، میرا بھتیجا ہے زین، میرے مرحوم بھائی کی اکلوتی نشانی۔“

”زین۔“ نمین مارہ نے سراٹھا کر انہیں دیکھا۔  
زین ہنس کر اس کی سمت چلا گیا تھا پھر وہ مسکرا دی۔  
”کہاں جو ملی کا سپوت اور کہاں ہو۔“

”بہت دنوں سے دل بھل رہا ہے اسے دیکھنے اور پیار کرنے کو اور آج تو۔“ انہوں نے سینہ مسلاتے ہوئے اک لمبی سانس کھینچی۔ پھر جھنجھلا کر بولیں۔  
”ایک تو بھون بھی خراب پڑا ہے۔“  
”نہیں، وہ تو خوشی سے ان کی بے چینی دیکھتی رہی۔“  
”اچھا چھوڑو۔ تم سناؤ کیا کرتی ہو اب۔“

”اس دن جو آپ نے باتیں کی تھیں۔“ اس نے اپنے ہاتھوں پر نظریں جماکر گستاخو کیل۔ ”بہت سوچا ہے میں نے ان کو۔“ آپ نے سچ کہا تھا۔ شاید یہ سب ہم سب کی آزمائش ہی تھا۔ آپ نے بالکل ٹھیک کہا تھا۔ مجھے اپنی صلاحیتوں کو آزمانا چاہیے۔

خدا نے مجھے صرف دکھ دینے کے لیے تو پیدا نہیں کیا ہو گا۔ زندگی کی خوشیوں میں تھوڑا سا حصہ میرا بھی تو ہو گا۔ اور میں کب تک دوسروں کے ہاتھوں کی طرف دیکھتی رہوں گی کہ کوئی بچی مجھی خوشی میری جھولی میں بھی ترس کھا کر ڈال دی جائے۔

”نہیں مارہ! تم کیوں دوسروں سے اس لگاؤ۔ تمہارا تو اپنا وجود دوسروں کے لیے خوشی بن جائے گا۔ بس ذرا سی بہت کرو۔ اپنے خدا پر بھروسہ کر قدم آگے بڑھاؤ۔ لوگوں سے مت ڈرو۔ تمہارا خدا تمہیں کس عظیم انعام سے نوازے گا۔“ وہ آہستگی سے اس کا ہچل بھٹکتا کر بولیں۔

”مجھے بڑا انعام نہیں چاہیے۔ میں تو بس سراٹھا کر عزت کے ساتھ جینا چاہتی ہوں۔“

”ایسا ضرور ہو گا۔“ وہ ایک دم بے چین سی ہو کر اس کا چہرہ دیکھنے لگیں۔ یہ سراٹھا کر جینے کی خواہش کا اظہار کسی اور نے بھی کیا تھا۔

وہ اٹھ کر دروازے تک نکلیں۔ نمین مارہ یونہی دونوں ہاتھ گود میں دھرے انہیں دیکھنے لگی۔ انہوں نے ایک دم دروازہ کھول کر کہا۔  
”تلی تلی۔“ وہ ہانکی آئی۔  
”سلیمان نہیں آیا شہر سے۔“ ان کے لیے میں عجیب سا اضطراب در آیا تھا۔

”نہیں تلی۔“  
”رفع ہو جاؤ۔“ وہ بری طرح جھنجھلا گئیں۔ ”فون بھی ٹھیک نہیں ہے۔“ انہوں نے پلٹنا چاہا پھر منہ جھٹک کر رک گئیں۔ لن کی نگاہیں آسمان پر جم کر مٹی تھیں۔

”نمین مارہ! آج شام کا رنگ کیسا ہے؟“ وہ اٹھ کر ان کے عقب میں آگئی۔

”ہاں۔“ بابا کہہ رہا تھا شاید آندھی آئے۔  
”آندھی سستہ انہوں نے زیر لب دہرایا۔ پھر بیٹھیں۔  
”میں اسے دیکھتی رہیں پھر آہستگی سے اس کا گلہ کر رہی ہیں۔“

”تم بہت چار دیواری ہو نمین مارہ! میں تمہارے لیے ہر کچھ کر دوں گی۔“ انہوں نے ایک دم سینے پر ہاتھ رکھا۔  
”کر دو گی لیوں سے نکلی تھی۔“

”ایا ہوا؟“ آپ ٹھیک تو ہیں۔“ نمین مارہ نے پریشانی سے پوچھا۔ وہ واقعی انہیں ٹھیک نہیں لگی تھیں۔  
آئندہ محض سا مسکرائیں۔

”میں ٹھیک ہوں بیٹی! یونہی دل ڈوب سا گیا تھا۔ آندھی آنے والی ہے اور مجھی۔“ یہ اپنے ساتھ بہت بھراؤ لے جاتی ہے تم اب کھر جاؤ آندھی آنے سے پہلے تمہیں کھر بیچ جانا چاہیے پھر کسی دن آنا“  
”خبردار سے بات کریں گے۔ آج دل کچھ قابو میں نہیں ہے۔“

نمین مارہ نے اثبات میں سر ہلایا۔ اپنے چہل پہل پنہ۔  
”اپنا خیال رکھیے گا۔“

”نہاٹے کیوں اب وہ قصدا“ بھی مسکراتی تھی۔  
اسے دیکھ کر مارہ قبول اٹھ کر قریب آیا۔  
”اتنی جلدی آگئیں۔“  
”ہاں۔ ان کی کچھ طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔“

♥ ♥ ♥ ♥  
وہی شام رائے ہاؤس کے وسیع لان میں کھلے۔ رنگ رنگ پھولوں، سرسبز پلوں، خارے کے موتی اٹاتے پانیوں میں بھی اتڑی تھی۔ جب رضوان نے زار اکو لان میں بیٹھ دیکھا۔ موبائل اس کے ہاتھ میں تھا اور چہرے پر مسرت کی پرچھاٹھیں۔  
رضوان اس کے قریب آگیا۔  
وہ تب بھی بے دھیان رہی۔

رضوان کچھ لمحے اسے دیکھا رہا پھر اس نے ذرا سا جھٹک کر کیچین سے نیکل بھائی۔ زار اچو تک کراس کی طرف متوجہ ہوئی۔ اس کے چہرے پر چھائی سنجیدگی میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔ اس دن نگاہوں سے آنے ہوئے

لچ کا پروگرام بنانے کے بعد وہ دوسری گھر نہیں آیا تھا۔ زار اٹھ کر رہی تھی، بلکہ اگلے دن بھی اس کے پاس اتنا وقت نہ تھا کہ وہ اس سلسلے میں زار اسے کوئی معذرت ہی کر لیتا۔ یا شاید وہ شعوری طور پر اسے نظر انداز کر رہا تھا۔

”کیا سوچا جا رہا ہے۔“ وہی مخصوص اپنائیت بھرا دوستانہ لہجہ وہ ایک طویل سانس لے کر دہرائی۔ پھر نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔  
”کچھ خاص نہیں۔“

”میں نہیں مانگا۔“ وہ پریقین لہجے میں بولا۔ زار اسے نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔  
”آپ کو کہیں جانا ہے؟“

”ابھی تو آیا ہوں باب۔“ ہاں اگر تمہارا موڈ ہو تو۔“  
وہ دونوں ہاتھ کرسی کی بیک پر جاتے ہوئے پوچھنے لگی۔  
”نہیں رضوان! اگر تھوڑا وقت ہے تو مجھے آپ سے کچھ ضروری باتیں ڈسکس کرنا ہے۔“ اس کا لہجہ ہنوز سنجیدہ تھا۔

رضوان کے چہرے پر بھی سنجیدگی چھا گئی۔ شاید اسے اندازہ تھا۔ زار اس سے کیا بات ڈسکس کرنا چاہتی ہے۔ اس نے موبائل اور کیچین نیکل پر رکھی اور اس کے سامنے بیٹھ گیا۔  
”کنوے۔“

زار اچھ لمحے اسے دیکھتی رہی مگر موزوں الفاظ منتخب کر رہی ہو۔ رضوان کی سوالیہ نظریں اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

”رضوان! میں آپ کی فیلنگز سمجھتی ہوں۔“  
”میرے لیے خوشی کی بات ہے۔“ وہ مسکرایا۔  
”لیکن آپ میری اور ممما کی فیلنگز نہیں سمجھ پا رہے۔“ رضوان نے اٹھ کر اسے دیکھا۔

”فرض کریں اگر سلیمان بھائی۔ جنہوں نے آپ کو باپ بن کر پالا ہے۔ اگر سلیمان بھائی سے کوئی بھیا تک غلطی ہو جائے تو آپ ان سے نفرت کر پائیں گے۔ یا شہر آؤ کچھ ایسا کرے تو کیا میں اس سے نفرت کر پاؤں گی؟“



"تم کتنا چاہتی ہو؟" اس نے جواباً "سوال کیا۔  
 زارا نے اک طویل سانس لے کر پشیم سے  
 نکالی اور نظروں کا زلوع بدل کر کھلے پھولوں کو دیکھنے  
 لگی۔  
 "آئندہ عمو جمشید سے نفرت نہیں کر سکتیں۔  
 اور نہ ہی زارا زین العابدین سے۔" اس کا لہجہ مدھم سا  
 تھا۔  
 "اور مرے والے سے تمہارا کوئی رشتہ نہیں تھا؟"  
 رضوان کا لہجہ چمکتا ہوا تھا۔  
 "کیوں نہیں تھا۔ بالکل تھا بلکہ ہے۔ اور آپ  
 کے حوالے سے یہ رشتہ کچھ اور مضبوط ہو گیا ہے لیکن  
 جو کچھ بھی ہوا اس میں زین العابدین کا کیا قصور؟ تو  
 سال بھر کا بچہ تھا رضوان۔"  
 "زارا! کیا ہم اس ناپک کو چھوڑ نہیں سکتے۔" وہ  
 بے زار سا ہو گیا۔  
 "نہیں۔" زارا کا لہجہ قطعی تھا۔ "یہ ناپک تو  
 شہر کی اب ہوا ہے اب جب کہ جمشید ہاموں بھی  
 نہیں رہے۔"  
 رضوان نے چونک کر اسے دیکھا یہ خبر تھی "اس  
 کے لیے نئی نئی۔ زارا ایک بل کو خاموش ہوئی تھی۔  
 "رضوان! آپ نے کیا تھا ہمارے رشتے کا سب  
 سے خوب صورت پہلو اعتبار ہے۔ اسی کو سامنے رکھ کر  
 آج آپ کو سب کچھ بتاؤں گی۔ کچھ ایسے حقائق جو  
 آپ کو ہمیں معلوم کچھ ایسی باتیں جن سے آپ کو  
 لاعلم رکھا گیا۔ کیونکہ آج زارا کو آپ کی پوری  
 سہولت کی ضرورت ہے۔ کیونکہ متقابل رائے  
 سلیمان ہیں جن کے ساتھ میرے کئی رشتے تھے ہیں۔  
 اور میں ان رشتوں میں درازیں نہیں ڈالنا چاہتی۔"  
 "تم کتنا چاہتی ہو؟" رضوان اچھے کیا۔  
 "میں جو کتنا چاہتی ہوں اس امید پر کہ رہی ہوں  
 کہ آپ سچ کا ساتھ دیں گے۔" اس نے ٹوٹتی نظروں  
 سے رضوان کو دیکھا۔  
 "کیا چاہتا ہے؟"  
 اور اس سے کچھ نہیں چھپایا۔ سب کچھ

بتایا تھا جو اسے معلوم تھا۔ اور رضوان رائے سلیمان  
 نہیں تھا کہ اپنے تاثرات چھپا سکتا۔ جو کچھ وہ سوچ رہا  
 تھا یا محسوس کر رہا تھا۔ زارا اس کے چہرے پر حرف  
 حرف پڑھ رہی تھی۔  
 "میرے لیے کچھ بھی معلوم کرنا ممکن نہیں ہے۔  
 جو پلی کا کوئی بھی پرانا ملازم یا مائی جان ہی مگر سلیمان  
 بھائی۔ وہ لیا گیا ہے کہ رہے ہیں؟"  
 رضوان لب بلبھیے خاموش رہا۔  
 "اگر یہ میری کوئی اسائنمنٹ ہوتی تو شاید میں آپ  
 کو اس میں شامل نہ کرتی۔ مگر اب یہ یوں بھی ضروری  
 ہے کہ یہ ہمارا خاندانی معاملہ ہے۔ اب فیصلہ آپ کو  
 کرنا ہے کہ آپ ہمارا ساتھ کس حد تک دے سکتے  
 ہیں۔"  
 "ہمارا؟" رضوان کا انداز استعجابیہ تھا۔  
 "آف کورس۔ میرا اور زین العابدین کا۔"  
 تب ہی اس کا موبائل جاگ اٹھا۔ زارا نے ایک  
 نظر رضوان کے منجید چہرے پر ڈالی۔  
 "ہیں۔"  
 "ہاں۔ میں بس نکل ہی رہی تھی۔ نہیں پورا ہو چکا  
 ہے۔ میں بس آ رہی ہوں۔" اس نے موبائل آف  
 کر کے رضوان کو دیکھا پھر اپنا بیگ اٹھاتے ہوئے بولی  
 تھی۔  
 "مجھے عالیہ کے میگزین کے لیے ایک آرٹیکل  
 دینے جانا ہے۔ تب ٹھٹھے دل و دل سے غور کریں  
 رضوان! پھر بتائیں کہ آپ ہماری کہاں تک مدد کر سکتے  
 ہیں۔"  
 وہ شاید پہلے ہی جانے کو تیار تھی۔ رضوان نے کوئی  
 جواب نہیں دیا۔ بس پونہ بی خیالی میں انہماک میں رہ  
 پڑا تھا۔ جب تک زارا نے گاڑی نکلی۔ وہ اسی زلوع سے  
 پرہیز رہا تھا۔  
 زارا کا ذہن گاڑی کی رفتار کے ساتھ اپنے اگلے  
 لائحہ عمل کو سوچ رہا تھا۔ سلیمان کے دیے گئے اسے  
 خالص مایوس کیا تھا اور کبھی کبھی تو اس کا ذہن ان کی بات  
 بار و بار لگتا۔

"سارے اختیارات اور جاگیر ان ہی کے ہاتھ تو  
 ال۔ سب فائدہ صرف اور صرف اسی شخص کو حاصل  
 ہوا۔"  
 اس نے رضوان سے اس امکان پر بات نہیں کی۔  
 وہ جانتی تھی رضوان بھڑک اٹھے۔ سلیمان اور  
 رضوان کی محبت باپ بیٹے جیسی تھی۔ اور جب تک  
 کوئی۔ حتمی بات اور ٹھوس حقائق اس کے ہاتھ نہ  
 لگتے۔ وہ خود بھی سلیمان کے خلاف کوئی فیصلہ صادر  
 نہیں کرنا چاہتی تھی۔  
 "تو رائے سلیمان! زارا عمو کے لیے ایک چیلنج  
 ہے۔" اسے گاڑی کی رفتار آہستہ رکھنا پڑی۔ سڑک  
 کے کنارے بے حد ہجوم تھا۔  
 "کیا ہوا بھائی؟" اس نے گاڑی روک کر شیشہ نیچے  
 کھسکاتے ہوئے ایک شخص سے پوچھا۔  
 "معلوم نہیں۔ شاید کوئی حادثہ ہوا ہے۔" وہ ابھی  
 ابھی آیا تھا۔  
 "ہر روز کوئی نہ کوئی ہنگامہ۔ کوئی نہ کوئی حادثہ یہ تو  
 معمول بن چکا ہے۔"  
 اس نے کوفت دل مگر فحش سے مڑتے ہوئے گاڑی  
 بیک کی اور دوسری سڑک سے نکل گئی۔  
 اسے کیا معلوم تھا آج اس سے چند قدموں کے  
 فاصلے پر حادثے کا شکار ہوئے ہوالا شخص کون تھا۔  
 ♥ ♥ ♥ ♥  
 رضوان ڈاکٹر شمش سے ملنے ہسپتال آیا تھا۔ زارا  
 سے بات کرنے کے بعد وہ بے حد مضرب ہو کر گھر سے  
 نکلا تھا۔ پونہ سڑکوں پر گاڑی بھاگتے ہوئے وہ ہسپتال  
 کے سامنے سے گزرا تھا۔ تو خیال آیا ڈاکٹر شمش سے  
 مل لے۔ اسے اس دور کر کے بارے میں بات کرنا تھی  
 جس کا بازو شمش میں اگر بری طرح پکلا گیا تھا۔ اپنے  
 در کرنا اپنے خاندان کی طرح خیال رکھنا اس نے انکل  
 عمو سے سیکھا تھا۔  
 کارڈور میں اس نے شوک کر اس نوجوان کو  
 دیکھا جو ایک ڈاکٹر کا بازو پکڑے بیٹھ رہا تھا۔  
 "اسے کچھ ہو گیا تو ہم اس اسپتال کی اینٹ سے

اینٹ بھجوائیں گے۔"  
 اس کے آگے ہی اسٹریچر پر ایک زخمی نوجوان خون  
 میں لت پت رہا تھا۔ رضوان سرسری نگاہ ڈال کر گزر  
 چلا آگرا اس نے غصے میں آگ بکول ہوئے اس نوجوان  
 کو پہچان نہ لیا ہوتا۔  
 وہ اشعر تھا۔ بے حد ذہین اور مقرر مزاج لڑک۔  
 رائے عمو کی ٹیکسری میں بیٹنگ کے شیعہ کاپیٹن اور  
 یوں تو ٹیکسری میں کئی سپر انٹرنیشنل گے مگر اشعر کو یوں  
 خصوصیت حاصل تھی کہ اس نے اپنی تعلیم ملازمت  
 کے دوران کھیل کی تھی۔ اور اب وہ یونیورسٹی کا  
 اسٹوڈنٹ تھا اور سلیڈ شقٹ میں کلام کرتا تھا۔ رائے  
 عمو نے اسے بہت سی مراعات دے رکھی تھیں۔  
 خاص طور پر امتحانوں کے دنوں میں وہ بغیر تنخواہ کالے  
 چٹیاں دے دیا کرتے تھے۔ اسے اجازت تھی کہ وہ براہ  
 راست اپنے کسی بھی مسئلے کے لیے ان سے مل سکتا  
 تھا۔  
 "اسے ہی نوجوان اس ملک و قوم کا سرمایہ ہیں۔"  
 ایک بار رضوان کے سامنے انہوں نے اپنی رائے کا  
 اظہار کیا تھا۔ ان کی وفات کے بعد جب رضوان نے  
 ٹیکسری سنبھالی تو اس نے اشعر کی دمایوسی میں گھرے  
 اس نوجوان کو رائے عمو کی طرح حشر کیا تھا۔  
 "شعرب! رضوان نے قریب جا کر اس کے  
 کندھے پر ہاتھ رکھا وہ فوراً "پلا" پھر اضطرابی انداز  
 میں اس کا ہاتھ دبوچ لیا۔  
 "سوس۔ یہ میرا یونیورسٹی فیلو ہے۔ یہ مر رہا  
 ہے اور یہ لوگ اسے دیکھ ہی نہیں رہے۔ کہتے ہیں  
 پہلے پولیس میں رپورٹ درج کرو۔ سرمایہ مرجائے گا  
 تب تک اتنی بے تحاشی۔ اتنی۔"  
 "شعرب! رضوان نے اس کا ہاتھ تسلی آمیز  
 انداز میں دبا دیا پھر ڈاکٹر کی طرف متوجہ ہوا۔  
 "کیا مسئلہ ہے ڈاکٹر۔"  
 "کیا مسئلہ ہونا ہے مسئلہ تو یہ سنس ہے ہمارا۔ بعد  
 میں پولیس آجائے گی ہمیں جگ کرنے ک۔" ڈاکٹر  
 جھنجھلا کر بولا۔

UrduPhoto.com  
 UrduPhoto.com  
 UrduPhoto.com



اسے گاہ "اشعر خراج" تھا "اس کی حالت بگڑ رہی ہے۔"

رضوان نے نظروں کا زائید بدل کر خون میں ڈوبے نوجوان کو دیکھا۔ کھڑی تاک، کشادہ چہرہ، اس کے لفظ ٹیپ میں بڑی جانتیت اور مائوسیت تھی۔ وہ پلٹ کر ڈاکٹر شعی کے کمرے میں داخل ہو گیا۔ ڈاکٹر شعی اس کے ساتھ ہی باہر آئے تھے۔ وہ نوجوان پر جھک گئے۔ نبھانے اس کی سانس بھی چل رہی تھی یا نہیں۔ وہ بے حس و حرکت تھا۔

"اسے آپریشن جیسٹر میں منتقل کریں۔" ڈاکٹر شعی نے پلٹ کر نوجوان ڈاکٹر سے کہہ کر دوسرے پل دیں بھاگ دوڑنے لگی تھی۔

"ڈونٹ ڈری اشعرا! اللہ اسے کچھ نہیں ہو گا۔" رضوان نے اسے تسلی دی تو اس نے بے حد مایوسی سے سر اٹھا کر رضوان کو دیکھا۔

"تجربہ نہیں کر۔! میں جب وہاں پہنچا تو خاصی دیر ہو چکی تھی۔ خون بہت بہہ رہا تھا اور لوگ کھڑے تماشا دیکھ رہے تھے۔" اشعری پلکیں غم تھیں۔

"وہ تمہارا دوست ہے۔"

"نہیں۔ میں اسے افتخار بھائی کے حوالے سے جانتا تھا۔" اشعری ایک مہر جو تک گیا پھر تیزی سے بولا۔

"سرا آپ کچھ دیر یہاں رہیں گے۔ میں افتخار بھائی کو فون کر آؤں۔"

رضوان نے اثبات میں سر ہلایا۔ اشعری چلا گیا۔ وہ پلٹ کر آپریشن جیسٹر کی طرف دیکھنے لگا۔ نرس تیزی سے باہر نکلی۔

"آپ ہیں مریض کے ساتھ؟" رضوان نے اثبات میں سر ہلایا۔

"نجان کی اشد۔ ضرورت ہے اسے پوزیو۔"

رضوان کا اپنا گروپ یہی تھا اسے سوچنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ وہ یوں خون دے کر اٹکا تو وہاں خون دینے والے کی لڑکے جم ہو چکے تھے۔

"تھینک یو سرا! تھینک یو سوچی۔" اشعری نے بے

اختیار آگے بڑھ کر اس کے دونوں ہاتھ تھامے۔

"اس کی ضرورت نہیں اشعرا۔" رضوان ہنس سکی سے اس کا کندھا چھو چھایا۔ پھر جیب سے نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔

"اس پر سیر اگھر اور موبائل کا نمبر ہے۔ کسی بھی کی مدد کی ضرورت ہو مجھے کال کریں۔" اشعری اشعری کے ساتھ کھڑے شخص نے پکڑا۔ ایک سرسری سی نگاہ دوڑائی اور پتہ تک کر سر اٹھایا۔ اس نے بغور رضوان کو دیکھا اور کھٹی مونچھیں سنوارتے ہوئے بھرپور انداز میں مسکرایا۔

"آج تو کمال ہو گیا۔"

اس نے جاستے ہوئے رضوان کو دیکھا اور زیر لب بڑبڑایا۔

"افتخار بھائی! کوئی بچ جائے گا۔"

اشعری کا لہجہ ڈرا ہوا تھا۔ افتخار کے چہرے پر سنگین سنجیدگی بکھری تھی۔ اس نے ایک نظر ہاتھ میں پکڑے کارڈ پر ڈالی۔

"مگر اسے پہچانہ ہو تو آج راتے رضوان یہاں نہ آتے۔ تم دعا کر۔ میرا دل کہتا ہے اسے کچھ نہیں ہو گا۔"

"لیکن اسے کوئی کس نے باری؟ وہ تو بے حد بے ضرور نوجوان تھا اپنے کام سے کام رکھنے والا۔" اشعری اٹھ کر پوچھنے لگا۔ افتخار نے خاموشی سے کارڈ جیب میں ڈالا۔

"ذرا خیال رکھنا میں زارا کو فون کر آؤں۔"

"زارا! ہم اشعری نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

"جو نظم کی زارا! اشعری اس کی گزرتی ہے۔" افتخار نے بتلایا۔

"آپ چھالے۔" اشعری کے لیے یہ انکشاف ہی تھا۔

♥ ♥ ♥ ♥

وہ سب ہی لائونج میں موجود تھے۔ اور ایسا بہت غرض کے بعد ہوا تھا۔

"السلام علیکم۔" زارا اندر آئی تو سب ہی نے اٹھ کر جواب دیا تھا۔

"چھا! زارا! اقم بھی آئیں۔ میں کہہ رہی تھی۔" اس مہارک دن ہے جو دونوں بھائی اکٹھے کھڑے نظر آ رہے ہیں۔ "عالیہ رضوان اور سلیمان کو دیکھ کر زارا نے وہیں بیٹھتے ہوئے رضوان کو دیکھا۔ وہ کچھ سنجیدہ نظر آیا۔ جب کہ سلیمان خامے خوشگوار لہجے میں تھا۔

"کونڈر تک لوٹی زارا؟" عالیہ نے پوچھا تو اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

"تم کچھ پریشان ہو رضوان۔" رائے سلیمان نے ان سے پوچھ رہے تھے۔ ان کے لمبے میں پد راند نفقت تھی۔

رضوان نے ایک نظر زارا کو دیکھا اور قصداً مسکرایا۔

"بیس یونی ٹیکٹری میں کچھ پراپرٹیز چل رہی ہیں۔"

"تجربہ کار کہا ہے مجھے بتلایا کہ مگر تم تو۔" انہوں نے رضوان کے کندھے پر بازو پھیلایا۔

"ہاں۔ سلیمان بھائی کے پس ساگر پراپرٹیز کا حل ہے بشرطیکہ کسی کی پراپرٹیز حل کرنا چاہیں۔" زارا کا لہجہ باوجود کہ شش کے نارمل نہ تھا۔

سلیمان کا قہقہہ بے ساختہ تھا۔

"میں دو سڑوں کو بھی موقع دتا ہوں۔ تاکہ انہیں بھی اپنی صلاحیتوں کا علم ہو۔ اس کے بعد میری مدد کی باری بنتی ہے۔"

"آپ کا اندازہ غلط بھی ہو سکتا ہے ہو سکتا ہے۔"

روڑوں کو آپ کی مدد کی ضرورت ہی نہیں نہ آئے۔

"زارا! آپ رضوان نے بے اختیار اسے ٹوکا تھا۔

"بولتے ہو یا ر۔" سلیمان نے محفوظ ہوتے ہوئے رضوان کا کندھا چھو چھایا۔ "تھکا ہے مجھ سے۔ غبار نکل جائے گا۔"

زارا اب بھیج کر رہ گئی۔ جب کہ عالیہ نے بے حد حیرت سے دونوں کو دیکھا۔

"آپ دونوں میں کیا باراشی ہو گئی۔"

اس سے قبل کہ دونوں میں سے کوئی جواب دیتا۔

فون کی بیل گونج اٹھی 'رضوان نے ریسیور اٹھایا پھر ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔

"تھمارا فون ہے زارا۔"

زارا اٹھ کر قریب آئی اور اس کے ہاتھ سے ریسیور لے لیا۔

"فون زارا! پیکنگ۔"

"افتخار خیریت۔" دوسری طرف افتخار کی آواز سن کر اسے خاصی حیرت ہوئی تھی۔

"خیریت ہی تو میں سے زارا! لی۔"

"دیکھا ہوا افتخار؟" اس کا دل دھڑک سا گیا۔ نظریں بے اختیار رائے سلیمان کی طرف اٹھیں جو عالیہ کی کسی بات کا جواب دے رہے تھے۔

"زین کو کوئی مل گئی ہے۔"

"دیکھا۔" زارا کا دل ایک پل کو بالکل خاموش ہو کر دھڑکا تھا۔ سب ہی پلٹ کر اسے دیکھنے لگے۔

"وہ ٹھیک تو ہے افتخار؟" اس نے بے تابانہ پوچھا۔

"آپریشن جیسٹر میں ہے حالت خاصی نازک ہے۔"

ڈاکٹر زبیر برائید نہیں ہیں۔" افتخار نے کچھ بھی چھپانا مناسب نہیں سمجھا۔ ہسپتال اگر اسے یہی سب معلوم ہوا تھا۔

"میں آ رہی ہوں افتخار۔" اس نے فون اٹھا اور تیزی سے بلیک فون رائے سلیمان پر جم گئی تھیں۔

اور اس کی آنکھوں میں اتنی بیگانگی اور نفرت تھی کہ ایک پل کو رائے سلیمان بھی ششک گئے۔

"تو آپ نے وہی کیا۔" وہ ان کے سامنے کھڑی سلگتے ہوئے لمبے میں کہہ رہی تھی۔ "اور میں بیٹھ ماما کو جھٹلاتی رہی کہ آپ ایسا نہیں کریں گے۔"

سلیمان نے اٹھ کر اسے دیکھا۔ رضوان کھڑا ہو گیا۔

"دیکھا ہوا زارا؟"

اس نے زارا کا کندھا تھام کر اس کا سر اپنی طرف کیا۔ کوئی سنگین حادثہ پیش آیا تھا اس کا اور آگ سب ہی کو ہو رہا تھا۔

زارا نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا اور رائے سلیمان کی



زارا ایک سی جگہ مانند بیت ایستادہ تھی۔  
 "بچہ چائیں زارا۔" افتخار نے اس کے سامنے  
 آکر آہستگی سے کہا۔  
 زارا نے اس کی سمت دیکھا۔ افتخار کو ان آنکھوں  
 میں ایسی خوف سی خوف نظر آیا تھا۔  
 "افتخار رو پی جائے گا۔"

"وہا کریں۔" وہ کسی سی کہہ سکتا تھا۔ اور سہل تو  
 روای رداں خود دعا تھا۔  
 کوئی بے حد خاموشی سے اس کے قریب آگیا ہوا  
 تھا۔ زارا نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ اسے حیرت نہیں  
 ہوئی۔ وہ جانتی تھی رضوان آئے گا۔  
 رضوان زارا کے ساتھ کھڑے افتخار کو دیکھ کر  
 چونک گیا۔

"تم۔" اس کی آنکھوں میں الجھن سی تیر گئی۔  
 "جی میں۔"

"شعر تمہارے ساتھ ہی تھا۔" وہ اب بھی  
 کچھ سمجھ نہ پایا تھا۔

"جی۔ اب وہ گھر چلا گیا ہے۔" افتخار نے جواب  
 دیا۔

"تو وہ۔" رضوان نے بے اختیار پلٹ کر تہہ نشین  
 حیض کے بند دروازے کو دیکھا "تو وہ زین العابدین  
 تھا؟"

"جی ہاں وہی زین العابدین تھا۔" افتخار نے ہنس  
 سے جواب دیا۔ اور آصف کی طرف مڑ گیا۔ زارا نے  
 سوالیہ نظروں سے ہکا بکا رضوان کو دیکھا۔ اس نے  
 انگلیوں سے پیشانی مسلتے ہوئے لگی میں سر ہلایا۔ وہ  
 سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ابھی ابھی جس شخص کو خون  
 دے کر وہ گھر گیا ہے وہ کوئی اور نہیں زین العابدین تھا۔  
 تب ہی آریشن حیض پر جلتی سریشی بچھ گئی۔  
 دن سب کے دل و حرکت اچھول گئے۔  
 ڈاکٹر شمس باہر آئے تھے۔

وہ سب اپنی اپنی جگہ منجمد ہو کر رہ گئے۔ خوف ان  
 کے قدموں کو زلزلہ کیے بیٹھا تھا۔ افتخار ہنس کی سے  
 آگے ہوا۔ اس کی بے تاب استفہامیہ نگاہیں۔ ڈاکٹر

میں زارا عصی ہوں۔ آنر عصی سمجھنے کی غلطی  
 مت کیجئے گا۔ مجھے تو اپنے بھائی کو کھو کر خاموش رہی تھی۔  
 اگر اسے کچھ ہو گیا تو رائے سلیمان باتوں میں کسی کو سوا  
 نہیں کروں گی۔ "اس کے لیے مجھے میں شعلوں کی لپک  
 تھی۔ ایک جھکے سے بچتی اور اپنا بیک اٹھا کر باہر نکلتی  
 گئی۔"

ہکا بکا رضوان نے رائے سلیمان کو دیکھا۔ ان کا چہرہ  
 بے حد سیاہ تھا۔

"سلیمان بھائی۔" اس نے کچھ پوچھنا چاہا۔ پھر  
 تیزی سے زارا کے پیچھے لپکا۔ وہ گاڑی کا لاک کھول رہی  
 تھی۔

"زارا! کیا ہوا ہے؟"

"رائے سلیمان سے پوچھیں۔" اس نے ایک  
 جھکے سے دروازہ کھولا۔ رضوان نے جھنجھلا کر دروازہ  
 بند کیا۔ کندھوں سے تمام کر اس کا رخ اپنی طرف کیا۔  
 "میں تم سے پوچھ رہا ہوں کیا ہوا ہے؟" اس کی  
 گرفت اور لہجہ وہ توں ہی سخت تھے۔

"زین العابدین پر قاتلانہ حملہ ہوا ہے۔"

"کیا۔؟" رضوان کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔

"اب یہ بھی بتاؤں کہ کس نے کیا ہے؟" وہ چپا چپا  
 کر بولی۔ رضوان شدید سارہ گیا۔ اس نے آہستگی  
 سے اپنے ہاتھ اس کے کندھوں سے ہٹا لیے۔  
 زارا نے آگ چھٹی ہوئی نگاہ اس پر ڈالی اور گاڑی  
 میں بیٹھ کر دروازہ بند کر لیا۔ ہکا بکا کھڑے چوکیدار نے  
 گیٹ کھول دیا۔ اس کی گاڑی نکلنے تک رضوان فیصلہ  
 نہیں کر پایا تھا کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔

آریشن حیض کے سامنے وقت گویا منجمد ہو کر رہ گیا  
 تھا۔ ایک ایک سینکڑ رنگ رنگ کر گزر رہا تھا۔ خوف  
 اور وہاں میں ڈوبے لیے وہ سب ایک دوسرے سے  
 اپنے اپنے خوف چھپائے دست بہ دعا تھے۔ ایک  
 "مرے کو تسلیم کر دیتے تھے۔"

آصف حیدر، سلیم افتخار اور نبجائے کون کون؟

بتاؤں کہ میں تھانیں ہوں یہ مسز آنگہ عصی میری  
 بچہ ہیں۔"

اس کے لبوں سے اک کراہ سی نکلی۔  
 ڈاکٹر شمس باہر نکلتے تھے۔ وہ ان کے سامنے آگئی۔  
 "نکل جائیں۔"

"بیٹا! خد کیوں کر رہی ہیں۔؟"

"میں صرف ایک نظر اسے قریب سے دیکھنا چاہ  
 رہی ہوں۔"

انہوں نے رضوان کی سمت دیکھا۔ وہ بس کندھے  
 اچکا کر رہ گیا۔

"چھا ٹھیک ہے لیکن زیادہ دیر نہیں۔"

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ڈاکٹر شمس نے دروازہ  
 کھولا۔ وہ بڑے ضبط سے اندر گئی تھی۔ وہ بالکل چپ  
 تھا۔ ایک دم خاموش مگر اس کی شوخ آواز زارا کی  
 سماعتوں میں اودھم مچا رہی تھی۔

"میں نے سوچا آپ کو اپنے ہاتھوں سے مچھلی  
 فراہی کر کے کھلاؤں گا۔"

"اور جو میں نہ آتی۔"

"یہی مچھلی لے کر آپ کے گھر پہنچ جاتا۔"

"جی ہاں زارا! آپ اور بچہ میرا سب سے  
 خوبصورت رشتہ ہیں۔ سب سے خوبصورت خوالہ۔"

زارا کا دل چاہا۔ وہ اس کی کشادہ پیشانی پر بکھرے  
 بالوں کو سینے۔

"نبجائے کیسا رشتہ ہے میرا آپ سے۔ میں اپنی ہر  
 خوشی ہر غم آپ سے شیئر کرنا چاہتا ہوں۔"

بلو جو ضبط کے آنسو اس کے چہرے پر بکھر گئے۔ وہ  
 بند لبوں سے التجا کر رہی تھی۔

"آپ مجھے کھولویں۔"

ڈاکٹر شمس نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر باہر  
 نکلنے کا اشارہ کیا۔

"بچہ سے کہیے گا زین انہیں بے حد یاد کرتا  
 ہے۔"

وہ تیزی سے باہر نکل آئی۔ ضبط کا دامن ہاتھ سے  
 چھوٹ گیا تھا۔

زارا نے پر ہی تھیں۔

انہوں نے اس کی حالت خطرے  
 میں دیکھی۔ چوبیس گھنٹوں میں ہوش آگیا تو  
 وہ۔۔۔

اس دن سے آگے سب کی سانسیں رک جاتی  
 تھیں۔ زارا نے خوف زدہ ہو کر رضوان کو دیکھا۔ اس  
 کی سے اس کا کندھا چھتا پٹایا اور آگے بڑھ

تا۔۔۔

اسی تک نہیں ہو رہی رضوان۔ "ڈاکٹر شمس نے  
 کہا کہ پوچھا۔"

آپ سے کچھ بات کرنی ہے۔" رضوان نے  
 اس کے لبوں پر ہاتھ کرتے ہوئے آگے بڑھ گئے تھے۔

♥ ♥ ♥ ♥

ایسی گھنٹہ۔

گویا چوبیس سہل بلکہ چوبیس صدیاں بن گئی  
 تھیں۔

ہر ایک رات سہی تھی۔

گویا اس رات کی صبح ہو گئی؟ "بکھی بکھی اس کے  
 اور کا خوف بول اٹھتا۔"

"ضرور ہوگی۔"

شیشے کے اس طرف بے حس و حرکت پڑے وہ خود کو  
 "جی ہاں دیکھ چکی تھی۔"

اس کی شہزادیاں۔

لڑائیاں

شنگھائیاں

کیا کچھ نہیں یاد آ رہا تھا۔

"آپ کے بغیر تو زین العابدین کچھ بھی نہیں ہے  
 بچہ۔" اس نے ایک بار مٹا سے کہا تھا۔

"میں جب تک آپ سے ملا نہیں تھا مجھے احساس  
 ہی نہیں تھا کہ یہ رشتہ اتنے اہم ہوتے ہیں۔ اب  
 مجھے احساس ہوتا ہے۔ ہم لوگ پہلے کیوں نہیں  
 ملے۔"



"زارا! ریلیکس۔" رضوان آگے بڑھا۔ افکار نے بس سر اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔  
 "رضوان! انسان انکا سنگدل بھی ہوتا ہے۔" اس نے بیجا چواٹھا کر اسے دیکھا۔

"کیا چاہتا تھا اس نے بس یہی کہ وہ اپنی اصل شناخت کے ساتھ زندہ رہتا چاہتا تھا۔ کیا یہ زمین العابدین کا تصور ہے کہ وہ ہمیشہ حیات کا پیرا ہے۔ غلطی رائے سلیمان کرے تو کیا سزا تھیں ملنی چاہیے۔"  
 "زارا! یہ وقت ان باتوں کا نہیں ہے۔"

"تو کن باتوں کا ہے۔ اگر اسے کچھ ہو گیا تو مہما زندہ نہیں رہیں گی۔ آپ نہیں جانتے زمین ان کے لیے کیا ہے۔" اس نے تھک کر دیوار سے نیک لگائی اور آنکھیں بند کر لیں۔

"اگر میں قتل کر دیا جاؤں تو آپ کیا کریں گی۔ یونسی ایک تو نیک لکھ کر خاموش ہو جائیں گی۔" اس نے خیر ذکر آنکھیں کھولیں۔

"افکار۔" اس نے بے اختیار پکارا۔ خاموش بیٹھے افکار نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔  
 "تم نے رو رو رہے ہو کدو کی غشی۔"

اس سے قبل کہ افکار کچھ بولتا "رضوان بول اٹھا تھا۔"

"ڈاکٹر مٹھی سے بات کر لی ہے میں نے۔ وہ سب سنبھل لیں گے۔ تمہیں تو بتا ہے وہ سب۔"

"کیا مطلب ہے آپ کا۔" زارا کی تم آنکھوں میں تیرا تڑپا۔ وہ سرے پل وہ پھر کر بولی تھی۔ "ہیرا کچھ نہیں ہوگا رضوان! رپورٹ دینا ہوگی اور رائے سلیمان کے خلاف ہوگی۔"

افکار نے ایک نظر اس دونوں کو دیکھا۔ اور من بدل لیا۔ وہ یکسوئی سے دیکھتا چاہتا تھا۔  
 "یہ ضروری تو نہیں زارا کہ۔"

"یہ ضروری ہے۔ اس وقت اس شہر میں رائے سلیمان واحد شخص تھا جو اسے زندہ دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ ہر شخص کے لیے گویا ہوئی۔"

رضوان کی آنکھیں کھلیں۔ وہ خاموش ہو گیا۔ وہ جانتا تھا وہ

اس وقت کچھ نہیں سنے گی۔ مگر جو کچھ وہ سوچ رہی تھی وہ ہونا بھی تو ممکن تھا۔ زراں لپکتی ہوئی وہ کسی کے کمرے میں گئی تھی۔ وہ سرے پل ڈاکٹر مٹھی اور ڈاکٹر فرحان آئے تھے۔

بست دور مؤذن نے اذان دی تھی۔ اندھیر سے پھوٹی صبح رات کو فکست دینی دنیا کی روشنی سو رہی تھی۔ سبکی کرن کے ساتھ ان بند پلوں میں جنبش ہوتی تھی۔ اک بلی سی کراہہ زندگی کی علامت بن گئی۔

زارا کی سینے میں کب سے انکی اک سانس باہر نکلی تھی۔  
 افکار نے وہیں سجدہ شکر ادا کیا تھا۔

رضوان کے سرے اک بوجھ اتر گیا اگر زمین العابدین کو کچھ ہو جاتا تو نچلنے رائے فیملی پر مزید کیا قیامتیں ٹوٹ پڑتیں۔

"میں نے گناہاں اسے کچھ نہیں ہو سکتی۔ آج تو مجھوں کلون تھا۔" افکار آصف سے کہہ رہا تھا۔

"اسے غینہ کا انجکشن دیا ہے۔ جلد ہی روم میں شفٹ کر دیا جائے گا۔"

"کسی قسم کی کوئی کمی نہیں ہونی چاہیے۔" رضوان کہہ رہا تھا۔

"ڈونٹ وری من۔" انگل مٹھی نے اس کا کندھا تپتپایا تھا۔

♥ ♥ ♥ ♥

"کپڑے استری کر دیے پتر میرے۔" ماما مقبول نے اندر آکر پوچھا۔ اسماء ابھی ابھی تھ علی کو سلا کر لیٹی تھی۔ وہ رات بارہ بجے اٹھ بیٹھا تھا۔ سو صبح صبح دوبارہ سو گیا۔

"ابھی کدو پتی ہوں اب! اس ذہن ہی سے نکل گیا۔" وہ جلدی سے اٹھ کر دھندلے سر پر لیٹے ہوئے بولی۔

"میں کدو پتی ہوں کیا۔" زمین تارہ ابھی ابھی برتن دھو کر آئی تھی۔ اسماء کے جواب کا انتظار کیے بغیر دھلے ہوئے کپڑوں میں سے ماما مقبول کے کپڑے نکالنے لگی۔

"میں تارہ! پتر شہر چلو گی میرے ساتھ۔" مانے دل کے لیے میں جا رہی ہوں۔ زمین تارہ نے بے حیرت سے پلٹ کر اسے دیکھا۔

"ہیں۔" پھر سر جھٹک کر بولی۔ "میں کیا کروں گی۔"

"اپنی پسند سے چیزیں خرید لیتا۔"

"چیزیں۔" استری کا پلگ لگاتے ہوئے زمین تارہ نے اک بار پھر بے حد حیرت سے اسے دیکھا تھا۔ پھر بولنے لگی۔ "ماما! ایسی چیزیں؟"

"یہ بھی بس جھلی ہے۔" ماما مقبول نے ہنس کر اسماء کو دیکھا تو وہ مسکرا دی۔

"مٹی جاؤ زمین تارہ! سب کچھ اپنی پسند کا خرید لیتا۔ آخر پینٹا اور دھاتا تو تم ہی کو ہے۔" اسماء نے بھی کماؤ اس کے ہاتھ رک گئے۔

"آخر آپ لوگ کرنا کیا چاہ رہے ہیں۔" استری بولی پھوڑ کر وہ پوری کی پوری من کی طرف مڑ گئی۔

"لب کیا خالی ہاتھ رخصت کریں گے تمہیں۔ کوئی زور گناہ کپڑا! تاکہ تو خریدتا ہے۔ چیز پورا تو اس وقت اتنی جلدی میں بن نہیں سکتا پر جو کچھ بن سکتا ہے وہ تو کریں گے۔" ماما مقبول نے کہا۔

وہ کچھ کہنے خالی الذہنی کے ساتھ اسے دیکھتی رہی۔ اسماء نے چپل پہنی اور پیار کر نکلی۔

"ماما! تمہیں واقعی نہیں ہے کہ وہ آجائے گا۔" وہ ایک بار پھر بے حد حیرت سے پوچھ رہی تھی۔

"تو تو بالکل ہی پاگل ہو گئی ہے۔" ماما مقبول جھنجھلا کر باہر نکل گیا۔ اسے ابھی نہانا تھا۔

"پھر مجھے یقین کیوں نہیں آتا۔" وہ نچلا لب کاٹنے ہوئے زیر لب برہنہ رہی تھی۔

♥ ♥ ♥ ♥

"مجھے ایس بی شاہ میرے بات کرنا ہے۔ میرا نام۔" ماما کل اس کے ہاتھ سے ایک دم جھپٹ لیا گیا تھا۔ وہ ایک دم گھوٹی۔

"تم بے وقوفی کر رہی ہو؟" رضوان سخت غصے میں تھا۔

"مجھے یہ بے وقوفی کر لینے دس رضوان۔" زارا نے موبائل لینے کو ہاتھ پھیلا دیا۔ اس کا لہجہ سنجیدہ و پُر سکون تھا۔

"یہ پاگل پن ہے۔ رائے سلیمان پر ہاتھ ڈالنا اتنا آسان نہیں ہے جتنا تم سمجھ بیٹھی ہو۔" رضوان کی کچھ میں نہیں اُتر پاتا تھا کہ وہ زارا کو اس اقدام سے کس طرح باز رکھے۔

"آسان ہے یا مشکل مگر مجھے یہ کام کرنا ضروری ہے۔ اور رضوان آپ کہہ رہے ہیں یہ پاگل پن ہے۔ مجرموں کو کیفر کرنا وارنٹ پھانٹنا پاگل پن ہے۔ ظالم کا ہاتھ روکنا پاگل پن ہے۔ اور وہ پاگل پن نہیں ہے جو رائے سلیمان نے کیا۔ اک معصوم شخص کو موت کے گھاٹ اتار دینے کی کوشش کو کس طرح جہنمی قاتلے کریں گے آپ کیا جوازدیں گے؟" وہ بھڑک اٹھی۔ رضوان کا یوں اپنے سامنے رکھوت بن کر کھڑے ہو جانا اس کے لیے شاک تھا۔

"زارا! میں بات ہوں۔" وہ دونوں ہاتھ اٹھا کر صلح ہو لینے میں گیا ہوا۔

"سلیمان بھائی سے غلطی ہوئی ہے۔ انہیں یہ انتہائی قدم نہیں اٹھانا چاہیے تھا۔ مگر تم جو کر رہی ہو۔ وہ بھی ٹھیک نہیں۔ سراسر جڈیاتی پن۔"

"جڈیاتی پن۔" زارا نے تھیرے اسے دیکھا۔ پھر رخ لیجے میں گویا ہوئی۔ "یہ تو عنوان لب بھی خطرے سے خالی نہیں ہے رضوان صاحب! اس نے بے سدھ پڑے زمین العابدین کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ زندہ بچ گیا ہے اور رائے سلیمان اسے دوبارہ موانے کی کوشش ضرور کرے گا۔"

"ایسا کچھ نہیں ہوگا زارا۔ بلوی۔" زارا کچھ لیجے اسے دیکھتی رہی۔

"تو آپ میرا ساتھ نہیں دیں گے ٹھیک ہے۔ مجھے ہی کچھ کرنا ہوگا۔" اس نے بھبک کر اپنا بیک اٹھا کر قدم بڑھائے تھے کہ رضوان نے ایک جھٹکے سے اسے کھینچ کر واپس لا کھڑا کیا۔

"تم جد سے بڑھ رہی ہو زارا رضوان۔"



# آب دُنیا بھر کے بیشتر ڈینٹس استعمال کرتے ہیں اور دوسرے

جب مارگزشتہ رات پینے اور

خواب ہو جائیں تو عارضہ ڈینٹس

ہوتا ہے۔ ڈینٹس کے اس اہتمام تک

پہنچنے کے پہلے سوزا دانت نوکھ بیٹے

استعمال کیجئے۔

دانتوں کو مارنے کے خطرہ اثرات سے

محفوظ رکھئے اور مضبوط بنائیے۔

Glaxo Pakistan  
Private Limited



Nonpareil

اس کی بات واضح اور لہجہ نفوس تھا۔

”عجب منطقی ہے رضوان صاحب آپ کی بھی

یعنی کہ۔“

افتخار کی آمد پر اس کی بات اور صوری رو گئی۔ اس کے

ہاتھ میں کچھ شاپنگ بیگ تھے۔ اس نے اچھتی سی نظر

ان دونوں پر ڈالی۔ کمرے میں ایک دم خاموشی سی چھ

گئی تھی۔ جسے موبائل کی بپ سے توڑ ڈالا۔

رضوان نے سپرد کیا اور موبائل زارا کی طرف

برعزت کیا۔ مہا کی کل تھی۔

”میں بالکل ٹھیک ہوں مہا! آپ کیسی ہیں۔“ اس

نے حتی الامکان اپنے لہجے کو نارمل کرنے کی سعی کی۔

رضوان دانستہ باہر نکل گیا۔ افتخار بیگ سے چیزیں نکال

کر ٹیبل پر رکھ رہا تھا۔

”رات سے طبیعت گھبرا رہی تھی۔ اوپر سے فون

بھی خراب تھا۔ ابھی ٹھیک ہوا ہے۔“ مہا نے بتایا۔

”طبیعت کیوں گھبرا رہی تھی مہا؟“

”چنانچہ۔ تم لوگ بھی تو مجھے بھول گئے ہو۔“

انہوں نے شکوہ کیا۔

”مہا! ایسا ممکن ہے؟“

”زین کو دیکھو۔ اس کے پاس اب اتنا بھی وقت

نہیں کہ ایک منٹ کی کل مجھے گرسکے۔“

”موصوف ہے مہا! ایذا کی ڈیٹ ایک دو دن میں

آنے والی ہے۔“ اس کا لہجہ بدھم ہو گیا۔

”ٹھیک تو ہے نا؟“

”بالکل ٹھیک ہے۔“ اس نے سوتے ہوئے زین پر

نگاہ ڈالی اس کے سینے کا زخم سفید چادر میں چھپا تھا۔

”اسے میری بہت سی دعا میں رہا۔“

”آپ کی دعا میں ہی تو۔“ وہ ہنسا اور چھوڑ کر

ایک دم خاموش ہو گئی۔ پھر اک طویل سانس لے کر

گویا ہوئی۔ ”بہت تھوڑے دنوں کی بات ہے۔ پھر

میں آپ اور زین بہت سادقت ایک ساتھ گزاریں

تھے۔“

”انشاء اللہ۔ پہلے میں نے سوچا تھا کہ میں شر

آجاؤں۔ لیکن اب سوچتی ہوں تم بھی مصروف ہوگی

زارا کا چہرہ مجھے سے دیکھ لے گا۔

”اپنے اور میرے رشتے کو درمیان میں نہ ہی لائیں

تو اچھا ہے۔“ اس نے جانا چاہا۔

رضوان نے دوبارہ پر ہاتھ ٹکا کر راستہ ہلاک کر دیا۔

”کیا کرو گی تم؟ یہ رشتہ ختم کرو گی۔“ اس کا لہجہ

استہزاانہ سا تھا۔ پہلی بار زارا کو اس کے لہجے میں

رائے خاندان کی مخصوص نخوت نظر آئی۔

”بات کو غلط رنگ دینے کی کوشش مت کریں۔“

”میں دے رہا ہوں، تم دے رہی ہو بات کو غلط

رنگ۔ کیسے ثابت کرو گی کہ مجھ رائے سلیمان ہے۔

تمہاری اس حرکت سے ہمارے خاندان پر کیا گزرتے

گی۔ یہ سوچا ہے تم نے؟“ خیارات اور ہمارے مخالفین

کیا کہو اس نکلیں گے۔ پھر خیر ہے تمہیں۔ ہمارا

خاندان کسی اور حلقے کا متحمل نہیں ہو سکتا زارا

رضوان! اور رائے سلیمان! بہت ہی غلط انداز ہے

تمہارا اس شخص کے بارے میں۔ رائے سلیمان کے

سامنے کھڑی ہو گی تو خود چھوٹی پڑ جائے گی۔ دو بتاؤ گے چاکر

رائے خاندان سے کت کر تم کیا ہو۔“

وہ اسے حقیقت سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اور

نو کچھ وہ کہہ رہا تھا۔ کچھ الفاظ بھی نہ تھا۔ یہ بات زارا

خود بھی اچھی طرح سمجھتی تھی۔

”کیا یہ ہمارے خاندان کا حصہ نہیں؟“ اس نے

بے حد سنجیدگی سے سوال کیا۔

”مجھے اس سے انکار نہیں۔“

”پھر بھی آپ اس کی مدد نہیں کریں گے۔ صرف

اس لیے کہ ظلم کرنے والا آپ کا بھائی ہے۔ میں آپ

کو بہت مختلف انسان سمجھتی تھی۔ رضوان۔“ اس

کے لہجے میں بالکراہٹ نظر آئی۔

رضوان نے کچھ لمحے اسے یونہی دیکھا رہا۔ پھر ہاتھ بنا کر

سرخ بدل گیا۔ دونوں ہاتھ پشت پر باندھتے ہوئے اس

نے زین کے چہرے پر نظریں جمادیں۔ پھر آہستہ سے

گویا ہوا۔

”میں اس کی مدد کروں گا زارا! اب یہ چاہتا ہے وہ ہو

کر رہے گا۔ مگر جو تم چاہتی ہو وہ ہونا ممکن نہیں۔“



ایک زمانہ تک رہی۔ میں تو اتنا دلکش نہ رہی۔ اس لیے زار اور اسے خاموش رہی۔

”پھر بھی دین سے کہنا، کبھی کبھار مجھے کل کر لیا کرے خود تو جب بھی فون کرو وہ گھر پر نہیں ملتا۔“  
”فحار کے ساتھ کہاں اسٹڈی کرنا ہے۔ میں کہہ دوں گی۔“ زار آہستگی سے گویا ہوئی۔ تو انہوں نے لیے نچالے کیا سوچتی رہی۔

”بے سب سے اپنے ہاتھ سے آپ کے لیے کھانا بنا کر بھیجا ہے اور زین کے لیے بھی۔“

”ہو۔۔۔“ فحار کی بات سنی نہ تھی۔

”نہیں۔ اس کی ضرورت نہیں۔“ زار نے پیشانی مسلی۔ اس کی نگاہیں ہاتھ میں پکڑے موبائل پر جمی تھیں۔ فحار نے بغور اسے دیکھا۔

”ایک بات کون زارانی ہے۔“

زار نے سر اٹھا کر سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

”رازے سلیمان کے مقابل مت آئیں۔“

زار کی نگاہوں میں تیرہویں تیر تھلا۔

”فحار وہ سنی پر جان دینے والا بندہ ہے زارانی ہی جو کچھ بولا اعلیٰ میں ہو گیا شراب کس مائی کے لال کی جرأت سے کہ فحار کو کھر کے ہوتے زین کی طرف نظر اٹھا کر بھی دیکھے۔“ اس کا بے خوف اور عذر لہجہ۔

زار اب کسا مسکرا دی۔

”میں جانتی ہوں، مگر فحار اتم ہی تو کہنا کرتے تھے۔“

”جیتنے کے لیے لڑنا ضروری ہے مگر لڑائی حکمت عملی سے بھی تو جیتی جاسکتی ہے۔“ موٹھیں سنوارتے ہوئے مٹی خیر لہجے میں کہہ رہا تھا۔

”حکمت عملی۔ تم کہنا کیا چاہتے ہو۔“ زار اٹھ کر پوچھنے لگی۔

رضوان اندر آیا تو زار اسے بات بدل دی۔

”ملا مقبول گھر سے چلا تو اس نے کتابوں کی ایک لسٹ اس کے ہاتھ میں تھوپی تھی۔“

”یہ کیا ہے؟“ ملا مقبول نے بے حد حیرت سے دریافت کیا تھا۔

”تمہیں ہیں بی ایس کی۔ یاد سے لیتے آنا ملا۔“

”پر یہ تو۔۔۔“ اس نے کچھ کہنا چاہا مگر نین تارہ نے اس کی بات قطع کر دی۔

”تم اپنا کام کرو ملا! مجھے اپنا کام کرنے دو۔“

اس نے مجبوراً ”لسٹ جیب میں ڈال لی تھی۔ گھر سے نکلا تو اس کا ذرا ہ تھا کہ وہ نظروں کی طرف نہیں جائے گا۔ مگر زار میں اس کا ہسیلہ مل گیا۔ اس نے بتایا تھا۔ نظروں سارا دن گھر پر رہتا ہے۔ کاروبار بالکل ٹھیک پڑا ہے۔ تمام دن بیوی کے ساتھ بیچ بیچ ہوتی رہتی ہے۔

”مجھے تو لگتا ہے اس کا دل غلٹ گیا ہے۔“ آخر میں اس نے راستہ دئی۔

ملا مقبول نہ چاہتے ہوئے بھی چلا آیا۔ دروازہ کھلا تھا۔ ملا مقبول اندر داخل ہو گیا۔ کچلے صحن میں عجیب سی دیر لائی تھی۔ ہر طرف دھول، ٹنگے، ٹنگے پتے، لگتا تھا۔ یہاں کوئی صفائی کرنے والا ہی نہیں۔ نین تارہ کے ہوتے ہوئے یہ آنگن کتنا صاف ستھرا اور روشن ہوا کرتا تھا۔ چوسلے کے گرد برتن بکھرے تھے اور چوسلے میں راکھ اڑ رہی تھی۔ کونے میں پچھی چارپائی پر تھوڑا سا ملا تھا۔ اس کا ایک بازو آنکھوں اور دھڑا سینے پر دھکا ملا مقبول اس کے قریب آکر رک گیا۔

”نظروں۔“ اس نے آہستگی سے پکارا۔ نظروں نے آنکھوں سے بازو ہٹا کر دیکھا پھر تیزی سے اٹھ بیٹھا۔

”ملا۔ اتم۔“ اور زندگی میں پہلی بار وہ اس کے گلے کا قہار ملا مقبول نے بس رسم بھائی تھی۔

”نین تارہ نہیں آئی؟“ اس نے پیچھے ہٹتے ہوئے پوچھا۔

”وہ واپس آنے کے لیے تو نہیں گئی تھی۔“ تارہ نے

ملا مقبول کے لیے چلا تو اس نے کتابوں کی ایک لسٹ اس کے ہاتھ میں تھوپی تھی۔

”یہ کیا ہے؟“ ملا مقبول نے بے حد حیرت سے دریافت کیا تھا۔

”تمہیں ہیں بی ایس کی۔ یاد سے لیتے آنا ملا۔“

”پر یہ تو۔۔۔“ اس نے کچھ کہنا چاہا مگر نین تارہ نے اس کی بات قطع کر دی۔

”تم اپنا کام کرو ملا! مجھے اپنا کام کرنے دو۔“

اس نے مجبوراً ”لسٹ جیب میں ڈال لی تھی۔ گھر سے نکلا تو اس کا ذرا ہ تھا کہ وہ نظروں کی طرف نہیں جائے گا۔ مگر زار میں اس کا ہسیلہ مل گیا۔ اس نے بتایا تھا۔ نظروں سارا دن گھر پر رہتا ہے۔ کاروبار بالکل ٹھیک پڑا ہے۔ تمام دن بیوی کے ساتھ بیچ بیچ ہوتی رہتی ہے۔

”مجھے تو لگتا ہے اس کا دل غلٹ گیا ہے۔“ آخر میں اس نے راستہ دئی۔

قبل نے پہنچتے ہوئے لمحے میں کما تھا۔ ظہور نامہ ش ساہو گیا۔ پھر آہستگی سے گویا ہوا۔

”شاید تم ٹھیک کہتے ہو۔ ورواپس کیوں آئے گی۔ تم مجھ سے۔“

”نہیں۔ بس پوچھ کر بڑے کڑے آیا تھا۔“ تارہ نے مقبول سے اوجھڑا کر دیکھا۔ ”یہ گھر کی کیا حالت بنا رکھی ہے۔ بھول کہاں ہے؟“

”ہوئی کہیں۔“ اس نے زیر لب کھلی دی۔

”کبھی عورت ہے۔ سارے کر توت کھل گئے ہیں کیا کیا کھیل کھاتی رہی ہے میرے ساتھ۔“

”مرد کی اپنی حقش نکال کرے تو کون کھیل کھیل سکتا ہے اس کے ساتھ۔ اس کو گالیاں دینے کا قاعدہ ہے۔“

”تو تمہاری اپنی ماری تھی۔ اسی کی آنکھوں سے دیکھتے اور اسی کے گلوں سے سنتے تھے۔“ ملا مقبول نے دھجے لہجے میں آئینہ دکھایا۔

”ٹھیک کہا ملا تم نے؟“ اس نے یاسیت سے اک ٹھنڈی تہ بھری۔ ”یہ بربادی تو خود مولیٰ ہی ہے میں نے کسی کا کیا بدش۔ اب تو سب کچھ ہی ختم ہو گیا۔“ اس نے آسف سے دونوں ہاتھ ملے۔

”ہوں لگتا ہے سب کچھ نہیں تارہ کے دم سے تھوڑا کیا تھی۔ چھت ہی سر پر آگری۔ سارا کاروبار ٹھیک ہو گیا۔“

اس نے اعتراف کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگائی۔ شاید ترس گیا تھا کہ کوئی تو ہو جس کے سامنے دل کا پوچھ بکا کرے۔ وہ بول رہا تھا اور ملا مقبول اس اکھڑ مزہ کو دیکھ رہا تھا۔ جس کی آنکھوں کی سرخی بتاتی تھی کہ اس کے تمہیر کی جھین اسے ساری رات سوتے نہیں دیتی۔ اس کا لہجہ اس کے بچپناہوں کا غماز تھا۔

وہ ایک طویل سانس لے کر رہ گیا۔

”انسان اپنے عمل سے پہلے ایک بار بھی سوچ لے کہ وہ کیا کرنے جا رہا ہے تو بچپناہوں میں اس کا مقدر نہ نہیں۔“

”نین تارہ سے کہیے گا اپنے بھائی کو معاف کر دے۔“

ملا مقبول نے تارہ سے کہا تھا کہ اس کے دھڑا سینے پر دھکا ملا مقبول اس کے قریب آکر رک گیا۔

”نظروں۔“ اس نے آہستگی سے پکارا۔ نظروں نے آنکھوں سے بازو ہٹا کر دیکھا پھر تیزی سے اٹھ بیٹھا۔

”ملا۔ اتم۔“ اور زندگی میں پہلی بار وہ اس کے گلے کا قہار ملا مقبول نے بس رسم بھائی تھی۔

”نین تارہ نہیں آئی؟“ اس نے پیچھے ہٹتے ہوئے پوچھا۔

”وہ واپس آنے کے لیے تو نہیں گئی تھی۔“ تارہ نے

ملا مقبول کے لیے چلا تو اس نے کتابوں کی ایک لسٹ اس کے ہاتھ میں تھوپی تھی۔

ایک زمانہ تک رہی۔ میں تو اتنا دلکش نہ رہی۔ اس لیے زار اور اسے خاموش رہی۔

”پھر بھی دین سے کہنا، کبھی کبھار مجھے کل کر لیا کرے خود تو جب بھی فون کرو وہ گھر پر نہیں ملتا۔“

”فحار کے ساتھ کہاں اسٹڈی کرنا ہے۔ میں کہہ دوں گی۔“ زار آہستگی سے گویا ہوئی۔ تو انہوں نے لیے نچالے کیا سوچتی رہی۔

”بے سب سے اپنے ہاتھ سے آپ کے لیے کھانا بنا کر بھیجا ہے اور زین کے لیے بھی۔“

”ہو۔۔۔“ فحار کی بات سنی نہ تھی۔

”نہیں۔ اس کی ضرورت نہیں۔“ زار نے پیشانی مسلی۔ اس کی نگاہیں ہاتھ میں پکڑے موبائل پر جمی تھیں۔ فحار نے بغور اسے دیکھا۔

”ایک بات کون زارانی ہے۔“

زار نے سر اٹھا کر سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

”رازے سلیمان کے مقابل مت آئیں۔“

زار کی نگاہوں میں تیرہویں تیر تھلا۔

”فحار وہ سنی پر جان دینے والا بندہ ہے زارانی ہی جو کچھ بولا اعلیٰ میں ہو گیا شراب کس مائی کے لال کی جرأت سے کہ فحار کو کھر کے ہوتے زین کی طرف نظر اٹھا کر بھی دیکھے۔“ اس کا بے خوف اور عذر لہجہ۔

زار اب کسا مسکرا دی۔

”میں جانتی ہوں، مگر فحار اتم ہی تو کہنا کرتے تھے۔“

”جیتنے کے لیے لڑنا ضروری ہے مگر لڑائی حکمت عملی سے بھی تو جیتی جاسکتی ہے۔“ موٹھیں سنوارتے ہوئے مٹی خیر لہجے میں کہہ رہا تھا۔

”حکمت عملی۔ تم کہنا کیا چاہتے ہو۔“ زار اٹھ کر پوچھنے لگی۔

رضوان اندر آیا تو زار اسے بات بدل دی۔

ملا مقبول گھر سے چلا تو اس نے کتابوں کی ایک لسٹ اس کے ہاتھ میں تھوپی تھی۔

”یہ کیا ہے؟“ ملا مقبول نے بے حد حیرت سے دریافت کیا تھا۔

”تمہیں ہیں بی ایس کی۔ یاد سے لیتے آنا ملا۔“

”پر یہ تو۔۔۔“ اس نے کچھ کہنا چاہا مگر نین تارہ نے اس کی بات قطع کر دی۔

ایک زمانہ تک رہی۔ میں تو اتنا دلکش نہ رہی۔ اس لیے زار اور اسے خاموش رہی۔

”پھر بھی دین سے کہنا، کبھی کبھار مجھے کل کر لیا کرے خود تو جب بھی فون کرو وہ گھر پر نہیں ملتا۔“

”فحار کے ساتھ کہاں اسٹڈی کرنا ہے۔ میں کہہ دوں گی۔“ زار آہستگی سے گویا ہوئی۔ تو انہوں نے لیے نچالے کیا سوچتی رہی۔

”بے سب سے اپنے ہاتھ سے آپ کے لیے کھانا بنا کر بھیجا ہے اور زین کے لیے بھی۔“

”ہو۔۔۔“ فحار کی بات سنی نہ تھی۔

”نہیں۔ اس کی ضرورت نہیں۔“ زار نے پیشانی مسلی۔ اس کی نگاہیں ہاتھ میں پکڑے موبائل پر جمی تھیں۔ فحار نے بغور اسے دیکھا۔

”ایک بات کون زارانی ہے۔“

زار نے سر اٹھا کر سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

”رازے سلیمان کے مقابل مت آئیں۔“

زار کی نگاہوں میں تیرہویں تیر تھلا۔

”فحار وہ سنی پر جان دینے والا بندہ ہے زارانی ہی جو کچھ بولا اعلیٰ میں ہو گیا شراب کس مائی کے لال کی جرأت سے کہ فحار کو کھر کے ہوتے زین کی طرف نظر اٹھا کر بھی دیکھے۔“ اس کا بے خوف اور عذر لہجہ۔

زار اب کسا مسکرا دی۔

”میں جانتی ہوں، مگر فحار اتم ہی تو کہنا کرتے تھے۔“

”جیتنے کے لیے لڑنا ضروری ہے مگر لڑائی حکمت عملی سے بھی تو جیتی جاسکتی ہے۔“ موٹھیں سنوارتے ہوئے مٹی خیر لہجے میں کہہ رہا تھا۔

”حکمت عملی۔ تم کہنا کیا چاہتے ہو۔“ زار اٹھ کر پوچھنے لگی۔

رضوان اندر آیا تو زار اسے بات بدل دی۔

ملا مقبول گھر سے چلا تو اس نے کتابوں کی ایک لسٹ اس کے ہاتھ میں تھوپی تھی۔

”یہ کیا ہے؟“ ملا مقبول نے بے حد حیرت سے دریافت کیا تھا۔

”تمہیں ہیں بی ایس کی۔ یاد سے لیتے آنا ملا۔“

”پر یہ تو۔۔۔“ اس نے کچھ کہنا چاہا مگر نین تارہ نے اس کی بات قطع کر دی۔

ایک زمانہ تک رہی۔ میں تو اتنا دلکش نہ رہی۔ اس لیے زار اور اسے خاموش رہی۔

”پھر بھی دین سے کہنا، کبھی کبھار مجھے کل کر لیا کرے خود تو جب بھی فون کرو وہ گھر پر نہیں ملتا۔“

”فحار کے ساتھ کہاں اسٹڈی کرنا ہے۔ میں کہہ دوں گی۔“ زار آہستگی سے گویا ہوئی۔ تو انہوں نے لیے نچالے کیا سوچتی رہی۔

”بے سب سے اپنے ہاتھ سے آپ کے لیے کھانا بنا کر بھیجا ہے اور زین کے لیے بھی۔“

”ہو۔۔۔“ فحار کی بات سنی نہ تھی۔

”نہیں۔ اس کی ضرورت نہیں۔“ زار نے پیشانی مسلی۔ اس کی نگاہیں ہاتھ میں پکڑے موبائل پر جمی تھیں۔ فحار نے بغور اسے دیکھا۔

”ایک بات کون زارانی ہے۔“

زار نے سر اٹھا کر سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

”رازے سلیمان کے مقابل مت آئیں۔“

زار کی نگاہوں میں تیرہویں تیر تھلا۔

”فحار وہ سنی پر جان دینے والا بندہ ہے زارانی ہی جو کچھ بولا اعلیٰ میں ہو گیا شراب کس مائی کے لال کی جرأت سے کہ فحار کو کھر کے ہوتے زین کی طرف نظر اٹھا کر بھی دیکھے۔“ اس کا بے خوف اور عذر لہجہ۔

زار اب کسا مسکرا دی۔

”میں جانتی ہوں، مگر فحار اتم ہی تو کہنا کرتے تھے۔“

”جیتنے کے لیے لڑنا ضروری ہے مگر لڑائی حکمت عملی سے بھی تو جیتی جاسکتی ہے۔“ موٹھیں سنوارتے ہوئے مٹی خیر لہجے میں کہہ رہا تھا۔

”حکمت عملی۔ تم کہنا کیا چاہتے ہو۔“ زار اٹھ کر پوچھنے لگی۔

رضوان اندر آیا تو زار اسے بات بدل دی۔

ملا مقبول گھر سے چلا تو اس نے کتابوں کی ایک لسٹ اس کے ہاتھ میں تھوپی تھی۔

”یہ کیا ہے؟“ ملا مقبول نے بے حد حیرت سے دریافت کیا تھا۔

”تمہیں ہیں بی ایس کی۔ یاد سے لیتے آنا ملا۔“

”پر یہ تو۔۔۔“ اس نے کچھ کہنا چاہا مگر نین تارہ نے اس کی بات قطع کر دی۔

ایک زمانہ تک رہی۔ میں تو اتنا دلکش نہ رہی۔ اس لیے زار اور اسے خاموش رہی۔

”پھر بھی دین سے کہنا، کبھی کبھار مجھے کل کر لیا کرے خود تو جب بھی فون کرو وہ گھر پر نہیں ملتا۔“

”فحار کے ساتھ کہاں اسٹڈی کرنا ہے۔ میں کہہ دوں گی۔“ زار آہستگی سے گویا ہوئی۔ تو انہوں نے لیے نچالے کیا سوچتی رہی۔

”بے سب سے اپنے ہاتھ سے آپ کے لیے کھانا بنا کر بھیجا ہے اور زین کے لیے بھی۔“

”ہو۔۔۔“ فحار کی بات سنی نہ تھی۔

”نہیں۔ اس کی ضرورت نہیں۔“ زار نے پیشانی مسلی۔ اس کی نگاہیں ہاتھ میں پکڑے موبائل پر جمی تھیں۔ فحار نے بغور اسے دیکھا۔

”ایک بات کون زارانی ہے۔“

زار نے سر اٹھا کر سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

”رازے سلیمان کے مقابل مت آئیں۔“

زار کی نگاہوں میں تیرہویں تیر تھلا۔

”فحار وہ سنی پر جان دینے والا بندہ ہے زارانی ہی جو کچھ بولا اعلیٰ میں ہو گیا شراب کس مائی کے لال کی جرأت سے کہ فحار کو کھر کے ہوتے زین کی طرف نظر اٹھا کر بھی دیکھے۔“ اس کا بے خوف اور عذر لہجہ۔

زار اب کسا مسکرا دی۔

”میں جانتی ہوں، مگر فحار اتم ہی تو کہنا کرتے تھے۔“

”جیتنے کے لیے لڑنا ضروری ہے مگر لڑائی حکمت عملی سے بھی تو جیتی جاسکتی ہے۔“ موٹھیں سنوارتے ہوئے مٹی خیر لہجے میں کہہ رہا تھا۔

”حکمت عملی۔ تم کہنا کیا چاہتے ہو۔“ زار اٹھ کر پوچھنے لگی۔

رضوان اندر آیا تو زار اسے بات بدل دی۔

ملا مقبول گھر سے چلا تو اس نے کتابوں کی ایک لسٹ اس کے ہاتھ میں تھوپی تھی۔

”یہ کیا ہے؟“ ملا مقبول نے بے حد حیرت سے دریافت کیا تھا۔

”تمہیں ہیں بی ایس کی۔ یاد سے لیتے آنا ملا۔“

”پر یہ تو۔۔۔“ اس نے کچھ کہنا چاہا مگر نین تارہ نے اس کی بات قطع کر دی۔



تھا۔

"کیا بھائی۔" وہ بھائی کا تھا۔ یہ بلا پہلے بھی ایک بار زمین بھائی سے ملنے آیا تھا۔

"تمہارا صاحب کھر ہے؟"

"نہیں۔ وہ تو۔" سلیم کچھ کہتے کہتے رک سا گیا۔

"خیریت سے تو ہے نا۔؟" لما مقبول مسکرایا۔

"اسے لگا تو اپنے بیٹے کی خیریت دریافت کر رہا ہے۔"

"بس اللہ نے بچالیا۔" سلیم متفکر لہجے میں بولا

تھا۔

"کسے کیا ہوا۔؟" مائے مقبول کا چہرہ ایک دم فٹ

ہو گیا۔

"(کیا کوئی نیا امتحان؟)"

"کون نگ گئی تھی بھائی جان کو۔" سلیم کا دھم

لہجہ مقبول کے قدموں تلے سے زمین کھینچ لے گیا۔

"اسے لگا کوئی زمین کو نہیں خود اسے لگی ہے۔ کچھ تو تھا

جوں کو کئی ٹکڑوں میں تقسیم کر گیا تھا۔"

"نہ۔ وہ بچ گیا ہے نا؟"

"گنڈہ کا بے حد کرم ہوا۔ بھائی جان کی حالت اب

خطرے سے باہر ہے۔" مائے مقبول کے سینے میں انگلی

سانس باہر آئی۔

"کوئی کس نے ماری؟"

"کچھ بتائیں کون دشمن نکل آیا۔ حالانکہ انہوں

نے تو کبھی بھی کسی کو تکلیف نہیں دی۔ اور ایسی

دشمنی کہ بات گولی تک پہنچ جائے۔"

سلیم کیا کہہ رہا تھا۔ مائے مقبول کی ساتھیوں اسے

سننے سے قاصر تھیں مگر اس کا ذہن یکسو ہو کر ایک ہی

نکتے پر غور کر رہا تھا۔ پھر اس نے سلیم سے ہسپتال کا جتا

پوچھا تھا۔

♥ ♥ ♥ ♥

ادنیوں کینڈے کینڈے تھک گیا

مینوں یاد نہ آیا کہ

اوپر دی ہسپتال دی اے

عقلی کے ہر دماغ کے باہر ہی تھیں

کے پھر اس نے مڑ کر بے بسی سے انہم کو دیکھا۔

"کیا ضروری ہے یہ شخص ہمیشہ میرے راستے میں آئے۔"

"وہ کیا کرے جب راستے ہی ایک ہیں۔" انہم نے

ترست جواب دیا۔

"میں نہیں جا رہی۔" اس نے پلٹنا چاہا۔

"یار! اتنی سنگدل کیوں ہو جاتی ہو کم؟" انہم نے

اس کا بازو اپنی گرفت میں لیا۔ ظاہر ہے وہ بازو پھوڑ کر

تو جائیں گے تھی۔ انہم نے دروازہ کھول کر اندر

جھانکا۔

"تہا۔ یہاں تو سب موجود ہیں۔" اس کی رجوش

توازی سب ہی نے پلٹ کر دیکھا۔ مجبوراً "عظمیٰ کو

اندر آنا ہر بلکہ وہ گھسٹ کر لے آئی تھی۔"

افتخار کے لبوں پر اک بھر پور مسکراہٹ بکھری اور

ساتھ ہی اس کی نگاہ نے ٹریک بدلا۔

ساڑی باری بھٹی اوکھی

ایہ اٹھری تے میں منہ زور

میں اپنی مرضی بالمالک

تے تو نے ٹور لی اپنی ٹور

و گھڑیاں دی ٹک کے کہ مرے

کٹھن ہر تئیں سکدے

ایسہ گل و کھری

و کھریاں ہو کے اک دو بے توں

زندہ رہ نہیں سکدے

(تاری دوستی جنہی مشکل ہے وہ اڑیل ہے اور

میں منہ زور۔ میں اپنی مرضی کا مالک ہوں اور اس نے

اپنی کرنی ہے وہ گھڑی بھی ہم ساتھ نہیں بیٹھ سکتے یہ

الک بات ہے کہ جد ہو کر زندہ نہیں رہ سکتے) عظمیٰ

کے سینے ہی چھوٹ گئے۔

"یہ حد سے بڑھتا جا رہا ہے۔"

وہ اسے بکھر نظر انداز کر کے زمین کی طرف بھی نہیں

بڑھ سکتی تھی کیونکہ وہ زمین کے سرانے ہی بیٹھا تھا۔

اس کا ایک بازو بیڈ کی بیک پر پھیلا تھا۔ وہ زار کی طرف

مڑ گئی۔

"کیسی ہو عظمیٰ۔" زار اس سے گلے ملی۔

"میں ٹھیک ہوں مگر یہ زمین۔" جب کہ انہم یہ

وال راہ راست زمین سے پوچھ رہی تھی۔

"اب ٹھیک ہے۔"

"تم نے اپنی کیا حالت بتا رکھی ہے۔" اس نے ذرا

جھپٹ کر اس کا چہرہ دیکھا۔

"بس۔ رضوان! یہ عظمیٰ اور انہم ہیں اور یہ

رضوان۔" اس نے تعارف کروایا۔ انہم تیزی سے

اٹھ اٹھے۔

"مرے آپ ہیں رضوان۔ بہت اشتیاق تھا آپ

سے ملنے کا۔" اس نے سر تیار رضوان کا جائزہ لیا۔

"لگتا ہے میرا غائبانہ تعارف پہلے ہی ہو چکا ہے۔"

رضوان اخلاقا "مسکرایا۔

"ایسا دیسا۔" انہم نے شرارت سے زار کو

دیکھا۔ وہ قصداً "مسکرائی۔ یہ ساتھ کھڑا شخص گزرے

پندرہویں میں اسے بے حد اجنبی سا لگنے لگا تھا۔

"آپ غالباً زمین کی عیارت کو آئی ہیں؟" افتخار

عظمیٰ سے مخاطب تھا۔

(تم یہاں سے دفع ہو کے تو میں کچھ کروں گی۔)

وہ ٹھٹھائی۔ افتخار مسکراتا ہوا اٹھا اور کھڑی کھول کر

باہر جھانکنے لگا۔ تب اس نے زمین کی خیریت پوچھی

تھی۔

"پہلے افتخار نے گولی کھائی۔ اب تم بھی اسی کے

نقش قدم پر چلنے لگے ہو۔" انہم پلٹی۔

زمین ہلکا سا مسکرایا۔ وہ پہلے سے بہتر تھا مگر اس کا چہرہ

اب بھی زور سا تھا۔

"ایک بات تو بتاؤ۔ افتخار نے تو کسی کو متاثر کرنے

کے لیے گولی کھائی تھی۔ تم کس کو متاثر کرنا چاہتے

ہو؟" انہم کی زبان کون پکڑ سکا تھا۔

"آپ کی تو غالباً" منگنی ہو چکی ہے۔" زمین کا جملہ

بے ساختہ تھا۔ انہم کامنہ بھل گیا۔ سب ہی مسکرائے

تھے وہ سر ہلاتے ہوئے بولی۔

"تم پر واقعی افتخار کا اثر ہو گیا ہے۔"

"گویا لاعلاج قرار دے دیا آپ نے مجھے۔ دیسے

مجھے نہیں پتا افتخار بھائی نے کس کو متاثر کرنے کے

لیے گولی کھائی تھی۔"

"اگرے وہ۔" جانے وہ کیا کرنا چاہتی تھی۔ عظمیٰ

نے گھبرا کر اس کا بازو پکڑا۔

"انہم۔"

افتخار کا قہقہہ بے ساختہ تھا۔ وہ جزیرہ ہو گئی جب کہ

ہٹنے کی کوشش میں زمین محض کراہ کر رہ گیا تھا۔ زار

تیزی سے آگے بڑھی۔

"زمین۔! ڈاکٹر نے تمہیں زیادہ باتیں کرنے سے

منع کیا ہے۔"

"جانے دیں زار! اوہ پارہ زندگی کو چھوٹنے کا

احساس اتنا جلیں فزا ہے کہ خاموش ہونے کو دل ہی

نہیں چاہتا۔"

"جی ہاؤ زمین! موت کے فرشتے سے ملاقات کیسی

رہی۔" انہم اور اس کے سوال۔ عظمیٰ نے سر ہٹ

لیا۔

"پیارے انہم۔" عظمیٰ نے کہا پھر زمین کی طرف پلٹی۔

"خدا تمہیں صحت یاب کرے اور دشمن سے محفوظ

رکھے میری ساری دعاؤں تمہارے ساتھ ہیں

زمین۔" اس کے لہجے میں خلوص ہی غلوں میں تھا۔

"ساری۔" افتخار نے بھنوں اچکا کر اسے

دیکھا۔ "تھوڑی بچا رکھیں عظمیٰ بی بی! کسی اور کو بھی

ضرورت پڑ سکتی ہے۔" اس کا لہجہ مٹنی خیر تھا۔

"کیوں افتخار بھائی! تمہارا دوبارہ گولی کھانے کا ارادہ

ہے۔" انہم کی زبان پھسلی۔ عظمیٰ نے بے اختیار ہاتھ

ماٹھے پر مارا۔ جب کہ وہ بھٹائی سے ہٹنے لگی تھی۔

"ہم اب چلتے ہیں زار!۔" اب کے اس نے

کھٹکے میں زیادہ دیر نہیں لگائی تھی۔

"میں انہیں چھوڑ کر آتا ہوں۔" افتخار بھی ان کے

ساتھ ہی نکل آیا۔

"ہب ہم لوگ آ رہے تھے تو آصف اور حیدر ملے

تھے سخت پریشان تھے کہ ایگزٹم کی ڈیٹ آئے والی

ہے اور تیاری خاک نہیں۔"

"تمہاری تیاری کیسی ہے؟" افتخار نے پوچھا۔

عظمیٰ کو نہیں تھا کہ وہ دوائی میں اپنی شادی کی تیاریوں



کی تفصیل سناتے کی۔ مگر انہم بڑی شرافت سے انگیزام کی تیاری ہسکس کرنے لگی۔

عظمیٰ نے ذرا سی گروں موڑ کر اسے دیکھا۔ وہ اونچا لمبا اونٹان دونوں ہاتھ پشت پر باندھے اس کے ہم قدم تھا۔ اس کے چلنے کے انداز میں بھی بے خوفی اور بے فکری تھی۔ اس کی باتوں میں ہر جھٹکی، روانی اور دویشا نہ پن تھا۔ جس کا ساتھ ہی تحفظ کا احساس بن کر اس کے پورے وجود کو گھیر لیتا۔ جو محبت ہی نہیں عزت کرنا بھی جانتا تھا۔

ایک لڑکی کو چاہیے بھی کیا؟

محبت عزت اور تحفظ

وہ کی سب تو دے رہا تھا۔

"یہ جلتا کڑھتا پڑتا میری مجبوری ہیں۔ تم ساتھ ہوتے ہو تو اک خوشی کا بے پایاں احساس میرے وجود کو گھیر لیتا ہے۔ میرے من میں محبت خوشیوں کی بجیل جاتی ہے۔ جسمیں کھودے کا سوچتی ہوں تو میرے اندر میرا اپنا آپ مرجاتا ہے۔ مگر میں کیا کروں۔ میں اپنی ہتھیاریوں پر چراغ بجائے گھر سے نکلی ہوں۔ میرے پیچھے آنے والوں کو ان ہی کی روشنی میں اپنا راستہ ڈھونڈنا ہے۔ جو میں لڑکھرائی تو یہ چراغ بجھ جائیں گے۔ اور جتنی تاریکی پھرے ان کا تقدیر بن جائے گی۔ میں انہیں تاریکیوں میں بھٹکا کر خود روشنی کا سفر کیسے شروع کروں۔ یہ تو غرض غرضی ہوگی۔ اور عظمیٰ خود غرض نہیں ہی مجبور ہے۔ وہ جسمیں چاہے کی مگر تمہاری محبت کی خوشبو کو قید نہیں کرے گی۔ یہی اس کا فیصلہ ہے اور یہی اس کا کام ہے۔"

اس نے آنکھ کنارے ٹھہر جانے والے آنسو کو بے حد خاموشی سے دل میں اتار لیا تھا۔ اور افتخار نے جانے کیوں اپنی بات بھول کر ایک دم خاموش ہو گیا تھا۔

♥ ♥ ♥ ♥

"سید زین العابدین اسی گھر سے ہیں۔" وہ دھڑکنے لگی زبان اور گھبراہٹ ہوا سا تھا۔ افتخار نے سر تھما اس کا جائزہ لیا۔

"کیسی بات؟"

"میں مقبول گلوں سے آیا ہوں۔ وہ زین وہاں گلوں میں میرے پاس ہی رہتا رہا ہے۔"

"اچھا۔ اچھا۔ ہاں سید زین کیسے ہے۔"

"پڑاؤ ٹھیک تو ہے۔"

"بالکل ٹھیک ہے بلکہ آپ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں۔" افتخار نے تسلی دیتے ہوئے دردانہ کھولا۔

"دیکھو زین العابدین تم سے ملنے کون آیا ہے؟"

گھر سے میں اکثر رضوان موجود نہ ہوتا تو یقیناً "افتخار کا جملہ کچھ اور ہوتا ایک وہی تو جانتا تھا۔ زین کی شادی اس شخص کی بھانجی سے ہوئے والی تھی۔

"بابا! آپ۔۔۔" سید افتخار ہی زین نے اٹھنا چاہا۔

مردود کی ٹہنیوں سینے میں اٹھنے لگی تھیں۔ رضوان نے دونوں ہاتھ اس کے کندھوں پر رکھ کر ہلکا سا رباؤ ڈالا۔

"جہیں احتیاط کی ضرورت ہے زین۔۔۔"

اما مقبول اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں لے کر سر پر ہوسہ دیتے ہوئے رو پڑا۔

"میں نے کہا تھا تا تم سے۔ مت کریدو ماضی کی راکھ۔"

"بابا! ٹیک اسٹ ایڑی۔ کچھ بھی تو نہیں ہوا۔ میں آپ کے سامنے ہوں زندہ سلامت۔" وہ بڑھکلی مسکرایا۔ آج جو تھک گیا تھا۔

"افتخار! تم کیسے ہو۔" رضوان نے اچانک پوچھا۔ افتخار نے چونک کر سر اٹھایا پھر اثبات میں سر ہلایا۔

"ٹھیک ہے۔ ہم لوگ ابھی آتے ہیں۔" اس نے زار کا ہاتھ تھاما اور اسے کہہ بھی کہنے کا موقع دیا۔ بغیر پھر لے آیا۔

"سید رائے رضوان یہاں کیا کر رہا ہے؟"

مائے مقبول نے چونک کر پوچھا۔

"سچا بن کر آیا تھا۔ خون دیا ہے اس نے مجھے۔" جان بھائی ہے میری۔ قدرت کا فیصلہ ہے "ایک بھائی جان چلے گئے کے در پے ہے اور وہ سر۔۔۔" اس نے تھک کر کہنے پر سر رکھا۔

"زین! تم تھوڑی دیر سو جاؤ۔ مگر یہ یہ ٹیبلٹ لے لو۔" افتخار نے سارے سے اسے لوٹا لیا اور گولیاں کھلا دیں۔ ایک درد کی تھی اور دوسری تھک کی۔ وہ ہوش میں آتا تو بوجھ ہی بے احتیاطی کرنا تھا۔ حالانکہ ڈاکٹر نے اسے ملنے جلنے اور زیادہ بات کرنے سے منع کیا تھا۔

"میں نے سوچا تھا۔ میں افتخار بھائی سے کہوں گا کہ وہ آپ سے مل لیں۔ کیسے آپ بھی یہ نہ سمجھیں کہ زین العابدین بھی دوسروں کی طرح۔"

"میں ایسا بھی نہیں سوچ سکتا۔" مائے مقبول نے آتشکی سے کہتے ہوئے سارے سے آنکھیں صاف کیں۔

"وہ تو سوچ سکتی ہے۔" زین ذرا سا مسکرایا۔ "ہر بدگمان ہے۔ لیکن اسے کیسے گاہ۔ زین العابدین وعدہ خلاف نہیں۔"

اس پر غور کی سی چھانے لگی۔

"یہ افتخار ہے۔ اس کی سب سے بات کرنے آیا تھا میں۔"

اما مقبول نے ایک نظر افتخار کو دیکھا اور خاموشی ہی رہا۔

"لیکن آپ کو کس نے بتایا میرے بارے میں۔؟"

"وہ لڑکا تمہارے ہاں کام کرتا ہے۔" مائے مقبول نے آتشکی سے جواب دیا۔

"سلیم! ہاں اچھا لڑکا ہے۔ بے چارہ بہت پریشان ہو رہا تھا۔" اس کی پائلیں نیند سے بوجھل ہونے لگیں۔

"تم سو جاؤ پتر۔" مائے مقبول نے اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا۔

"بابا۔۔۔ مگر آپ نے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ میں تارہ کیسی ہے۔؟" وہ نیم غنودہ سی کیفیت میں سوال کر رہا تھا۔

"اچھی ہے۔"

"بل۔۔۔ مگر بدگمان بہت ہے۔"

افتخار نے مائے مقبول کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا

تھا۔

♥ ♥ ♥ ♥

رضوان نے اس کے احتجاج کی پروا کیے بغیر گاڑی کے پاس آکر ہی اس کا ہاتھ چھو ڈالا تھا۔

"کھلیں جانا ہے۔"

"مہینہ جاؤ۔ تماشا مت بنو۔" وہ ڈیٹ کر گیا ہوا۔ زار اگوا بچوہرا "بٹھی تھی۔ وہ گھوم کر دوسری طرف آکر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا۔ گاڑی اسپتال سے نکل کر سڑک پر آئی تو وہ پھر سے بول اٹھی۔

"رضوان! مجھے کیس نہیں جانتا۔"

وہ شجیدگی سے ڈرائیو کر رہا تھا اس کی بات کا جواب ہی نہیں دیا۔ وہ جزیرہ ہو کر رہ گئی۔

سارا راستہ گاڑی میں خاموشی ہی چھائی رہی۔ پہاں تک کہ گاڑی واسے ہاؤس کے پورچ میں جا کر کی تھی۔ سلیمن بھائی کی گاڑی موجود نہ تھی۔ گویا وہ گھر نہیں اور یہ اچھا ہی تھا۔ وہ اس شخص کی شکل بھی نہ دیکھنا چاہتی تھی۔

رضوان نے رخ بدل کر اس کے ناراض چہرے پر ایک نگاہ ڈالی اور مسکرایا۔

"تھینک یو۔"

"فار داسٹ۔؟" زار نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔

"تمہاری سمجھ میں میری بات آگئی۔" وہ مسکرایا۔ زار اچکھ لئے اس کی بات سمجھنے کی کوشش کرتی رہی۔ پھر نظریں سامنے جماتے ہوئے گویا ہوئی۔

"زین العابدین ایسا نہیں چاہتا۔"

گویا تمہاری سمجھ میں میری بات نہیں آئی۔"

رضوان ہنس دیا۔

زار افتخار کی ہی رہی۔

"ہم سے تو زین العابدین ہی اچھا نکلا۔"

"تو کیا اصل ملا اس کو اس کی اچھائی کا۔" وہ چہچہتے ہوئے لہجے میں پوچھنے لگی۔

"زار! بات نگار کیوں بدل دیتی ہو۔ اتنا غصہ اتنی



نفرت۔

”زندگی کا ہی سب بدل گیا ہے رضوان صاحب۔“ وہ دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔ عالیہ لاؤن میں بیٹھی تھیں۔  
”السلام علیکم۔“ اس نے ہنسنگی سے کہا۔ آج اپنے ہی گھر میں اپنا ہی وجود اجنبی لگ رہا تھا۔  
”زارا۔“ عالیہ تیزی سے اٹھ کر اس کے قریب آئیں۔ اسے گلے لگا کر ریا کرتے ہوئے کہنے لگیں۔  
”کہاں تم ہو آستہ دنوں سے۔“  
”ہسپتال میں ہی تھی۔“ وہ قدرے بے زاری سے گویا ہوئی۔  
”زین کیسا ہے۔“  
”تمہیک ہے۔“

”میں نے تو کئی بار رضوان سے کہا۔ میں بھی اسپتال جاتی ہوں مگر یہ ہمیشہ ہی روک جاتا تھا۔“  
”یہ تو وہاں ہمارا ہی دروازہ ہی برداشت نہیں کرتیں۔ زبردستی لٹکتے ہوئے ہیں وہاں۔“ رضوان نے اندر آتے ہوئے کہا۔

”تم لوگ فریض ہو جاؤ تو میں کھانا لگا دوں۔“  
”بالکل۔“ رضوان نے کہا۔ پھر اس کا کندھا چھو کر بولا۔  
”جاؤ زارا! سوچ کر اور فریض ہو آؤ۔“

”سعد کہاں ہے بھائی۔“  
”اسکول۔“ وہ کچن میں گھس گئیں۔ تو زارا اپنے کمرے میں آگئی۔ سامنے دیوار پر گروپ فوٹو لگا تھا۔ وہ لپٹا شیراز اور ماما۔

وہ اس کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ اس کے نظریں راستے سمیٹ پر جمی تھیں۔

”پاپا! کیا آپ بھی یہی سب کرتے جو رضوان کر رہے ہیں۔ اس نے زین العابدین کو خون دیا۔ اس کی جان بچائی۔ وہ اس کے لیے سب ہی کچھ کرنے کو تیار ہے مگر سلیمان کے خلاف ایک لفظ نہیں من سکتا۔ حالانکہ وہ بھی اچھی طرح جانتا ہے کہ زین پر حملہ اسی

نے کر دیا ہے۔“  
”جانتے ہو اس کے سوال کر رہی تھی کہ جواب تو

محض خاموشی تھا۔

”اور ماما! آپ۔“ اس نے نظریں کا زاویہ بدلا۔  
”تھے برس ان اوکوں کے درمیان کس طرح گزار دیے آپ نے۔ بہت حوصلہ تھا آپ میں۔ اور میں۔ میں اتنا بیزار ہو گئی ہوں ان چند دنوں میں کہ رائے پاؤں کے کسی فرد کی شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتی۔“

اس نے سر جھکا اور وارڈ روپ سے دو سرا سوٹ نکال کر واش روم میں چلی گئی۔ نما کر آئی تو قدرے خود کو تازہ دم محسوس کر رہی تھی۔  
”زارا! کھانا لگ گیا ہے۔“ عالیہ نے اندر آکر کہا۔

”میں آتی ہوں۔“ اس نے ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑے ہو کر برش اٹھایا اور گینے بالوں کو انگلیوں سے سلجھانے لگی۔

”اور یہ میں ہوں زارا رضوان۔“ اس کی نگاہیں ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں منعکس ہوتے آتے ہی عکس پر جم گئی تھیں۔ ”جیسے چند ہی دنوں میں باور کروا دیا گیا کہ وہ رائے خاندان سے کٹ کر کچھ بھی نہیں ہے شاید میں یہ ثابت کر رہی ہوں کہ زارا اتنی بھی کمزور نہیں۔“ اس نے سسکی اٹھائی تو کرسکتی ہے ایک ہلکا سا دھچکا بھی رائے سلیمان کو لگ جائے تو اس کا زعم پاش پاش ہو جائے مگر یہ افکار اور زین العابدین۔“

وہ جھنجھلائی۔ تب ہی نگاہ عقب میں کھڑی عالیہ پر پڑی۔ وہ حیدرآباد ہی اب تک وہیں کھڑی تھیں۔ زارا جانتی تھی کہ وہ کیا کہنا چاہتی ہیں۔

ایک رخ سی مسکراہٹ نے اس کے لبوں کا احاطہ کیا۔

”زارا۔“ انہوں نے کچھ کہنا چاہا۔ زارا برش واپس ٹیبل پر رکھتے ہوئے چلی۔

”چلیں بھائی! کھانا کھاتے ہیں۔“  
وہ اس موضوع پر ان سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتی تھی۔

رضوان خود بھی نما کر آیا تھا اور اب ٹیبل پر اس کا

کھڑا تھا۔ زارا عالیہ کے برابر کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔  
”آپ کے بھائی کی گفتنی کب ہے عالیہ بھائی۔“

رضوان نے دیکھا، نکھرے نکھرے دھلے چہرے پر ہلکا سا اضطراب اور اضمحلالی بکھراہٹ۔ آنکھوں میں بے اعتنائی اور شکل کی ٹیکر۔ مکہ خود کو مارل پوز کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

(مگر میں اس سے زیادہ کربھی کیا سکتا تھا۔ باپ جیسے بھائی کے خلاف کیسے اٹھ کھڑا ہوتا۔ تم نے مجھ سے میرے حوصلے سے زیادہ ہانگ لیا تھا زارا۔)

”اگلے جمعہ ہے۔“ عالیہ بھائی نے مختصر ”بتایا۔ زارا نے اپنے چہرے پر اس کی نگاہوں کی پیش محسوس کی تو پلٹ پر جھک گئی۔ رضوان نے بھی اچھی توجہ کھانے کی طرف مبذول کر لی تھی۔ عالیہ ایک ایک ڈش ان دونوں کے سامنے رکھ رہی تھیں۔

”سلیمان بھائی کہاں ہیں۔“ رضوان نے اچانک پوچھا۔

”پتا نہیں۔“ صبح ہی نکل گئے تھے۔“ عالیہ نے آہستگی سے بتایا۔

زارا براے نام کھا کر اٹھ گئی۔

”چلیں۔“ اس نے رضوان سے کہا۔

”ہاں۔ میں یہ ختم کر لوں۔“ رضوان نے کہا پھر عالیہ سے مخاطب ہوا۔ ”ایک کپ کافی مل جائے گی۔“

”ہاں۔ میں جاتی ہوں۔“

زارا اجڑ رہی تھی۔ وہ جان بوجھ کر رو کر رہا تھا۔

”تم لوگ زارا!۔“ عالیہ نے پوچھا۔

”نہیں۔ میں اپنے کمرے میں ہوں۔ ذرا جلدی

فارغ ہو جائے گا۔“ وہ رضوان سے کہہ کر کمرے میں آگئی۔

تھا بھی جاسکتی تھی۔ مگر جانتی تھی۔ وہ جانے نہیں دے گا۔ وہ یونہی کتابیں کھول کر دیکھنے لگی۔

بہت دیر تک بیٹھنے کے بعد بھی وہ نہ آیا تو وہ جھنجھلا کر

آگئی۔

اسی بل رضوان اندر آگیا۔

”فارغ ہو گئے آپ۔“ اس نے طنزاً پوچھا۔  
”جی ہو گئے۔“ اس کا لہجہ مستم تھا۔  
”تو چلیں پھر۔“ وہ چپ سی کی تھی۔

”نئی جلدی کیا ہے۔“ اس کی مستم نگاہیں زارا کے چہرے پر جمی تھیں۔ اپنے عقب میں دروازہ آہستگی سے بند کرتے ہوئے اس نے بند دروازے سے ٹیک لگائی۔

”زین وہاں آگیا ہے رضوان۔“ زارا کو سخت غصہ آ رہا تھا۔

”کیا نہیں ہے۔ بہت لوگ ہیں اس کے پاس۔ جو تم سے بہتر اس کی دیکھ بھال بھی کر سکتے ہیں اور حفاظت بھی۔“ لہجہ ہنوز وہی تھا۔

”آخر آپ چاہتے کیا ہیں۔“ وہ جھنجھلائی۔

”بہت دنوں سے تمہیں ڈھنگ سے دیکھا نہیں

اور نہ بات کی ہے۔“ وہی پر شوق نگاہیں وہی مستم لہجہ۔

زارا ایک بل کو پرل سی ہوئی۔ پھر تھملا کر بولی تھی۔

”میرے پاس نہ وقت ہے اور نہ ایسی کوئی خواہش۔“

”میرے پاس وقت بھی ہے اور خواہش بھی۔“

لجھوا لہجہ ہنوز وہی نغہ۔

”رضوان! ہمارا گلاسک۔“

رضوان نے اسے کندھوں سے تھام کر اس کا رخ دوسری طرف کیا۔

”ذرا آگینے میں اپنا چہرہ دیکھو۔ کیا حال کر لیا ہے ان

چند دنوں میں۔“

وہ ایک جھٹکے سے پیچھے ہٹی۔ پھر اس کی طرف چلی۔

”آپ چل رہے ہیں یا نہیں۔“

”نہیں۔“ دونوں ہاتھ سینے پر باندھتے ہوئے وہ

کچھ اور پھیل گیا۔ زارا کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

اپنے سامنے ایسا لہجہ اس دیوار چین کو کس طرح

بنائے اس کا چہرہ سرخ اور نفس تیز تھا۔ یہ یقیناً اس

کی قربت کا اعجاز نہیں۔ غصے کا اثر تھا۔ تھننا ہوا چہرہ اس

کی اندرونی کیفیات کا غماز تھا۔ رضوان مسکرا دیا۔



"اچھا ٹھیک ہے۔ تھا جو نے کی ضرورت نہیں۔ چلتے ہیں۔" شاید ترس گیا تھا۔ اس نے دروازے کی تال تھما لی۔ کچھ سوچ کر پلٹا۔ ایک لمحے اس کی سرخ آنکھوں کو بغور دیکھا۔ پھر بارہا ہرنگے لگا۔ پھر رک گیا۔ زارا بوا بیا دھن میں آگے بڑھی تھی۔ اس سے ٹکرا گئی۔

"رضوان۔۔۔" اس نے جڑ کر کہا۔  
"فرمائیے۔۔۔" وہ وہیں ایستادہ تھا۔  
"یہ کیا حرکت ہے۔۔۔؟"

"ارادہ تو یہی تھا کہ ہم واپس جائیں گے مگر اب بدل گیا ہے۔ بہتر ہے۔ تم کچھ دیر آرام کر لو۔"

"مجھے اس کی ضرورت نہیں۔" وہ تھک کر بولی۔  
"تمہیں ضرورت ہے۔ بہت دنوں سے ڈھنگ سے سو نہیں پائی ہو۔ بہتر ہے کچھ گھنٹوں کی پرسکون خندے اور میں بھی ایک چکر آؤں گا گاؤں گد شام کو اکٹھے اسپتال جا میں گے۔ آوازیں دینے کی ضرورت نہیں کیونکہ عالیہ سعد کو لینے اسکول چاری ہیں اور ملازم یہ کام کریں گے نہیں۔" اس نے بے حد آرام سے پان کیا اور دوسرے بٹن پر کلک کر دروازہ بند کر دیا۔

"رضوان! دروازہ کھولیں۔ مجھے نہیں سوئے۔" ایک بڑے گودہ کچھ سمجھ ہی نہ پائی تھی۔ بس ششدر سی رہ گئی۔ پھر ہوش آیا۔ تب چینی چینی۔  
"زیادہ چلانے کی ضرورت نہیں۔" وہ ڈپٹ کر بولا۔  
"میں چند گھنٹوں میں آ جاؤں گا۔ گڈ بائے۔"

"گڈ بائے کے ساتھ ہی وہ سری طرف خاموشی چھا گئی تھی۔ شہدے غصے کے باوجود وہ جانتی تھی۔ اب کسی کو پکارنے کا کوئی فائدہ نہ ہو گا۔ بہت دیر گھرے میں اوچر اوچر پکڑانے کے بعد وہ بیڈ پر بیٹھی کھولنے لگی۔ اسی کھولنے تھلانے کے درمیان کب اس کی آنکھ لگی۔ اسے خود بھی خبر نہ تھی۔

"آپ بے حد اطمینان سے واپس جائیں بیبا! اب میں بالکل ٹھیک ہوں۔"

جب تک زین سویا رہا تھا۔ ماما مقبول اس کے پاس بیٹھا نجانے کیا کیا پڑھ کر بچو نکلا رہا تھا۔  
"اور ہاں۔۔۔" کسی کو کچھ بتانے کی ضرورت نہیں۔  
میں جلد ہی آؤں گا۔"

ماما مقبول اب بھی جانے کو تیار نہ تھا۔ زین نے بہت اصرار کے ساتھ بھیجا۔  
"پتہ! اس کا خیال رکھنا۔" اس کے سر پر بوسہ دیتے ہوئے اسے مقبول نے افتخار سے التجا کی۔  
"آپ فکر ہی نہ کریں۔"

"اور بیبا۔ بہت خیال رکھیے گا۔ کسی کو خبر نہیں ہونی چاہیے کہ آپ سب کچھ جانتے ہیں۔ بس ایک مناسب وقت پر گواہی دینی ہے۔"

ماسے مقبول نے خاموشی سے اثبات میں سر ہلادیا۔  
"مالا نکدہ کچھ اور سوچ رہا تھا۔"

"وہو بھی وہاں براہمت کرنے والا سر ڈھونڈا ہے تو ہے۔" ماسے مقبول کے جاتے ہی افتخار نے ہنستے ہوئے پتھرنا۔

"بات تو اس کی ہے جو شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتی۔" زین مسکرایا۔

"تمہاری اور میری قسمت ایک جیسی ہے۔" افتخار نے ایک تھ بھری اور پھر سے "وہ آخری لئے میں منہ زور نکالتا ہے لگا تب ہی رضوان اور زارا آ گئے۔

"ہیلو ابوری! باؤی! رضوان کاموڈ خاصا خوشگوار تھا۔ سارا رستہ وہ زارا کا ہڈا ہوا موڈ دیکھ کر حفظ اٹھا تا رہا تھا۔

"آپ لوگ کہاں غائب ہو گئے تھے؟" زین نے پوچھا۔  
"تھوڑی دیر کے لئے گھر گئے تھے۔ محترمہ کو نیند آرہی تھی۔ گھرے میں گھس کر سو گئیں تو بس ابھی جاگیں ہیں۔" رضوان کا لہجہ بہت نرم اور شیریں تھا۔  
"رضوان! بھوٹ کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔" وہ تھلا کر گویا ہوئی۔

رضوان ہنستے ہوئے زین پر چمکا۔  
"ٹھیک ہونا۔ کوئی تکلیف وغیرہ تو نہیں ہے؟"

"نہیں۔ اب میں بہت بہتر ہوں۔"

"اچھا۔ مجھے ایک میٹنگ کے لیے جانا ہے۔ رات میں آؤں گا۔"

"کوئی ضرورت نہیں۔" زارا نے غلطی سے کہا۔  
رضوان ہنس دیا۔

"آپ سے مشورہ کس نے مانگا ہے محترمہ۔"

"میں بھی ایک چکر گھر کا لگا آتا ہوں۔ زین کے لیے کچھ بوالاؤں گا۔" افتخار نے کہا۔ وہ دونوں ایک ساتھ ہی باہر نکل گئے۔

"آپ کاموڈ کیوں خراب ہے؟" زین نے اس کا تپا ہوا چہرہ دیکھا۔  
"یہ رضوان! اس نے بھی آج حد کر دی۔" زارا نے ہنستے ہوئے بتایا تو زین مسکرا دیا۔

"بہت اچھا کیا۔ اب خاصی فریش لگ رہی ہیں۔"

زارا خاموش ہی رہی۔  
"وہیے زارا آپ اپنی بات واقعی کہتی ہیں۔"

"وہ کس طرح؟"

"رضوان واقعی بہت اچھے اور شاندار انسان ہیں۔"

"شاندار اور اچھے انسان کی تعریف میرے نزدیک تھوڑی مختلف ہے۔ جو حق کا ساتھ دے سکے خواہ سامنے اس کا کوئی عزیز ہی کیوں نہ ہو۔" زارا کا لہجہ سنجیدہ تھا۔

"کہاں ہوتا ہے ایسا۔ اب اگر مجھے یہ معلوم ہو کہ بابا نے واقعی قتل کیا تھا۔ تو آپ کا کیا خیال ہے۔ میں ان سے نفرت کر سکوں گا۔ میں ان کے اس فعل سے تو نفرت کروں گا۔ مگر ان سے نہیں۔ رضوان بھائی بھی رائے سلیمان کی اس حرکت سے نفرت کرتے ہیں۔ مگر وہ ان سے نفرت نہیں کر سکتے۔"

"اب تم نے کیا سوچا ہے؟ ہمارے یہ خاموشی ہماری کمزوری بن جائے گی۔ رائے سلیمان کو تو شہدہ مل جائے گی۔"

"ہمیں اس خاندان کو اکٹھا کرنا ہے زارا! ہمارا شہدہ یہ تو عمل تو دلوں میں مزید کدورتیں اور نفرتیں پیدا

کرتا۔ ہمیں جو کچھ کرنا ہے، بے حد احتیاط اور سوچ سمجھ کر کرنا ہے۔"

اس کی بات سن کر زارا مسکرا دی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر اس کی پیشانی پر بکھرے بالوں کو انگلیوں سے میٹھا۔

"زین! تم سے اب زارا کو مشورے لینے پڑتے ہیں۔ مگر مجھے اچھا لگا۔ تمہارے اندر اب وہ جذباتی پن نہیں رہا۔"

"وقت سب سے بڑا استاد ہے، سارے کس مل ٹکل دیتا ہے۔" وہ آہستہ سے ہنسا۔  
"مگر اب ہمیں کرنا کیا ہے۔ میں سوچ رہی تھی، میں خود گاؤں جاؤں۔"

"میرا نہیں خیال اس کی ضرورت ہے۔"

"تو اس شخص کا پتا کیسے چلے گا۔ کبھی بھی تو مجھے بھی شک ہوئے لگتا ہے۔ رائے سلیمان اس میں انوالوڈ ہے۔"

"اتنی بڑی باتیں منہ سے نہیں نکالتے زارا! جن پر بعد میں کچھ تانا پڑے۔" ان دونوں نے چونک کر دروازے کی سمت دیکھا اور ساکت رہ گئے۔  
رائے سلیمان اپنے مخصوص انداز میں اندر داخل ہوئے تھے۔

(آخری قسط آئندہ جلد ملاحظہ فرمائیں)

عمران ڈائجسٹ کا ایک حیرت انگیز سلسلہ

# ایر میسٹرس

آپ درحقیقت میں شانہ ہو گئی ہے!

مکتبہ عمران ڈائجسٹ، ۲۴، ندو بازار کراچی

UrduPhoto.com

UrduPhoto.com

UrduPhoto.com



”بہت خوب۔ یہ تم اخبار والے اور تمہاری کمائیاں۔“

”حقیقت سامنے نہیں آئے گی تو ہم مفروضات پر ہی بات کریں گے۔“ زین نے طنز سے کہا۔

”حقیقت! جانتے ہو حقیقت کیا ہے؟“ وہ اس کی طرف بٹے۔

”جانتا چاہتا ہوں۔“ زین نے جواب دیا پھر سوالیہ انداز میں پوچھنے لگا ”کیا آپ نہیں جانتا چاہیں گے۔ اگر آپ واقعی اس میں اتنا دلچسپ ہیں۔“

”حقیقت جان کر کیا کرو گے؟“ رائے سلیمان نے اس کا سوال نظر انداز کر دیا۔

”بے فکر رہیں کوئی دعویٰ نہیں کر دوں گا۔“ وہ مسکرا دیا۔ رائے سلیمان کا مقدمہ بے ساختہ تھا۔ پھر سنجیدہ ہوتے ہوئے بولے۔

”تمہارا کیا خیال ہے۔ رائے سلیمان تمہارے دعوؤں سے ڈرتا ہے۔“

”زین خاموش ہی رہا۔ زارا بھی خاموشی سے ان کی گفتگو سن رہی تھی۔

”جانتا ہوں۔ بہت نفرت بھری ہے تم دونوں کے دلوں میں۔“ انہوں نے خاموش کھڑی زارا پر نگاہ ڈالی۔

”نفرت تو آپ کے دل میں بھی زین کے خلاف جو باہر بھی آگئی۔“ زارا نے پیچھے ہٹتے ہوئے لہجے میں ان کی بات قطع کی۔

”ریلیکس زارا۔“ انہوں نے پرسکون انداز میں اسے بچوں کی طرح ہلکا کر دیا۔

زارا اٹھلا اٹھی مگر خاموش رہی۔ رائے سلیمان کا انداز ڈر لگ رہا تھا۔

”چلو ان سب باتوں کو ایک طرف رکھ کر ایک ڈیل کرتے ہیں۔ اس مسئلے کو حل کرتے ہیں۔“ ان کا لہجہ دوستانہ تھا۔ دونوں نے چونک کر ایک دوسرے کو دیکھا۔

”کیسی ڈیل۔“ زین نے پوچھا تھا۔

”تم جانتا چاہتے ہو؟“ شخص کون تھا جس نے مجھے میرے باپ کے قتل کی اطلاع دی۔“ ان کا لہجہ

”آپ۔“ زارا کھڑی ہو گئی۔

”ہاں میں۔“ انہوں نے پرسکون انداز میں جواب دیا اور زین کی طرف بڑھے مگر زارا یوں ان کے سامنے آگئی تھی۔ جیسے انہیں زین تک جانے سے روکنا چاہتی ہو۔ ان کی پیشانی پر ایک شکن ابھری۔

”آپ یہاں کس لیے آئے ہیں؟“

”زین کی خیریت معلوم کرنے۔“

”آپ کو اس کی خیریت سے کیا سروکار۔“ اس نے پہنچتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

”زارا! اسٹ جاؤ سامنے سے۔“ وہ مقلی انداز میں گویا ہوئے۔

”آئی ایم ساری رائے سلیمان صاحب! لیکن اب میں آپ کا سایہ بھی زین پر پڑنے نہیں دوں گی۔“

”ڈونٹ لی سلی زارا۔“ زارا کے رویے پر غصہ آنے کے بجائے ان کے چہرے پر مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔

”زارا! آنے دیں۔“ زین کے کہنے پر زارا گویا مجبوراً آگے سے بھی گئی۔

وہ زین کے قریب آگئے ایک ہاتھ بیڈ کی بیک پر ٹکاتے ہوئے اس پر ہنکے۔

”کیسے ہو زین العابدین۔“

زین نے جواب نہیں دیا۔ خاموشی سے انہیں دیکھتا رہا۔ اس کی آنکھوں میں استغلاب تھا۔ جواب زارا کی طرف سے ملا تھا۔ گہرے طنز میں لپٹا ہوا۔

”زندہ ہے۔“

”چھی بات ہے۔“ وہ زیر لب مسکرائے اور سیدھے ہو کر دونوں ہاتھ پشت پر باندھتے ہوئے زارا کو دیکھنے لگے۔ جس کے بے حد سنجیدہ انداز میں بیزارگی ہی بیزارگی تھی۔

زین جیسے کے سارے ذرا سا ناخواب۔

”قربانی کیسے زحمت کی؟“ زارا کا ہر انداز اجنبیت لیے ہوئے تھا۔

”تو تمہارے خیال میں میں اپنے باپ کے قتل میں الزامی ہوں۔“ وہ زارا سے مخاطب تھے۔

دوستانہ تھا۔ دونوں نے چونک کر ایک دوسرے کو دیکھا۔

”یقیناً۔“ زین نے مختصراً کہا۔ رائے سلیمان کچھ لمبے خاموشی سے اسے دیکھتے رہے پھر بیک پر ہاتھ اٹا کر ہنکے۔

”وہ شخص کون تھا زین! جس نے تمہیں سب کچھ بتایا ہے۔“

زین نے ٹھنڈا کر زارا کو دیکھا۔ اس نے آہستگی سے نی میں سر ہلایا تھا۔

”صوری۔ یہ میں نہیں بتا سکتا۔“

”گالوں میں ہی ہے نا۔“

سلیمان نے پوچھا۔ زین نے لب بھینچ لیے۔ اسے سلیمان کی زیرک اور گہری نگاہوں سے انجھن ہو رہی تھی۔

”تو تم نہیں جانتا گے۔“ وہ کچھ لمبے منتظر رہنے کے بعد گویا ہوئے پھر سیدھے ہو گئے۔

”ٹھیک ہے ایریووش۔“ چٹا ہوا لب میں۔ اس کا خیال رکھنا زارا۔ ویسے میں ڈاکٹر کسی سے مل لوں گا۔“

”بہت بہت شکریہ۔“ زارا کا لہجہ گہرے طنز کا نمازی تھا۔ وہ ہلکا سا مسکرائے اور جس طرح اچانک آئے تھے اسی طرح چلے گئے رضوان ان کو پارکنگ میں ملا تھا۔ انہیں دیکھ کر ہنک گیا۔

”آپ یہاں۔“ ظاہر ہے سلیمان کا یہاں آنا انجھن کی بات ہی تھی۔

”ہاں۔ تم گھر جا رہے ہو؟“ انہوں نے سنجیدگی سے پوچھا۔

”نہیں آفس۔“ رضوان کا انداز کڑیا ہوا تھا۔ سلیمان نے بغور اسے دیکھا پھر اس کا کندھا تھپتھا کر اپنی جیب کی طرف بڑھ گئے رضوان کی آنکھوں میں انجھن خیر نے لگی تھی۔

♥ ♥ ♥ ♥

بلیب کی زرد روشنی میں وہ کب سے کتابوں کو الٹ پلٹ کر دیکھ رہی تھی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ

کہاں سے شروع کرے۔ امن دن ملا مقبول خالی ہاتھ ہی گھر آیا تھا۔ کچھ دواں اور بہت بے چین۔ زمین تارہ کے بار بار پوچھنے پر بھی اس نے کچھ نہیں بتایا تھا۔ کتابیں اسے قاسم نے لاکر دی تھیں اور اب سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔

”صبح خولی جاؤں گی شاید وہی میری کچھ مدد کر سکیں۔“

انکس کی کتاب کی ورق گردانی کرتے ہوئے اس نے سوچا۔

ماتے مقبول کی چار پائی چرچ آئی۔

نیم تارہ نے چونک کر سر اٹھایا۔ وہ کب سے کھوت پر کھوت بدل رہا تھا۔ اسے لگا دو شنی ماتے مقبول کو بے چین کر رہی ہے۔ وہ کتابیں رکھ کر اس کے قریب آگئی۔

”کیا ہو الما! ایند نہیں آ رہی؟“

ماتے مقبول نے چونک کر سر اٹھایا۔

”نہیں۔ بس ایسے ہی۔“

”بتی بھجواؤں۔“

”رہے دو۔ پڑھو تم۔“

”پڑھنا تو نہیں۔ ابھی تو کتابیں دیکھ رہی تھی۔“

نیم تارہ نے آہستگی سے کہا اور پائنتی کی طرف بیٹھ کر اس کے پاؤں دبانے لگی۔ ملا مقبول سیدھا ہو کر لیٹ گیا۔ اس کی کھلی آنکھوں کے سامنے سیاہ رات کے سینے پر لاکھوں ستارے غنما رہے تھے۔ تب ہی ایک ستارہ ٹوٹ کر زمین کی طرف بکھرا۔

”خدا اسے اپنی امن میں رکھے۔“

بے ساختہ ایک دعا اس کے لبوں پر پھلی۔

”کسے ملا۔“ نیم تارہ نے حیران ہو کر پوچھا۔

وہ خاموش ہی رہا۔ نیم تارہ بھی خاموشی سے پاؤں دباتی رہی۔ آج خلافت مقبول ماتے مقبول نے اسے منع نہیں کیا تھا۔ بہت دیر کے بعد نیم تارہ نے خود ہی پوچھا تھا۔

”اما! ایک بات پوچھوں؟“

ماتے نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔



”جب سے شہر سے آئے ہو۔ یونسی بے چین ہو۔ شہر میں کوئی بات ہو گئی کیلے۔“

اس کے ہاتھ رک گئے تھے۔ مائے مقبول نے پاؤں کھینچ لیے اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ دونوں ہاتھ گھٹنوں کے گرد لپیٹ لیے۔

”اما مجھے بھی نہیں بتاؤ گے؟“

اما بے حد خاموشی سے اسے دیکھا رہا۔ پھر زیر لب پڑھایا۔

”تمہارے لیے یہ تمہارے لیے یہ سب کرنا پڑے گا ورنہ تو سب ختم ہو جائے گا۔“

”کیا کہہ رہے ہو اما۔“ ”نہیں تارہ کے پلے کچھ نہیں پڑا تھا۔“

”کچھ نہیں چاہو تم سو جاؤ۔“

اس نے دوبارہ سے لیت کر کوٹ بدل لی۔ وہ کچھ لمبے حیرت سے اسے دیکھتی رہی کہ مائے مقبول کا رویہ ناقابل فہم تھا۔ پھر لپٹ کر چارپائی پر آکر بیٹھی تو ذہن میں صرف اور صرف کتابیں تھیں جنکے مائے مقبول کا ذہن ہر قسم کے سووڑیاں سے نکل کر ایک خاص فیصلے پر پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا۔

♥ ♥ ♥ ♥

”تمہارا کل پاگل ہو چکی ہو۔“ وہ سخت غصے میں تھی۔ عظمیٰ نے سر اٹھا کر اسے دیکھا اور مسکرا دی۔

”تمہیں یہ گمان کیوں ہوا؟“

”کیونکہ ایسا فیصلہ ہوش میں نہ کر نہیں کیا جاسکتا۔“

انہم نے غصے سے کہا تو وہ ہنس دی۔

”ست ہنسو اس طرح۔ زہر قحطی ہے مجھے تمہاری یہ ہنسی! کیا ثابت کرنا چاہتی ہو۔ بہت خوش ہو تم۔ تم خوش نہیں ہو عظمیٰ بی بی! تو خوش ہونے کا ٹانگ بھی ست کرو۔ جی پاؤں کی ایک ایسے شخص کے ساتھ جس کے نزدیک یونیورسٹی جانے والی ہر لڑکی کا کردار مشکوک ہے جسے نہ کسی کرنے والی عورت نہیں چاہیے۔ کیا تمہارے پاس اتنے بڑے لکھ کر اب کیا ساری عمر اس جاہل کے ساتھ گزار دو گی تمہیں کیا مل جائے گا تمہیں اس کی

چاکری کر کے الٹا کر جائے گا! خاندان کی باقی لڑکی کو مکمل ڈال کر گھر میں جو بند کر دیا اس نے۔ وہ ایک دم جاہل ہے عظمیٰ۔ کیسے رہاؤ گی اس کے ساتھ۔“

عظمیٰ نے سر اٹھا کر دروازے میں کھڑی آگ بکولہ ہوتی انہم کو دیکھا۔ وہ اس کی سبیلی تھی اس کی ہمدردی اور غمگسار سبیلی۔ اس کے لیے اسی سے لڑ رہی تھی۔ بے وقوف تھی اس سے لڑنے کو کہہ رہی تھی جو سارے ہتھیار پھینک چکی تھی۔ لب خاموش تھے۔ آنکھیں خشک مگر خود کہ اس کے چہرے پر لکھا گیا تھا ”صرف انہم بڑھ سکتی تھی۔“

اس نے ماہ جس اٹھا کر بلا وجہ تلی جلائی۔ کچھ لمبے اس کے شعلے کو دیکھتی رہی پھر پھونک مار کر تلی بجھا دی۔

”جاہل تو نہیں خاندان کا واحد گریجویٹ ہے۔“ اس کی توازن میں کچھ بھی نہ تھا۔ ایک دم سیات۔

”ہاں ایسا گریجویٹ جس کے ذہن کے جالے اس کی ڈگری بھی نہ اتار پائی۔ جو ترجیح بھی عورت کو دیا کر جلا کر خوش ہوتا ہے۔“ ”نہ خرچ کر لوں۔“ ”پاؤں کی جوتی بنا کر رکھے گا! طے دے دے کر مارے گا اور جو سر راہ کوئی کلاس فیلو مل گیا۔ تو خشک کے کوڑے رسید کرے گا تمہارا وہ گریجویٹ کرن۔“

”اب اتنا ہولناک نقشہ تو مت کھینچو۔“ عظمیٰ جھرمجھری لے کر رہ گئی۔

”کچھ ایسا ہی ہو گا۔ تم سے زیادہ تو میں جانتی ہوں تمہارے خاندان کو۔ اپنی ہنسیوں کو تو پراگمندی کے بعد ہی گھر بٹھا چکا ہے۔ اور تم۔“

انہم نے بے حد دکھ سے اس سے جس لڑکی کو دیکھا۔ جو بے حس نہیں تھی بننے کی کوشش کر رہی تھی۔ انہم کے لیے میں پھلتا غصہ دکھ میں بدل گیا۔

”تمہیں تو فیملی میں اتنا تھا عظمیٰ! انہم کرنا تھا خود کو متواتر تھا کیا ہوئے تمہارے وہ خواب وہ آرزوئیں وہ خواہشیں۔“

عظمیٰ نے ماہ جس پھوڑ کر دونوں ہاتھ تھنوں کے گرد لپیٹ لیے۔

”زندگی کوئی ہماری خواہشوں کے مطابق تھوڑی گزرتی ہے تقدیر کے اپنے ہی پکڑ ہیں۔ اسے ہمارے خوابوں اور آرزوئوں سے کیا غرض اور میں نے تو خواب دیکھا چھوڑی دیا ہے۔“

”جب کوئی خود ہی ڈوبنے کو تیار ہو تو تقدیر بے چاری کیا کرے۔“

”میں کچھ نہیں کر سکتی انہم!“

”روشنی کی سفیر بن کر نکلی تھیں۔ خود کو اندھیروں کے سپرد کر دیا۔ وہ روشنی کا دیو کیا ہوا جسے پاؤں مخالف بھی بچھان پائی تھی؟“

انہم کے سوال پر اس کی آنکھوں میں ہلکی سی چمک ابھری۔

”وہ دیا اب بھی نہیں بچھا۔ میرے پیچھے کتنے والے روشنی کے رستے پر قدم رکھیں گے۔“

”یہی آنے والے سوال کریں گے کیا تعلیم تمہیں اتنا شعور بھی نہ بخش سکی کہ صحیح اور غلط کا فیصلہ کر سکو۔ تمہارا عمل انہیں خوفزدہ کرے گا جو اپنے لیے رستہ نہ ڈھونڈ سکی وہ دوسرے کے لیے کیا راہ نکالے گی۔“ ”بھگے ہوئے لوگ دوسروں کو رستہ دکھا سکتے ہیں عظمیٰ بی بی!“

”بھگے ہوئے لوگ۔“ عظمیٰ نے تعجب سے اسے دیکھا۔

”اپنے اپنی آنکھوں میں غور سے دیکھنا عظمیٰ! وہاں کھمبے خوابوں کی دھول اڑتی ہے۔ انہوں نے تو بڑے ماں کے ساتھ اپنے خواب سوئے تھے تم نے کیا کیا ان کے ساتھ۔ انہوں نے کیا کچھ تمہیں سوچ رکھا تھا تمہارے لیے۔ ایک خوبصورت زندگی! ان تنگ

زمنوں اور گھٹے ہوئے ماحول سے دور۔ اسی لیے تمہیں اتنا بڑھایا لکھایا سب سے غریب۔ آج بھی وہ تمہاری ڈھال بن جائیں گے عظمیٰ۔“

عظمیٰ کیا کہتی۔ دیکھ رہی تھی! اب کتنے خاموش ہو گئے تھے اور ان سارا دن پڑھائی رہتی۔ انہیں ان باپ بیٹی کی سمجھ نہیں آتی تھی۔ وہ اب اسے لڑتیں اتنا اچھا رشتہ خاندان کا سب سے امیر گھرانہ! پیسے اور

زمینوں والا۔ بیٹی کے بوجھ کو تو اتارنا ہی ہے پھر انتظار کس بات کا۔ لیام سلوے بیٹھے تھے۔ بجائے انہیں کس کا انتظار تھا۔ اماں اندر سے ڈرتی تھیں۔ ان کی نفاست پسند پڑھی لکھی بیٹی اس ماحول میں گھٹ کر رہ جاتی۔ مگر مجبوری تھی۔ عظمیٰ کی ہم عمر سب بیوی بچی تھیں اور وہ بڑھائی کے پتھروں میں عمر نکال رہی تھی۔

اماں کے حساب میں لوگ بائیں بناتے تھے۔ عظمیٰ سب دیکھتی اور سمجھتی تھی مگر کوئی بہری بیٹی رہتی۔

”خاموش کیوں ہو عظمیٰ ہو۔“ انہم نے چونکا دیا۔ وہ شاکی نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

”اچھی سبیلی ہو۔ حوصلہ بڑھانے کے بجائے کم کر رہی ہو۔“

”میرا نہیں خیال! قسطوں میں خود کشی اتنا اچھا فعل ہے۔“ ”وہ طعنا“ مسکرائی عظمیٰ خفا ہو کر انہی باہر نکلنے لگی تو انہم نے اس کا بازو پکڑ کر روکا۔

”اسے بھول سکو گی۔“ اس نے جھپٹے ہوئے لمبے میں پوچھا۔ وہ بھلابھلاہٹے ہوئے نظروں سے انہی پر اچھی پھر بازو چھڑا کر ہار نکلی۔ انہم ایک طویل سانس لے کر رہ گئی تھی۔

♥ ♥ ♥ ♥



سکون انداز میں بیٹھے تھے مگر رضوان ایک ایسا شخص تھا جس کی بے اعتنائی اور خفگی انہیں بے سکون بنا دے۔ چٹکن کر رہتی تھی۔

وہ بے سکون اور بے چین تھے کیونکہ رضوان ان سے تھا تھا۔

وہ یہ بھی جانتے تھے کہ اپنی عادت کے مطابق وہ دن سے کہے گا نہیں۔

”تم ہیشتمہ کیوں نہیں کر رہے۔“ انہوں نے اخبار سے نظر اٹھا کر اپنے ازل پر سکون انداز میں دریافت کیا۔

رضوان نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا پھر مختصراً ”گویا“

”وقت نہیں ہے۔“

”اپنا حال جان رہے ہو۔“ انہوں نے اخبار لپیٹ کر ایک طرف رکھا اور چائے کا کپ اٹھا لیا۔

”آفس۔“ رضوان نے بریف کیس بند کر کے کھڑا ہو گیا۔ اس سے قبل کہ باہر نکل جاتا انہوں نے دوبارہ پکارا۔

”رضوان! وہ پولیٹ کرا نہیں دیکھنے لگا۔ وہ کچھ لمے انہیں دیکھتے رہے۔ پھر نظروں سے اٹھا کر تے ہوئے بولے تھے۔

”تمہارا وارنٹ۔“

رضوان نے چونک کر نگاہ دوڑائی پھر آگے بڑھ کر وارنٹ اٹھا لیا۔

”تم مجھ سے کتنا لے کیوں گے ہو؟“

رائے سلیمان کے اچانک پوچھنے پر وہ مضطرب سا گیا۔ پھر وارنٹ ہاتھ میں لیتے ہوئے بولا تھا۔

”ایسی کوئی بات نہیں۔“

”ایسی بات ہے۔“ رائے سلیمان زور دے کر بولے۔

”میں نہیں پر ہوں تو تم ہاشتمہ نہیں کرتے۔“

”آپ کو پروا ہے؟“ رضوان کا لہجہ جھجکا ہوا تھا۔

”کیا یہ بتانے کی ضرورت ہے۔“ انہوں نے لٹا دیا۔

”جی ہاں۔ کیا رائے سلیمان کو یہ بتانے کی ضرورت ہے کہ اسے تمہاری پروا ہے یا نہیں۔“ وہ زور دے کر بولے۔

”آپ کو کسی کی پروا نہیں ہے۔“ رائے سلیمان ساکت رہ گئے۔

”مگر ہوتی تو۔“ وہ جملہ اوجھڑا چھوڑ کر لب بھجج کر رہ گیا۔

”تو۔؟“ انہوں نے استہدایہ انداز میں اسے دیکھا۔

”میں چلا ہوں۔“

”جملہ پورا کرو رضوان۔“ ان کی گرج دار آواز نے جہاں رضوان کے قدموں کو نہ بچر کیا تھا وہیں عالیہ

کچن کے دروازے میں رک گئیں۔

”بولو۔“ وہ اٹھ کر اس کے سامنے آ گئے۔

رضوان نے لب بھجج کر انہیں ایک نظر دیکھا پھر بڑبڑایا تھا۔

”آپ کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔“

”کیا نہیں کرنا چاہیے تھا۔“ وہ رخ بدل گیا تھا۔

سلیمان نے اسے کندھے سے جھنجھوڑ کر دوبارہ سے اپنے سامنے کیا۔ ان کی آواز اور آنکھوں میں غصے کی لپک تھی۔

”زین کو قتل کروانے کی کیا ضرورت تھی۔“

رضوان جھنجھلا گیا۔

اس کے کندھے پر سلیمان کی آہنی گرفت ہلکی پڑ گئی۔

”وہ قدم پیچھے ہٹ کر انہوں نے رضوان کو بغور دیکھا۔ وہ سبے حد جھنجھلا رہا تھا اور خفا سا نظر آ رہا تھا۔

انہوں نے دونوں ہاتھ پشت پر باندھتے ہوئے ایک طویل ساٹن بھری۔ بولے تو لہجہ ہر قسم کے جذبات سے عاری تھا۔

”تمہیں لگتا ہے زین پر قاتلانہ حملہ میں نے کروایا ہے۔“

”زارا کو یقین ہے۔“

”اپنی بات کرو۔“ انہوں نے اس کی بات قطع کی۔

”اور کون کر سکتا ہے؟“

وہ رضوان کے منہ سے یہ جملہ سننا نہیں چاہتے تھے اور نہ رضوان نے یہ کہتے ہوئے ان کی سمت دیکھا تھا۔ وہ کچھ لمے اسے دیکھتے رہے پھر لیٹ کر ٹیبل کی

دوسری سمت چلے گئے۔ ان کی چائے بالکل ٹھنڈی ہو گئی تھی۔ انہوں نے خاموشی سے پانی عالیہ کی سمت

پڑھا دی۔ عالیہ نے تیزی سے کپ پکڑا اور کچن میں گھس گئیں۔

رائے سلیمان نے بلیک پینٹ اور لائٹ گرین شرٹ میں ملبوس رضوان حیدر کو دیکھا جسے انہوں نے اپنے بچوں کی طرح پالا تھا۔ ست روی کے ساتھ

دونوں بچہ لڑکوں کا ہوا میز پر ڈال کر وہ کرسی پر بیٹھ گئے۔

رضوان کے لیے خاموشی کا یہ لمحہ بہت طویل اور شاک تھا۔

”تو تم مجھتے ہو میں نے زین کو قتل کروانے کی

کوشش کی ہے۔“

انہوں نے سیٹ لمبے میں پوچھا تو وہ لب بھجج کر رہ گیا گویا اب ایک لفظ نہیں بولے گا۔

”میں نے زارا سے بھی کہا تھا ایسی بات منہ سے

ست نکالو جس پر بعد میں پچھتاؤ پڑے۔“

وہ زیر لب بڑبڑاتے پھر سر اٹھا کر رضوان کو دوبارہ دیکھا۔

”سنو رضوان حیدر! ان کا مخصوص ٹھہرا ہوا

لہجہ غور آیا۔“ مجھے وضاحت دینے کی عادت نہیں مگر

تمہارے لیے بتا رہا ہوں مجھے زین العابدین کو قتل

کروانا ہوتا تو اسی دن کروا دیتا۔ جب وہ گھوڑا گیا تھا۔“

رضوان تیزی سے ان کی طرف پلٹا۔

”یا پھر اس دن جب وہ زارا کو پھوڑنے رائے

ہاؤس تک چلا آیا تھا۔“

”آپ۔۔؟“ حیر کے مارے وہ کچھ بھی نہ کہہ سکا۔

”میں اپنا انتقام رائے جشید کے ساتھ اسی کی قبر

میں دفن کر چکا تھا۔“ انہوں نے مزید کہا۔

”آپ۔ آپ جانتے تھے؟“

”رائے سلیمان کو پچھ مجھتے ہو تم لوگ۔“ ان

نے

نے

نے

نے

نے

کے لمبے کی گرج بیدار ہوئی۔ ”وہ پورا ہفتہ میرے

گناؤں میں گزار دے اور رائے سلیمان کو خبر نہ ہو۔ زارا

اور آئمہ آئی اس کے گھر جا کر ملتی رہیں اور رائے

سلیمان کو پتا نہ چلے اتنا بے خبر نہیں ہوں میں۔

رضوان حیدر اچانک کچھ دیکھ لو کھلی آنکھوں سے ہر

واقعہ کو دیکھنا اور دماغ سے سوچنا سیکھ لو تب آثار رائے

سلیمان سے جواب ملے گی۔

”سلیمان بھائی! میں۔“

”جاسکتے ہو اب تم۔“ انہوں نے بات ہی ختم

کر دی رضوان جاننا تھا اب وہ اس کی کوئی بات نہیں

سنیں گے۔ وہ بریف کیس اٹھا کر خاموشی سے باہر نکل

گیا۔ تب ہی عالیہ چائے لے کر آئیں اور خاموشی

سے کپ ان کے سامنے رکھ دیا۔

”تم نے دیکھا عالیہ!۔“ سلیمان نے کہا۔

عالیہ نے پتلی پارہ ان کے لمبے میں ایسا دیکھ محسوس

کیا تھا انہوں نے تسلی آمیز انداز میں ان کے کندھے

پر ہاتھ رکھ دیا۔

♥ ♥ ♥ ♥

وہ سب دم بخود تھے۔

زین ایک دم نہیں دیا اور اس کی ہنسی کی آواز نے

ماحول پر چھائی خاموشی کو بھیر کر رکھ دیا۔ سب ہی نے

چونک کر اس کی سمت دیکھا۔

”گور ہم یہ سوچے بیٹھے تھے کہ رائے سلیمان سب

سے زیادہ بے خبر ہیں۔ میں اس وقت خود کو احمق تصور

کر رہا ہوں۔“

”میں بھی۔“ زارا نے اک طویل ساٹن لے کر

کہا۔ ”کیا کیا جتن نہیں کرتے تھے ہم ان سے یہ سب

چھپانے کے لیے۔“

اور سب کچھ ان پر عیاں تھا۔ ”رضوان نے آہستگی



# صوت 5 منٹ میں جوڑو اور لیکچروں سے مکمل نچا



زین نے اثبات میں سر ہلایا تو افتخار ہنس دیا۔  
”گو یا یہ فریضہ آپ کے سامنے انجام دیا تھا انہوں نے۔“

زین نے بے حد فحاشی سے اسے دیکھا۔  
”مگر تم تو کہہ رہے تھے تم اس لڑکی کو نہیں جانتے تمہارا اس کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔“  
زارا نے مشکوک نظروں سے اسے دیکھا۔  
”تعلق نہیں تھا آپ ہو گیا ہے۔“

”ہست گرا ہو گیا ہے۔ کیونکہ یہ اس کے ساتھ شادی کر رہا ہے۔ اس شام ہم اس کی شادی کی تیاری کر رہے ہوتے اگر یہ کوئی نہ کھا بیٹھتا۔“ افتخار نے مزید بتایا۔

”زین العابدین۔“ زارا نے بے حد سنجیدگی سے اس کی سمت دیکھا۔ ”تم مجھے تفصیل بتانا پسند کرو گے؟“

”در اصل میں۔“ اب بتائے بغیر کوئی چارہ بھی نہ تھا۔

”گالوں میں کس کے ہاں ٹھہرے تھے تم۔“  
رضوان اور زارا نے بے حد خاموشی سے اس کی ساری بات سنی تھی۔

”قاسم کے ہاں۔ اس کے والد کا نام مقبول ہے۔“ زین نے رضوان کے سوال کا جواب دیا تو زارا اچھلی پڑی۔

”تم اسماء کے ہاں ٹھہرے تھے۔ گویا وہ لڑکی۔“  
ایک دم اسے اسماء کے ساتھ آنے والی اک ذرا رد سمجھی لڑکی یاد آگئی۔ ”تو وہ عین تارہ تھی۔“  
”آپ کی تمہیں اس سے۔“ زین نے اشتیاق سے پوچھا۔

”ہاں وہ آئی تھی اسماء کے ساتھ۔“  
”کیسی لگی آپ کو؟“

”ہالہ۔ اچھی ہے۔“ زارا نے شاکی نظروں سے اسے دیکھا۔ زین ان نگاہوں کا مطلب سمجھتا تھا۔

”مسوری میں آپ کو بیٹا چاہتا تھا مگر اس وقت آپ جلدی میں تھیں۔“ وہ معذرت خواہانہ انداز میں گویا

فحاشی سے پوچھا تو وہ ہنس دیا۔  
”سوچنے کی بات یہ ہے کہ یہ کیسے یقین کر لیا جائے کہ زین پر حملہ سلیمان بھائی نے نہیں کروایا۔“ زارا نے سوچنے ہوئے کہا تھا رضوان نے بے حد سنجیدگی سے اس کی طرف دیکھا۔

انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ اگر انہوں نے کہا ہے تو واقعی یہ انہوں نے نہیں کیا ہو گا۔ انہیں ہم سے ڈرنے یا گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے کہ وہ جھوٹ بولیں۔ ان میں اتنی یاد رہے کہ وہ اپنے کسی بھی عمل کو تسلیم کر سکیں۔ خواہ وہ غلط ہی کیوں نہ ہو۔“ رضوان بھر پور یقین کے ساتھ بولا۔

”سوال یہ ہے کہ اگر رائے سلیمان نہیں تو پھر کون؟“

زارا کے سوال پر سب کی نگاہیں زین کی طرف اٹھیں۔

”آپ سب تو یوں میری طرف دیکھ رہے ہیں جیسے گولی چلانے والے نے گولی چلانے سے پہلے اپنا تعارف کروایا ہو۔“ وہ گڑبڑا گیا۔

”زین! کہیں یہ عین تارہ کے بھائیوں کی حرکت نہ ہو۔“ افتخار نے اچانک کہا۔ زارا نے چونک کر اسے دیکھا۔

”عین تارہ کون؟“  
”عین تارہ! افتخار نے مسکرا کر زین کو دیکھا۔ ”بتاؤ زین۔“

”عین تارہ۔ افتخار بتائے گا۔“ زین گڑبڑا گیا۔  
”کیا پر اہم ہے جلدی بتاؤ کون ہے یہ عین تارہ؟“  
زارا نے اپنے پرے ہونے کا رعب جمایا۔

”موصوف عین تارہ سے شادی کر رہے ہیں۔ اس کے بھائیوں کے ساتھ ایک دفعہ پہنچا بھی ہو چکا ہے اس کے گھر آکر رہائی کر گئے تھے۔“

”افتخار بھائی! زین نے دہائی دی۔ جب کہ زارا بری طرح جوگی۔

”یہ وہ لوگ ہیں زین! جو میرے ہوتے ہوئے آئے تھے۔“



ہوا۔

"جائے دو۔ لیکن کیا اس کے بھائی اس حد تک جاسکتے ہیں۔"

"کچھ کہہ نہیں سکتا۔ مجھے نہیں لگتا، مائے مقبول نے انہیں کچھ بتایا ہو یا پھر ہو سکتا ہے۔"

"آپ سب لوگ بہت اچھے جرنلسٹ ثابت ہوں گے۔" رضوان کی طنزیہ آواز سب ہی نے چونک کر اسے دیکھا۔ دونوں ہاتھ منٹ کی جیبوں میں گھسائے انہیں طنزیہ نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

"غالب گمان تو یہی تھا کہ۔"

"غالب گمان۔" رضوان نے تیزی سے اس کی بات قطع کی۔ "آج سلیمان بھائی کے سامنے میں نے جو کچھ کہا۔ اس کے بعد انہیں میری شکل نہیں دیکھنا چاہیے اور رہائش۔ تو میں اب ان کا سامنا ہی نہیں کر سکتا۔"

وہ روزانہ کھول کر باہر نکلتا تو انہم سے ٹکر ہو گئی۔

"اسلام علیکم رضوان بھائی۔"

"وعلیکم السلام۔" اس نے سنجیدگی سے جواب دیا اور کترا کر نکل گیا۔ وہ اندر آئی تو زمین مایوسی سے کہہ رہا تھا۔

"ہم سب اسحق ہیں۔"

"اسلام علیکم۔" انہم نے کہا تو افتخار گویا ہوا۔

"بجیے ایک اور کا اضافہ ہو گیا۔"

"میں اس وقت بے حد سنجیدہ ہوں۔" وہ ڈاراکے قریب بیٹھ گئی۔

"سنیپت تو ہے۔ آج تمہاری سکھی بھی نظر نہیں آ رہی۔" افتخار نے پوچھا۔

"وہ خود کشی کر رہی ہے۔"

"گور تم یہاں نشی ہو۔" افتخار نے حیرت کا اظہار کیا۔ "بجیے سبکی ہے روکنے کے بجائے ہمیں اطلاع دینے آگئی۔"

"تو دقت بذات کار نہیں ہے افتخار۔" انہم واقعی سنجیدگی سے کہنے لگی۔ "اس نے سینے پر انقی رگے حیرت سے

پوچھا۔

"عظمیٰ کو کیا سمجھتے ہو تم؟" اس نے ایک دم سوال کیا۔

"جی جیبل۔" افتخار برکت گویا ہوا۔

"شادی کرنا چاہتے ہو اس سے؟"

"ظاہر ہے۔ مگر وہ ملنے بھی۔"

"افتخار! اگر تم اس بات کے انتظار میں ہو کہ عظمیٰ تمہیں کوئی رسپانس دے گی تو یہ ناممکن ہے۔ وہ احتیال کی سردار ہے اور میرا تو دل چاہتا ہے کہ مار مار کر اس کا ہر کس نکال دوں۔" انہم نے ہلکی سی ہنسی کی۔

"مگر۔" کیا کر رہی ہیں۔ کچھ ہمارا ہی خیال کریں۔" وہ موچیں سنوارتے ہوئے مسکرایا۔

"مراہم کیا ہے؟" ڈاراکہ رضوان کی خفگی میں ابھی ہوئی تھی تب ہی سنجیدگی سے پوچھنے لگی۔

"موصوف کے کزن کارپونل تیار ہے۔ اس کے تیار کیا ہے۔ خاندان کا واحد گرجا بیٹ ہے سوچو ہی اسے

ایک ماہے پاس چاہیے۔ جسے گھر میں بند کر کے نہانے بھر کر دیا جائے گا۔ ایک دم جھلجھل ہے وہی سوچ رہی انداز۔ تھوڑی سی زمین ہے مگر انداز چاکر داروں والے اکلے تاسپوت ہے اور حد درجہ بگڑا ہوا۔"

"گویا کوئی خفی نہیں موصوف میں۔" افتخار نے مایوسی سے سر ہلایا۔ انہم نے تپ کر اسے دیکھا۔

"ہوں گی مگر ایک ہزار ایک خویاں بھی ہوں۔ تب بھی عظمیٰ کا ذہن اس سے نہیں ملے والا۔"

"عظمیٰ راضی ہے؟" افتخار نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا۔

"وہ تو ہر معاملے میں راضی بہ رضا ہے۔" انہم جل کر بولی۔

"تو پھر میں کیا کر سکتا ہوں۔"

"تم۔" انہم غصے میں کھڑی ہو گئی۔ "تم دونوں اپنی اپنی اناکار جیم بلند رکھو مگر اور کچھ تم دونوں ہی سر پکڑ کر دوڑ گئے میں ہی افسق اور پاگل ہوں جو تم

دونوں کی ہمدردی اور محبت میں یہاں تک بھانگی چلی آئی۔ اب جو کچھ بھی ہو میری ہلا ہے۔"

"انقا غصہ۔" افتخار ہنس دیا۔ پھر زمین کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھنے لگا۔ "کیا کیا جائے یا ر؟"

"ارے بھئی! بے بے کو لے کر اس کے گھر جاؤ۔"

وہ جھنجھلا کر بولا۔

"ہاں افتخار! اب کوئی قدم اٹھائی لو۔" ڈاراکے بھی آنکھیں۔

"پچھلے۔" اس نے باری باری دونوں کو دیکھا پھر پشت پر دونوں ہاتھ باندھتے ہوئے انہم کی طرف پلٹا۔

"تھیک ہے انہم! کل میرا اور بے بے کا انتظار کیجیے گا۔"

"جی۔ یہ بھی مجھے ہی پر افسان ہو گا۔" وہ اس کے شہانہ انداز پر چٹکی لگی تھی۔

لہذا مقبول نماز پڑھنے کے بعد دوبارہ چارپائی پر لیٹ گیا تھا۔ تب ہی اس کی آنکھ لگی تھی۔

"ابا انہی تک سو رہا ہے۔" قاسم ناشتے کے لیے آیا تو حیرت سے پوچھنے لگا۔ پھر چگانے لگا تو عین تارہ بول

اٹھی۔

"رہے دو قاسم بھائی! ابھی ابھی آنکھ لگی ہے۔"

"کیوں طبیعت تو تھیک تھی۔" وہ چونک کر پوچھنے لگا۔

"ہاں۔ بس ساری رات جاگتے رہے ہیں۔" عین تارہ نے بتایا اور بیابوں میں چائے نکالنے لگی۔

"تمہیں کیسے پتا چلا کہ ابا ساری رات جاگتا رہا ہے۔"

اسماعیل نے پراٹھا تو اسے اتارتے ہوئے پوچھا تو وہ خاموش ہو رہی۔ کیا بتائی ایک عرصہ ہوا رات کی بس چند گھنٹاں ہی ایسی ہوئی ہیں جب نیند مہمان ہوئی ہے

ورنہ ساری رات خود پر جھٹکے آسمان کو تلکتے گزر جاتی ہے۔

قاسم ناشتہ کر کے باہر نکل گیا۔ اسماعیل نے برتن اکٹھے کر کے دھونا شروع کر دیے۔ عین تارہ صحن میں جھانڈو دینے لگی۔ محمد علی اسماعیل کے پاس بیٹھ کر برتن پیچھڑنے لگا۔ اسی کے ہاتھ سے کوئی برتن چھوٹا تھا۔ لہذا مقبول

پڑہا کر جاگتا۔

سورج سر پر چمک رہا تھا۔

دھوپ دیواروں پر اتر آئی تھی۔

"نوم۔" وہ سر پر ہاتھ مار کر رہ گیا۔ پھر جلدی سے پاؤں میں چپل اڑتے ہوئے نکلا۔

"عین تارہ! میرے کپڑے استری کرو۔"

"نکل جانا ہے ماما؟" وہ جھانڈو چھوڑ کر کھڑی ہو گئی۔

"شیر۔" وہ مختصر "کہہ کر ہاتھ روم میں گھس گیا۔

"شیر کی کرنے جانا ہے؟" وہ اسماعیل سے پوچھنے لگی۔

"پتا نہیں ذکر تو نہیں کیا اس نے۔"

عین تارہ اندر جا کر کپڑے استری کرنے لگی۔ ماما مقبول نماز نکلا تو بے غفلت بولا۔

"اسما مجھے ایک چٹائی دی ہے۔"

اسما اثبات میں سر ہلا کر اٹھ گئی۔ محمد علی باقاعدہ کمرے میں بیٹھ کر برتن دھونے لگا تھا۔

"شیر کیا کرنے جانا ہے ابا۔" اسماعیل نے وہی کاپیال اس کے سامنے رکھا۔

"ایک کام ہے۔ بہت ضروری۔" مائے مقبول نے مختصر "کہا۔ کام کی وضاحت کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔

"ہاں کر تارہ پتہ! لے آکر۔" مجھے جلدی ہے۔"

اس نے پکار کر کہا۔ پھر وہی کچا کر خود ہی اندر چلا گیا۔

عین تارہ اسے کپڑے تھما کر باہر نکل گئی۔

"تبا کی تو لگتا ہے۔ ٹرین پھونکی جا رہی ہے۔" اسماعیل نے ہنسنے ہوئے کہا۔

"ہاں پتا نہیں ایسا کیا کام سوچ گیا؟" عین تارہ نے دوبارہ سے جھانڈو اٹھالی۔ لہذا مقبول کپڑے بدل کر باہر نکل آیا۔

"قاسم کو تارہ! میں شہر جا رہا ہوں کسی کام سے۔"

"شام تک تو آجاؤ گے بابا! اسماعیل نے پوچھا۔

"ہاں۔ ہاں۔ شام تک آجاؤں گا۔" قاسم ہو گیا تو شاید جلد ہی آجاؤں۔"

وہ باہر نکل گیا۔ لیکن کا انتظار اس نے سڑک کے کنارے بنے بابا دین محمد کے کھوکھے پر چائے پیتے



ہوئے کیا تھا۔

دیکھن آئی۔ اس میں بیٹھے ہوئے اس نے ایک پل کو سوچا تھا۔

”کس زمین ناراض ہی نہ ہو جائے۔“

”اللہ مالک ہے۔“ اس نے خود کو تسلی دی اور بیٹھ کر کرایہ نکالنے لگا۔ شہر پہنچے تک اس کا ذہن مختلف سوچوں کی آماجگاہ بنا رہا۔

دیکھن کی تو اس نے اتر کر رکشے کو آواز دی۔ رکشے والے کو آواز دیتے ہوئے اس نے پھر سوچا تھا۔

”کیا میں جو کچھ کرنے جا رہا ہوں وہ ٹھیک ہے۔“

اور جب رکشہ پھینکنا ہوا ”راستے ہاؤس“ کے سامنے رکنا تو ایک پل کو اس کا دل دھک سے رہ گیا۔

اس کا دل چاہا وہ اسی رکشے میں بیٹھ کر اپنی چلا جائے۔ ”جو وہ گاڑ بکھا جائے گا۔“

وہ سر جھٹک کر آگے بڑھتا ہی گیت کھلا۔ رائے رضوان کی گاڑی باہر آئی اور اس کے قریب سے گزر گئی۔ چونکہ اس گیت بند کرنے لگا۔ تو وہ آگے بڑھ گیا۔

”راستے سلیمان ہے؟“

چونکہ اس نے سر ہٹا اسے دیکھا۔ پھر رکھائی سے پوچھنے لگا۔

”کیا کام ہے۔“

”بہت ضروری کام ہے۔ اس سے کہو۔ گاؤں سے مقبول آیا ہے۔“ اس نے آہستگی سے کہا۔

”وہ بابا! وہ ایک دن میں یوں بھی صاحب کو گاؤں ہی جاتا تھا۔“

”تم سے مشورہ نہیں مانگا میں نے۔“ ماما مقبول نے چڑ کر کہا۔ ”ضروری کام ہے اسی لیے صبح بھاگا ہوا آیا ہوں۔“

وہ بڑبڑاتا ہوا اندر آگیا۔ ملازم کو پیغام دیا۔ ملازم نے پیغام رائے سلیمان تک پہنچایا۔ رائے سلیمان نے چونک کر سر اٹھایا۔

”گاؤں سے مقبول۔ اچھا۔ ٹھیک ہے اسے۔“

”ابھی میں دفتر میں آئی تھی۔“ رائے سلیمان نے کہا۔ ”ابھی میں گھر سے آئی تھی۔“

”ابھی میں گھر سے آئی تھی۔“ رائے سلیمان نے کہا۔ ”ابھی میں گھر سے آئی تھی۔“

”ابھی میں گھر سے آئی تھی۔“ رائے سلیمان نے کہا۔ ”ابھی میں گھر سے آئی تھی۔“

”ابھی میں گھر سے آئی تھی۔“ رائے سلیمان نے کہا۔ ”ابھی میں گھر سے آئی تھی۔“

”ابھی میں گھر سے آئی تھی۔“ رائے سلیمان نے کہا۔ ”ابھی میں گھر سے آئی تھی۔“

کر کے نکلیں۔

”گاؤں کے دھندے گاؤں میں ہی پھونڈ آیا کریں۔“

”میلان۔“ وہ ہلکا سا مسکرائے اور کھڑے ہو گئے۔ باہر آئے تو ماما مقبول بے چینی سے کڑی پر بیٹھا انتظار کر رہا تھا۔

”ابھی میں گھر سے آئی تھی۔“ رائے سلیمان نے کہا۔ ”ابھی میں گھر سے آئی تھی۔“

”ابھی میں گھر سے آئی تھی۔“ رائے سلیمان نے کہا۔ ”ابھی میں گھر سے آئی تھی۔“

”ابھی میں گھر سے آئی تھی۔“ رائے سلیمان نے کہا۔ ”ابھی میں گھر سے آئی تھی۔“

”ابھی میں گھر سے آئی تھی۔“ رائے سلیمان نے کہا۔ ”ابھی میں گھر سے آئی تھی۔“

”ابھی میں گھر سے آئی تھی۔“ رائے سلیمان نے کہا۔ ”ابھی میں گھر سے آئی تھی۔“

”ابھی میں گھر سے آئی تھی۔“ رائے سلیمان نے کہا۔ ”ابھی میں گھر سے آئی تھی۔“

”ابھی میں گھر سے آئی تھی۔“ رائے سلیمان نے کہا۔ ”ابھی میں گھر سے آئی تھی۔“

”ابھی میں گھر سے آئی تھی۔“ رائے سلیمان نے کہا۔ ”ابھی میں گھر سے آئی تھی۔“

”ابھی میں گھر سے آئی تھی۔“ رائے سلیمان نے کہا۔ ”ابھی میں گھر سے آئی تھی۔“

”ابھی میں گھر سے آئی تھی۔“ رائے سلیمان نے کہا۔ ”ابھی میں گھر سے آئی تھی۔“

”ابھی میں گھر سے آئی تھی۔“ رائے سلیمان نے کہا۔ ”ابھی میں گھر سے آئی تھی۔“

”ابھی میں گھر سے آئی تھی۔“ رائے سلیمان نے کہا۔ ”ابھی میں گھر سے آئی تھی۔“

”ابھی میں گھر سے آئی تھی۔“ رائے سلیمان نے کہا۔ ”ابھی میں گھر سے آئی تھی۔“

”ابھی میں گھر سے آئی تھی۔“ رائے سلیمان نے کہا۔ ”ابھی میں گھر سے آئی تھی۔“

”ابھی میں گھر سے آئی تھی۔“ رائے سلیمان نے کہا۔ ”ابھی میں گھر سے آئی تھی۔“

”ابھی میں گھر سے آئی تھی۔“ رائے سلیمان نے کہا۔ ”ابھی میں گھر سے آئی تھی۔“

”ابھی میں گھر سے آئی تھی۔“ رائے سلیمان نے کہا۔ ”ابھی میں گھر سے آئی تھی۔“

”ابھی میں گھر سے آئی تھی۔“ رائے سلیمان نے کہا۔ ”ابھی میں گھر سے آئی تھی۔“

مکھنوں پر تھوڑی نکالے کسی غیر ملکی نقطے پر نظر کریں۔ جیسے بچانے کیا سوچ رہی تھی۔ کہ انہم نے دیا اور اسے جھانکا اور مسکرا دی۔

”خیریت تو ہے۔ کس کام کو مٹا جا رہا ہے؟“

”عظمیٰ نے چونک کر سر اٹھایا اور قصداً ”مسکرائی۔“

”یو کی۔“ کچھ کرنے کو دل نہیں چاہا تو سب چھوڑ چھاڑ کر بیٹھ گئی۔

”ہاں یہ بھرم رکھنے کی بے چاری سی کوشش۔ وہ بھی ان کے سامنے جو آپ کی رنگ رنگ سے واقف ہوں۔“

”پہلو اچھا ہوا۔ تم نے بھی اپنے دل کی سنی۔“ اس نے دیوار پر پاؤں رکھا اور اس کے پاس اتر آئی۔ کچھ لمبے کمر ہاتھ نکالے اور ہر طرف دیکھتی رہی۔

”تم نے صفائی بھی نہیں کی۔“

”بس موڑ نہیں ہٹا۔“ اس نے بیزارگی سے کہہ کر کھلے بالوں کو ہاتھوں سے سلجھا کر جوڑا سا بنا لیا۔

”تھوڑی بہت صفائی تو ہونی چاہیے۔ آخر تمہاری سسرال والے جواب لینے آرہے ہیں۔“

”انہم نے مسکراتے ہوئے امرود کے پیچھے پڑی جھاڑو اٹھالی۔ ”عظمیٰ نے بیزارگی واکتھاٹ سے اسے دیکھا۔

پھر اسے جھاڑو اٹھاتے دیکھ کر کہنے لگی۔

”رہے۔۔۔ میں کر لیں گی۔“

”ارے تم کیا خاک کر دی۔ صبح سے ان ہی بیڑیوں پر بیٹھی وظیفہ پڑھ رہی ہو۔ انہم بھی اتنی ہی بہت کر دہندہ یہ لڑکی تو ناک کنوائے کی۔ اسی لیے کتنی ہوں یہ بڑھائیاں تو لڑکیوں کو نکلا کر دیتی ہیں۔“ انہم نے مسکرا کر رخ بدل لیا۔

”ابھی میں گھر سے آئی تھی۔“ رائے سلیمان نے کہا۔ ”ابھی میں گھر سے آئی تھی۔“

”ابھی میں گھر سے آئی تھی۔“ رائے سلیمان نے کہا۔ ”ابھی میں گھر سے آئی تھی۔“

”ابھی میں گھر سے آئی تھی۔“ رائے سلیمان نے کہا۔ ”ابھی میں گھر سے آئی تھی۔“

”ابھی میں گھر سے آئی تھی۔“ رائے سلیمان نے کہا۔ ”ابھی میں گھر سے آئی تھی۔“

”ابھی میں گھر سے آئی تھی۔“ رائے سلیمان نے کہا۔ ”ابھی میں گھر سے آئی تھی۔“

”ابھی میں گھر سے آئی تھی۔“ رائے سلیمان نے کہا۔ ”ابھی میں گھر سے آئی تھی۔“

”ابھی میں گھر سے آئی تھی۔“ رائے سلیمان نے کہا۔ ”ابھی میں گھر سے آئی تھی۔“

”ابھی میں گھر سے آئی تھی۔“ رائے سلیمان نے کہا۔ ”ابھی میں گھر سے آئی تھی۔“

”سلمان کا شہر عظمیٰ کے ہاتھ میں دیا پھر انہم کو دیکھ کر مسکرائے۔“

”قرن سارا کام انہم بیٹا سے ہی کروانا ہے۔“

”نہیں۔ میں تو ابھی آئی ہوں۔“

”عظمیٰ نے بے حد حیرت سے بڑے سے شہر میں جھانکتے بیٹے کے لیٹر پیک، پھل اور سموں کے لفافے کو دیکھا۔

”یہ اتنا کچھ۔“ بابا کے جانے کے بعد عظمیٰ نے انہم سے پوچھا تھا۔

”تمہارے سسرال والوں کی خاطر مدارات نہیں کرنا۔“ اس نے سر اٹھائے بغیر جواب دیا۔ ”عظمیٰ کچھ لمبے ہوٹ کا کٹی رہی۔ پھر آہستگی سے پوچھنے لگی۔

”کیا واقعی آج آیا وہیو آرہے ہیں۔“

”ہاں۔ جواب لینے آرہے ہیں۔“ اس نے بے ہوشی سے مسکراہٹ ضبط کر کے سنجیدگی سے جواب دیا تو وہ خاموشی سے بچن میں گھس گئی اور بہت دیر تک باہر نہیں نکلی تھی۔

”انہم کی پھرتیاں عروج پر تھیں۔ لمحوں میں اس نے سارا گھر چکڑا تھا۔

”عظمیٰ کہاں ہے؟“ انہم نے آکر پوچھا تھا۔

”بچن میں۔“ انہم کیاری سے خشک پتے آکھنے کر رہی تھی۔

”اسے کو منہ ہاتھ دھو کر ڈھنگ کے کپڑے پہن۔“

”خیر ہے خالہ! انہوں نے کیا سہل، عظمیٰ کو دیکھا نہیں۔“ اس نے بے نیازی سے جواب دیا۔

”تب ہی دروازے پر دستک ہوئی۔“

”لیں۔ لگتا ہے آگے وہ لوگ۔“

”ابھی میں گھر سے آئی تھی۔“ رائے سلیمان نے کہا۔ ”ابھی میں گھر سے آئی تھی۔“

”ابھی میں گھر سے آئی تھی۔“ رائے سلیمان نے کہا۔ ”ابھی میں گھر سے آئی تھی۔“

”ابھی میں گھر سے آئی تھی۔“ رائے سلیمان نے کہا۔ ”ابھی میں گھر سے آئی تھی۔“

”ابھی میں گھر سے آئی تھی۔“ رائے سلیمان نے کہا۔ ”ابھی میں گھر سے آئی تھی۔“

”ابھی میں گھر سے آئی تھی۔“ رائے سلیمان نے کہا۔ ”ابھی میں گھر سے آئی تھی۔“

”ابھی میں گھر سے آئی تھی۔“ رائے سلیمان نے کہا۔ ”ابھی میں گھر سے آئی تھی۔“



تھے مگر وہ سن لیا تھا کہ اس مسئلے پر زیادہ غور ہی نہ کر سکی۔ پھر خیال آیا انعم کی لگی ہوئی ہے۔

”حق ہو عظمیٰ! جب فیصلہ اپنا ہے تو قرار کیسا؟“ اس نے چہرے پر دونوں ہاتھ رکڑے اور اٹھ کر کچن میں آئی۔ انعم کو لندڑ نکس سڑ کر چکی تھی۔ اب چائے کے ساتھ لوازمات رکھ رہی تھی۔ اس نے سر اٹھا کر عظمیٰ کو دیکھا وہ خاموشی سے برتن نکالنے لگی۔

”چائے لے کر تم جاؤ گی۔“ انعم نے پوچھا۔ ”نہیں۔ تم ہی دے دو۔“ اس نے آہستہ سے کہا پھر پوچھنے لگی۔ ”کون کون آیا ہے؟“

”زیادہ لوگ نہیں ہیں۔“ انعم نے مختصراً کہا اور زبے اٹھا کر کھڑی ہوئی۔ عظمیٰ نے اس کے چائے کے بعد چائرس سیمیں پھر مخصوص جگہ پر آکر بیٹھ گئی۔

نجانے کتنا وقت گزرا۔ بیٹھک سے نکل کر آوازیں باہر آنے لگیں۔

پھر وہ ہڑوا کر کھڑی ہو گئی۔ خوش و خرم اہل، مطمئن اماں اور ہنسی مسکراتی انعم کے ساتھ افکار کی بے بسی تھیں۔ اس کے قدموں تلے سے زمین کھٹک گئی۔

بے بس نے آپ اگر اسے ذمہ یوں پکار کیا۔ ”یہ تو میرے گھر کی خوشی تھی۔“ نجانے وہ کیا کیا کہہ رہی تھیں۔ انہوں نے ہکا بکا کھڑی عظمیٰ کے ہاتھ میں ہزار روپے کا نوٹ ٹھونس دیا۔

اماں منع کرنے لگیں۔ انعم فقرے چست کر رہی تھی۔ وہ ہونٹ بنی کھڑی تھی۔

پھر اماں انہیں رخصت کرنے دوازے تک چلی گئیں۔ انعم بھی ساتھ تھی۔ واپس آئی تو ہاتھ میں مٹھائی کی بڑی سی ٹوکری تھی۔

”خاصا دل والا ہے۔“ اس نے ٹوکری مٹھن میں پڑی چارپائی پر رکھی۔ پھر ہونٹ بنی عظمیٰ کو دیکھا تو ہنستے ہوئے آگے بڑھی۔ اسے بازوؤں سے پکڑ کر گھمرا ڈالا۔

انعم نے عظمیٰ کی گتھی خوش ہوں۔ اتنی خوش تو مجھے اپنی دلفریبی نہ ہوئی تھی۔ کتنے نفل اور کتنی مٹھیاں ملی

تھیں میں نے۔“

اس نے چھوڑا تو وہ لڑکھڑا کر دیوار سے جا لگی اور خاموش نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

”کیا ہوا۔ خوشی کے مارے کہا میں تو نہیں چلی گئیں۔“ انعم نے پوچھا۔

”یہ کیا ہے۔“ عظمیٰ نے بے یقینی سے مٹھی کھولی۔ ہزار روپے مٹھی سے نکل کر چارپائی پر گر آئے۔ انعم نے آرام سے اٹھا کر ہاتھ سے اس کی سلونٹیں نکالیں۔ پھر اسے ہوا دیتے ہوئے بولی۔

”مقررہ کی خوبصورت سازش، خوابوں کی تعبیر، آرزوؤں کی تکمیل۔“

”تم افکار کے پاس گئی تھیں۔“ عظمیٰ نے اچانک سوال کیا۔ ایک پل گورہ کڑ پڑائی۔ پھر اسیٹ بن کر بولی۔ ”تو کیا کرتی۔“

”ہمت برا کیا تم نے انعم! وہ ذریعہ بیزاری۔ پتا نہیں کیوں۔ پہلے دل ڈوبا جا رہا تھا اور اب شدید غصہ آ رہا تھا۔ اسے خود اپنی ہیلتھ کنز سبھ میں نہ آتی تھیں۔“

”پاکل برا نہیں کیا بلکہ ہمت عقل مندی سے کام لیا ہے۔“ وہ اپنے کارنامے پر اترا رہی تھی۔

”شہرہ کیا خیال ہے۔ میں اس سے شادی کر لوں گی؟“

”تو اور کیا کرو گی؟“ انعم جھنجھلا گئی۔

”انکار۔“ وہ سنجیدہ دو ٹوٹتین لہجے میں گویا ہوئی۔

”دل غٹھیکہ ہے تمہارا۔“ انعم غصے میں آئی۔

”ہاں میں انکار کر دوں گی۔ مجھے افکار سے شادی نہیں کرنی۔“

”تو پھر کس سے کرنی ہے؟“ اماں کے کان میں اس کا آخری جملہ پڑا تھا۔ تو پھر اگر اس کے سامنے آئیں۔

”تیرا دل غٹھیکہ تو نہیں الٹ گیا۔ کیسے منہ بھار کر انکار کر رہی ہے۔ ارے بایں قبر کھود کر دفن دوں گی۔ اپنے ہاتھوں سے گلا گھونٹ دوں گی تمہارا۔ اس سے نہیں اس سے نہیں۔ تو پھر کس سے کرنی ہے یہ بھی بتاؤ۔ ایسا کون سا پسند آئی ہے میری حور پر ی کو۔“

”اماں! میں۔“ اس کا رنگ زرد پڑ گیا۔ یہی الزام تھا۔ یہی وہ جملے تھے جس سے بچنے کے لیے وہ اپنے خواب رہن رکھ رہی تھی۔ اسی سے بچنے کے لیے اپنی ہمت کا گلا گھونٹ رہی تھی۔

”پہلے تمہارے باپ کے مزاج نہیں ملے تھے۔ اب یہ کھڑی ہو گئی ہے۔ یہی سکھاتی ہیں تمہاری پڑھائیں۔ اسی لیے کتنی تھی مت سمجھو۔“

کوئی نہ کوئی گل گل کر رہے گا۔ اب دیکھ لو۔ پر ایک بات کان کھول کر سن لو۔ لڑکا مجھے اور تمہارے باپ کو پسند ہے تم رخصت ہو گی تو اسی کے ساتھ۔ ورنہ میری طرف سے جہنم میں جاؤ۔“ اماں آگ بگولہ ہو رہی تھیں۔ اس میں مزید سننے کی تاب نہ رہی تو بھاگتی ہوئی کمرے میں ٹھس گئی۔ انعم انہیں خاموش کروانے لگی۔

”سمجھا دینا اس کو اچھی طرح۔“ ان کا سانس پھول گیا تھا۔

”میں سمجھا دوں گی۔“ انعم نے انہیں بائی کا گلاس دیا۔ وہ کچھ ریلیکس ہوئیں تو اٹھ کر اندر آئی۔ وہ اونٹ سے منہ پڑی سسکیاں لے رہی تھی۔ انعم دروازے کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ کیا کہے۔

”میری سمجھ میں نہیں آ رہا تمہاری اس بے وقوفی کو کن الفاظ میں خراج تحسین پیش کر دوں۔“

انعم نے کہا۔ جواب میں سسکیاں ابھرتی رہیں۔ تب ہی اسے لگا عظمیٰ ہنسی ہے۔

اس نے ہمت غور سے دیکھا اور سنا۔ وہ رو رہی تھی۔

نہیں شاید ہنس رہی تھی۔

نہیں سسکیوں کی آواز ہے۔

مگر نہیں۔ کہیں ہلکی سی ہنسی بھی گونج رہی ہے۔

وہ کچھ حیران سی ہو کر آگے بڑھی۔ اسے کندھوں سے حاتم کر سیدھا کیا اور مضطرب گئی۔

وہ عجیب و غریب ساوین کا منظر تھا۔ وہ روئی جاتی تھی اور ہنسی جاتی تھی۔

انعم نے گھور کر اسے دیکھا تو عظمیٰ اس سے لپٹ گئی۔ انعم کے بازو ڈھیلے ہی رہے اسے عظمیٰ پر سخت غصہ آ رہا تھا۔ مگر شدید غصے کے باوجود اس کے لبوں پر ہنسی کھیر گئی۔ اس کے بازو اٹھے اور عظمیٰ کو گھیر لیا۔

اب وہ دونوں روئی جاتی تھیں اور ہنسی جاتی تھیں۔ نجانے کیوں؟

♥ ♥ ♥ ♥

جیب بے حد تیز رفتاری سے آگے بڑھ رہی تھی۔ کچی کچی سڑک پر اچھے وچھل کے باہل راستے کم کر رہے تھے۔ جیب رائے سلیمان خود ڈرائیو کر رہے تھے۔ ان کے چہرے کے تاثرات اسنے پھرے اور جلد تھے کہ ڈارا اور رضوان کو کچھ بھی پوچھنے کی ہمت نہ ہوئی تھی۔ پوچھنے کی ہمت تو انہیں تب بھی نہ ہوئی تھی۔ جب رائے سلیمان نے کچھ بھی بتائے بغیر انہیں اپنے ساتھ چلنے کو کہا تھا۔ انہیں خبر نہ تھی کہ وہ جگہاں جا رہے ہیں اور اگر جارہے ہیں تو کیوں؟

جیب آہم کے کتنے درختوں سے نکل کر ایک نیچی چھتوں والے چھوٹے سے مکان کے سامنے جا رہی۔ رضوان تو واقف تھا مگر زارا یہاں پہلے کبھی نہ آئی تھی۔

جیب کے رکتے ہی اندر سے دو ملازم بھاگتے ہوئے نکلے۔ آن کا ڈیل ڈول، حلیہ اور باتوں میں پکڑی بند و قس دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ رائے سلیمان نے انہیں یہاں کیوں رکھا ہے۔ انہوں نے دیکھتے ہی زوردار سلام کیا تھا اور ڈارا کو دیکھتے ہی جلدی حیرت ان کی آنکھوں میں اتری تھی۔ وہیں وہ احترازا ”نظر میں جھکا کر ایک طرف ہو گئے۔“

رائے سلیمان نے سر کے اشارے سے جواب دیا تھا۔

”ہم یہاں کیوں آئے ہیں۔؟“ زارا نے رضوان سے پوچھا تھا۔ وہ محض کندھے اچکا کر رہ گیا۔ رائے سلیمان ہر آدمے میں رکے۔

”کہاں ہے۔؟“

”اندر ہے۔“ ایک نے تیزی سے جواب دیا۔



”ہوں۔“ انہوں نے دوا نہ کھولنے کو ہاتھ بڑھایا پھر روک کر پلٹے۔

”مجھے اپنے معاملات میں دو سروں اور خاص طور پر غور توں کی دخل اندازی پسند نہیں۔“ انہوں نے ایک نظر زار اگودیکھا۔ ”مگر تمہارا معاملہ کچھ اور ہے۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ حقیقت تم دونوں کے سامنے کھلے۔“

اس سے قبل کہ وہ کوئی سوال کر سکتے وہ دوا نہ کھول کر اندر داخل ہو گئے۔ سوائس بھی تاکید کرنی پڑی پھر وہ شخص تک گئے۔ کمرہ دھول مٹی اور پرانے فرنیچر سے اٹا ہوا تھا اور حیرت انگیز چیز مٹی بشیر علی تھا۔ جو فرش پر انگوٹھ پینچا وہ نون بازو گھٹنوں کے گرد لپیٹے۔ غنڈہ لم کی طرح آگے پیچھے جھول رہا تھا۔ اس کے سر پر گھڑا بندوق بردار گویا اس کی روح سنبھل کر رہا تھا۔

”کیسے ہو مٹی بشیر علی۔“ رائے سلیمان نے اس کے سامنے کھڑے ہو کر ٹھنڈے لہجے میں پوچھا۔ اس نے ہڑبڑا کر اٹھا چاہا مگر بندوق بردار نے اپنی بندوق کی نٹل اس کے کندھے پر چھو کر دوبارہ بیٹھنے پر مجبور کر دیا۔

”سلیمان پترایہ کیا ہو رہا ہے میرے ساتھ۔ مجھ سے کوئی غلطی ہو گئی۔ کوئی قصور سرزد ہو گیا۔“ مٹی بشیر دہائی دیتے ہوئے بولا۔

”تم سے قصور نہ نہ۔ قصور تو ہمارا ہے۔ غلطی تو ہم سے سرزد ہوئی ہے مٹی چاچا! اور اسے نیچے کیوں بٹھایا ہے۔“ انہوں نے بندوق بردار کو گھورا۔ ”تم تو ہمیشہ ہمارے برابر بیٹھتے رہے ہو۔ اٹھو۔ اوپر کرسی پر بیٹھو۔“

تب تک دو سرے ملازم تین کرسیاں بھاڑ پونچھ کر ان کے قریب رکھ چکے تھے۔ ایک نے دھول میں اپنی کرسی سمجھ کر مٹی کے قریب کی اور کندھے سے پکڑ کر اٹھایا اور زبردستی کرسی پر بٹھا دیا۔ اس کے عین سامنے رائے سلیمان نے کرسی سنبھل لی۔

”سلیمان کھالی۔“ رضوان نے کچھ کہنا چاہا مگر سلیمان نے ہاتھ اٹھا کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

”بیٹھو اور دیکھو۔“ ان کا لہجہ سرد تھا۔ رضوان لب بچھ کر رہ گیا۔

”نہیں تو مٹی بشیر علی۔“ رائے سلیمان نے کھائی موز کر گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ ”میرے پاس وقت بہت کم ہے تقریباً دس منٹ۔“

”سلیمان پتر میں۔“

”میں بے بس پہلے جس شخص نے حوٹلی میں رائے سلیمان کے قتل کی اطلاع پہنچائی وہ تم تھے۔“ رضوان اور زار اسے چونک کر پہلے مٹی بشیر علی کو پھر ایک دوسرے کو دیکھا۔ دوسرے پہل انہیں یہاں آنے کا مقصد سمجھ میں آیا۔

”تو یہ تمہارے شخص۔“

”تم نے آگرتایا کہ رائے نواز کو قتل کر دیا گیا ہے اور قتل کرنے والا رائے جمشید ہے۔ ہے نا۔“

رائے سلیمان نے ذرا سا جھک کر اپنی سرونگ میں اس کے چہرے پر نگاہیں ڈالیں۔ مٹی بشیر علی کا چہرہ زبردست گھبراہٹ کی آگہوں میں اُلٹ آیا۔ مگر اس نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی۔

”ہاں۔ ہاں۔“

”تم نے تو خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا کیونکہ تم اس وقت اتفاق سے امیوں کی فصل کا جاتے ہوئے بارش کی طرف نکل گئے تھے۔“ سلیمان نے مزید کہا۔ مٹی بشیر علی نے تھوک نچکتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔

”کیا ہوا تھا؟“

”تم جانتے ہو سلیمان پتر۔“

”یہ لوگ تفصیل تمہارے منہ سے منٹا چاتے ہیں۔“ انہوں نے سیٹ بے میں کہا۔ مٹی بشیر علی نے آٹک ایک کر کہنا شروع کیا۔ مگر دوسرے پہل رائے سلیمان کے بھاری ہاتھ کا بھرپور پتھر اس کے چہرے پر ڈال دیا۔ بندوق بردار نے اسے گریبان سے پکڑ کر سیدھا کیا۔ رضوان نے لب بچھ کر زار اگودیکھا۔ وہ دونوں ہاتھ سینے پر باندھے خاموشی سے دیکھ رہا تھا۔

”بچ بولو مٹی بشیر علی! بالکل سچ۔“ سلیمان نے انگلی اٹھا کر تنبیہ کی۔

”میں بالکل سچ بول رہا ہوں سلیمان پتر۔“ وہ دوتے ہوئے بولا۔

”اگواس بند کرو مٹی۔“ رائے سلیمان حنا سے۔ ”سولہ سال کے سلیمان کو بے وقوف بہانا آسان تھا مگر آج نہیں۔ آج صرف سچ سنوں گا۔“

”میں نے جھوٹ نہیں بولا۔“ وہ دہائی دیتے ہوئے بولا۔

”زین العابدین کو گولی تم نے ماری ہے۔“ رائے سلیمان نے اچانک سوال کیا۔ وہ ایک پہل کو خشکا پھر تھری سے نفی میں سر ہلاتے لگا۔

”میں نے نہیں ماری۔“

”تم جھوٹ بڑی ہو۔ ایسے نہیں مانو گے۔“

”چوہدری صاحب! آپ حکم کریں۔“ پیچھے کھڑے بندے نے موچھوں کو تاکو دے کر کہا۔

رائے سلیمان نے پیچھے ہو کر کرسی کے ساتھ ٹیک اگالی۔ کچھ لمحے مٹی بشیر کو ٹوٹتی نگاہوں سے دیکھتے رہے پھر ان کے لبوں پر پراسرار سے مسکراہٹ ابھری۔

”تم تو جانتے ہو مٹی! پھر بھی خود کو مصیبت میں ڈال دیا۔“

”سلیمان پتر! میری بات سنو۔ خدا گواہ ہے میں نے کچھ بھی جھوٹ نہیں بولا۔“

”نور محمد۔“ رائے سلیمان نے گویا اس کی بات سنی ہی نہ تھی۔ نور محمد ایک کراس کے قریب آیا۔

”نور محمد! جاؤ۔ مٹی بشیر علی کے گھر کو آگ لگا دو۔“

رائے سلیمان کے لہجے میں اطمینان ہی اطمینان تھا۔

”اور لگانے سے پہلے یہ اطمینان کر لینا کہ اس کے سارے گھروالے گھر کے اندر ہی موجود ہوں۔“

رائے سلیمان کے لہجے میں سفاکی ہی سفاکی تھی۔

”نہیں تم! تم ایسا نہیں کر سکتے ہو۔“ مٹی بشیر علی کی نگاہیں پچی کی پچی رہ گئیں۔

”نور محمد! تم نے سنا نہیں۔“ رائے سلیمان نے گرج کر کہا۔

”سن لیا چوہدری صاحب۔“ اس نے موچھوں کو

تاکو دیتے ہوئے مٹی بشیر علی کو دیکھا اور باہر نکل گیا۔

”نہیں۔ نہیں۔ سلیمان پتر نہیں۔“ وہ خود نور محمد کے پیچھے لگا۔ پاس کھڑے بندے نے اسے گردن سے پکڑ کر کھینچا۔ وہ پھل پھل کر خود کو چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا۔ مٹی بشیر علی کو نور سے کو آوازیں دے رہا تھا۔ رائے سلیمان نے بے حد اطمینان سے یہ منظر دیکھا۔ زار اسے ضبط نہ ہوا۔

”سلیمان بھائی! پلیز۔“

”تمہیں دخل دینے کی ضرورت نہیں۔“ انہوں نے رکھائی سے جواب دیا اور مٹی کو دیکھنے لگے۔ مٹی پتر اس کا گناہ سمجھ گیا تھا۔

”جس چیز مٹی کی ہو بہت ہی لاپرواہی عورت ہے سارا گناہ جانتا ہے۔ ذرا سی لاپرواہی سے سارے گھر کو آگ لگا دی۔ سب جل کر راکھ ہو گئے۔ مٹی کا بیٹا ہو! اس کے تین نواسے اور۔“

”جس کو سلیمان! بس کرو یہ قلم ہے۔“ وہ خود کو چھڑا کر دونوں ہاتھ باندھتے ہوئے اس کے پیروں میں گر گیا۔

”تم بتاؤ سچ کیا ہے۔“

”اے روک۔ اے روک۔“

”میں اسے روک سکتا ہوں مگر سچ بولنا ہو گا۔ ایک منٹ کے اندر اندر۔ اگر نورے کے قدم اس بارغ سے باہر نکل گئے تو پھر میں اسے نہیں روکوں گا۔“

انہوں نے اطمینان بھرے لہجے میں کہا اور مٹی کے سامنے اپنا ہواں بیٹا خوبصورت ہو اور ننھے ننھے بچے آگے جو آگ کے شعلوں میں گھرے مٹی کی گرا سے عدو کے لیے پکار رہے تھے۔

اور ایک پہل انہیں لگا اسے وہ راز اٹھتے ہوئے جیسے اس نے میں برس تک چھپائے رکھا۔

”رائے نواز نے مجھے گناہ میں جھنڈ کو گولی مار دی۔ سارا قصہ ختم ہو جائے گا۔ اس نے خود جمشید کو بلایا کہ فیصلہ کرنا ہے۔ وہ دھوکے سے رائے جمشید کو وہاں تک لے آئے جہاں میں پہلے ہی چھپا ہوا تھا۔ انہوں نے اشارہ کیا تو میں نے گولی چلا دی مگر جمشید کا



تھوڑا بیک گیا۔ گولی دے کر اسے نواز کو چاٹ گئی۔ میں اسے مارنا نہیں چاہتا۔ مگر۔۔۔

وہ دھاڑیں مار مار کر رو رہا تھا۔ دے سلیمان ساکت وصامت بیٹھے تھے۔ خود زارا اور رضوان سانس لینا بھولی گئے تھے۔

”مجھے لگا زین العابدین سب کچھ جان لے گا۔ میں نے اسے گولی مار دی۔ مگر وہ بچ گیا۔“

آج اعتراف جرم کا دن تھا۔ جس بچ کی تلاش میں زین بھٹلا کر رہا تھا۔ عیاں ہو گیا تھا۔

دے سلیمان کی ٹھوکر اتنی بھری ہوئی تھی کہ وہ پیچھے کو الٹ گیا۔ انہوں نے جھپٹ کر متعلق ہاتھ میں لے لیا۔

”نمک حرام ہمیں ہر س تک آستین کے سانپ بن کر چلے رہے۔“

”نہیں سلیمان بھائی! رضوان نے تیزی سے آگے بڑھ کر متعلق پکڑ لیا۔

”بھٹ جاؤ رضوان۔۔۔“

”یہ زین سلیمان بھائی! کاؤن ہاتھ میں مت لیں۔“

زارا تیزی سے ان کے سامنے آئی اگر وہ دونوں وہاں نہ ہوتے تو اس وقت مٹی کی بلاش تڑپ رہی ہوتی۔

”میں نے میں ہر س تک اس شخص کو بزرگ سمجھ کر اپنے برابر بٹھایا اور یہ۔۔۔“

رضوان اور زارا نے پہلی بار انہیں اس طرح پھرتے دیکھا تھا۔ وہ مٹی بھر مٹی کی بوٹی بوٹی کر رہا تھا۔

”نور۔۔۔ نور۔۔۔“ ان کی گرج پر دوواڑے کے باہر کھڑا نور ایک کراندر آیا۔ مٹی نے ذرا سا سر اٹھا کر اسے دیکھا اور قدرے اطمینان سے زمین پر سر ٹکا دیا۔ اسے اب اس بات کی فکر نہ تھی کہ وہ اعتراف جرم کر چکا ہے۔

”لے جاؤ اسے میرے سامنے سے اور اس کے ساتھ وہی سلوک کرو جو کسی غارش زدہ کتے سے کیا جاتا ہے۔“

انہوں نے اسے لے کر غارت سے کہا جاتا ہے۔ اس کی شاہ میر کا بھڑکایا۔ وہ اسے تحسیت کر باہر

لے گئے تھے۔

رضوان نے سوا کل آف کیا تو سلیمان نے بغیر ان کی طرف پلٹے کہا تھا۔

”زارا کو لے کر حویلی چلے جاؤ۔ چالی جیب میں ہے۔“

”سلیمان بھائی! آپ۔۔۔“ وہ قدم آگے بڑھا۔

”میں اس وقت اس کے رہنا چاہتا ہوں۔“

”رضوان فارگڈ سیک۔! زارا اسے لے جاؤ۔“ اس وقت ان کی کیفیت ایسی تھی کہ وہ کسی کا سامنا نہیں کرنا چاہتے تھے۔ زارا نے رضوان کے بازو پر ہاتھ رکھ کر متوجہ کیا اور باہر نکلنے کا اشارہ کیا تھا۔

♥ ♥ ♥ ♥

سپر کلوقت تھا اور کتنی چپ۔

تھکا ہوا ذہن اور بھٹکی ہوئی سوجھیں۔

کون ہوں میں؟ یہ سوال کئی بار ان کے ذہن کی دیواروں سے ٹکراتا تھا۔

بس ایک دھند تھی جس میں ان کا وجود گم ہوتا جا رہا تھا۔

ان کا دل چاہتا وہ بھاگ جائیں ان دو دیوار سے باہر ان رشتوں سے دور بہت دور کسی ایسی جگہ جہاں انہیں کوئی نہ ڈھونڈ پائے۔

نجانے کیوں وہ اپنا اعتراف کھتی جا رہی تھیں۔

وہ اپنی جگہ سے اٹھیں اور ست روئی سے چلتی ڈورنگ ٹیبل کے سامنے جا کھڑی ہو گئیں۔ آئینے میں منعکس ہوتا چہرہ ان کا اپنا ہے؟

ایک بل کو انہیں دھچکا سا لگا۔

”آئمہ مراد! کیا یہ تم ہو؟“

جواب ایک آہ کی صورت ان کے لبوں پر آکر ٹوٹ گیا۔

”یہ زرد مچھلیا“ عمو سے محروم زندگی سے عاری وجود میرا ہے۔“

ان کی انگلیوں نے آئینے میں منعکس ہوتے عکس کو چھونے کی کوشش کی۔ انگلیاں آئینے کی شفاف سطح

سے ٹکرائیں۔

ہم لوگ نہ تھے ایسے جس جیسے نظر آتے

اس وقت کو ایسی دے

ہم لوگ نہ تھے ایسے

خبر نہ تھا ایسا

ہم لوگ نہ تھے ایسے

دار اندھے رشتے

لہ ان نہ تھی ہستی

ظہان نہ تھی ہستی

ہوں موت نہ تھی ہستی

آن جو صورت ہے

ملاوت نہ تھے ایسے

ہوں غیرت تھے موسم

ان رات نہ تھے ایسے

تقریب نہ تھی ایسی

ہم لوگ نہ تھے ایسے

اس وقت کو ایسی دے

ہم لوگ نہ تھے ایسے

”اے کاش! یہ سب ہوں نہ ہوں تو آج۔۔۔“

کمرے کا دروازہ آہستہ سے چرچا ایا۔ وہ سر تھکا کر

انہوں میں لڑنے والے آنسو صاف کرنے لگیں۔

کوئی دسبے قدموں اندر داخل ہوا اور کسی کے

دروازے پر پھونکی مانوس سی خوشبو پھیلی۔ تب ہی کسی

کے بازوؤں نے عقب سے انہیں اپنی گرفت میں لے لیا۔

انہوں نے چونک کر سر اٹھایا پھر ساکت ہو گئیں۔

انہیں لگا وہ ذرا بھی نہیں تو آئینے میں منعکس ہونا

عکس بکھر جائے گا۔

”مسکرایا۔ آئمہ بہت سی دیکھتی رہیں۔“

”چھو۔! اس نے آہستہ سے پکارا۔ وہ بری

طرح پر عکس اور تیزی سے پٹیں۔

وہ ایک قدم پیچھے ہوا اور مسکرا کر پوچھنے لگا۔

”کیا ہوا؟“

”نہیں نہیں آیا۔۔۔“

”آئمہ دس ذرا ان سے بھی دو دو ہاتھ ہو جائیں۔“

وہ اطمینان سے گویا ہوا۔

”تم سمجھ نہیں رہے۔“

”چھو۔! وہ مجھے کچھ نہیں کہیں گے کیونکہ۔“

”دیکھو نہ زین العابدین کو میں خود یہاں لایا ہوں۔“

ان کے دونوں ہاتھ اٹھے اور اس کے نقش چھونے لگے۔

زین نے ان کے دونوں ہاتھ تھام کر ہاتھ کی پشت پر بوسہ دیا اور سر اٹھا کر پوچھنے لگا۔

”آپ کو خوشی نہیں ہوئی؟“

تو وہ اس سے لپٹ کر بھٹ کر رو دیں۔

”کتنا چاہا تھا میں نے کہ تم میرے پاس آؤ یہاں۔۔۔“

”تو آپ کا خواب سچ ثابت ہو گیا نا۔۔۔“

اچانک انہوں نے زین کے سینے پر رکھا اپنا سر اٹھایا۔ کچھ لمبے اسے دیکھتی رہیں۔

”تم اتنے کمزور کیوں ہو رہے ہو۔“

اس سے قبل کہ وہ کوئی جواب دے انہوں نے اس کی شرٹ کے بٹن کھولنا شروع کر دیے اور اس کے

سینے کا زخم اور زخم پر بندھی ہوئی ان کے سامنے تھی۔

”یہ۔۔۔ یہ کیا ہے؟“ انہوں نے خوفزدگی سے پوچھا۔

”کچھ نہیں۔ معمولی سی چوٹ لگی تھی۔“ زین نے

بلا اور ان کا ہاتھ تھام کر انہیں بند پر بٹھا دیا اور خود ان کے قدموں میں قالین پر بیٹھ گیا۔ مگر وہ گھبرا کر کھڑی ہو گئیں۔

”تم یہاں تک کیسے آئے زین۔! چلے جاؤ۔ کوئی دیکھ لے گا۔“

”کوئی کچھ نہیں کہے گا پچھو۔! وہ اپنی جگہ سے اٹھا نہیں۔“

”نہیں۔ تم جاؤ یہاں سے۔ کہیں کہیں سلیمان۔۔۔“

”آئمہ دس ذرا ان سے بھی دو دو ہاتھ ہو جائیں۔“

وہ اطمینان سے گویا ہوا۔

”تم سمجھ نہیں رہے۔“

”آئمہ دس ذرا ان سے بھی دو دو ہاتھ ہو جائیں۔“

وہ اطمینان سے گویا ہوا۔

”تم سمجھ نہیں رہے۔“

”چھو۔! وہ مجھے کچھ نہیں کہیں گے کیونکہ۔“

”دیکھو نہ زین العابدین کو میں خود یہاں لایا ہوں۔“

”سلیمان اندر داخل ہوئے۔ زین اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ آئمہ تیزی سے زین کے سامنے آئیں۔ جیسے

اسے چھپا دینا چاہتی ہوں۔“



"میں تم کو بلانا ہے ہوا سے یہاں۔"  
 "کیا یہ اس کا گھر نہیں۔" سلیمان نے جواباً  
 سوال کیا سو کچھ پریشان ہو کر ان کا چہرہ دیکھنے لگیں۔  
 "اور آپ ہی نے تو کہا تھا۔ زمین یہاں آئے تو اسے  
 کچھ مت کہنا۔ میں۔ کچھ نہیں کہا۔ بس کلن سے  
 پکڑ کر یہاں تک لے آیا ہوں۔ اب جو چاہیں اس کے  
 ساتھ کریں۔"

وہ خامسے خوشگوار موڑ میں کہہ رہے تھے۔  
 "سلیمان! تم۔"

"اتنے بھی ہرے نہیں ہوں۔" زمین نے ان کا ہاتھ  
 پورا کیا۔ سلیمان کھل کر مسکرائے تھے اور آگے بے  
 نیکی سے دونوں کو دیکھتی رہیں پھر انہیں یوں نگاہیں  
 آبلہ پانی کا سفر تمام ہو گیا ہو۔

♥ ♥ ♥ ♥  
 جو بلی میں برسوں کی سوئی ہوئی خوشیاں اٹھوائی لے  
 کر جاگ اٹھیں۔

صدیوں کا چھایا سناٹا ایک چھناکے سے ٹوٹ کر بکھرا  
 تھا۔ اب تو انہیں تھیں۔ مسکرائیں، قہقہے، زندگی  
 سے بھر پور چہرے۔

آگے گویا پھر تہ تیغ انہیں۔ زمین کا اس گھر میں آنا  
 محض ایک فرد کا آنا نہیں تھا۔ یہ وہ خاندانوں کا ملبہ  
 تھا۔ وہ اوھر سے اوھر مہمانوں کو اٹینڈ کرتے  
 رہا دیووں میں آتے جاتے۔ لان میں ڈرنک سرو  
 کر داتے ہوئے انہیں لنگان آوازوں میں ایک آواز  
 اور بھی سنائی دی ہے۔ ان قہقروں میں ایک قہقہہ سب  
 سے الگ ہے۔ سب سے بلند اور سب سے چاند اور۔  
 "میں جانتی ہوں آج تمہاری ہے چھین دوس کو قرار  
 آیا ہو گا جیسا۔"

انہوں نے ایک طرف کھڑے ہو کر سوچا تھا۔  
 پلکیں جھٹک گئیں۔  
 "مہمان! آؤ کسی لیے؟" زارا انہیں ڈھونڈتے  
 ہوئے وہاں تک آئی تھی۔

"نہی بیٹا! تمہارے پیلا کا خیال آیا۔ وہ ہوتے تو  
 خوشیوں کا رنگ ہی کچھ اور ہوتا۔"

"وہ اب بھی ہمارے ساتھ ہیں۔ ہماری یادوں میں  
 ہمارے دل میں۔"

انہوں نے مسکرا کر اس کا گل پھینچا۔  
 "آئیں۔ دیکھیں افکار کتنی زیروست نظائیں سنا رہا  
 ہے۔" زارا نے ان کا حسیان بٹانا چاہا۔

"میں کیا کروں گی۔ وہ تو تمہارا انوں کی محفل ہے۔ تم  
 جاؤ۔ میں ذرا تمہاری تائی جان سے مل لوں۔"  
 انہوں نے ہلا پھر پوچھنے لگیں۔ "رضوان سے کوئی  
 ناراضی چل رہی ہے۔"

"میں تو کیوں۔؟" اس نے حیرت سے پوچھا اور  
 پلٹ کر رضوان کو دیکھنے لگی۔ وہ عمو کے پودے کے  
 پاس ایک ہاتھ تے پر نکائے اور دوسرے میں ڈرنک  
 کے زمین سے بات کر رہا تھا۔

"نہی کی۔ مجھے لگا تھا۔"  
 "کیسی تو کوئی بات نہیں۔"

رضوان نے اسے اپنی طرف دیکھتے پایا تو وہیں چلا  
 آیا۔

"جتن تو ہمیں لکھی نہیں مل رہی۔"

"جی ایسا ہی خیال میرا بھی ہے۔" زارا نے بھی  
 جتا دیا تو وہ نہیں دیا۔

"میں تو کچھ اور سوچے بیٹا افکار معلوم ہوا محترم  
 ہمیں اچھا انسان ہی نہیں سمجھتیں۔"

"یہ آپ سے کس نے کہا۔" اس نے پلٹ کر زمین  
 کو گھورا۔ وہ اشارے سے وہیں بلانے لگا۔

"اوھر اوھر سے معلوم پڑ ہی گیا۔"

"اوھر اوھر کی باتوں پر اعتبار نہیں کرتے۔ آئیے  
 وہاں زمین بلارہا ہے۔"

"تم چلو۔ مجھے اسی کی پاس کام ہے۔"

"خیر تو ہے تائی ابل سے آج سب کو کیا کام پڑ گیا۔"

وہ کھٹک سی گئی تھی۔ عالیہ، مہما اور تائی جان سرخوڑے  
 نچائے کون سی پلاننگ کر رہی تھیں۔

"نہی میں سوچ رہا ہوں۔ اسی کی خواہش بھی  
 پوری کر دی دوں۔" وہ اپنی پر شوق جذبے لٹائی نگاہیں  
 اس کے چہرے پر جماتے ہوئے بولا۔ وہ ایک پل کو پل

ی ہوئی پھر احتجاج کرتے ہوئے بولی۔

"یہ چیٹنگ ہے رضوان۔"

"سب مگر چلے گی۔ اب تمہارا کیا بھروسہ سا کل کو  
 مجھ سے کوئی غلطی ہو جائے تو میرے ہی خلاف کھڑی  
 نظر آؤ کہ موصوف اچھے انسان نہیں ہیں۔" وہ

پھینرتے ہوئے بولا تو وہ کچھ خفاسی ہو کر پلٹ گئی۔  
 "باقی رہے تمہارے شوق، تمہارا مقصد۔"

سب شنائی کے بعد سہی۔

رضوان نے کہا تو وہ سر جھٹک کر بولی تھی۔  
 "دیکھا جائے گا۔"

اور ان کے قریب چلی آئی۔ افکار، غلطی، انعم اور  
 زمین اپنی محفل جمائے بیٹھے تھے۔ غلطی کو خاصی مشکل  
 سے اجازت ملی تھی وہ بھی زارا کی سفارش پر۔ اول تو وہ

خود ہی اتنا نہ چاہتی تھی کہ وہاں افکار ہو گا۔ مگر زارا اور  
 انعم نے ایک نہ سنی تھی۔ اب وہ اپنی ساری کوشش  
 خود کو بے نیاز ظاہر کرنے میں صرف کر رہی تھی اور  
 افکار کے لیے کے رنگ ہی کچھ اور تھے۔ وہ غالب کا

وہابی ترجمہ سنا رہا تھا۔

میں خیا آپ تے ہے چنگا، ٹیڈی چند ملوک تے چنگی  
 نہیں

کدی قسمت تل ہے تھہ آوے تھہ نال چھو پایاں  
 گل نہ بنے

(اس نزاکت کا راہو وہ بھٹے ہیں تو کیا  
 ہاتھ آویں تو انہیں ہاتھ لگائے نہ بنے)

نہیں عشق ہو رہاں تے زور کوئی اے۔ آگ تے  
 غالب دھڑکی اے

تکچہ بھوکل مارے نہیں بھجھری پانی تل بھجھایاں  
 گل نہ بنے

(عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب  
 کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے)

اس سے قبل کہ وہ اگلا شعر پڑھتا انعم نے ہاتھ جوڑ  
 لیے۔

"بس کرو افکار خدا کے لیے۔"

"بس ایک اور۔"

"ہرگز نہیں۔"

زمین خاموشی سے کھڑا تھا۔ انہیں آپس میں جھگڑنا  
 دیکھ کر اس نے کھٹکنا چاہا مگر زارا اس نے آگئی۔

"گھبرا۔"

"کہیں نہیں۔" وہ مگر بڑا سا گیا۔  
 "تو پھر بیٹھ جاؤ۔" زارا نے اطمینان سے کرسی کی

طرف اشارہ کیا۔  
 "میں بس ابھی آتا ہوں۔"

"کوئی ضرورت نہیں۔" وہ جانتی تھی زمین کہاں  
 جانا چاہتا ہے۔

زمین نے غلطی سے اسے کھٹک۔  
 "زارا آئی لاتی بھی ظالم مت نہیں۔"

"میں اتنی ہی ظالم ہوں چھوٹے بھائی۔" اس  
 کے اطمینان و سکون میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔

"وہ آپ کو رضوان صاحب بلارہے ہیں۔"

"وہ مجھے نہیں بلارہے۔" وہ کس سے کس نہ  
 ہوئی۔

"آپ۔" وہ بری طرح جھنجھلا گیا۔ تب وہ بیٹھے  
 ہوئے ایک طرف ہو کر اشارہ کرتے ہوئے بولی تھی۔

"جاؤ۔"

"تھک چکا ہوں۔" اس نے ذرا ماسر کو خمیہ کر کہا  
 پھر چیز سی باہر کی طرف بڑھا تو اندر آئے سلیمان

سے ٹکر ہو گئی۔ سلیمان نے اسے کندھوں سے پکڑ کر  
 روکا پھر کندھے پر ٹھکی دیتے ہوئے کچھ کہا تھا۔

"یار! تمہارے یہ کزن بہت زیروست پر سنیل  
 رکھتے ہیں۔ بندہ خواہ مخواہ عیب میں آجاتا ہے۔" انعم

نے متاثر کن لہجے میں کہا تھا۔ زارا پلٹ کر انہیں  
 دیکھنے لگی۔

انہوں نے کہا تھا۔

"مجھے صرف اس بات کا افسوس ہوا تھا کہ تم لوگوں  
 نے مجھے اپنا دشمن سمجھ کر خود سے ہی کہانیاں گھڑ لیں۔"

خود ہی راست ڈھونڈنے نکل کھڑے ہوئے۔ ایک بار  
 میرے پاس تو آتے پھر دیکھتے رائے سلیمان تمہارے

لیے کیا کرنا ہے۔ میں نے بہت چھوٹی عمر میں اس جاگیر  
 لیے کیا کرنا ہے۔



جی نہ رہتا کہ یہاں ایک دوست تو سوداگر ہیں۔  
 جس میں سے ہمیشہ اپنے دوستوں کی نظر سے دیکھا تھا۔  
 جب اپنے باپ کو دشمن سمجھنے لگیں تو باقی کیا رہ جاتا  
 جسے وہ اعتماد نہیں دے سکتا۔

”ہاں ان کی اسی رعب و اب اور بظاہر سخت گیر  
 شخصیت نے ہمیں ان کو کبھی سمجھنے کا موقعہ نہیں دیا۔  
 مگر زمین کو جوڑی میں لا کر انہوں نے ثابت کیا ہے کہ  
 واقعی اس جاگیر کے صحیح وارث اور اس خاندان کے  
 سربراہ ہیں۔“

زارا آہستگی سے کہہ رہی تھی۔ تکی جان نے اسے  
 پکارا تو وہ محذرت کر کے ان کی طرف چلی گئی۔  
 ”کتنی شاندار جوڑی ہے ان کی۔“ اگم نے سر  
 اٹھا کر اس کے دو درو پار کو دیکھا۔ پھر کھڑی ہو گئی۔  
 ”میں ابھی آئی ہوں۔“

اسے جانے میں ایک بل نہ لگا۔ عظمیٰ ہڑبکا کر چوکی  
 اس سے قبل کہ اگم نے بے حد سادگی سے کہا  
 تھا۔

”میں تو آپ کو کچھ بھی نہیں کہہ رہا۔“  
 عظمیٰ نے تیوری چڑھا کر اسے دیکھا اور قدرے سن  
 بدل کر بیٹھ گئی۔ وہ بے نیازی سے ایک بازو کرہ کی  
 پشت پر پھیلائے کوہر اوہر دیکھا رہا۔

”کہاں مر گئی ہے؟“ وہ زبردست بڑبڑاتی تھی۔  
 افکار نے نظروں کا زاویہ بدل کر اسے دیکھا۔ وہ پیل  
 سی بیٹھی ہاتھ مسل رہی تھی۔ ایک ہلکی سی مسکراہٹ  
 اس کے لبوں پر کھڑ گئی۔ اپنی موچیں سنوارتے ہوئے  
 وہ ہلکا سا کہنے لگا۔ ”عظمیٰ کا دل دھڑوہڑ کرنے لگا۔ وہ  
 کچھ بھی نہیں کہہ رہا تھا۔ پھر بھی لگتا تھا۔ سب کچھ  
 کہہ گیا ہے۔“

”اٹھ جاؤں یا بیٹھی رہوں۔“ وہ متذبذب سی  
 تھی۔ ”نہیں وہ سمجھے گا میں پیل ہو رہی ہوں۔“  
 اس نے دھک دھک کرتے دل کو سنبھال کر خود کو  
 سرزنش کی۔

جب ہی اس نے پوچھی بیٹھے بیٹھے پوچھا تھا۔  
 ”اور سنائیں عظمیٰ کی بی بی! کیا حال چل رہی ہے؟“  
 ”ٹھیک ہوں۔“ اس نے سچے میں رکھائی پیدا  
 کرنے کی کوشش کی۔  
 ”خوش باش۔“

”ظاہر ہے۔“ وہ چڑ گئی۔  
 ”ہاں ہوتا بھی چاہیے۔“ افکار نے سر ہلاتے  
 ہوئے کہا۔

”اگر مطلب ہے۔“  
 ”سننا ہے۔ آپ کی منتظر تھی ہو رہی ہے۔“ اس کا  
 لہجہ اور نگاہیں جیسے گرم تھیں۔  
 عظمیٰ کو آؤ آگیا۔

”دیکھو! میرے ساتھ زیادہ فری ہونے کی ضرورت  
 نہیں۔“  
 افکار کا قہقہہ زبردست تھا۔

”ہاں بھئی“ چلے گا یہی انداز چلے گا۔ میں تو سوچ رہا  
 تھا عظمیٰ کی بی بی کا لہجہ بدل گیا تو ہمیں یقین کیسے آئے گا کہ  
 یہی ہماری عظمیٰ ہیں۔“

”ہماری عظمیٰ۔“ اس بے تکلفی پر وہ غش کھا  
 کر کرنے کو تیار تھی مگر کوئی فائدہ نہ ہوا۔ افکار کو  
 موقعہ مل جاتا مزید بیٹھنے کا۔ سو وہ تھکے سے کھڑی ہو  
 گئی۔

”دیکھو! میرے ساتھ اس انداز میں بات کی  
 تو۔“

”تو۔“ اس نے سمجھ نہیں اچکا کہ اسے دیکھا۔  
 ”میں انکار بھی کر سکتی ہوں۔“ اس نے گویا دھکی  
 دی۔

”اچھا۔“ وہ مظلوم ہو کر مسکرایا۔ عظمیٰ چڑ کر بیٹی  
 جب اس نے پکار کر پوچھا۔  
 ”ایک بات تو بتائی جاؤ۔“

”وہ نہ چاہتے ہوئے بھی رک مٹی مگر بیٹی نہیں تھی۔“  
 ”اس بار تمہارے گھر آئے کر آؤں یا اچھا کر  
 مرچاؤ۔“

”اس بار توپ صرف بات لے آئیں۔“ اگم نے کچھ  
 کہہ

فاسلے سے نکاری تھی۔  
 ”تم لوگ۔“ عظمیٰ نے غصے سے کہنا چاہا مگر  
 اس سے پہلے اسے لگا وہ یہ مصنوعی غصہ زیادہ دیر تک  
 قائم نہ رکھ سکے گی۔ کیونکہ سب مسکرا رہے تھے اور وہ  
 بہ قریز کھل کر ہنس رہا تھا۔ عظمیٰ کو لگا اس کا چہرہ مسخ ہو  
 رہا ہے۔ اسے سمجھ نہ آیا وہ کہاں جا چھپے۔



سارا لگاؤں حیران تھا۔  
 گھر گھر نکلی گئی ہر جگہ ہر محفل میں یہی تذکرہ تھا۔  
 رائے جشد، زمین العابدین، مفتی بشیر علی۔

نوبلی میں جشن کا سہارا تھا اور تاج کاؤں والوں کی  
 دعوت تھی۔ دعوت عام جس میں ہر کوئی مدعو تھا۔  
 سب ہی گئے تھے۔ زمین بارہ نے انکار کر دیا تھا۔ اکیلے  
 جانے کی بات اور تھی مگر بھینڑ بھاڑ سے اسے اب بھی  
 اچھن ہوئی تھی۔

”کمال ہے۔ تم مبارکباد بھی نہ دو گی انہیں۔“ اسامہ  
 نے حیرت سے پوچھا تھا۔

”بعد میں جا کر دے دوں گی۔“ اس نے آہستگی سے  
 کہا تو مسرور ساما مقبول بول اٹھا۔

”ہاں۔“ ہاں بعد میں چلی جائے گی۔ یہ تو دانی بیٹی  
 ہے۔ اسے یوں جانا بھی نہیں چاہیے۔“

”یہ بہت اچھا ہوا۔ آئمہ آئی بہت خوش ہوئی گی۔“  
 ان کا بھتیجا ان کے پاس آگیا۔ کتنی پریشان تھیں اس  
 دن۔“

ان سب کے جانے کے بعد اس نے صحن میں  
 کھڑے ہو کر سوچا تھا۔ پھر اوہر اوہر دیکھنے لگی۔  
 برسات آنے والی تھی اور کچے صحن کو لپیٹائی کی  
 ضرورت تھی۔ اسامہ نے مٹی گوندھ رکھی تھی مگر  
 دعوت کے شوق میں سب چھوڑ چھاڑ کر چلی گئی۔

”چلو زمین تاردا! پہلے ہی کلام نہ لادو۔“ اس نے کمر  
 کے گرد دوپٹہ لپیٹا اور شروع ہو گئی۔ یہ کلام اس کے لیے  
 مشکل نہ تھا۔ وہاں بھی جھٹ کی لپیٹائی وہی کرتی تھی۔  
 تو اسے صحن کی لپیٹائی ہو گئی۔ وہ سر جھکائے اپنے کلام  
 میں منہمک تھی۔ جب کوئی دنداٹا ہوا صحن میں گھس

آیا۔ ساری محنت برباد ہو گئی۔  
 زمین تارہ نے جھنجھلا کر سر اٹھایا تاکہ آنے والے کی  
 کھجائی کر سکے۔  
 مگر سادہ رہ گئی۔ جہاں تھی وہیں محمد ہو گئی۔  
 وہ اس کے قریب آکر رک گیا تھا۔  
 ”اتنی حیرت۔“ اس نے زمین تارہ کی تحیر بھری  
 آنکھوں میں جھانک کر کہا۔

اسے یقین نہیں تھا کہ وہ آئے گا۔ اس نے زمین  
 العابدین کے حوالے سے کوئی خواب نہیں سچایا تھا۔  
 کوئی امید نہیں باندھی تھی۔ کبھی دعا نہیں کی تھی۔  
 اسے لگتا تھا خواب جھوٹے ہیں امیدیں ٹوٹ جانے  
 کے لیے اور دعا۔ خدا اس کی دعا نہیں مستجاب کرے۔

ان دیکھے خواب یوں پورے ہوتے ہیں۔  
 ٹوٹ جانے والی امیدیں پھر سے بندھ جاتی ہیں۔  
 اور کوئی بھولی بھری دعا یوں بھی پوری ہو جاتی ہے۔  
 زمین تارہ کا دل چاہا۔ وہ یونہی بیٹھے بیٹھے اس کے  
 قدموں میں خاکہ بن کر کھڑ جائے مگر زمین العابدین نے  
 ذرا سا جھک کر اسے کندھوں سے تھام کر اپنے مقابل  
 کھڑا کر کے اس کے مقام کا یقین کر دیا۔  
 ”اب انتظار آیا۔“

وہ پوچھ رہا تھا اور زمین تارہ کا دل چاہا اس کے سینے پر  
 سر رکھ کر آتا دے کہ سارے آنسو ختم ہو جائیں۔

عمران ڈائجسٹ کا ایک حیرت انگیز سلسلہ!

# ایئر پوسٹس

آپ وہ قصوں میں شائع ہو سکتی ہے!

مکتبہ عمران ڈائجسٹ، ۲۴ دیوبند بازار کراچی



کہہ نکلے وہ آج کے بعد روٹا نہیں چاہتی تھی۔  
”ساتھ چلو۔“ اس نے دونوں ہاتھوں میں چہرہ  
چھپا کر روٹا چاہا۔

زین العابدین نے اس کی کلاںیاں تھام لیں۔  
”لو ہوں۔ بھوتہ بن جاؤ گی۔“

وہ جھینپ کر مسکرائی پھر کھکھلا کر ہنس دی۔  
اور مسکرائی عین تارہ کیسی لگتی ہوئی۔

زین العابدین نے کئی بار سوچا تھا۔

”چلو۔“ زین العابدین نے کہا تو وہ اثبات میں سر ہلا  
گئی۔ زین نے اس کی کلاںیاں چھوڑ کر دو قدم پیچھے ہو  
کر سر تپا اس کا جائزہ لیا پھر ٹاک چڑھا کر بولا۔

”یوں لے کر جاؤں گے۔“

”میں ہاتھ دھو کر آتی ہوں۔“ وہ شرمندہ سی ہو گئی۔

”پھر بھی اس بیٹے میں۔“

”چلیں“ میں کپڑے بدل لیتی ہوں۔“ وہ مزید  
شرمندہ ہوئی۔

”نہیں۔“ وہ اب بھی مطمئن نہ ہوا تھا۔

”تو پیچھے۔“ عین تارہ اسے دیکھنے لگی۔

”یوں نہیں۔ میں تمہیں اسی طرح لے کر جاؤں گا  
جس طرح ہر لڑکی کا ارمان ہوتا ہے۔ چلو گی نا حویلی۔“

”سوئی۔“ اس نے چونک کر سر اٹھایا۔

”ہاں حویلی۔“

وہ پکرا گئی۔ حویلی، زین العابدین، مائے مقبول کی  
باتیں۔

”آ۔ آپ حویلی میں رہتے ہیں۔۔۔“ وہ انک سی  
گئی۔

”رہتا نہیں تھا۔ اب رہوں گا۔“ وہ کھل کر  
مسکرایا۔ پھر اسے ہنکاؤ نکھ کر پوچھنے لگا۔

”کیوں حویلی کے زین العابدین سے شادی نہیں کرو  
گی۔“

وہ کیا کہتی۔ کم صم کھڑی تھی۔ زندگی میں اتنی  
کھٹانیاں آئی تھیں۔ اسے لگا وہ مر جائے گی۔ مگر وہ

مری نہیں گئی۔ زندہ تھی۔ مگر یہ نہیں جانتی تھی کہ  
خدا اس کے لیے اتنا بڑا انعام چھپا کر رکھے ہوئے تھا۔

اتنا سا بھی شبہ ہو تا تو کبھی خدا اسے گلہ نہ کرتی۔

”اب تو انتظار کرو گی۔“ وہ پوچھ رہا تھا۔ اس نے  
اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ مسکرا کر پلٹ گیا۔ عین تارہ اس

کے ساتھ چلتی دروازے تک آئی۔

”سنو! سلا خفہ کیا لو گی۔“ وہ دروازے میں رک کر  
پوچھ رہا تھا۔ وہ کچھ نہ دیکھنے والے انداز میں اسے

دیکھنے لگی۔

اس نے دوبارہ اپنا سوال دہرایا۔

”کچھ بھی نہیں۔“۔۔۔ آہستہ لگی سے گویا ہوئی۔

”اچھا۔ پھر خود ہی کچھ کریں گے۔“ وہ کندھے اچکا  
کر جابے لگا تو عین تارہ نے بے اختیار اسے پکارا۔

”سنو۔“

وہ رک گیا۔

”مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ نہ محبت نہ وفا نہ دولت  
نہ حویلی۔ مگر میں ایک اعتبار۔“ وہ سر جھکائے کہہ رہی

تھی۔

”مجھے تمہیں سب ہی کچھ دینا ہے اعتبار سمیت۔“  
اب وہ اس کے کسی بھی لفظ پر آنکھیں بند کر کے

اعتبار کر سکتی تھی۔

وہ باہر نکل گیا تو عین تارہ دروازے میں کھڑی ہو کر  
اس کے قدم گھسنے لگی۔ وقت ان دونوں کو دیکھ کر

مسکرائے لگا۔

”وقت سے پہلے کسی کو کچھ نہیں ملتا۔“ یہ عین تارہ  
نے سیکھا تھا۔

”آپ قسمت سے بھاگ نہیں سکتے۔ زندگی میں  
آنے والی سختانیاں سہنی پڑیں گی۔ بعض اوقات وقت

کی دھند میں واقعات بہم ہو جاتے ہیں لیکن سلا قدم  
پہلی کو شش آپ کے لیے راستے کھول دیتا ہے۔ منہلی

واضح کر دیتا ہے۔ بس کو شش شرط ہے۔ پہلا قدم اٹھنا  
چاہیے۔“

یہ زین العابدین نے سیکھا تھا۔ وقت نے ان دونوں  
پر ایک مہیاں نگاہ ڈالی اور خاموشی سے گزر گیا۔ وہ اپنی

گواہی دے چکا تھا۔

